جلد 50 • شمارہ 03 • مارچ 2020 • زرِ سالانہ 1200 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 100 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: (021) 35895313 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

151 — جواری
[illegible]

164 — الاؤ
انسان نما درندوں کی داستان وہ جیتے جاگتے [illegible] بازاری جنس بنادیتے ہیں

195 — راستہ
الفت..... نفرت اور اکتاہٹ سے جڑی تکون کے مختلف زاویے

199 — جادو
اپنی جادوگری سے زندگی کے اندھیروں کو اجالوں میں بدلنے کی خواہش منزل کا پہلا قدم

208 — چالاک
چالاکی سے دوستی کرنے والے دشمن کی انتقامی کارروائی.....

217 — دیر آید
تیزی سے شگفتگی کے زینے اترتی چڑھتی تحریر کے ناہموار زاویے

228 — گھات
[illegible] تشنگی بجھانے کے لیے ظاہر و باطن [illegible] والے فریب گزیدہ کا انجام

259 — قاتل ہیولا
ایک ہی صورت میں ڈھلے دو متضاد مزاجوں کا شاخسانہ..... سرورق کی تیکھی کہانی

پبلشر و پرنٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پروپرائٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیراعلیٰ

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من ۔۔ السلام علیکم!

گھی، تیل، چینی، آٹا، پیٹرول، بجلی غرض ہر سمت سے مہنگائی کا ایسا طوفان آیا ہوا ہے کہ محدود آمدنی والے طبقات بُری طرح بوکھلا گئے ہیں۔ بات اتنی بڑھی کہ اعلیٰ حکومت کو بھی سخت اقدامات کا اعلان کرنا پڑ گیا ہے۔ اس ضمن میں کچھ مافیاز کا بھی ذکر چلا جو معاشی اور مالی اصلاحات میں چور دروازے سے رکاوٹیں پیدا کررہی ہیں۔ سرکار اور مافیاز کی لڑائی کی چکی میں تیل بے بس ولاچار عوام کا نکل رہا ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ تیز تر حکومتی اقدامات مہنگائی کے اس چوطرفہ بحران کو سختی سے کچلنے میں کامیاب رہیں گے اور عوام کو سکھ کا سانس لینے کا موقع میسر آئے گا۔ یہ درست کہ عالمی منظرنامے میں پاکستان کا تاثر مثبت اشارے دے رہا ہے مگر ان سے عوامی مشکلات میں فوری طور پر کوئی کمی واقع نہیں ہوسکتی۔ سب کچھ اسی طرح بہتری کی طرف چلتا رہا تو چند سالوں میں اس کے اچھے اثرات سامنے آسکیں گے۔ فوری ازالے کی امید صرف اور صرف حکومت ہی سے کی جاسکتی ہے کیونکہ مافیاز کے منظم وار کا مقابلہ کرنا عوام کے بس سے باہر ہے۔ آفات قدرتی ہوں تو انسان اسے مشیتِ الٰہی سمجھ کر صبر کرلیتا ہے لیکن اپنے ہی جیسے انسانوں کے پیدا کیے ہوئے امتحانوں پر دلوں سے صرف بددعا ہی نکلتی ہے۔ کاش ذخیرہ اندوز اور گراں فروش یہ حقیقت جان لیں کہ

دل سے جو آہ نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پَر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

ہم سب کو یہ جان لینا چاہیے کہ ذخیرہ اندوزی، گراں فروشی اور دیگر غیر قانونی وغیر اخلاقی ذرائع سے سمیٹی ہوئی دولت کے انبار اپنے ساتھ سکھ چین کے بجائے موذی بیماریوں، بے رحم معذوریوں اور دماغی انتشار کا ہولناک عذاب ہی لاتے ہیں۔ پس مرگ ایسے لوگوں کے ساتھ جو ہوتا ہے، وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ روزمرہ خورونوش کے بے پایاں قدرتی وسائل پر قابض لوگ اور گروہ اس رمز کو سمجھ لیں تو کہیں گرانی کا طوفان سر اٹھائے نہ قحط کی سی صورت پیدا ہو۔ بہرحال دمِ تحریر چینی سستی ہو یا نہ ہو، ہم اپنی چینی نکتہ چینی پر گزارا کرتے ہیں۔

راولپنڈی سے عابد علی بھٹی کی پسندیدگی ''اس ماہ فروری کا شمارہ توقع کے برعکس جلد ہی مل گیا۔ سرورق پر موجود لڑکی کچھ پریشان سی تھی۔ اگر اس لڑکی کو ذاکر انکل نے اسکیچ کیا ہوتا تو یہ منہ اوپر اٹھا کر ہنس رہی ہوتی۔ ہم اسے یونہی پریشانی کی حالت میں چھوڑ کر خطوط کی محفل میں چلے گئے۔ جہاں منڈی سے آنے ہوئے منصور کامران براجمان تھے۔ تبصرہ جلدی بھیجنے کے چکر میں کہانیوں کو غور سے نہیں پڑھ پائے۔ میں آپ کو کہوں گا کہ گولڈن جوبلی جیسی کہانیاں بہت کم پڑھنے کو ملتی ہیں اور سالوں یاد رہتی ہیں۔ باقیوں کے خطوط بھی اچھے تھے، خاص کر محمل علی اور ریاست خان کے تبصرے اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اپنے پسندیدہ لکھاری محترم مرحوم کاشف زبیر کی الاؤ پڑھی۔ پہلی چھ قسطیں تو خون کو گرمادینے والی تھیں۔ اب اختتام تک عبدالرب بھٹی پہنچا ئیں گے۔ گو کہ پہلے والا مزہ نہیں آیا۔ جس طرح کاشف کسی بھی موضوع کو اپنے سادہ اور خوب صورت الفاظ سے اپنی کہانی کو نکھار دیتے تھے۔ بھٹی صاحب نے بھی اپنی بہترین کوشش کی۔ کاشف زبیر نے اتنے انکشاف تین چار اقساط میں نہیں کیے جتنے بھٹی صاحب نے ایک ہی قسط میں کرڈالے۔ پچھلی تمام اقساط کے صفحات اٹھارہ سے بیس ہوتے تھے لیکن اس ماہ چودہ تھے۔ میرے خیال میں یہ اب اتنی طویل نہیں ہوگی جتنا اس کو ہونا تھا۔ (اتنی دور کا کیوں سوچ رہے ہیں؟) الاؤ کے بعد باغ سے باغ تک پڑھی۔ اس دفعہ مغل صاحب اپنے طلسماتی قلم سے انڈیا کی سرزمین پر رونما ہونے والے واقعات لے کر آئے ہیں۔ انڈیا جس کے بارے میں تصویر دیکھ کر یا کچھ پڑھ کر دل میں ایک عجیب سی بے چینی پیدا ہوتی ہے یہی انڈیا جہاں ہمارے آباؤاجداد نے طویل حکمرانی کی اور کئی یادگاریں چھوڑیں۔ اب وہاں پر ہندوؤں کی حکمرانی ہے۔ اپنے آباؤاجداد کی تعمیر کردہ خوب صورت یادگار، محل، عمارتیں اور قلعے دیکھنے کو دل مچلتا ہے۔ کیا باقی قارئین کو بھی ایسا ہی احساس ہوتا ہے۔ مجھے یہی لگتا ہے کہ وہ ہماری اپنی زمین ہے اور ہم نے اسے گروی رکھوایا ہوا ہے۔ چونکہ یہ کہانی انڈیا کے بارے میں تھی اس لیے ہم نے خوب دل سے پڑھی۔ اس کہانی کا ایک اہم موضوع جلیانوالہ باغ کا قتلِ عام تھا۔ مغل صاحب نے اپنی کہانی میں جنرل ڈائر کے سوا سب کرداروں کے نام تبدیل کر کے لکھے۔ راسم حیدر نے کشمیر پر ظلم وستم ڈھانے والے آکاش اروڑا کو اس کے گھر میں جا کر جہنم واصل کردیا اور پھر خود کشمیر کی آزادی کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ چار کوٹھیوں کے بارے میں پڑھ کر پنڈی کے راجہ بازار کے انگریز دور کی عمارتیں نظر کے سامنے آگئیں۔ مغل صاحب نے انڈیا کی خوب سیر کرائی۔ 5 فروری کشمیر کے حوالے سے یہ ایک یادگار تحفہ بھی تھا۔ یہ کہانی سالوں یاد رہے گی۔ اس کے بعد نئی سلسلے وار تحریر اناگیر پڑھی۔ امید ہے کہ یہ کہانی ہماری توقعات پر پورا اترے گی۔ یعقوب بھٹی صاحب اور مغل صاحب کی تحاریر کا شدت سے انتظار ہے۔''

سید بدرالاسلام بدر کے خیالات ''اس بار شمارہ 2 تاریخ کو ملا اور تین کو پڑھ کر خط حاضرِ خدمت ہے۔ سرورق اس بار کافی الگ دوشیزہ سے مزین تھا۔ پھر وہی کہ حالِ دل کیونکر لکھوں۔ ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا۔ اب چینیوں میں چھلانگ لگائی اور ڈائجسٹ کو تھوڑا دور رکھ کر پڑھا کہ اگر چینیوں میں سے کرونا وائرس کا خطرہ ہو تو بچیں رہیں البتہ اپنا نام تھوڑا قریب کر کے دیکھا۔ الاؤ کے بارے میں جب پڑھا کہ ڈاکٹر صاحب لکھ رہے ہیں تو آوارہ

گرد کا انجام یاد آیا۔ ڈاکٹر صاحب رحم کیجیو! نئی قسط وار کہانی امجد جاوید کے نام کے ساتھ دیکھ کر حیرت ہوئی اور ابتدائی قسط دیکھ اور پڑھ کر اس سے بھی زیادہ حیرانی ہوئی۔ اے صاحب، کاہے کو تڑپاتے ہو۔ اب کی بار اتنا ہی۔''

وزیر آباد سے محمد احسن زمان جیسے درویش کی صدا ''فروری کا شمارہ اس بار 29 جنوری کو ہی مل گیا تو دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا لیکن جلد ہی ساری خوشی کافور ہو گئی جب اپنا تبصرہ غائب پایا، غالباً محکمہ ڈاک کی نذر ہو گیا۔ افسوس ہوا لیکن پچھتائے کیا ہوت جب لفافہ ہو گیا گم۔ (گم تو نہیں ہوا مگر بہت تاخیر سے ملا)۔ سرورق اس بار کچھ خاص نہ تھا، حسینہ اجڑی اجڑی سی تھی۔ لہٰذا اس سے صرف نظر کر کے محفل ہاؤ ہو میں داخل ہوئے۔ پہلے تو آپ کا لیکچر ہضم کرنا پڑا جو کہ سراسر ہمارے فائدے کے لیے تھا لیکن حرام ہے جو کوئی اس آہ و فغاں پر عمل کرے۔ خاتونِ خانہ کی شبانہ روز مصروفیت کو ہی مدِنظر رکھ لیں اور ہماری آفت کے پرکالہ بچوں کو لے لیں، انجام کار ایک دوسرے پر ذمے داری ڈال کر خاموش ہو بیٹھتے ہیں اور پرنالا وہیں کا وہیں رہتا ہے، اگلی بارش تک...... مم...... میرا مطلب ہے اگلی تلخ کلامی تک۔ منصور کامران کا تبصرہ پہلے پائدان پر کھڑا تھا، منصور صاحب نے راسو کے بارے میں صحیح اندازہ لگایا تھا اور کیا خوب لگایا۔ میانوالی سے ریاست خان نے جاسوسی پر تو کم لکھا محفل کا حال زیادہ سنایا۔ محمل علی اور نورین مبارک کے تبصرے بھی جاندار تھے۔ ذیشان کاظمی اور ممتاز فیروز پوری نے قلم کا حق ادا کیا، ایمانے زاراشاہ، عرفان شبیر راجہ اور ساگر تلوکر کی تعریف نہ کرنا بھی ناانصافی ہوگی۔ ایمانے زاراشاہ کی تیکھی باتیں محفل کا لطف دوبالا کر دیتی ہیں۔ امجد جاوید اناگیر کے ساتھ حاضر تھے۔ صحرائے چولستان کی بھول بھلیوں میں الجھی داستان سے بے حد لطف اندوز ہوں گے، آغاز بتاتا ہے۔ خصوصاً علی زین اور ساوری کی کہانی دور تک چلے گی لیکن علی کی ماضی کی کوئی پھانس بھی ساتھ ہے جو اس علاقے سے جڑی ہے۔ بہرحال ابھی تو آغاز ہے آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ جمال دستی کی بساط جاسوسی ڈائجسٹ کے سارے لوازمات کو پورا کر رہی تھی اور جیکب رسل کی بچھائی بساط میں اس کا اپنا بیٹا ہی پھنس گیا اور ساتھ میں کیری بھی۔ واقعی اگر ڈیوڈ بساط پر بچھے مہروں کا علم بھی سیکھ جاتا تو کیا بھلا ہوتا لیکن وہ مجرم ہی کیا جس سے غلطی نہ ہو۔ محبت کی طاقت کے انجام نے حیران کر دیا۔ یوں لگا جیسے اش (اشائیل) بیوی کے سر کی قیمت رکھے گا لیکن وہ تو اس کی محبت میں ایسا سرشار نکلا کہ اس کی مدد کو میدان میں آنے کو ہی تیار ہو گیا، واہ مغرب تیرے رنگ۔ اعتراز سلیم وصلی کی وجہ اچھی کاوش تھی، روبیر نے درست کہا تھا۔ حیوانوں کی دنیا کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں لیکن مہذب دنیا کے باسیوں نے قاعدے، اصول، ضابطے نام کے جھنجھٹ سے اپنی جان کب کی چھڑائی ہوئی ہے لیکن اس بات کا دکھ ضرور ہوا کہ جزیرے کے لوگ علاج پر راضی نہیں ہوئے اور نہ ہی بیماری کی تشخیص کے لیے کوئی تگ و دو ہوئی لیکن آخر میں سارا سچ بیان کر گیا، الاؤ کی باگ ڈور اب بھٹی صاحب کے ہاتھ میں آ گئی ہے، وہ بھی منجھے ہوئے قلم کار ہیں امید ہے اپنے قلم سے بھرپور انصاف کریں گے۔ اللہ کاشف صاحب کی منزلیں آسان کرے، ان کی غلطیوں، کوتاہیوں کو... بدل کر جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین) مجھے تو پہلی قسط میں ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ جب ڈاکٹر میش وہ سلور بکس خاص طور پر ڈاکٹر سیف کو دکھا کر لفٹ میں داخل ہوا اور بعدازاں عادل کی لاش ملی تو میرا ذہن فوراً سلور بکس کی جانب چلا گیا۔ بعد میں آنے والے واقعات نے جسے درست ثابت کر دیا۔ بہرحال بلی چوہے کا یہ کھیل جلد ختم ہونے والا تو نہیں لگتا۔ ناقابلِ اعتبار میں مارگریٹ کے انجام نے ٹھرا کر رکھ دیا، سیلاس نے بھرپور کوشش کی کہ سب کچھ اس کے ہاتھ آ جائے لیکن اس کے ہاتھ صرف ہتھکڑی اور کال کوٹھری ہی آئی۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔ منظر امام کی بھیڑیا، واہ کیا دل کو چھو گئی۔ کہانی کے اختتام تک اندازہ نہ ہو سکا کہ تنزیلہ کا انجام ایسا ہوگا اور باس کی فطرت یہ ہوگی۔ اچھی فطرت کا حامل اپنے محسن کو کبھی نہ بھلا پایا۔ باغ سے باغ تک دوسرے حصے میں اپنے انجام کو پہنچی لیکن جاتے جاتے یہ پیغام ضرور دے گئی کہ آزادی پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں بھری راہ گزر ہے۔ یہ ایسی پیاس جسے پانی سے نہیں بجھایا جا سکتا بلکہ اس کے لیے انسانی رگوں میں دوڑتا ہوا خون درکار ہے اور ہمارے کشمیری بھائی اور بہنیں ہر روز ایسی ہی لازوال داستانیں رقم کر رہے ہیں۔ قابض بھارتی افواج ظلم و بربریت کا بازار گرم کیے اقوامِ عالم کے منہ پر طمانچے مار رہی ہے اور دردِ دل رکھنے والے لوگ تلملاہٹ کے سوا کچھ نہیں کر سکتے لیکن ایک بات کا یقین ہو چلا ہے کہ مغربی طاقتیں کبھی بھی مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیں گی۔ جعلی مقابلہ پڑھ کر بہت ہنسی آئی کہ رابرٹ نے ولی کے ساتھ مل کر چوروں کی مت ہی مار دی، حاضر دماغی بھی کیا چیز ہے۔ سرور اکرام کی مرحوم قاتل بھی عمدہ تحریر تھی، بوڑھا اکرم مرتے مرتے بھتیجے کے جوڑوں میں بیٹھ گیا جو دولت چراتے چراتے جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ ماہ رخ کی پیش بیں انسانی ذہن کے انتہائی نظام کو سمجھانے کی عمدہ کاوش تھی۔ احمد جعفری صاحب کی ناکردہ عمدہ تحریر رہی، واقعی بھٹکنا تو بہت آسان ہوتا ہے لیکن بھٹکے ہوؤں کو راہِ راست پر لانا انتہائی کٹھن اور دل گردے کا کام ہوتا ہے، وکٹر نے جوزف سے کیا ہوا وعدہ خوب نبھایا لیکن جب اسمتھ نے وکٹر کو پانی میں دھکا دیا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور میں سمجھا کہ شاید وکٹر کے اندر کا شیطان جاگ گیا ہے لیکن بھلا ہو اس فون کال کا جس کی آمد سے وکٹر کی جان بچ گئی۔ اب باری آتی ہے سرورق کی دو کہانیوں کی۔ بچھڑے خواب بہت عمدہ انداز میں پیش کی گئی تھی۔ سیمن، اسد اور نتاشا کی تکون کے گرد ساری کہانی گھومی۔ اسد بالآخر اپنی بیٹی کو کھوجنے میں کامیاب ہو گیا۔ واقعی انسان جب کسی کو کھوجنے میں لگ جاتا ہے تو پھر ملنا ہی مقدر ہوتا ہے، اب انسان چاہے تو اللہ کو کھوجے یا اللہ کے بندے کو، مل ہی جاتا ہے۔ خون آشام کا انجام بالکل بھی اچھا نہیں لگا، کچھ عجیب الجھی ہوئی کتھا تھی۔ اس لیے میرا ذہن بھی الجھا ہوا ہے، لہٰذا اس پر تبصرہ ندارد۔ بہرحال اس بار کے شمارے پر بہت محنت کی گئی تھی۔ ملک و ملت کی سربلندی اور حفاظت کے لیے دعا گو ہیں، اس درویش کی یہی صدا ہے۔''

رانا بشیر احمد ایاز احسان پور ضلع رحیم یار خان سے شکوہ کناں ہیں ''کافی طویل غیر حاضری کے بعد پھر سے محفلِ خوش رنگ میں آنے کی جسارت کی ہے۔ ایک تو کچھ تعلیمی سرگرمیاں دوسرے بے رخی، جاناں! ارے وہ جاناں نہیں۔ یہاں جاناں سے مراد جاسوسی ہے۔ گزشتہ سال کے ماہ ستمبر میں خط

لکھا تھا اور محفل تو دور کی بات کالی فہرست میں بھی نام نہیں آیا۔ اس لیے چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ کو آئندہ نہ استعمال کرنے کا فیصلہ کرلیا لیکن پھر سوچا ایک مرتبہ پھر کوشش کرلی جائے۔ (ہمیشہ اچھا ہی سوچیں) فروری کا شمارہ 3 تاریخ کو ہاتھ آیا۔ سرورق پر ٹائٹل گرل میرے خیال سے یونانی حسن سے متاثر ہو کر تخلیق کی گئی۔ وہی انداز اور عشوہ و ناز۔ ساتھ میں نیچے زمین بوس شخص وطنِ عزیز کے ایک مشہور وفاقی وزیر کا عکس نظر آئے۔ وزیراعظم کی کرسی پر منصور کامران فائز رہے۔ بہت عمدہ تبصرہ نگاری۔ ریاست خان غلط فہمیوں کے سمندر میں غوطہ زن نظر آئے۔ اپنے ہی ضلع رحیم یار خان سے محمل علی بھی جامع تبصرہ کے ساتھ قلم نگاری کے جوہر دکھاتی نظر آئیں۔ ویلڈن محمل علی۔ آخرکار سید ذیشان حیدر کاظمی نے محفل میں قدم رنجہ فرما ہی دیا مگر کڑوی کسیلی باتوں سے۔ موصوف کی کڑوی باتیں بالکل ہمدرد صافی کی طرح تھیں۔ ایمانے زارا شاہ کی لفاظی اور گولا باری بھی بہت اچھی رہی۔ ویلڈن ایمانے شاہ۔ کہانیوں میں اس دفعہ خلافِ معمول آغاز پہلی کہانی سے کیا۔ اناگیر، امجد جاوید کے قلم سے نیا سلسلہ۔ شروع میں ہی جنوبی پنجاب میں واقع صحرائے چولستان کی منظر نگاری شاندار رہی۔ لیکن ہیرو لگتا ہے ناسٹیلجیا کا شکار رہے۔ ملا کی دوڑ مسجد تک، کے مصداق علی کی دوڑ گوپے سے ڈیرے تک رہی۔ اینڈ میں پیروزاں کے کردار سے کچھ سنسنی آتی دکھائی ہے۔ الاؤ کو اس دفعہ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی آگے بڑھاتے دکھائی دیے۔ حسبِ توقع اندازہ درست ثابت ہوا کہ کاشف زبیر مرحوم کی جگہ نئے رائٹر بھٹی صاحب ہوں گے۔ کہانی بہت اچھی رفتار اور مزاج آشنائی کے ساتھ آگے چل رہی ہے۔ مختصر کہانیوں میں سب سے پہلے منظر امام کا نام دیکھا تو فوراً سے بیشتر بھیڑیا کی طرف گامزن ہوئے۔ مصنف اس دفعہ دورِ حاضر کے انسانی رویّوں اور معاشرتی المیوں پر نوحہ خواں نظر آئے۔ اس دنیا میں سب ہوتا ہے۔ آخرکار دنیائے روزگار تو چلنا ہے۔ کافی معقول تحریر رہی۔ نگاہِ انتخاب اپنے ہردلعزیز اور من پسند مصنف طاہر جاوید مغل کے اسم گرامی پر گئی تو باغ سے باغ تک کا وہ سفر وہاں سے جوڑا جہاں سے گزشتہ ماہ تعطل آیا تھا۔ پڑوسی ملک کا انتہائی غلیظ و مکروہ چہرہ سامنے آیا۔ مغل صاحب نے داستان میں جس طرح حسن ترتیب سے تاریخ، محبت اور جدوجہد کشمیر کو یکجا کیا ہے، اس سے نشہ ایک یا دو آتشہ نہیں بلکہ سہ آتشہ ہوگیا۔ مغل صاحب بے شک داد و تحسین کے حق دار ہیں۔ کہانی میں اہلِ کشمیر کے حالات کی بھرپور عکاسی کی گئی۔‘‘

احسان پور سے عکاشہ سجاد کا انکشاف ’’گزشتہ تین سال سے باقاعدہ قاری ہوں لیکن تبصرہ پہلی بار لکھ رہا ہوں امید ہے خوش آمدید ضرور کہیں گے۔ (یقیناً۔ خوش آمدید) سرورق بس ٹھیک ہی تھا۔ سرورق کو نظرانداز کرتے ہوئے محفل کا دروازہ منصور کامران نے کھولا اور اپنا نام ڈھونڈنا شروع کیا آخرکار بلیک لسٹ میں مل ہی گیا ہم پر کیا گزری...... کیفیت تو مت پوچھیں (بتادیں......) الاؤ کو اب بھٹی صاحب مکمل کریں گے امید تو مغل سر سے تھی، خیر بھٹی صاحب بھی کمال لکھتے ہیں۔ اناگیر سے ایک خوبصورت آغاز ہوا۔ مختصر کہانیاں خوب تھیں خاص کر اعتراز سلیم وصلی کی کہانی۔ مختصر سرورق کے رنگ ابھی پڑھے نہیں وہ بھی اچھے ہی ہوں گے۔ بڑی امید سے لکھ رہا ہوں......‘‘

ریاست خان کا داود خیل میانوالی سے غم و غصہ ’’جاسوسی کا شمارہ اس مرتبہ جلد ہی مل گیا۔ سرورق کے بارے میں اب کیا کہیں بالکل بچکانا سرورق تھا۔ ہمیں علم ہو چکا ہے کہ ہمارا تبصرہ کچھ زیادہ ہی کاٹ دیا جاتا ہے۔ اس بار تو اتنا غصہ تھا تبصرہ کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا شاید یہی آخری ہو۔ (آپ کی خام خیالی ہے ضرورت ہو تبھی کٹنگ ہوتی ہے...... ورنہ نہیں) منصور کامران کیا بات ہے آپ کا تبصرہ پرفیکٹ تھا۔ محمل صاحبہ آپ کو طنز کا حق حاصل ہے لیکن میں پھر بھی آپ سے ایک بار پھر معذرت چاہوں گا۔ نورین صاحبہ بڑے دنوں بعد نظر آئیں، ویلکم۔ ہمیں آپ کی کمی کا احساس تھا، ہم یہی سمجھے کہیں مصروف ہوں گی آپ۔ سعدیہ صاحبہ آپ کو کس چیز کا تحفہ ملا بھلا اتنی غیرحاضری اچھی نہیں۔ ممتاز احمد چھا گئے، کمال کا تبصرہ تھا۔ ایمانے صاحبہ ہمیں بہت دکھ ہوتا ہے جب شعر یا تبصرہ کاٹ لیا جائے وجہ بھلا کوئی ہو۔ (اب کونسی بات رہ گئی ہے جس سے دکھ نہ ہو......؟) کہانیوں میں سب سے پہلے الاؤ پر نظر پڑی دیکھنا تھا کہ ڈاکٹر صاحب توقعات پر پورا اترتے ہیں۔ کمال ہو گیا بہت زبردست...... کاشف صاحب کی کمی محسوس ہی نہیں ہونے دی۔ اناگیر امجد جاوید کی نیا سلسلہ وار کہانی بہت رنگ جمائے گی۔ پہلی قسط نے دلوں پر قبضہ کرلیا۔ روہی نے سسی پنوں کی یاد دلا دی غالباً وہ بھی اسی صحرا کے کردار تھے۔ باغ سے باغ تک کی کیا تعریف کریں بھلا۔ مغل صاحب کا ایک اور شاہکار جس نے دلوں کو دھڑکا یا خون کے آنسوں رلایا۔ اللہ پاک کشمیر کو جلد آزادی عطا فرمائے آمین۔ بھیڑیا منظر امام کی بہت زبردست تحریر۔ منظر صاحب مختصر تحریروں میں کمال...۔ سبق دے جاتے ہیں۔ سرورق کے دونوں رنگ اس بار پھیکے تھے، بالکل مزہ نہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ کم از کم پہلی کہانی اور سرورق کی کہانیاں اچھی شائع کیا کریں۔ (ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے) معذرت کے ساتھ مجھے علم نہیں تھا کہ اقلیم صاحب زندہ ہیں میں تو انہیں مرحوم سمجھا تھا۔ اللہ پاک اقلیم صاحب کو لمبی زندگی عطا فرمائے۔ میری طرف سے ان سے معذرت اور آپ ان سے ایک کہانی تو لکھوائیں اولین صفحات پر۔

کیماڑی، کراچی سے محمد نعمان کے خدشات۔ ’’اس دفعہ کراچی کی ریکارڈ توڑ اور کڑاکے دار سردی میں دو فروری کی صبح قدرے تاخیر سے گزشتہ ایک ماہ سے گمشدہ اپنا متاعِ جاں جاسوسی ملا، جس کی طلب بے حال کیے ہوئے تھی کیونکہ ایک تو الاؤ کے نئے مصنف کا نام پردہ کشا اور نئی سلسلے وار کہانی اناگیر کا بھی شدت سے انتظار تھا۔ اس دفعہ کا سرورق پہلے سے اچھا تھا۔ ایک خوبرو حسینہ پورے سرورق پر چھائی ہوئی تھی اور ایک چھوٹی سی صورت صنف کرخت کی بھی تھی جو کہ حسینہ کی موجودگی میں نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی، ہم نے اس کی طرف شعلہ بار نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی نگاہیں حسینہ کی طرف مرکوز کیں۔ حسینہ اپنے زیورات سے سردست کسی ناگ کی انسانی شکل میں مادہ لگی حالانکہ اس کی رنگت میں ملاحت نہ تھی جو کہ ان کا خاصہ ہوتی ہے، کہانیوں کی فہرست اور خطوط کی نکتہ چینی کو پھلانگتے ہوئے اول بھڑکتے الاؤ پر پہنچے، سرورق پر ہی الاؤ کے نئے مصنف کا نام بھٹی صاحب لکھا ہوا دیکھا جسے دیکھ کر دل دھک سے رہ گیا۔ ایک اور کہانی کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا، بہرحال مرتا کیا نہ کرتا الاؤ پر ذہن مرکوز کیا اور اسے پڑھنے لگا، پڑھتے پڑھتے اپنے خدشات بھی وا ہونے لگے کیونکہ کہانی نے پہلی قسط سے ہی 4G کی رفتار پکڑ لی تھی اور ہمارے جیسے تھکے ہوئے اذہان کہاں اس جیسی تیز رفتار کہانی کا

مقابلہ کر سکتے ہیں؟ (اس میں کوتاہی کس کی ہے؟) اب آتے ہیں نئی سلسلے وار کہانی اناگیر کی طرف، اس کا بیتے ایک ماہ سے شدت سے انتظار تھا کیونکہ اس سے قبل فاضل مصنف کی کوئی بھی سلسلے وار کہانی نہیں پڑھی تھی صرف رنگوں تک ہی امجد جاوید صاحب کا تعارف تھا، پہلی قسط سے ہی اپنے نام کی طرح ایک خوش گوار سی احساسیت لیے ایک بالکل مختلف مقام کی کہانی ثابت ہوئی، موضوع یقیناً جرم وسزا اور انتقام ہی ہوگا لیکن یہ بات بھی حقیقت ہے کہ اس سے قبل صحرا چولستان پر نہ اتنا واضح کسی ناول میں پڑھا اور شاید ہی کسی ناول میں اس قدر تفصیل سے لکھا گیا ہو، اناگیر پڑھ کر ایسا لگا کہ فاضل مصنف نے یا تو بہت قریب سے ان مقامات کا مشاہدہ کیا ہے یا پھر ان مقامات کے مطالعے میں بہت وقت صرف کیا ہے، کہانی پر گرفت مضبوط اور عمدہ تھی۔ پڑھتے سے کچھ بھی بوریت کا احساس نہ ہوا۔ تبصرہ طویل ہو چکا اب اجازت چاہتے ہیں باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں، یہ 2014ء کے بعد پہلا تبصرہ ہے امید ہے کہ اسے چبھتی نکتہ چینی کے خطوط میں جگہ دے کر یقیناً ممنونیت کا موقع دیں گے۔''

عامر خان کی مدانی، بھکر سے امیدیں'' جاسوسی ڈائجسٹ کے ساتھ تعلق تو کافی پرانا ہے لیکن محفل نکتہ چینی میں اس امید کے ساتھ حاضر ہو رہا ہوں کہ سب دوست احباب خوش آمدید کہیں گے۔ فروری کے جاسوسی کا سرورق کافی منفرد اس لحاظ سے لگا کہ ایک نظر میں تو یہ کسی خواتین کے لیے مخصوص رسالے کا سرورق لگا۔ عجیب طرح کا تاج پہنے سبز آنکھوں والی حسینہ پتا نہیں کس بات پر اتنی حیران ہو رہی ہیں۔ نیچے ایک بڑی عمر کے بھائی صاحب کسی سے گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ مجموعی طور پر سرورق اچھا لگا۔ سرورق کے بعد اپنی محفل چبھتی نکتہ چینی میں جھانکا۔ بہت سے دوست احباب چینی کی گرانی کے دور میں چینی بانٹتے نظر آئے۔ منصور کامران زبردست تبصرے کے ساتھ وکٹری اسٹینڈ پر براجمان نظر آئے۔ پورے رسالے کا اس سے زیادہ عمیق جائزہ اتنے الفاظ میں ممکن ہی نہیں تھا۔ ویسے بھی اپنی صنف کے کسی بھائی جان کو وکٹری اسٹینڈ پر دیکھ کر ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔ اپنے پڑوسی ضلع میانوالی سے جناب ریاست خان کا تبصرہ قدرے طویل لیکن کافی دلچسپ اور جاندار رہا۔ (انہیں تو مختصر کرنے کی شکایت ہے) اقلیم صاحب بہت اعلیٰ پائے کے مصنف ہیں اور وہ جاسوسی میں کئی شاندار کہانیوں کے خالق ہیں، ان سے ضرور کوئی کہانی لکھوانی چاہیے۔ اپنے جنوبی پنجاب سے ایک اور قاریہ محمل علی کا تبصرہ اچھا لگا۔ ویسے محترمہ کا نام کافی مردانہ قسم کا ہے لیکن محترمہ کو لڑکا ہونے کا شوق کیوں ہے، بتانا پسند کریں گی۔ سکھر سے محترمہ نورین مبارک تمام لوگوں کو انکل انکل کہہ کر مخاطب کیے جا رہی تھیں، اس سے پہلے کہ مجھے بھی ایسا کہہ دیں میں بتادوں کہ میں ابھی اس منزل سے دور ہوں۔ ویسے آپس کی بات ہے لگتا ہے کافی تیز مرچوں والی خوراک کھا کر تبصرہ لکھتی ہیں یہ عزیزہ۔ ویسے ان کو احمد اقبال کی کہانی سمجھ نہیں آئی تو اس پر کیا کہا جا سکتا ہے۔ یہی کہ یہ رسالہ ناسمجھ بچوں کے لیے نہیں ہے۔ اس کے علاوہ سید ذیشان حیدر کاظمی، سعدیہ قاری اور ایمانے زارا شاہ نے زبردست چینی شامل کی ہے۔ اپنی محفل کے بعد پہنچے سیدھے الاؤ پر جو کہ اب بھٹی صاحب کے ذمے ٹھہرا۔ اس بار قسط کچھ مختصر رہی لیکن بھٹی صاحب کی کہانی پر گرفت قائم ہے۔ امید ہے آگے چل کر وہ اس کہانی کو یادگار بنادیں گے۔ امجد جاوید، اناگیر کے ساتھ بغل گیر ہوتے نظر آئے۔ کہانی کی اٹھان تو اچھی ہے لیکن اس رفتار سے کہانی نے تو تین چار قسطوں میں ابتدا پر ہی ہونی ہے۔ اس طرح کے ماحول میں سفر کرتی کہانی قاری کو اپنے ساتھ ساتھ لے کر چلتی ہے تو بہت لطف آتا ہے۔ اس کے بعد اپنے محبوب مصنف طاہر جاوید مغل کی باغ سے باغ تک پڑھی۔ اپنے منفرد موضوع کا احاطہ کرتی یہ ایک یادگار کہانی رہی۔ روبینہ رشید کی کہانی اگرچہ سسپنس سے بھرپور تھی لیکن کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔ غلام قادر کی بچھڑے خواب ان کے مخصوص انداز میں لکھی گئی کہانی اس شمارے کی زبردست کہانی تھی۔ مختصر کہانیوں میں جعلی مقابلہ، ناکردہ اور ناقابلِ اعتبار اچھی لگیں۔ آخر میں گزارش ہے کہ کسی اچھے انگلش ناول کا ترجمہ ضرور شائع کر دیں۔ اس بار تبصرہ شائع ہو گیا تو آئندہ ضرور حاضری ہوگی۔''

سکھر سے نورین مبارک کی ناپسندیدگی'' جاسوسی فروری کا شمارہ میرے ہاتھوں میں جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔ سرورق کی دوشیزہ کو لگتا ہے داڑھ میں درد ہے تبھی ایک طرف سے اس کا منہ پھولا ہوا ہے اور چہرے پر تکلیف کے آثار بھی نظر آ رہے ہیں۔ آنکھیں البتہ دوشیزہ کی خوبصورت ہیں۔ تبصروں میں سب سے پہلے اپنے تبصرے کو شرفِ مطالعہ بخشا۔ نورین مبارک کے حملے......؟ اجی، میں تو بڑی شریف سی بچی ہوں، میں بھلا کیسے حملے کر سکتی ہوں۔ باقی لگتا ہے آپ کی مزاح سے شدید دشمنی چل رہی ہے کہ چن چن کے میرے تبصرے سے مزاحیہ باتیں کاٹ کے اسے خشک سے تبصرے کا روپ دے دیا۔ منصور انکل میں نے ازراہِ تفنن ہی دھمکی دے دی تھی۔ بخدا میرا کچھ غلط مطلب نہیں تھا۔ ریاست خان کو بھی میرے تبصرے میں بس دھمکی ہی نظر آئی۔ محمل علی، مجھ سے کوئی دشمنی ہے آپ کو، سب کا ذکر کیا، بس میرا حذف کر دیا۔ ممتاز احمد، وہ تو خالی خولی دھمکی ہی تھی ورنہ تبصرے انشاء اللہ کچھ عرصہ تو باقاعدگی سے کرنے ہیں۔ سید ذیشان، نہیں کرتے بھئی دھمکی پر عمل۔ یہ کیا جی میں نے دھمکی کیا دی کہ سب نے ہی مجھے دھمکانا شروع کر دیا۔ ایمانے کا تبصرہ ڈرتے ڈرتے پڑھا مگر وہی ہوا جس کا ڈر تھا انہیں بھی میرے تبصرے میں بس دھمکی ہی نظر آئی۔ (تو ایسے جملے لکھے کیوں؟) عرفان شبیر، سعدیہ قادری اور ساگر تلوکر نے شکر ہے میری دھمکی کا ذکر نہیں کیا۔ کہانیوں میں باغ سے باغ کا بے چینی سے انتظار تھا۔ کشمیر کے موضوع پر یہ لاجواب اور ناقابلِ فراموش تحریر رہی۔ ویسے پہلے حصے میں تو اندازہ تک نہ تھا کہ اس کا رخ کشمیر کی طرف مڑے گا۔ بہرحال مغل انکل نے قلم کا حق ادا کر دیا۔ خون آشام کا صفحہ نکالا مگر یہ کیا؟ ادھر تو غلام قادر بچھڑے خواب لے کر براجمان تھے۔ البتہ اگلے صفحے پر نام پھر خون آشام تھا اور موضوع سے بھی یہ خون آشام ہی لگی۔ (جی ہاں انٹرو کی غلطی ہوگئی......) بہرحال جو بھی تھی کہانی خالص جاسوسی انداز میں تحریر کی گئی۔ روبینہ رشید کا اسلوب بہت پسند آیا مگر کہانی میں کئی کردار جیسا کے جادوگر کا کردار فالتو میں ڈالے گئے اور اتنی قتل وغارت کہانی میں کرائی گئی اور پھر آسانی سے سب سمیٹ دیا گیا، اتنا لطف آیا نہیں جتنا آنا چاہیے تھا۔ پہلا رنگ تو فضول ترین تھا۔ کہانی کا کوئی سر پیر ہی نہیں اور اولین صفحات پر اناگیر کی پہلی قسط اچھی لگی۔ خاص طور ہر منظر نگاری جاندار تھی مگر دیگر جزئیات لکھتے، لکھاری کا قلم کئی جگہوں پر بہکا بھی کہ جملوں کی ساخت قدرے کمزور ہوگئی۔ بہرحال کہانی جاندار لگ رہی ہے۔ الاؤ پڑھ کے اس بار جی

ذلت ملدر ہوا۔ ڈاکٹرز کی رائٹنگ بری ہوتی ہے مگر ڈاکٹر بھٹی کی تو اردو بھی انتہائی بری ہی ہے۔ اردو بے چاری کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ الاؤ نے تو جسم و جاں کو راحت دینے کے بجائے دماغ ہی بھڑکا دیا۔ ماہ رخ ارباب کی پیش بین کافی دلچسپ تحریر رہی۔ اعتزاز سلیم وصلی کی وجہ نے سکتہ زدہ کر دیا۔ دائمی مہذب کہلانے والے ہی تہذیب کے آداب بھلائے بیٹھے ہیں۔ فی الحال اتنا ہی شمارہ پڑھ پائی ہوں۔‘‘

لاہور سے راحیلہ بھٹی کی آمد ’’پہلی بار تبصرہ بھیج رہی ہوں امید ہے کہ سب مجھے ویلکم کہیں گے۔ جاسوسی پڑھنے کی ہمیشہ سے شوقین رہی ہوں لیکن شادی اور بچوں کے بعد تھوڑی مشکل ہوگئی۔ اب پھر سے شروع کیا ہے تو سوچا اپنے خیالات بھی ادارے تک پہنچاؤں۔ (بہت اچھا سوچا) سرورق اس بار کافی منفرد تھا۔ لڑکی بس ذاکر صاحب جیسی بناتے تھے ویسی نہیں تھی لیکن پھر بھی خوبصورت تھی۔ نیچے لڑائی کٹائی کا منظر بھی اچھا لگا۔ اداریہ بہت اچھا لکھا گیا تھا۔ میں تو سو فیصد متفق ہوں آپ سے، موبائل فون کو بچوں کی پہنچ سے دور رکھنا چاہیے۔ پہلا تبصرہ پڑھ کر افسوس ہوا کیونکہ منصور صاحب ہر کہانی کو رد کر کے آپ کی ساری محنت پر پانی پھیرنے کی پوری کوشش کرتے نظر آئے۔ کافی نیگیٹو قسم کے انسان لگے۔ ریاست خان کا تبصرہ گزارے لائق تھا۔ محمل علی بہت اچھے تبصرے کرتی ہیں۔ نورین مبارک کی شوخ گفتگو پسند آئی سوائے اس بات کہ تراجم شائع نہ کیے جائیں۔ وہی تو شمارے کی جان ہوتے ہیں۔ اسد عباس کی سمجھداری پڑھنے کی کوشش کی لیکن کہیں بھی نظر نہ آئی۔ سعدیہ قادری کا تبصرہ پوری محفل میں سب سے زیادہ پسند آیا۔ ممتاز احمد اور سید ذیشان کے خطوط بھی کافی دلچسپ تھے۔ ایمانے زارا اور ساگر تلوکر میرے پسندیدہ تبصرہ نگار ہیں۔ جس ماہ چھٹی کرتے، اس ماہ چینی نکتہ چینی پھیکی لگتی ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اس کہانی کا ذکر کرنا پسند کروں گی جس کی وجہ سے میں یہ تبصرہ لکھنے پہ مجبور ہوئی۔ گولڈن جوبلی نمبر سے شروع ہونے والی طاہر جاوید مغل کی کہانی باغ سے باغ تک نے شروع سے لے کر آخر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ انا گیر میں امجد جاوید کے منفرد اندازِ تحریر نے پہلی قسط سے ہی مبہوت کر کے رکھ دیا۔ سانول اور ساوری سے علی زین کی جذباتی وابستگی ہمیں یقین آ گیا۔ ابھی تک کہانی میں ہیرو کا کردار کھل کر سامنے نہیں آیا اور کافی مبہم ہے۔ امید ہے کہ اگلی اقساط میں اس کے جوہر کھل کر سامنے آ جائیں گے۔ کاشف زبیر سے الاؤ کی منتقلی ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کو ہوگئی۔ پہلے تو مبارکباد اور ساتھ میں درخواست بھی کہ اسے آوارہ گرد نہ بنایئے گا بلکہ جلد از جلد مکمل کر کے کچھ اپنا لکھا پیش کیجیے گا۔ مختصر کہانیاں اس بار ایک سے بڑھ کر ایک تھیں شاید گولڈن جوبلی نمبر کی کسر نکالی گئی تھی۔ تنویر ریاض، سیرینا راض، عکس فاطمہ، تمکین رضا نے شاندار مغربی کہانیاں منتخب کر کے عمدہ تراجم پیش کیے۔ ہمیشہ اتنی ہی اچھی کہانیاں پیش کیا کریں تو امید ہے کہ نہ پڑھنے والے بھی تراجم کے گرویدہ ہو جائیں گے۔ ماہ رخ ارباب کی پیش بین بھی بہت زبردست رہی جبکہ منظر امام کی بھیڑیا نے چکرا کے رکھ دیا۔ غلام قادر کی بچھڑے خواب اچھی تحریر تھی۔ اس میں کچھ بیمار ذہن کی عورتوں کا بھی ذکر تھا۔ اکثر پڑھی لکھی مال دار عورتیں مردوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتیں۔ دونوں فریقوں کو سوچ سمجھ کر شادی کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ آخر میں روح والی بات عجیب لگی لیکن فکشن سمجھ کر قبول کر لی۔ دوسرے رنگ میں روبینہ رشید اپنے مخصوص انداز میں وارد ہوئیں۔ اس رنگ نے پچھلے ماہ شائع ہونے والے رنگوں کے سارے گلے شکوے دھو دیے۔ یہی تو روبینہ رشید کا خاصہ ہے کہ وہ ایک ہی تحریر میں قاری کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہیں۔ اپنے مخصوص اسٹائل کو بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے صفحۂ قرطاس پر جو رنگ بکھیرے وہ بہت زبردست تھے۔‘‘

گوجر خان سے عرفان شبیر راجہ کی تبصرہ نگاری ’’فروری 2020ء کے شمارے کا سرورق ایک پُراسرار حسینہ سے مزین ہے۔ لگتا ہے حسینہ نے اپنی دادی اماں کے زیورات اڑائے ہیں۔ بزم جاسوسی کا آغاز آپ نے جدید دور کی سہولتوں کے منفی اثرات سے کیا۔ منصور کامران، ریاست خان، اسد عباس، ایس آر ملنگی ممتاز فیروز پوری، سید ذیشان، ساگر تلوکر اور انور یوسف زئی نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں حاضری دی۔ جبکہ صنفِ نازک میں محمل علی، نورین مبارک، سعدیہ قادری اور ایمانے زارا شاہ نے بھی اپنی اپنی آرا سے مستفید کیا۔ مغل جی کی باغ سے باغ تک نے مزہ دوبالا کر دیا۔ لازوال کرداروں میں راسم اور آنیہ کا اضافہ ہوگیا۔ کشمیر کے حوالے سے ادارے کی طرف سے یہ تحفہ من کو بھا گیا۔ امجد جاوید کی انا گیر کی کہانی کا موضوع تو روایتی ہے لیکن لگتا ہے کہانی رنگ جمائے گی۔ علی زین کا ماضی بھی ہنگامہ خیز لگتا ہے۔ الاؤ کی کاشف زبیر مرحوم کی اقساط پوری ہوئیں۔ اس قسط میں کہانی میں انسانی اعضا کے درندے بیوپاریوں کے ریکٹ کا تعارف ہوا۔ کہانی لاہور سے حاصل پور تک چلی گئی۔ لگتا ہے کہانی کافی طوالت کی جانب جائے گی۔ لیکن میرے خیال میں 25 اقساط تک رہے تو کافی اچھا رہے گا۔ کاشف زبیر والا انداز ختم ہوگیا لیکن بھٹی صاحب سے امید ہے کہ اچھا لکھیں گے۔ غلام قادر کی بچھڑے خواب نے اچھا تاثر نہیں دیا۔ خون آشام از روبینہ رشید نے مشن محافظ سیریز کا آغاز کر دیا۔ تیمور احمد، اسد اور شیبا کی تکون نے طارق، جواد اور شاہانہ عرف تباہی کی جرم پر مبنی تکون کو مختلف زاویوں سے انجام تک پہنچایا۔ امید ہے اگلا کارنامہ مزید تھرلنگ ہوگا۔ (انشاء اللہ)

چشمہ بیراج سے ساگر تلوکر کی المناک رُوداد ’’جاسوسی بہت تردد کے بعد ملا۔ ٹائٹل اچھا تھا مگر جاسوسی کی روایت سے مختلف تھا۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح اچھا تھا۔ چینی نکتہ چینی میں اکثر تبصرے ماٹھے ہی رہے۔ گولڈن جوبلی کی شان کے مطابق نہیں تھے۔ انا گیر روایتی کہانی کو نئے ڈھنگ سے پیش کیا گیا۔ اندازِ تحریر بہت دلچسپ اور سسپنس سے بھرپور ہے۔ امید ہے طویل اور بہترین چلے گی۔ بھیڑیا، منظر امام نے احساسات اور جذبات سے گندھی بہترین اور حیرت انگیز کہانی پیش کی۔ باغ سے باغ تک بہت لاجواب اور شاندار رہی۔ راسو کا کردار کھل کر سامنے آیا اور کہانی پر چھا گیا۔ شہابی کے کردار کو سکیڑ دیا گیا، اچھا نہیں لگا۔ باقی کہانیاں بہت کوشش کے باوجود نہیں پڑھ سکا کیونکہ سارے صفحات گڈمڈ تھے۔ دوبارہ 35 کلومیٹر سفر کر کے میانوالی بک اسٹال پر گیا مگر جاسوسی بک چکا تھا۔ ناکام لوٹنا پڑا شدید دکھ ہوا۔ خدارا دھیان دیجیے۔‘‘

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

مسز سونیا چوہدری، لاہور۔ راحیل جمال، کراچی۔ فرحانہ ریاض، شیخوپورہ۔ راؤ نبیل احمد، بھکر۔

وبائی ہتھیار

روبینہ رشید

ہوس اقتدار کی ہو یا دولت کی... انسان کو ذلت و رسوائی کی ایسی کھائی میں لے جاتی ہے جہاں درندے بھی اس سے شرماتے ہیں... بالادستی اور عالمی اقتدار کی دوڑ میں بعض اوقات ان علوم کو بھی داؤ پر لگا دیا جاتا ہے جن کا اصل مقصد انسان کی فلاح ہونا چاہیے... اعلیٰ تعلیم یافتہ ماہرین جہاں مختلف ریاستوں کے لیے منفی کام کر رہے ہیں... وہیں بہت سے غیر ریاستی عناصر بھی اس دوڑ میں شریک ہیں... یہ کہانی ایسے ہی کرداروں کے گرد گھومتی ہے جو کرۂ ارض کی انسانی آبادی میں نسلی پسند اور ناپسند کی بنیاد پر بھیانک تخفیف کی سازشوں میں مصروف ہیں... اپنی تجربہ گاہ میں مرتے اور سسکتے لوگوں کو دیکھ کر شیطانی رقص کرتے ہیں... اور پھر یہ وائرس تجربہ گاہوں سے نکال کر منتخب انسانی آبادیوں میں پھیلا دیے جاتے ہیں... ناگہانی بیماری اور سفاکی سے متعلق گردوپیش کا احاطہ کرتی... جسم و جاں میں سنسنی پھیلا دینے والے عوامل کی دردناک منظرکشی...

[illegible]

وہ ایک بڑا سا کمرا تھا جسے جدید انداز میں سجایا گیا تھا۔ کمرے میں ہر چیز سفید رنگ کی تھی۔ اس میں ایک جانب گول میز رکھی ہوئی تھی جس پر ہولو گرام کے انداز کا کمپیوٹر میز کی سطح سے کچھ اوپر ہوا میں معلق تھا۔ اس پر ہر چند لمحوں بعد ایک تصویر سی بنتی اور پھر تحلیل ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس میں سے ایک مدھم سی بیپ کی آواز بھی برآمد ہو رہی تھی۔

کمرے کی دوسری جانب ایک شاندار ایگزیکٹو بورڈ روم ٹیبل موجود تھی جس کے گرد چھ آرام دہ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس وقت وہاں صرف ایک نوجوان لڑکی مؤدبانہ انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے میز پر ایک غیر معمولی جسامت کا لیپ ٹاپ رکھا ہوا تھا اور اس کی انگلیاں کی بورڈ پر رقصاں تھیں۔

کمرے کے وسط میں کئی آرام دہ صوفے ایک قطار میں رکھے ہوئے تھے جن پر وہ چاروں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سب سے پہلا شخص ایک بھاری بھرکم شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے بال بھورے تھے۔ عمر چالیس کے لگ بھگ نظر آ رہی تھی۔ اس کی شخصیت میں سب سے اہم چیز اس کی آنکھیں تھیں جو مسلسل بے چینی سے حلقوں میں حرکت کر رہی تھیں۔ اس کے بعد والی

نشست پر سنہرے بالوں والی ایک خاتون براجمان تھی۔ دلکش نقوش، چھوٹی قامت اور دبلی پتلی جسامت والی اس خاتون کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ بار بار اپنے ہاتھوں سے بالوں کو سنوار رہی تھی۔ اس کے برابر میں بیٹھی خاتون اس کی ہم عمر تھی۔ اس کے بال سرخ تھے جب کہ چہرے کی رنگت گلابی تھی۔ اس کی آنکھوں پر سجا موٹی فریم کا چشمہ اس کی شخصیت کی جاذبیت میں اضافہ کررہا تھا۔ آخری صوفے پر ایک دبلا پتلا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ چاروں بالکل خاموشی سے سامنے موجود دیوار کو گھور رہے تھے جیسے وہ سنیما کی اسکرین ہو اور وہ کسی دلچسپ فلم کے منتظر ہوں۔

''ہیلو ایوری ون......'' کمرے میں گونجنے والی بھاری بھرکم سرد آواز کو سن کر وہ سب مشینی انداز میں کھڑے ہو گئے۔ ''تو آپ لوگ آ گئے...... میرا خیال ہے کہ وہ تاریخی لمحہ بھی آ گیا ہے۔'' وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ وہ ایک طویل القامت دبلا پتلا شخص تھا۔ اس کی عمر پچپن ساٹھ سال کے اردگرد نظر آرہی تھی۔ اس کے بال کندھوں تک لمبے اور بالکل سفید تھے جنہیں اس نے پونی کی شکل میں باندھ رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر عمر نے کوئی خاص اثرات مرتب نہیں کیے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی مگر آنکھوں میں مکاری اور سفاکی نمایاں تھی۔

اُس کے اشارے پر وہ چاروں بیٹھ گئے۔ وہ اپنے لیے مختص صوفے کی جانب بڑھتے ہوئے میز کے پاس کھڑی نوجوان لڑکی کی طرف مڑا اور مسکرایا۔ اس کے سر ہلانے پر لڑکی نے دیوار میں موجود ایک بٹن کو دبا دیا۔ بٹن دبتے ہی دیوار بے آواز انداز میں پیچھے ہٹتی چلی گئی۔

چند لمحوں بعد دیوار کی جگہ ایک موٹے سے شیشے نے لے لی تھی۔ کمرے کی دوسری جانب سے دیکھنے والوں کے لیے یہ اب بھی ایک عام دیوار تھی جب کہ اس طرف سے دیکھنے والوں کے لیے وہ ایک شیشہ تھا جس سے وہ آر پار دیکھ سکتے تھے۔

کمرے کی دوسری جانب کا منظر ایک بڑے ہال کا تھا۔ ہال کے عین درمیان آئی سی یو طرز کا ایک وارڈ سا بنایا گیا تھا جہاں صرف ایک بیڈ موجود تھا۔ اس بیڈ پر ایک مریض موجود تھا۔ کمرے کے انتہائی دائیں جانب دیوار کے ساتھ موجود میزوں پر کمپیوٹرز اور مشینیں نظر آرہی تھیں۔ دو ڈاکٹرز وہاں کام میں مصروف نظر آرہے تھے۔ کمرے میں ان کے علاوہ چار ڈاکٹرز موجود تھے۔ ان سب نے خود کو مکمل حفاظتی ملبوس میں چھپایا ہوا تھا۔ اُن کے چہروں پر حفاظتی ماسک موجود تھے اور وہ اپنے لباس میں موجود آکسیجن کی مدد سے سانس لے رہے تھے۔

بیڈ پر موجود شخص سخت بیمار اور کمزور نظر آرہا تھا۔ اس کی رنگت دبی ہوئی آنکھیں چھوٹی سی ناک اور چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا تعلق ساؤتھ ایشیا سے ہے۔ وہ بار بار کھانس رہا تھا اور اس کے بعد کئی لمحوں تک کراہ رہا تھا۔ کمرے میں موجود تمام تر طبی سہولیات کے باوجود اس کے جسم پر نہ تو کسی قسم کے حفاظتی انتظامات کا بندوبست کیا گیا تھا اور نہ ہی آکسیجن ماسک وغیرہ لگا کر اسے سہولت دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ البتہ اس کے جسم پر کچھ تار نما ڈوریاں چپکی ہوئی تھیں جو کمپیوٹر اور دیگر مشینوں سے منسلک تھیں اور وہ اس کی حالت میں آنے والی ہر تبدیلی کو مانیٹر اور محفوظ کررہی تھیں۔

''آہ......آہ......'' وہ بالآخر بولا۔ ''مم...... میں سانس نہیں لے پارہا...... ہوں۔'' وہ اتنا کہنے میں بُری طرح ہانپ گیا تھا۔ ''میری...... میری مدد کرو...... پلیز......''

اس کے اردگرد موجود ڈاکٹرز اس کی آواز سن کر الرٹ ہو گئے تھے مگر ان میں سے کوئی بھی اس کے قریب نہیں آیا۔ شاید انہیں اسی بات کا انتظار تھا۔

''مم...... میں مرجاؤں گا......'' اس کا چہرہ تکلیف کی شدت اور خوف سے پیلا پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں دہشت اور سانس نہ لے پانے کی اذیت کی وجہ سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ اب اس کی گردن پر تھے، وہ سانس نہیں لے پارہا تھا۔ سانس لینے کی کوشش اس کے پورے جسم کو تڑپا رہی تھی۔ اس کا جسم بستر پر اچھل رہا تھا۔ پھر اس کے ناک اور منہ سے خون نکلنا شروع ہو گیا اور چند لمحوں بعد اس نے دم توڑ دیا۔ اس کی بے نور نگاہیں چند فٹ دور موجود آکسیجن ماسک پر جمی رہ گئی تھیں۔

شیشے کی دیوار کے دوسری جانب موجود افراد اس پورے منظر کو پوری توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں مسرت سے چمک رہی تھیں۔ اس کی دم بہ دم بگڑتی ہوئی حالت کے ساتھ ان لوگوں کے چہرے کھِلتے جارہے تھے اور جب اس نے دم توڑ دیا تو ایک شخص نے دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ''ہم جیت گئے، ہمارا تجربہ کامیاب رہا۔'' اور پھر وہ دونوں وحشیانہ مسرت کے ساتھ بغل گیر ہو گئے اُن کے کھلے ہوئے دہانوں سے سفید دانت یوں جھانک رہے

تھے۔ نفاک بھیڑیوں نے اپنے شکار پر آخری فتح حاصل کر لی ہو۔

☆☆☆

سام کو صبح سے ہی بہت زیادہ تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ آج کل کام اچھا جا رہا تھا۔ سالانہ تہوار کی آمد تھی جس کی وجہ سے دکان پر رش بھی زیادہ تھا۔ اسی لیے وہ اپنی طبیعت کو نظر انداز کرتے ہوئے دکان پر آ گیا تھا مگر اب جوں جوں شام ہو رہی تھی، اس کی طبیعت بگڑتی جا رہی تھی۔ جسم ٹوٹنے اور ہلکے بخار کے ساتھ زکام اور چھینکوں نے اس کا مزاج پوچھ لیا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہیں فلو ہو رہا ہے۔'' اس کے ساتھی لی نے اسے مسلسل چھینکتے دیکھ کر کہا۔

''ہاں یار وہ تو ظاہر ہی ہے۔'' وہ جھنجلا کر بولا۔

''تو تم گھر جا کر دو گولیاں لو اور آرام کرو، میں یہاں کام دیکھ لیتا ہوں۔'' وہ اس کے چڑچڑے پن کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

''مگر کام زیادہ ہے، تم پر بہت بوجھ پڑ جائے گا۔'' سام نے شرمندگی سے کہا۔

''ارے نہیں، اب یہ تو مجبوری ہے نا..... تم دوا لے کر آرام کرو۔'' وہ مسکرایا۔

سام دکان سے نکل کر بس میں جا بیٹھا۔ راستے بھر وہ چھینکتا ہوا ہی گیا تھا۔ بس میں بھی لوگ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے، وہ جانتا تھا کہ اسے ٹشو پیپر یا رومال ساتھ رکھنا چاہیے تھا مگر وہ گھبراہٹ میں ایسے ہی نکل آیا تھا۔ اسٹاپ پر اتر کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ گھر پہنچنے کے لیے اسے دو سڑکیں پار کر کے دوسری جانب جانا پڑتا تھا۔ اس نے سگنل کو سرخ ہوتا دیکھ کر زیبرا کراسنگ پر قدم رکھا..... پھر اچانک اس کا سر چکرانے لگا۔

یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی سانس رک رہی ہو۔ اس نے خود کو سنبھالنے کے لیے اندھوں کے مانند ہوا میں ہاتھ لہرائے پھر کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح سڑک پر ڈھیر ہو گیا۔

☆☆☆

پاکستانی نژاد طالبہ ثمینہ آج کوئی کلاس نہیں لے پائی تھی۔ وہ میڈیکل یونیورسٹی میں چوتھے سال کی طالبہ تھی۔ کبھی کوئی کلاس مس نہ کرنا اور ہمیشہ وقت پر کلاس میں پہنچنا اس کی شناخت تھی مگر گزشتہ رات سے ہی اس کی طبیعت قدرے خراب تھی۔ یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے فلو ہو گیا ہے اور اسے اس بات پر حیرت تھی کیونکہ وہ اپنی سالانہ ویکسین لے چکی تھی۔ صرف ایک دن پہلے اس کی روم میٹ سائرہ بھی فلو کا شکار ہوئی تھی۔ اس وقت بھی وہ دونوں ہی اپنے اپنے بستروں میں گھسی ہوئی تھیں۔ سائرہ کی حالت اس کے مقابلے میں خاصی خراب نظر آ رہی تھی۔ ان کی چند کلاس فیلوز کچھ دیر قبل انہیں ناشتا کروا کر گئی تھیں۔

''مجھے لگتا ہے کہ یہ منحوس فلو اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑنے والا۔'' سائرہ چھینکتے ہوئے بولی۔ ''ہمیں ڈاکٹر کے پاس چلنا چاہیے ویسے بھی ڈاکٹر کو اپنا علاج خود نہیں کرنا چاہیے اور ہم تو ہیں بھی نیم حکیم.....''

''چلتے ہیں دوپہر میں..... فاریہ وغیرہ بھی آ جائیں گی ویسے یہ تو ہے اس فلو کی جاسوس..... تو نے ہی پھیلایا ہے یہ جراثیم۔'' ثمینہ نے اسے گھورا۔

''ہاں یار..... اب کسی کو تو یہ ذمے داری بھی پوری کرنا ہی تھی نا.....'' وہ بولتے بولتے رکی پھر بمشکل بولی۔ ''ثمینہ مجھے پتا نہیں کیا ہو رہا ہے؟''

''کیا.....؟'' ''کیا ہو رہا ہے؟'' ثمینہ نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ایسے..... ایسے لگ رہا ہے جیسے میری سانس رک رہی ہو۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولی۔

''اوہ..... شاید گھٹن ہو رہی ہو..... یہ ہر طرف سے بند کمرے جو بناتے ہیں چلو تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلتے ہیں۔''

''نہیں..... میری ہمت نہیں ہو رہی۔''

''سائرہ ہمت کرو۔ میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتی ہوں۔'' ثمینہ نے کہا اور کھڑی ہو گئی۔ خود اسے بھی چکر سے آ رہے تھے۔ اس نے دوبارہ بیٹھتے ہوئے سیل فون اٹھایا۔ ''میں سپرنٹینڈنٹ اور گروپ دونوں کو کال کرتی ہوں۔''

''ٹھٹ..... ٹھیک ہے۔'' سائرہ بولی، اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ وہ مشکل سے سانس لے رہی تھی اور اس کوشش میں اس کے گلے سے عجیب سی آواز نکل رہی تھی پھر اچانک اس کے جسم کو جھٹکے سے لگنے لگے۔ ثمینہ تیزی سے اس کے قریب آ گئی۔

''سائرہ..... سائرہ کیا ہو رہا ہے تمہیں؟'' اس نے اس کا چہرہ اپنی جانب گھمایا۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ہچکیاں سی لے رہی تھی اور اس کے ہونٹوں کے کنارے سے خون کی باریک سی لکیر بہہ رہی تھی۔ ثمینہ کی

چیخوں سے پورا ہاسٹل گونج اٹھا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر شہزاد احمد کے کلینک پر مریضوں کی بھیڑ چھٹ چکی تھی۔ ان کا اسٹاف ڈاکٹر صاحب کے کلینک سے جانے کا منتظر تھا مگر وہ معمول کے برخلاف اب تک کلینک میں ہی تھے۔ ڈاکٹر شہزاد کو پاکستان سے چین منتقل ہوئے دس سال گزر چکے تھے۔ انہوں نے اپنی اسپیشلائزیشن یہاں رہ کے ہی مکمل کی تھی اور پھر شادی کر کے اوہان میں ہی سکونت اختیار کرلی تھی۔ انہیں ایک نہایت قابل اور معروف فزیشن کے طور پر جانا جاتا تھا۔ مختلف وائرسز اور بیماریوں کی کھوج میں ان کی ریسرچ نامی گرامی میڈیکل جرنلز کا حصہ بنتی رہتی تھی۔ وہ کلینک کے ساتھ ساتھ میڈیکل یونیورسٹی کی فیکلٹی کا حصہ بھی تھے۔ وقت کی سخت پابندی کی عادت کی وجہ سے ان کا اسٹاف انہیں پیٹھ پیچھے ڈاکٹر کلاک کے نام سے پکارتا تھا مگر آج کا دن مختلف تھا۔ آج کچھ ایسا ہوا تھا جس کی وجہ سے ڈاکٹر شہزاد پریشان ہوکر اپنے معمولات بھلا بیٹھے تھے۔

وہ گزشتہ کئی دنوں سے الجھن کا شکار تھے۔ ان کے پاس ہر روز ایسے کئی مریض آرہے تھے جنہیں فلو کی شکایت تھی۔ وہ ان کا علاج کررہے تھے مگر اب نہ صرف ہر روز یہ تعداد بڑھتی جارہی تھی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان پر فلو کی ادویات بھی بے اثر ثابت ہورہی تھیں۔ آج سائرہ کی اچانک موت نے انہیں مزید الجھا دیا تھا۔ سائرہ نہ صرف پاکستانی بلکہ ان کی اچھی شاگردوں میں بھی شمار ہوتی تھی۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اس کا ہنستا مسکراتا چہرہ گھوم رہا تھا۔ بحیثیت ایک ڈاکٹر بیماری اور موت ان کے لیے زندگی کے معمولات کا حصہ تھے مگر سائرہ کو یکدم کیا ہوا؟ اور معاملہ صرف اس تک محیط بھی نہیں تھا۔ یہ سوال انہیں پریشان کررہے تھے۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر انہوں نے اس کی روم میٹ ثمینہ کو اسپتال میں داخل کرادیا تھا۔ سائرہ اور ثمینہ کی رپورٹس ان کے سامنے میز پر پڑی تھیں۔ وہ کئی بار ان کا جائزہ لے چکے تھے۔ ان رپورٹس کے مطابق ان دونوں کو ہی فلو نہیں تھا...... اگر انہیں فلو نہیں تھا تو پھر یہ کیا ہے؟ اچانک ان کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ایک خیال نے شک کا روپ دھار کر ان کی سوچ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

''مجھے ابھی اسپتال جانا ہوگا۔'' وہ بڑبڑائے اور پھر اپنا کوٹ اٹھا کر باہر نکلتے چلے گئے۔

☆☆☆

دارالحکومت کی اس کثیر المنزلہ عمارت کی اٹھارہویں منزل پر واقع ورلڈ ہیپی نیس آرگنائزیشن کے دفتر میں ایک طویل القامت سفید بالوں والا شخص اپنے آراستہ کمرے میں اپنے پسندیدہ مشروب سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ اس نے اپنے لمبے بالوں کی پونی بنا رکھی تھی اور اس کے ہونٹوں پر مکاری سے بھری مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔ وہ ڈاکٹر جونز اسٹیفن تھا۔ ڈاکٹر جونز ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز رہا تھا اور اب وہ دنیا کی خوش حالی اور خوشی کے قیام کے لیے بنائی گئی اس تنظیم کا سربراہ تھا۔ میز کی دوسری جانب ایک موٹا سا پست قامت شخص بیٹھا تھا۔ اس نے ارمانی کا مہنگا سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کی انگلیوں میں بہترین برانڈ کا سگار پھنسا ہوا تھا۔ وہ رابرٹ اسٹیو تھا۔ رابرٹ واشنگٹن کی ایک بڑی فارماسیوٹیکل کمپنی کا مالک تھا۔

''ڈاکٹر تمہارا یہ آئیڈیا غضب کا ہے۔ واقعی اس وقت دنیا کو تمہارے جیسے ذہنوں کی شدید ضرورت ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم جیسے جینئس کو اوول ہاؤس میں ہونا چاہیے۔''

''اصل میں ہم سب حقیقت سے آنکھیں چُرانا چاہتے ہیں۔ حکومت کا مسئلہ اور ہے، انہیں تو اپنے ووٹرز کو جواب دینا ہوتا ہے جب کہ یہ انسانیت کی فلاح کے لیے مشکل فیصلے کرنے کا وقت ہے۔'' ڈاکٹر جونز بولا۔

''اب پروگرام کیا ہے؟''

''سب کچھ طے شدہ منصوبے کے مطابق ٹھیک جارہا ہے۔ ہمارے تجربے بے حد کامیاب رہے ہیں اور کنسائنمنٹ کو پہلی منزل تک پہنچا دیا گیا ہے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''مگر سنا ہے کہ یہاں بھی کچھ کیسز ہوگئے ہیں؟''

''ظاہر ہے کہ اس طرح تو ہوتا ہی ہے۔'' ڈاکٹر جونز کندھے اُچکا کر بولا۔

''ہم نے احتیاط کی تھی مگر آپ اسے روک نہیں سکتے، بس اس کے اثرات کم کرسکتے ہیں اور اس کے لیے ہمارے پاس تم جیسے اسپانسرز موجود ہیں نا...... آخر تمہارا کاروبار بھی تو پھلنا پھولنا چاہیے۔''

''سچ کہہ رہے ہو ڈاکٹر، ویسے میں نے ویکسین پر کام شروع کردیا ہے۔'' رابرٹ سگار کا کش لگا کر بولا۔

''مگر میری اجازت کے بغیر تم اسے لانچ نہیں کرو گے۔ ہمیں اس پروجیکٹ سے جو نتائج درکار ہیں، ان کے آنے سے قبل ہرگز نہیں۔'' ڈاکٹر جونز نے سختی سے کہا۔

''بالکل...... یہ طے ہے...... ویسے بھی جب طلب

میں شدت آئے گی کام بھی تب ہی چمکے گا۔'' رابرٹ مسکرایا۔ ''ویسے تمہارا ٹارگٹ ہے کیا؟''

''ٹارگٹ......؟'' ڈاکٹر جونز نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''ہمیں دنیا کا بوجھ کم کرنا ہے مگر نہایت محتاط منصوبہ بندی کے ساتھ طے شدہ جگہوں سے...... یہ دنیا ہماری ہے......ہم اس کی ترقی کے لیے کام کررہے ہیں، یہاں سفید فاموں کو جینے کا حق ہے۔ یہ قدرت کا قانون بھی ہے۔ طاقتور کمزور کو کھاجاتا ہے۔ ہمیں بھی یہ کالے، پیلے، بھورے لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ حقارت سے بولا۔ ''جنگیں ہمارے لوگوں کے لیے بھی خطرہ ہیں لہٰذا اب عقل اوردانش کی جنگ ہوگی۔ اس سے پہلے کہ وہ یہ سمجھ پائیں کہ ان کے ساتھ ہوکیا رہا ہے، موت ان کا بیک اَپ کردے گی اوروہ ہماری جانب انگلی بھی نہیں اٹھاسکیں گے اور جب تباہی پیک پر پہنچ جائے گی تو ہم اس کی ویکسین مارکیٹ میں لے آئیں گے اور خوب ڈالر کمائیں گے۔'' رابرٹ خوشی خوشی بولا۔ اس کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

''پھر ان ہی کے ڈالر ان ہی کے خلاف دوسرے پروجیکٹ میں استعمال ہوں گے۔'' ڈاکٹر جونز بولا۔ ''اور دنیا احمقوں اور کیڑے مکوڑوں سے پاک ہوتی جائے گی۔ ان کے وسائل پر ہمارا حق ہے اوروہ حق ہم حاصل کرکے ہی رہیں گے۔'' یک لخت اس کی آنکھیں نفرت سے بھر گئیں مگر اگلے ہی لمحے اس کی مسکراہٹ دوبارہ لوٹ آئی۔

''تو ہماری کامیابی کے نام......'' اس نے مشروب کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ رابرٹ بھی جواباً مسکرایا اور اس نے اپنا گلاس ایک سپ میں خالی کردیا۔ اس کے چہرے پر لالچ کی چمک تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سرمایہ کاری اس کے لیے ڈالرز کی فصل اُگانے والی تھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر شہزاد احمد اس وقت صوبے کے ہیلتھ سیکریٹری کے سامنے بیٹھے تھے۔ ''ڈاکٹر میں نے آپ کی پوری بات سن لی ہے۔ آپ ایک قابل ڈاکٹر ہیں مگر کیا قابل لوگ ہمیشہ درست ہوتے ہیں؟ میں مانتا ہوں کہ لوگ بیمار ہورہے ہیں۔ یہ فلو کی کوئی نئی قسم ہوسکتی ہے۔ آپ کا کام اس کا علاج کرنا ہے اوربس......'' وہ بالآخر بولا۔

''یہ اتنی آسان چیز ثابت نہیں ہوگی سر، میری ابتدائی ریسرچ کے مطابق یہ فلو ایبولا یا سارس سے بڑی وبا ثابت ہوسکتی ہے۔ بڑی اور ایک خطرناک وبا...... اس میں سب سے زیادہ خطرہ نظام تنفس کو ہوتا ہے جس میں مریض بہ آسانی موت کی آغوش میں جاسکتا ہے اور اس کے پھیلنے کی رفتار خاصی تیز ہے، یہ ویسا ہی جرثومہ ہوسکتا ہے جو اس سے پہلے مڈل ایسٹ میں بھی اچھی خاصی تباہی پھیلا چکا ہے۔''

''معاف کیجیے گا ڈاکٹر...... مجھے یہ محسوس ہورہا ہے کہ آپ کچھ زیادہ اوورری ایکٹ کررہے ہیں۔''

''سرآپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہمیں اس معاملے میں عوام کو اعتماد میں لینا چاہیے۔ اس وقت جانکاری اورآگاہی سب سے زیادہ اہم ہے۔''

''اورآپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس بات کو پھیلانے کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ ملک میں افراتفری پہنچ جائے۔ ہمارے ملک میں وبائی مرض پھیلنے کی خبر سے ہمارے دشمن کیا کیا فائدے اٹھا سکتے ہیں، کیا سمجھ سکتے ہیں آپ؟ ہماری معاشی سرگرمیاں شدید متاثر ہوں گی، پہیا رک جائے گا......لوگ یہاں آنا بند کردیں گے۔ نہیں ڈاکٹر ہم یہ افورڈ نہیں کرسکتے۔'' وہ میز پر ہاتھ مار کر بولا۔

''اپنے لوگوں کے جانی نقصان پر بھی نہیں؟'' ڈاکٹر شہزاد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں.... یہاں کا شہری ہوں اور ملکی مفاد مجھے بھی عزیز ہے مگر یہاں بات انسانی جانوں کی ہے سر......اور یوں بھی اگر اس پر قابو نہ پایا جاسکے تو آپ اس خبر کو روک نہیں سکیں گے۔''

''ہم اس سلسلے میں کچھ ایمرجنسی اقدامات لیتے ہیں مگر لوگوں تک اس بات کو اس طرح پہنچانے یا افراتفری پھیلانے کی کسی بھی کوشش کو ملک دشمنی ہی سمجھا جائے گا...... مجھے امید ہے کہ آپ محتاط رہیں گے۔'' منسٹر...... کا یہ جملہ میٹنگ کے خاتمے کا اعلان تھا۔ ڈاکٹر شہزاد نے منسٹر سے ہاتھ ملایا اور کمرے سے باہر آگئے۔

جو کچھ ہورہا تھا، وہ تشویش ناک سے بھی کچھ زیادہ تھا مگر حکومت کے کارندوں کو سمجھانا ان کے بس سے باہر تھا۔ ثمینہ، سائرہ اور ان کے دیگر مریضوں میں سب کو ہی کم یا زیادہ سانس کا مسئلہ درپیش نظر آرہا تھا۔ ان دوتین دنوں کے درمیان اسی مرض کے سیکڑوں مریض ان کے کلینک میں لائے جاچکے تھے۔ ان میں سے کچھ کی حالت خطرناک تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ایسے ہی مریض دوسرے اسپتالوں اور کلینکوں میں بھی بڑھتے جارہے ہیں۔ ہر گزرتا لمحہ مسئلے کی سنگینی میں اضافہ کررہا تھا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہ سکتے۔ کسی نہ کسی کو کچھ نہ کچھ ضرور کرنا تھا۔ وہ چند لمحے سوچتے رہے پھر اپنی کار کی جانب بڑھ گئے۔

☆☆☆

ریٹا کئی راتوں سے سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن سے منسلک تھی اور ڈاکٹر جونز کی سیکریٹری کی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔ گزشتہ دنوں وائرس کے تجربات اور لوگوں کے تڑپ تڑپ کر مرنے کی فلم گویا اس کے دماغ میں پیوست ہو گئی تھی۔ وہ جیسے ہی آنکھیں بند کرتی، وہ سب اس کی نظروں کے سامنے آ جاتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے ساتھ ایسا ہی کچھ ہو رہا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے خالی الذہن ہو گئی تھی۔

''ریٹا، کیا تم ٹھیک ہو؟'' ڈاکٹر جونز کی آواز اسے گویا ہوش میں لے آئی۔ ''میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کئی دنوں سے اُلجھی ہوئی ہو؟''

''نہیں نہیں ڈاکٹر......'' وہ بوکھلا گئی۔

''ریٹا کم آن...... کیا ہوا ہے؟ کوئی فیملی پرابلم ہے؟''

''نہیں سر...... آپ کو معلوم ہے کہ میں اکیلی ہوں۔''

''اوہ ہاں...... پھر کیا بات ہے؟'' ڈاکٹر جونز نے پوچھا۔

''سر یہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں...... یہ مجھے پریشان کر رہا ہے۔'' وہ اٹکتے ہوئے بولی۔

''کیا مطلب......؟'' ڈاکٹر جونز کے ماتھے پر بل سا پڑ گیا۔

''جو لوگ وائرس کے تجربے میں مارے گئے...... مجھے ہر وقت وہ نظر آتے ہیں۔'' ریٹا نے دھیرے سے کہا۔

''اوہ...... یہ تو ٹینشن اور اسٹریس کی نشانی ہے ڈیئر۔'' ڈاکٹر چند لمحے بعد بولا۔ ''تمہیں آرام کرنا چاہیے۔''

''نہیں سر...... گھر میں تو میں زیادہ پریشان ہو جاتی ہوں۔'' وہ گھبرا کر بولی۔ ''کچھ دن کام کاج کی مصروفیت میں سب بھول جاؤں گی۔''

''ویسے بھول جانا ہی بہتر ہے ریٹا...... اگر تم ان معمولی باتوں کے بجائے اپنے مقصد پر دھیان رکھو تو یہ سب مسائل نہیں ہوں گے۔'' وہ بولا۔

''جی سر......'' ریٹا نے خالی الذہنی کے عالم میں کہا۔

''ٹھیک ہے تم جا سکتی ہو۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

ریٹا کے جانے کے بعد وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے ایک نمبر ڈائل کیا۔

''بل میں بول رہا ہوں۔'' رابطہ ملتے ہی وہ بولا۔ ''یہاں چھوٹی سی گڑبڑ ہو رہی ہے۔ ریٹا جذباتی ہو رہی ہے...... مجھے اندازہ ہے کہ شاید وہ مسئلہ بن سکتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ زیادہ پریشان ہو...... تم سمجھ رہے ہو نا......؟''

''جی سر...... میں آج رات ریٹا سے مل لیتا ہوں۔''

''ہاں آج رات ہی......'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''مجھے تمہاری یہی بات پسند ہے، تم مسئلہ حل کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔'' وہ مسکرایا اور پھر اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر شہزاد کے فون پر میڈیا نوٹیفکیشن کی رنگ ٹون مسلسل بج رہی تھی اور وہ ہر بار اپنا فون چیک کر رہے تھے۔

''شہزاد آخر یہ ہو کیا رہا ہے؟'' ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی ان کی بیوی نوشابہ دس منٹ تک یہ سب دیکھنے کے بعد بالآخر بول پڑی۔

''نوشی میں نے تم سے ذکر کیا تھا کہ لوگ ایک پُراسرار بیماری کا شکار ہو رہے ہیں۔ میں نے اس حوالے سے اپنے روز کے تجربات اور مشاہدات کے حوالے سے ''وائی بو'' نامی چینی سوشل میڈیا پلیٹ فارم پر ڈائری لکھنا شروع کی ہے۔ یہ ہر لمحے نئے مریضوں کے پیغامات ہی آ رہے ہیں۔ لوگ پریشان ہیں۔ حالات تیزی سے بگڑ رہے ہیں مگر کوئی کچھ سننے پر آمادہ نہیں ہے۔''

''تمہیں اتھارٹیز سے بات کرنی چاہیے شہزاد...... تم یہاں کے قانون اور ان کے مائنڈ سیٹ کو جانتے ہی ہو......'' اس نے فکرمندی سے کہا۔

''کی تھی یار مگر وہ اسے میری اوور تھنکنگ سمجھ رہے ہیں۔ سچ پوچھو تو مجھے یہ اندازہ ہوا ہے کہ وہ اس بارے میں کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے۔'' شہزاد نے مایوسی سے کہا۔

''تو پھر تم خود کو خطرے میں کیوں جھونک رہے ہو؟'' اچانک آنے والی چھینک نے اس کا جملہ پورا نہیں ہونے دیا تھا اس کی پے در پے چھینکوں نے چند لمحوں میں ہی گفتگو کا سلسلہ بند کر دیا۔

''تمہیں کیا ہوا ہے نوشی؟'' ڈاکٹر شہزاد نے گھبرا کر بیوی کی جانب دیکھا۔

''ارے صرف چھینکیں ہیں۔'' وہ ہاتھ جھٹک کر بولی۔

''نہیں، تمہیں آج ہی یہ ٹیسٹ کروانے ہیں۔'' ڈاکٹر شہزاد نے پرچے پر کچھ لکھا۔ ''تم اسکول سے فارغ ہو کر

کلینک آجانا تاکہ یہ ٹیسٹ ہو جائیں۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

''تم واقعی بہت زیادہ پریشان ہو رہے ہو۔'' وہ مسکرائی۔

''پلیز تم ہیلتھ سیکریٹری والی زبان مت بولو۔'' شہزاد نے اُسے گھورا۔ ''اور ہاں، راستے میں جو ڈسٹ سیفٹی ماسک ملتے ہیں نا، وہ خریدنا مت بھولنا......''

''اب وہ کس لیے؟''

''خود کو اور دوسروں کو بچانے کے لیے۔'' ڈاکٹر شہزاد نے گمبھیر لہجے میں کہا اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ نوشی کی چھینکوں نے واقعی انہیں پریشان کر دیا تھا۔ وہ آج کل حفاظتی تدابیر پر ہی کام کر رہے تھے اور چہرے پر ماسک فوری خطرے سے بچا سکتا تھا یہ خیال انہیں ابھی ابھی آیا تھا اور وہ اسے فوری طور پر عمل میں لانا چاہتے تھے سرکاری سطح پر نہ سہی تو عوامی سطح پر ہی سہی۔ ان کا کام زندگیاں بچانے کی کوشش تھی مگر بعض کوششیں خواہ کتنی ہی نیک نیتی سے کیوں نہ کی جائیں، مشکلات میں اضافے کی وجہ بھی بن سکتی ہیں۔ وہ کلینک پہنچے تو اس کا اسٹاف دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ ایک جانب کچھ مریض بھی موجود تھے۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ تم لوگ باہر کیوں کھڑے ہو؟'' وہ تیزی سے گاڑی سے اتر کر کلینک تک پہنچے۔

''سر...... ہم کلینک نہیں کھول سکتے۔'' ان کی اسسٹنٹ بولی۔

''کیا مطلب؟ کیوں؟''

''اس لیے کہ آپ آج کلینک پر موجود نہیں ہیں۔'' پیچھے سے آنے والی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک درمیانی قامت کا شخص ان کے عین پیچھے کھڑا تھا۔ ان سے آنکھیں ملتے ہی وہ مسکرایا۔

''اس بات کا کیا مطلب ہے؟'' ڈاکٹر شہزاد نے اسے گھورا۔

''ڈاکٹر صاحب آپ کو آج ہمارے ساتھ چلنا ہے...... میرا نام انسپکٹر کین چی ہے اور میرا تعلق پولیس سے ہے۔''

''تم مجھے گرفتار کر رہے ہو؟''

''نہیں، فی الحال ہم آپ کو کچھ سوالوں کے لیے اپنے ساتھ لے کر جا رہے ہیں مگر ہو سکتا ہے کہ آپ کا عدم تعاون ہمیں گرفتاری پر بھی مجبور کر دے۔'' اس کا انداز دھمکی آمیز تھا۔

''مگر کس سلسلے میں؟'' ڈاکٹر شہزاد نے سختی سے پوچھا۔

''سلسلہ آپ جانتے ہیں، آپ لوگوں میں ہراسمنٹ پھیلا رہے ہیں ڈاکٹر...... اب آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا باقی گفتگو اسٹیشن پر ہوگی۔'' ان کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔

ڈاکٹر شہزاد نے بے بسی کے عالم میں اپنے اسٹاف کی جانب دیکھا اور انسپکٹر کے ساتھ چل پڑے۔

☆☆☆

ریٹا شام ڈھلے اپنے اپارٹمنٹ... پہنچی تھی۔ وہ نہایت خوف زدہ تھی۔ وہ ڈاکٹر جونز کے ساتھ دو سال سے کام کر رہی تھی اور اس کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ جتنا سوچ رہی تھی، اتنا ہی اسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ ڈاکٹر سے اپنی کیفیت کے بارے میں گفتگو کر کے اس سے بڑی غلطی سرزد ہوگئی ہے۔ اگرچہ اس کے بعد وہ سارا وقت بالکل نارمل رہا تھا اور اس نے اس حوالے سے کوئی بھی بات نہیں کی تھی مگر پھر بھی اس کی چھٹی حس مسلسل الارم بجائے جا رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور اپنے فلیٹ میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں گروسری کا سامان تھا جس میں ٹن پیک کھانوں کے ڈبے وغیرہ بھی شامل تھے۔ بوجھ کی وجہ سے وہ نہ تو کی ہول سے چابیوں کا گچھا نکال پائی تھی اور نہ ہی دروازہ بند کر سکی تھی۔ سامان کچن میں رکھ کر دروازہ بند کرنے کا سوچتے ہوئے اس نے لاؤنج میں قدم رکھا اور منجمد سی ہوگئی۔ اس کا خوف، اس کے وسوسے اور اس کا ڈر ڈیوڈ بل کی شکل میں مجسم ہو کر اس کے سامنے آگیا تھا۔ وہ صوفے پر نیم دراز تھا۔ اسے دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرایا۔

''تم...... تم یہاں کیسے آئے اندر......'' وہ ہکلائی۔

''احمقانہ سوال ہے...... ظاہر ہے کہ دروازہ کھول کر۔''

''تمہارے پاس چابیاں کہاں سے آئیں؟''

''یار تمہارا دماغ تو واقعی کام نہیں کر رہا...... تم مجھے جانتی ہو نا......؟ میں چابیوں کے بغیر دروازے کھولنے کے معاملے میں گاڈ گفٹڈ ہوں۔''

''کیوں؟ تم یہاں کیوں آئے ہو؟ اور وہ بھی میری غیر موجودگی میں...... یوں چوروں کے مانند؟'' وہ اب خود پر قابو پا چکی تھی۔

''اب تم نے عقلمندی کا سوال کیا ہے یہی اہم بات

ہے کہ آخر میں یہاں آیا کیوں ہوں...... تمہارے لیے مائی ڈیئر...... ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ تم بہت پریشان ہو اور مجھے تمہیں شانت کرنے کے لیے مامور کیا گیا ہے۔ سوسمپل۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''مگر اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ بولی۔ اس دوران میں اس کا دماغ تیزی سے کام کررہا تھا۔ اسے کسی طرح یہاں سے نکل کر بھاگنا تھا۔

''سوری ڈیئر تمہیں معلوم ہے نا کہ میں اپنی ڈیوٹی ہر حال میں پوری کرتا ہوں۔'' وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی کیوں نا ہم ایک ایک کپ کافی پی لیں ساتھ بیٹھ کر؟''

''اور...... اس کے بعد......؟ اس کے بعد تم مجھے قتل کر دوگے...... ہے نا؟'' ریٹا نے اسے طنزیہ نظروں سے دیکھا۔

''دنیا میں ہر لمحے کے بعد دوسرا لمحہ آتا ہے اور ہر چیز کے بعد کچھ نہ کچھ ہوتا ہے۔ میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ سب کچھ مہذبانہ طریقے سے ہو۔ ویسے ڈاکٹر کو بھی تمہاری بہت فکر ہے اس نے مجھے خصوصی طور پر کہا ہے کہ تمہیں تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔'' وہ مسکرایا۔

''تم اور ڈاکٹر دونوں جہنم میں جاؤ۔'' ریٹا نے غصے سے انگریزی میں کہا اور یکلخت ہاتھ میں پکڑا فوڈ ٹن کھینچ کر بل کے سر پر دے مارا، اسے اس چیز کی بالکل امید نہیں تھی۔ وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر پایا تھا اور ٹن سیدھا اس کے ماتھے پر لگا۔

''اووف......'' اس نے بے اختیار ماتھے کو چھوا پھر تیزی سے ریوالور نکال لیا۔ ریٹا اس دوران میں دوسرا ٹن اس کی جانب اچھال کر تیزی سے دروازے کی جانب مڑی۔ اس نے تیر کی طرح باہر نکل کر دروازہ بند کرلیا۔ چابیوں کا گچھا اب بھی کی ہول میں تھا اس نے چابی گھما کر دروازہ لاک کیا اور سیڑھیوں کی جانب لپکی۔ وہ جانتی تھی کہ اسے باہر نکلنے میں چند منٹ ہی لگیں گے۔ اس کے پاس جان بچانے کے لیے یہ چند لمحات ہی تھے۔ وہ ایک فلور ہی نیچے اتری تھی کہ سیڑھی پر اس کا پیر دھیرے سے مڑا اور وہ پھسل کر سامنے والے فلیٹ کے دروازے سے جاٹکرائی۔ عین اسی وقت دروازہ کھل گیا اور ایک لڑکی باہر نکل آئی۔

''اوہ...... یہ کیا ہوا؟ تم شاید پھسل گئی ہو...... آؤ اندر آؤ۔'' وہ اسے سہارا دے کر اندر لے آئی۔ ریٹا کے لیے یہ آفرامدادِ غیبی کی طرح تھی۔

''مم...... میرا جوتا......'' اس نے سیڑھی کے پاس پڑے جوتے کی طرف اشارہ کیا وہ وہاں اس کی موجودگی کا اشتہار بن سکتا تھا۔

''او کے......'' اس لڑکی نے ایک لمحے اس کی طرف دیکھا اور پھر جوتا اٹھا کر اندر آگئی۔

''پپ پلیز یہ دروازہ بند کردو...... جلدی......'' ریٹا کی آواز کپکپا رہی تھی ''اسے لاک کردو......''

''ہاں، کررہی ہوں......'' وہ دروازہ لاک کرکے اس کی طرف مڑی۔ ''کیا بات ہے؟ تم اس قدر گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟ مسئلہ کیا ہے؟''

''مم میں سب بتاتی ہوں...... مجھے ایک گلاس پانی ملے گا۔''

''ہاں...... ضرور......''

''ہم یہ روشنی بند کرکے اندر والے کمرے میں بات کرسکتے ہیں......'' پانی پی کر اس نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

''تمہیں اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے...... خیر آؤ......'' وہ اُسے سہارا دے کر بیڈروم میں لے گئی۔

''میرے پاؤں میں ہلکا سا درد ہے، میں خود چلی جاتی ہوں تم یہ روشنی بند کردو...... باہر سے یہ فلیٹ بند نظر آئے تو اچھا ہے۔'' ریٹا نے کہا۔

''او کے......'' اس بار وہ قدرے خشک لہجے میں بولی تھی۔

''اب بتاؤ ماجرا کیا ہے؟'' چند لمحوں بعد وہ دونوں بستر پر آمنے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ ریٹا کی درخواست پر اس نے بیڈروم کا دروازہ اور بیرونی کھڑکی بھی بند کردی تھی۔

''وہ مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔'' وہ بمشکل بولی۔

''کون؟...... تمہارا شوہر؟''

''نہیں، نہیں میں سنگل ہوں۔'' ریٹا نے جواب دیا۔

''پھر......؟''

''یہ تھوڑی لمبی کہانی ہے مگر اب میں خود اسے کسی سے شیئر کرنا چاہتی ہوں، کیا تم سننا پسند کروگی۔ دوسری صورت میں تم مجھے رات یا زیادہ سے زیادہ صبح تک پناہ دے دو پھر میں کہیں چلی جاؤں گی۔''

''تم بتاؤ مسئلہ ہے کیا...... اور ہاں ہم تو ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں ہیں، میرا نام خولہ ہے، خولہ فریدالدین...... پاکستان سے آئی ہوں۔''

''اوہ یس...... میں ریٹا ہوں ریٹا جوزف۔'' وہ پھیکی

[illegible] کے ساتھ بولی۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی، باہر سے آنے والی کھٹکے کی آواز نے ان دونوں کو چونکا دیا۔

''وہ...... وہ آگیا ہے۔'' ریٹا خوف زدہ ہو کر بولی۔ ''اب میری وجہ سے تم بھی ماری جاؤ گی۔ اوہ میرے خدا......'' وہ پوری جان سے کانپ رہی تھی۔

''میں دیکھتی ہوں۔'' خولہ دروازے کی جانب بڑھی اسی لمحے دروازہ کھلا اور بل کمرے میں داخل ہو گیا۔ اسے دیکھ کر ریٹا کے ہونٹوں سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

''یہ تو تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھا یائی ڈیئر ریٹا...... اس بے چاری براؤنی کے گھر میں گھسنے سے قبل......''

''یہ کیا بدتمیزی ہے تم اس طرح میرے گھر میں داخل نہیں ہو سکتے...... میں ابھی پولیس کو کال کرتی ہوں۔'' خولہ نے غصے سے اسے گھورا۔

''شاید ابھی ریٹا تمہیں میرے بارے میں کچھ بتا نہیں پائی ہے ظاہر ہے اسے میرے اتنی جلد یہاں آنے کی امید نہیں ہو گی نا......'' وہ جیب سے ریوالور نکالتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں چارلی گرل بننے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ ریٹا سے پہلے تمہیں اوپر جانا پڑے گا۔''

''تم مجھے مارنا چاہتے ہو نا...... مار دو...... یہ قصہ ختم تو ہو۔'' ریٹا ہسٹریائی انداز میں بولی۔

''وہ تو ہے مگر اس کے لیے مجھے جو اسکرپٹ دیا گیا ہے کام اسی کے مطابق ہو گا۔''

''یعنی......؟''

''یعنی تمہیں اپنے بیڈروم کی کھڑکی سے نیچے جانا ہو گا سوسائڈیکل (خودکشی) نوٹ لکھنے کے بعد......'' وہ نرمی سے بولا۔ ''ویسے تم نے پوچھا نہیں کہ میں سیدھا یہاں اس کمرے تک کیسے آگیا؟''

''کیسے......؟''

''تمہارے اس لاکٹ کی وجہ سے۔'' اس نے جیب سے لاکٹ نکال کر لہرایا۔ ''جب تم یہاں آئی ہو گی تو اسے دروازے پر گرا آئی تھیں آدھا اندر آدھا باہر...... یعنی تم نے خود نشانی چھوڑ دی اپنی......'' وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا۔ ''اس بار مجھے ڈبل شفٹ کرنا پڑے گی یعنی ایک ہی منٹ میں دو مرڈرز...... چلو ہوتا ہے ایسا بھی......'' اس نے ریوالور کا رخ خولہ کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

''میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے نہ ہی مجھے کچھ پتا ہے پھر تم مجھے کیوں مار رہے ہو؟'' وہ بولی۔

''کیونکہ تمہیں مارنا تو ہمارا مشن ہے نا۔'' وہ بازو سیدھا کرتے ہوئے بولا۔

''نن نہیں......'' ریٹا چلّائی تھی۔ اسی دوران خولہ پھرکی کے مانند گھومی اور اس کی طاقتور کک بل کے ریوالور والے ہاتھ پر پڑی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے اچھل کر دور جا گرا تھا۔ خولہ کی دوسری کک کا نشانہ اس کا سینہ تھا جس کے بعد وہ اوغ کی کریہہ آواز نکالتا ہوا نیچے گرا تھا۔ اسے خولہ سے اس کارروائی کی قطعی امید نہیں تھی۔ ریٹا کا منہ بھی کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ خولہ کے نائف ہینڈ اسٹرائیک نے اسے پھر زمین چٹادی۔

''میں چھوڑوں گا نہیں تجھے......'' وہ غصے میں مغلظات بکتا ہوا کھڑا ہوا اور اس نے خولہ کے منہ پر مُکا مارنے کی کوشش کی۔ آخری لمحے میں اس کے ہٹنے کی وجہ سے وہ مُکا خولہ کے کندھے پر لگا۔ بل کے دوسرے مُکے نے خولہ کو اچھال دیا۔ خود کو سنبھالتے ہی وہ اچھل کر آگے آئی اور اس کا ہاتھ پوری قوت سے بل کی گردن کی پچھلی جانب پڑا۔ وہ ایک لمحے کو چکرا سا گیا پھر غرا کر اس کی جانب مڑا مگر اس دوران خولہ کا بازو اس کی گردن کو اپنی آہنی گرفت میں لپیٹ چکا تھا۔ اس نے اپنے پیروں اور کہنیوں کی مدد سے خود کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کی مگر اس کی یہ کوشش خولہ کی گرفت کو مزید تنگ کرنے کا باعث بن رہی تھی۔ بالآخر کڑک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ ہی بل کے ہاتھ لٹک گئے۔ لمحے بھر بعد جب خولہ نے اسے چھوڑا تو وہ زمین پر ڈھے گیا۔

''یہ...... یہ بے ہوش ہو گیا...... تم نے اسے بے ہوش کر دیا۔'' ریٹا کو گویا اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''نہیں۔'' خولہ خود بھی ہانپ رہی تھی۔ ''یہ مر چکا ہے۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا اور پھر فون کی جانب بڑھی۔

''کیا؟'' ریٹا ایک لمحے کو ساکت رہ گئی۔ ''اب تم کیا کر رہی ہو؟''

''پولیس کو بلا رہی ہوں...... یہ میرے گھر میں زبردستی گھسا تھا۔ ظاہر ہے کہ مجھے اپنے بچاؤ کا حق حاصل ہے۔''

''مم مگر وہ لوگ...... وہ لوگ تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔'' ریٹا بمشکل بولی۔

''پولیس......؟''

''نہیں وہ لوگ......''

''دیکھو ریٹا...... تمہارے پاس پانچ منٹ ہیں اگر تم

مجھے کچھ بتانا چاہتی ہو تو شروع ہو جاؤ ورنہ پولیس کو اپنی کہانی سنانا۔‘‘ اس نے سختی سے کہا۔

ریٹا خاموشی سے چند لمحوں تک اس کی جانب دیکھتی رہی۔

’’میں نے تمہاری مدد کی پوری کوشش کی ہے یقیناً تمہیں یہ اندازہ تو ہو ہی گیا ہوگا کہ مجھ سے تمہیں نقصان نہیں پہنچے گا۔‘‘ خولہ بولی۔

’’ہاں مگر میری وجہ سے تمہیں جو پریشانیاں ہو رہی ہیں، میں ان پر شرمندہ رہوں گی۔‘‘ وہ بولی۔ ’’یہ ایک بڑا مافیا ہے۔ میں اپنی ایک غلطی کی وجہ سے ان کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔ اب میں انہیں چھوڑنا چاہتی ہوں مگر وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑنا چاہتے اسی لیے آج یہ مجھے مارنے آیا تھا۔‘‘

’’وہ کون لوگ ہیں......؟‘‘ خولہ نے پوچھا۔

’’وہ یہاں کا مشہور ڈان ہے، میں اس کا دفتر جانتی ہوں جو کہ ایک ریسٹورنٹ میں بنا ہوا ہے۔‘‘ ریٹا اسے حقیقت نہیں بتا سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ پولیس ڈاکٹر جونز کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرے گی جواب میں وہ ان دونوں کو مروا ڈالے گا۔

’’اچھا......‘‘ اس دوران خولہ نے پولیس کو کال کر دی تھی۔

’’میں پانی پی لوں؟‘‘ چند لمحوں بعد ریٹا نے پوچھا۔

’’تمہارے پیر میں تکلیف ہے، میں لے آتی ہوں۔‘‘ خولہ اٹھتے ہوئے بولی۔

’’نہیں، میں اب چل سکتی ہوں۔‘‘ ریٹا کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ’’ویسے بھی میں چل کر دیکھنا چاہتی ہوں اور اس کمرے سے باہر جانا چاہتی ہوں۔‘‘ اس نے زمین پر پڑے بل کی طرف دیکھتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔

’’ٹھیک ہے تم لاؤنج میں بیٹھو، میں واش روم سے ہو کر آتی ہوں۔‘‘

’’او کے......‘‘ ریٹا کمرے سے نکل کر لاؤنج کی جانب بڑھی مگر جیسے ہی اسے واش روم کے دروازے کے بند ہونے کی آواز آئی وہ تیزی سے مڑی اس نے بیڈ روم کے دروازے کو بند کیا۔ دروازے میں باہر کی جانب ایک چابی خوب صورت سے کی ہولڈر کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ اس نے کمرے کو لاک کر کے چابی وہیں چھوڑ دی اور ہلکا سا لنگڑاتی ہوئی خولہ کے اپارٹمنٹ سے باہر نکل گئی۔ باہر کا دروازہ اس نے بند کر دیا تھا۔ وہاں سے وہ اپنے اپارٹمنٹ میں گئی۔ اس نے تیزی سے چند جوڑے، زیور، رقم اور کارڈز وغیرہ اپنے چھوٹے سے بیگ میں ڈالے، آرام دہ جوتے پہنے، کار کی چابی لی اور لفٹ کے ذریعے نیچے اتر گئی۔

☆☆☆

’’تم لوگوں کو یہ تو معلوم کرنا چاہیے تھا کہ وہ انہیں کس اسٹیشن میں لے گئے ہیں؟‘‘ نوشابہ انتہا سے زیادہ پریشان تھیں۔ ڈاکٹر شہزاد احمد کی گرفتاری کے بعد سے ان کی کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔ لوکل پولیس کو بھی ان کی گرفتاری کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔

’’میڈم، اس نے کہا کہ وہ انسپکٹر ہے اور اس نے ڈاکٹر صاحب کو اپنا کارڈ دکھایا تھا جس کے بعد وہ اس کے ساتھ چلے گئے تھے۔‘‘ کلینک کا اسسٹنٹ بولا۔

’’او کے...... تم لوگ کلینک بند کر کے جا سکتے ہو۔‘‘ نوشابہ نے کہا اور گاڑی کی طرف بڑھ گئیں۔ ’’مجھے کوئی اور راستہ اختیار کرنا ہوگا۔‘‘ وہ مسلسل سوچ رہی تھیں۔ وہ اسکول کی پرنسپل تھیں ان کی ایک شاگرد کے والد خفیہ پولیس میں اعلیٰ عہدے پر تھے۔ وہ شاید ان کی مدد کر سکیں۔ انہوں نے سوچا اور پھر کار کا رخ پولیس ہیڈ کوارٹرز کی جانب موڑ دیا۔

’’میڈم مجھے اس بارے میں علم نہیں ہے مگر جیسا کہ آپ بتا رہی ہیں کہ معاملہ سوشل میڈیا اور پوسٹس کا ہے تو اس سے متعلقہ ڈپارٹمنٹ سے معلومات اکٹھی کرتا ہوں۔ جیسے ہی خبر ملتی ہے میں آپ کو مطلع کروں گا۔‘‘ ان کے اس جواب کے بعد نوشابہ کے پاس گھر آ کر ڈاکٹر شہزاد کے انتظار کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔

ان کی طبیعت ویسے ہی صبح سے بہتر نہیں تھی اور اب تو انہیں ہلکا ہلکا بخار بھی محسوس ہو رہا تھا۔ گھر میں وہ دونوں اکیلے ہی رہتے تھے۔ اولاد ان کی نہیں تھی۔ صرف ایک جز وقتی ملازمہ ہر روز صبح چار گھنٹے کے لیے آ کر تمام کام سمیٹ جایا کرتی۔ تنہائی اور انتظار دونوں ہی تکلیف دہ کیفیتیں ہوتی ہیں مگر جب یہ یکجا ہو جائیں اور ان پر بے یقینی اور خوف کا تڑکا بھی لگا ہو تو انسان کو کسی پل سکون نہیں آتا۔ نوشابہ کی بھی یہی حالت تھی۔ تب ہی آدھی رات کو ہونے والی ہلکی سی دستک نے ان کی سماعت کو چھو لیا تھا۔ وہ تقریباً دوڑتے ہوئے دروازے تک پہنچیں۔ اسے کھولتے ہی ان کا دل شکر کے سجدے میں گر پڑا تھا۔ ڈاکٹر شہزاد ان کے سامنے کھڑے تھے۔

☆☆☆

خولہ کو واش روم سے باہر نکلتے ہی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے دروازے کی جانب لپکی، دروازہ باہر

مقفل تھا۔ اس نے ناب کو پوری قوت سے گھمایا پھر مایوس ہو کر بستر پر آکر بیٹھ گئی۔ اسے اب پولیس کی آمد کا انتظار تھا۔ اس وقت وہ خود کو بہت بڑی احمق بلکہ خضر کی زبان میں چغد محسوس کررہی تھی۔ خضر کا خیال آتے ہی اس نے بیڈ سائڈ پر رکھا موبائل اٹھا کر اس کا نمبر ملایا۔

"ہیلو....." خضر کی آواز سن کر اسے بے حد طمانیت کا احساس ہوا تھا۔

"خضر، میں ایک پریشانی میں پھنس گئی ہوں۔" وہ لمحے کے توقف کے بعد بولی۔

"ایز یوژول (ہمیشہ کی طرح) اس میں نیا کیا ہے ڈیئر کزن۔ میں تو سوچتا ہوں کہ کیا کوئی ایسا بھی دن ہوسکتا ہے جب تم کسی پریشانی میں نہ پھنسو، ویسے اس بار کیا ہوا ہے؟ گاڑی کا پیٹرول اچانک بیچ راستے میں ختم ہوگیا ہے یا تم پرس گھر بھول آئی ہو؟" اس نے ہلکے سے قہقہے کے ساتھ پوچھا۔

"کچھ زیادہ نہیں ہوا بس میں اپنے کمرے میں بند ہوں اور میرے کمرے میں ایک کریمنل کی لاش پڑی ہے۔" اس نے متانت سے کہا۔

"کیا.....؟" وہ بہت زور سے چلّایا تھا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہوتم؟ تم کمرے میں کیوں بند ہو اور وہ لاش تمہارے کمرے میں کہاں سے آئی؟"

"اصل میں جب وہ یہاں آیا تب وہ لاش نہیں تھا یعنی زندہ تھا۔ وہ مجھے اور میری پڑوسن کو قتل کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کے پاس ریوالور بھی تھا۔ مجھے اپنی جان بچانے کے لیے اس سے لڑنا پڑا۔ اس لڑائی میں ہم میں سے ایک ہی بچ سکتا تھا۔ یوں یہ لاش بن گیا۔ اس کے بعد میری پڑوسن مجھے اس کمرے میں لاک کر کے فرار ہوگئی۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے یار....."

"یہ تم کیا کہے جارہی ہو؟" وہ اُلجھ کر بولا۔ "صرف ڈھائی گھنٹا پہلے تو تم دفتر سے گئی ہو۔ اتنی دیر میں اتنا لمبا کھڑاگ آخر کیسے کھڑا کرلیا تم نے..... بہرحال تم نے پولیس کو فون کیا؟"

"ہاں....."

"اور اپنے وکیل کو؟"

"نہیں..... میں کرلیتی ہوں۔"

"ضرورت نہیں ہے، میں اسے بلا رہا ہوں اور میں بھی آٹھ دس منٹ میں وہاں پہنچ رہا ہوں اس دوران خدا کے واسطے تم کچھ نیا مت کرنا۔"

"اوکے، ٹھیک ہے مگر ایک مسئلہ ہے۔"

"وہ کیا؟" خضر نے پوچھا۔

"اب مجھے اس لاش سے ڈر لگ رہا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ میں بلیک بیلٹ ہولڈر ہوں، نشانہ بازی میں بھی ماہر ہوں مگر بھوتوں کو تو آپ دوبارہ نہیں مار سکتے نا....."

"اووف خولہ....." خضر جو اس کی بات بہت توجہ سے سن رہا تھا جھنجلا گیا۔

"تم اس کی طرف مت دیکھو، ویسے بھی کوئی لاش اتنی جلدی بھوت نہیں بن سکتی۔"

"تمہیں یقین ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں.....سو فیصد.....دیکھو خولہ پولیس وہاں پہنچنے والی ہوگی۔ اس دوران میرا وکیل سے رابطہ ضروری ہے۔ پلیز مجھے اسے کال اور ڈرائیو کرنے دو تب ہی میں وہاں پہنچ سکوں گا۔"

"اوکے خضر۔" اس نے کال بند کر کے موبائل اپنے قریب رکھ لیا۔ خضر سے بات کر کے وہ قدرے مطمئن ہوگئی تھی۔

وہ اور خضر فرسٹ کزنز تھے۔ خضر نے کرمنالوجی میں ڈاکٹریٹ کی تھی۔ کچھ عرصے وہ پاکستان میں پولیس ڈیپارٹمنٹ کے ساتھ بھی وابستہ رہا تھا مگر وہ اپنی ڈیٹکٹو ایجنسی قائم کرنا چاہ رہا تھا۔ اسے امریکا میں مزید پڑھائی اور کام کا موقع ملا تو وہ امریکا چلا آیا۔ اسے امریکا شفٹ ہوئے چھ سال سے زائد ہوچکا تھا جب کہ خولہ کو وہاں آئے تین سال ہوئے تھے۔ خولہ نے سائیکلوجی اور ہیومن بی ہیوئر میں تعلیم مکمل کی تھی۔ اماں اور پھر ان کے چھ ماہ بعد ابا کی وفات نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ایسے میں ماموں اور ممانی نے یہ حل نکالا کہ وہ خضر کے پاس امریکا چلی جائے۔ وہ تو کچھ اور بھی چاہتے تھے مگر اس کے لیے خضر اور خولہ دونوں کو ہی وقت درکار تھا۔ اب وہ ڈبل کے ایجنسی کو مل کر چلا رہے تھے۔

خولہ کراٹے میں بلیک بیلٹ کی مالک تھی۔ خضر نہ صرف بہترین نشانہ باز تھا بلکہ مارشل آرٹ کا ماہر بھی تھا۔ ان کی جوڑی اب تک کئی اہم کیسز میں شہر کی پولیس کی مدد کر چکی تھی۔

پولیس سائرن کی آواز نے اسے کچھ تقویت دی تھی۔ ریٹا نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ یہ وہ سوال تھا جو بار بار اس کا پارا ہائی کررہا تھا۔

☆☆☆

فون کی مسلسل بجتی گھنٹی نے بالآخر ڈاکٹر جونز کو بیدار کر دیا۔

''اوہ گاڈ......'' اس نے بیڈ سائڈ پر رکھا سیل فون اٹھایا۔ رات ابھی شروع ہی ہوئی تھی۔ اسکرین پر کوئی نمبر نہیں تھا۔ اس نے فوری طور پر ریسیونگ بٹن دبایا۔

''ڈاکٹر اب جاگنے کا وقت آگیا ہے۔'' دوسری جانب سے ایک سرد آواز نے اس کی نیند مکمل طور پر اُڑا دی۔

''سر، خیریت تو ہے؟''

''شاید نہیں یا شاید ہاں، اس بات کا فیصلہ تم خود کرو گے البتہ میرے پاس تمہارے لیے ایک نہیں دو خبریں ہیں۔ تمہاری سیکریٹری ریٹا فرار ہوگئی ہے اور تمہارا ڈیتھ اسکواڈ یعنی ڈیوڈ بل مارا گیا ہے۔''

''بل مارا گیا؟'' وہ یکدم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''ریٹا نے اسے مار ڈالا؟''

''نہیں جونز اسے کسی پاکستانی لڑکی نے مارا ہے جو ریٹا والی بلڈنگ میں رہتی ہے اور جہاں ریٹا نے پناہ لی تھی۔ وہ اب وہاں نہیں ہے۔ بظاہر وہ فرار ہوگئی ہے مگر آپ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے اس پاکستانی نجا کو کیا کچھ بتادیا ہو۔''

''میں سمجھ رہا ہوں۔ میں اس معاملے کو دیکھتا ہوں سر۔''

''دیکھ لو تو بہتر ہے اور یہ ٹاپ سیکرٹ اور اہم ترین ایشو ہے جونز، شاید ہم سب یا کم از کم تم سب کی بقا کا سوال...... اس پر کوئی سمجھوتا ڈیتھ وارنٹ پر دستخط کے برابر ہوگا۔'' ان الفاظ کے ساتھ دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا۔

ڈاکٹر جونز گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ اپنے بال سنوار رہے تھے اور ذہن اس سچویشن میں اٹکا ہوا تھا...... ریٹا...... ریٹا کہاں جا سکتی ہے؟ اور وہ پاکستانی لڑکی......بل اس کا بہترین فائٹر تھا، وہ اس لڑکی کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس نے گہری سانس لی۔ اس کا کام بڑھتا جا رہا تھا۔ اسے فوری ایکشن کرنا تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے موبائل پر کچھ نمبر دبائے اور اسے کان سے لگا لیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر شہزاد احمد تیس گھنٹوں سے مسلسل جاگ رہے تھے۔ ان کے سامنے بستر پر ان کی زندگی نیم بے ہوش حالت میں موجود تھی۔ نوشابہ سے انہوں نے محبت کی شادی کی تھی اور اس کی ہی وجہ سے وہ یہاں اکیلے تھے۔ نوشابہ کے والدین اس کے بچپن میں چین منتقل ہوئے تھے اور اب اس کا خاندان یہاں کے اچھے تاجروں میں شمار ہوتا تھا۔ انہیں رات ہی وہ کچھ زیادہ ٹھیک نہیں لگی تھی پھر صبح ہوتے ہوتے اس کا بخار تیز ہوگیا تھا۔ اس کے ضروری ٹیسٹ کر لیے گئے تھے۔ رپورٹس البتہ اب تک نہیں آئی تھیں مگر ڈاکٹر شہزاد کو کسی رپورٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اسی موذی مرض نے نوشابہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ انہیں اسے بچانا تھا۔ ہر قیمت پر......انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ بخار اب بھی ہلکا نہیں ہوا تھا۔

''کچھ دیر...... کچھ دیر آرام کر لو شہزاد۔'' وہ ان کا لمس محسوس کر کے جاگ گئی تھیں۔ ان کے چہرے پر ماسک موجود تھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں پرنسپل صاحبہ، ضرورت یہ ہے کہ تم آرام کرو اور فوری طور پر ٹھیک ہو جاؤ۔'' وہ بمشکل مسکرائے۔ ''تمہیں معلوم ہے نا کہ تمہاری بیماری مجھے بہت ڈسٹرب کر دیتی ہے۔''

''ہاں...... میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

''بالکل ہو جاؤ گی۔'' انہوں نے پُریقین لہجے میں کہا۔ ''اب تم سونے کی کوشش کرو۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔'' وہ اس کا سر سہلاتے ہوئے بولے۔ عین اسی وقت ان کا فون بج اٹھا۔

''ہیلو......!''

''ڈاکٹر شہزاد احمد؟'' دوسری طرف سے زنانہ آواز میں سوال کیا گیا۔

''یس......''

''سر پلیز انتظار کریں، آپ سے ہیلتھ کمیشن کمیٹی کے ایکشون لی بات کریں گے۔''

''میں اس وقت مصروف ہوں، میری وائف بیمار ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''مجھے یہ سن کر افسوس ہوا ڈاکٹر شہزاد لیکن اس وقت پورے شہر کا مسئلہ ہے۔'' دوسری جانب لی خود لائن پر تھے۔

''فرمائیے مسٹر لی' میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''آپ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے شہر میں پھیلنے والی بیماری کی نشان دہی کی ہے۔''

''جی ہاں اور اس کی سزا کے طور پر ایک پورا دن پولیس اسٹیشن میں گزارا ہے۔'' وہ تلخ لہجے میں بولے۔

''میں اس کے لیے آپ سے معذرت کرتا ہوں

ڈاکٹر شہزاد، میں چاہتا ہوں کہ آپ اسپیشل ٹیم سے رابطے میں آ جائیں اور ان سے اپنے تجربات شیئر کریں تاکہ ہم مل کر اس مصیبت کا سامنا کر سکیں۔''

''اب کیا ہوا ہے...... میرا مطلب ہے کہ ایسا کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے ان اقدامات کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے؟''

''پورا شہر خطرے میں ہے ڈاکٹر اور شاید پورا ملک ہی۔'' وہ گمبھیر انداز میں بولے۔ ''ہمیں شک ہے کہ شاید سارس نامی وائرس نے دوبارہ ہم پر حملہ کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں نا کہ 2002ء میں سارس 745 افراد کی زندگیاں نگل گیا تھا۔''

''جی ہاں۔'' اس بار وہ خود پُرتشویش لہجے میں بولے۔ ''مگر میرا خیال یہ ہے کہ یہ وہ نہیں ہے...... یہ اس سے زیادہ خطرناک مسئلہ ہے مسٹر لی سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس سے مکمل طور پر آگاہ بھی نہیں ہیں۔''

''بندرگاہ پر تین ہلاکتیں ہو چکی ہیں ڈاکٹر شہزاد...... ابھی ان کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا گیا مگر ہمیں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کو بالآخر اس کی رپورٹ دینی ہوگی۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟ ابھی ایک گھنٹے بعد ہیڈ آفس میں ایک مشاورتی اجلاس ہو رہا ہے۔ آپ کی شرکت ضروری ہے۔''

''اوکے۔'' ڈاکٹر شہزاد بولے۔ فون بند کر کے انہوں نے نوشابہ کے لیے نرس کا انتظام کیا۔ ان کے بدترین خدشات اپنے خدوخال واضح کر رہے تھے۔ آنے والے دن شہر اور لوگوں کے لیے نہایت مشکل ثابت ہونے والے تھے۔

☆☆☆

ریٹا اس وقت ایک درمیانے درجے کے ہوٹل کے ایک کمرے میں موجود تھی۔ اس نے اپارٹمنٹ سے نکلتے ہی پہلے...... اے ٹی ایم سے اپنے تینوں کارڈز میں موجود تمام رقم نکلوا لی تھی۔ اس کے بعد پہلا کام گاڑی سے چھٹکارا تھا۔ گاڑی اس کے اپنے نام پر تھی لہٰذا اس نے رات تک اسے بھی اونے پونے داموں فروخت کر دیا تھا۔ وہ ڈاکٹر جونز اینڈ کمپنی اور پولیس دونوں میں سے کسی کے بھی پوری طرح ایکٹو ہونے سے قبل اپنے تمام فوٹ پرنٹس مٹا دینی چاہتی تھی۔ پیسا اکٹھا کرنے کے بعد اس نے کچھ نئے کپڑے خریدے اور ایک بڑی سپر مارکیٹ کے واش روم میں اپنا حلیہ تبدیل کر لیا تھا۔ بالوں کی وگ، کانٹیکٹ لینز اور بالکل مختلف طرز کے کپڑوں میں وہ خود کو بھی پہچان نہیں پا رہی تھی۔ اس نے ایک ایجنٹ کے ذریعے ایک اسٹوڈیو اپارٹمنٹ تین ماہ کے لیے کرائے پر لے لیا تھا۔ شام تک وہ وہاں شفٹ ہونے والی تھی۔ اس ساری ہنگامہ آرائی سے اسے بہرحال فائدہ ہی ہوا تھا۔ اب وہ ساری بے چینی اور ڈراؤنے مناظر اور خواب اس کا پیچھا چھوڑ گئے تھے۔ وہ خود کو بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔ البتہ وہ خولہ کے لیے ضرور پریشان تھی۔ اسے اس طرح چھوڑ آنا اس کی مجبوری تھی۔ اسے خود کو بچانا بھی تھا اور ڈاکٹر جونز کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو تیار بھی کرنا تھا مگر وہ خولہ سے بے پروا نہیں تھی۔

''ایک دن میں ضرور تمہارے کام آؤں گی۔'' اس نے گویا خود اپنے آپ سے عہد کیا اور آئینے میں دیکھ کر مسکرا دی۔

☆☆☆

''میرا خیال ہے کہ تمہارا فی الحال اپنے گھر میں اکیلا رہنا مناسب نہیں ہے۔'' خضر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ وہ دونوں تین گھنٹے بعد پولیس اسٹیشن سے نکلے تھے۔

''کیا تمہیں لگتا ہے کہ اس کے اور ساتھی وغیرہ بھی ہوں گے؟''

''خولہ یہ معاملہ صرف اسٹریس پاس کا نہیں ہے۔ یہ کوئی گہرا چکر نظر آ رہا ہے۔ ریٹا...... میرا مطلب ہے کہ تمہاری دوست ریٹا۔'' وہ تینوں لفظوں پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''مسلسل جھوٹ بولا ہے۔ اس شخص کا کوئی کریمنل ریکارڈ نہیں مل پایا ہے یعنی مافیا والا چکر تو غلط بیانی لگتا ہے مگر کچھ ہے اور اتنا زیادہ سنگین ہے جس میں خون بہانا اور کسی کو مار ڈالنا سب شامل ہے۔ تم نے بتایا ہے کہ وہ اس لڑکی سے زبردستی سوسائڈیکل نوٹ بھی لکھوانا چاہ رہا تھا۔'' خضر نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... ہم صبح پہلا کام ریٹا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا ہی کریں گے ویسے وہ میری دوست نہیں تھی، میں نے انسانیت کے ناتے اس کی مدد کی تھی اور باقی سب کچھ ہوتا چلا گیا۔ ویسے تمہارا کیا خیال ہے وہ واپس آ سکتی ہے؟'' خولہ نے پوچھا۔

''آ بھی سکتی ہے۔ فی الحال تو یہ لگ رہا ہے کہ وہ کسی سے بچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اصل خطرہ اس سے نہیں، ان لوگوں سے ہے جنہیں اس کی تلاش ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ متبادل پر یقین رکھتے ہوں۔'' وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے مسکرایا۔

''خیر اتنا آسان بھی نہیں ہے ہم سے بھڑنا۔'' خولہ

خیالی کالر اچکا کر مسکرائی۔ ''اتنا اندازہ تو انہیں بھی ہو گیا ہو گا۔''

''خیر فی الحال ہم کوئی رسک نہیں لے سکتے۔ ویسے بھی ابھی اس معاملے کی تفتیش چلے گی اور وہ کرائم سین ہے۔''

''یعنی بعد میں رسک لے سکتے ہو؟'' خولہ کی سوئی فی الحال پر اٹک گئی تھی۔

خضر نے ایک لمحے کے لیے اس کی جانب دیکھا۔ اس کی سنہری رنگت میں غصے کی ہلکی سی سرخی شامل ہو رہی تھی۔ گہری بھوری آنکھیں خضر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ تراشیدہ بھورے سیاہ بال اس کے کاندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ اپنی زندگی میں اسے کھونے کا رسک لینے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

''دیکھ کیا رہے ہو؟ جواب دو نا۔''

''یار رسک تو بہرحال مجھے ہی لینا پڑے گا۔ وہ کیا کہ میں ایک سعادت مند مشرقی لڑکا جو ہوں۔ اماں ابا کی بات ٹال نہیں سکتا یوں گلے میں پڑا ڈھول بجانا ہی پڑے گا۔'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

''میں ڈھول ہوں؟'' وہ چیخ پڑی تھی۔

''ڈھول ماہیا......اب خوش؟'' خضر نے یہ کہہ کر بیک ویو مرر پر نظر ڈالی اس کے ماتھے پر بل سا ابھر آیا تھا۔ وہ اس گاڑی کو تھانے سے ہی اپنے تعاقب میں دیکھ رہا تھا۔ پہلے اس نے اسے اپنا وہم سمجھا تھا مگر اب اسے یقین ہو رہا تھا کہ ان کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ اس نے گاڑی کی رفتار تیز کر کے اسے بائیں سمت میں موڑ لیا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟ مجھے کم از کم اپنے کپڑے اور سامان تو لینے دو۔'' خولہ بولی۔

''گڑبڑ ہے۔'' وہ بولا۔

''کیسی گڑبڑ؟''

''ہمارا پیچھا کیا جا رہا ہے۔'' خضر نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہمیں پولیس کو بتانا چاہیے۔'' خولہ نے پوچھا۔

''ذرا رک جاؤ، دیکھنا پڑے گا کہ یہ چاہتے کیا ہیں؟'' خضر نے جواب دیا پھر بگڑ کر بولا۔ ''خولہ سیٹ بیلٹ لگاؤ تم ہمیشہ بھول جاتی ہو۔''

خولہ نے بغیر کسی بحث کے بیلٹ کو کھینچ کر ہک میں لگا لیا۔ وہ اب ایک قدرے کم رش والی سڑک پر آ گئے تھے۔

''یہاں سے آگے تو پارک اور پھر سٹی فاریسٹ کا علاقہ آ جائے گا۔'' خولہ نے کہا۔

''ہاں دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس خالی سڑک پر بھی ہمیں فالو کرتے ہیں یا نہیں۔''

''یہ سیاہ رنگ کی ٹیوٹا کرولا ہی ہے نا......'' خولہ کی نظر سائڈ مرر سے اسی کار پر جمی ہوئی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ تھیم پارک والی سڑک پر مڑ گئے۔ رات کے اس پہر وہاں اِکّا دُکّا کاریں ہی نظر آ رہی تھیں۔

''انہوں نے کار کی رفتار بڑھا دی ہے۔'' خضر بولا۔

''مجھے ان کے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے۔''

''میں پولیس کو کال کر رہی ہوں۔'' خولہ نے کہا اور ایمرجنسی نمبر ڈائل کرنے کے لیے موبائل نکالا عین اسی وقت ان کی کار کو زوردار جھٹکا لگا، خضر نے بمشکل کار کو پھسلنے سے بچایا۔

''یا اللہ......!'' خولہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ خضر نے ایکسلیریٹر پر پیر دبایا مگر پیچھے سے آنے والی کار نے بھی رفتار بڑھا لی۔ اس بار وہ بائیں جانب سے آگے آئے تھے۔ خضر نے گاڑی کو قدرے ہلکا کر کے پھر تیز کر دیا مگر سیاہ کار مسلسل ان کے ساتھ چل رہی تھی۔

''سنبھالو خضر......'' کار کو دوبارہ قریب آتے دیکھ کر خولہ چیخ اٹھی تھی۔ اس بار کار کو لگنے والا جھٹکا بہت زوردار تھا۔ کار تیزی سے کچے کی جانب بڑھی مگر خضر نے اسٹیئرنگ کو پورا گھما کر نہ صرف کار کو روک لیا بلکہ تیزی سے واپس آ کر سیاہ کرولا کو ٹکر ماری۔ کرولا پھسلتی ہوئی سڑک کے دوسرے کونے سے جا لگی۔ خضر نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ آگے اور پیچھے جانے کے بجائے وہ دوبارہ پلٹ کر کار کی جانب آیا اور سیاہ کرولا کو ایک اور زبردست ٹکر رسید کی۔ یہ ٹکر فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ کار سڑک سے کچے اور پھر پھسلتی ہوئی سٹی فاریسٹ میں اتر گئی تھی۔ خضر نے کار کو تیزی سے ریورس کیا اور سیدھا نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

سٹی ہاسپٹل میں ہر جانب لوگ ہی لوگ نظر آ رہے تھے۔

لوگ مسلسل اپنے پیاروں کو اسٹریچر، وہیل چیئرز اور گودوں میں لے کر اسپتال...کا رخ کر رہے تھے۔ اسپتال میں اب مزید بیڈ میسر نہیں تھے۔ یہی حال شہر کے دیگر اسپتالوں کا بھی تھا۔

''اگر جگہ نہیں ہے تو آپ بتائیے کہ ہم اپنے مریض کو اس حال میں کہاں لے کر جائیں؟'' ایک ضعیف مریضہ کے

ساتھ آنے والا اس کا بیٹا پھٹ پڑا تھا۔ ''کیا آپ کی ذمے داری نہیں ہے؟''

''ذمے داری ہے مگر آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ اسپتال میں صرف آٹھ سو بستر موجود ہیں اور ہمارے پاس دوسرے مریض بھی ہیں۔''

''پھر... اب یہ مریض کیا کریں۔ ان کا کیا ہوگا؟'' اس کی آواز میں بہت ساری آوازیں شامل ہوگئی تھیں۔

''اس صورت حال کا حل کیا ہے آپ کے پاس؟''

''حل ہے......'' اسپتال کے ایم ایس کو حالات سنبھالنے کے لیے ایمرجنسی میں آنا پڑا تھا۔ ''ہر مریض ہماری ذمے داری ہے مگر آپ یہ تو مانیں گے نا کہ ڈاکٹرز اور میڈیکل اسٹاف بھی انسان ہیں۔ یہاں آنے والے ہر مریض کو ہم دیکھیں گے اور علاج کریں گے مگر اس کے لیے سب کو تعاون کرنا ہوگا تب ہی کچھ ممکن ہو پائے گا۔''

کچھ دیر میں وہ بکھرا ہوا بھپرا ہوا مجمع مختلف کوریڈورز، لاؤنجز اور ہالز میں ڈسپلن کے ساتھ بٹ گیا تھا۔ ایم ایس نے اسٹاف اور ڈاکٹرز کی بھی ٹیمیں بنادی تھیں اور ہر ٹیم اپنے ایریا کے مریضوں کو نمبروار دیکھ رہی تھی۔

سٹی اسپتال کے اس واقعے کو وہاں سے قدرے فاصلے پر واقع نیشنل ہیلتھ کمیٹی کے دفتر میں بھی دیکھا جارہا تھا جہاں وائرس کو لے کر میٹنگ جاری تھی۔

''ایم ایس نے نیشنل جذبے کا مظاہرہ کیا ہے۔ اُن کی تعریف ہونی چاہیے۔'' کمیٹی کے ہیڈ نے ویڈیو سے نظر ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''مگر یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔''

''پھر کیا کرنا چاہیے سر؟'' کسی نے پوچھا۔

''ہمیں جلد از جلد مزید اسپتال بنانے ہوں گے۔ ایسے اسپتال جو صرف وائرس کے مریضوں کے علاج کے لیے درکار سہولیات سے لیس ہوں۔'' انہوں نے مصمم لہجے میں کہا۔

''اس ایمرجنسی میں نئے اسپتالوں کے قیام کے بجائے موجودہ عمارتوں کو استعمال کیا جائے تو بہتر نہیں ہے؟'' ایک ممبر نے رائے دی۔

''کام تو چل سکتا ہے مگر ہمیں جس طرح کی سہولتیں درکار ہیں وہ وہاں فراہم نہیں کی جاسکیں گی۔ آپ لوگوں کو یاد ہوگا اٹھارہ سال پہلے جب سارس نے حملہ کیا تھا تب ہم نے دس دنوں میں پورا اسپتال قائم کردیا تھا۔ اس بار ہم اپنا یہ ریکارڈ خود توڑیں گے۔'' اس نے پورے یقین سے کہا۔

☆☆☆

''ایک دن میں دوبار ایک ہی ٹارگٹ کو حاصل کرنے میں ناکامی......شاید اسے بھی ہمارے ریکارڈز میں شامل ہو جانا چاہیے۔'' ڈاکٹر جونز کا چہرہ غصے سے سرخ ہورہا تھا مگر اس کی آواز بالکل نارمل تھی۔ ''وہ ایک عام لڑکی ہے۔ پاکستان جیسے پسماندہ ملک سے تعلق رکھتی ہے مگر دوسری جانب وہ بل جیسے کلر کو صرف ہاتھوں کی مدد سے مار ڈالنے کی طاقت رکھتی ہے اور پھر میری ٹیم کے دو جانباز ان کی گاڑی کو ٹریفک حادثے کی کہانی بنانے میں نہ صرف ناکام رہے بلکہ ان کی جگہ حادثے والا رول بھی خود ہی کر کے چلے آرہے ہیں۔ ہماری ٹیم کو کیا ہوگیا ہے؟''

''جونز، کول ڈاؤن۔'' اس کے سامنے سنہرے بالوں والی خاتون موجود تھی۔

''گلوریا ان حالات میں یہ تھوڑا مشکل نہیں ہے؟'' ڈاکٹر جونز نے اسے دیکھتے ہوئے سادگی سے پوچھا۔

''مشکل ہے مگر ایسا ہوتا ہے، خود تم ہمیشہ کہتے ہو کہ دشمن کو کم نہیں سمجھنا چاہیے اور یہ پاٹی تو ویسے بھی کچھ بھی کر جاتے ہیں۔'' گلوریا نے اپنے بال جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''تم صرف یہ کیوں دیکھ رہے ہو یہ بھی تو دیکھو کہ ''وائرس پروجیکٹ'' کس قدر کامیابی سمیٹ رہا ہے۔ ہم اس لڑکی سے بھی نمٹ لیں گے مگر اس کے ساتھ ساتھ ریٹا کی تلاش ضروری ہے۔''

''ریٹا کی تلاش بھی اہم ہے اور اس معاملے کا ختم ہونا بھی ضروری ہے۔ مجھے شک ہے کہ ریٹا نے اسے ہمارے پروجیکٹ کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور بتایا ہے۔ ہم وائرس پروجیکٹ کے حوالے سے ہلکی سی بے پروائی بھی برداشت نہیں کرسکتے۔ صرف اسی وجہ سے میں نے بل کو ریٹا کے لیے کام دیا تھا۔ خیر ہم اس معاملے سے نمٹ لیں گے۔ آج رات کے اجلاس میں چند اور ضروری باتیں بھی طے کی جانی ہیں۔'' ڈاکٹر جونز کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ یہ ملاقات کے خاتمے کا اعلان تھا۔ گلوریا سر ہلاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

ڈاکٹر جونز مسلسل سوچ میں تھا۔ اس کے ماتھے پر دو بل پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے فون اٹھایا۔

''مجھے ریٹا کی عمارت میں رہنے والی اس پاکستانی لڑکی کے بارے میں مکمل معلومات درکار ہیں۔'' وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ''ہاں وہی جس کے فلیٹ سے بل کی لاش ملی تھی۔ کوشش کرو کہ یہ تمام تفصیل رات تک میرے ان باکس

میں پہنچ جائے تو بہتر ہوگا۔‘‘ اس نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

ریٹا اپنے نئے اپارٹمنٹ کے بیڈ روم میں بستر پر ساکت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اس کی نظریں سامنے دیوار پر لگے 40 انچ کے دیوار گیر ٹیلی ویژن پر جمی ہوئی تھیں جہاں ایک صوبے کے تیرہ شہروں کو لاک ڈان کرنے کی خبر چل رہی تھی۔ تصویروں میں شہر میں ہزاروں کی تعداد میں متاثرہ بوڑھوں، نوجوانوں، عورتوں اور بچوں کو دکھایا جا رہا تھا جو مختلف اسپتالوں میں سخت تکلیف میں تھے۔ شہر کسی ویرانے کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ لوگ گھروں میں بند تھے۔ لوگ اشد ضرورت کی صورت میں ہی گھروں سے باہر نکل رہے تھے۔ اس نے بمشکل ریموٹ اٹھایا اور چینل تبدیل کیا۔ اس چینل پر وائرس کی تباہ کاری کا ذکر چل رہا تھا۔ تھائی لینڈ، ہانگ کانگ میں متاثرہ افراد کی تعداد بڑھنے کے خدشے کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ اس نے دوبارہ چینل بدلا۔ اس بار خبر امریکی بحری جہاز کے بارے میں تھی جو کسی جاپانی بندرگاہ پر کھڑا تھا اور جس میں سو سے زیادہ افراد وائرس کا شکار ہو چکے تھے۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ اس کے دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ وہ خود کو بچانے کی مہم میں مصروف تھی مگر اس دوران انسانوں سے بھرے شہر اور پھر کئی ممالک اس جنون کی نذر ہو چلے تھے۔ وہ تو ڈاکٹر جونز کی تجربہ گاہ میں تڑپ تڑپ کر دم توڑنے والوں کے چہروں کو نہیں بھلا پائی تھی مگر یہاں دنیا کا ایک بڑا حصہ موت کے وائرس کا نشانہ بن چکا تھا۔ اس نے ٹی وی بند کر دیا۔ اس سے زیادہ دیکھنے کی اس میں ہمت بھی نہیں تھی۔

مگر اب وہ خاموش تماشائی بن کر بھی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ اس سب کو روکنا آسان نہیں تھا نہ ہی ڈاکٹر جونز اور اس کے ساتھیوں سے مقابلہ کرنا آسان تھا لیکن یہ سب بھی ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے مگر وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ دل سے کی گئی کوشش منزل کو قریب لے آتی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر شہزاد احمد اور ان کے ساتھی ڈاکٹرز مسلسل کام کر رہے تھے۔ چوبیس گھنٹوں میں وہ بمشکل دو سے تین گھنٹے ہی آرام کر پا رہے تھے۔ نوشابہ کے صحت مند ہونے کے بعد سے تو وہ اسپتال کے ہی ہو کر رہ گئے تھے۔ نیشنل ہیلتھ کمیٹی کے اجلاس اور دیگر انتظامی امور کے بعد ان کا سارا وقت مریضوں کے ساتھ ہی گزر رہا تھا۔

شہر میں تو قیامت ہی ٹوٹ پڑی تھی۔ ہر طرف لوگ دھڑا دھڑ وائرس کا شکار ہو رہے تھے۔ ہر طرف خوف و دہشت کی فضا بکھری ہوئی تھی۔ دوائیاں، ماسک، روزمرہ استعمال کی اشیاء، گروسری ہر چیز کی قلت نظر آ رہی تھی۔ شہر کا تعلق دنیا بھر اور بقیہ ملک سے بھی کٹ سا گیا تھا۔ جہاز اور ٹرینیں تو پہلے سے ہی بند تھیں۔ حکومت نے صوبے کے تمام متاثرہ شہروں میں بسیں اور ٹرانسپورٹ بھی بند کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دھان بندرگاہ والا شہر تھا... مگر بندرگاہ بھی بند کر دی گئی تھی۔ اس سب کی وجہ سے ضروریاتِ زندگی کا حصول دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ گیارہ ملین کی آبادی والا شہر اس وقت عجیب سی افراتفری کا شکار تھا۔ تمام تر احتیاطی تدابیر کے باوجود ہر روز ہزاروں افراد وائرس کے نئے شکار بن رہے تھے۔ چند دنوں میں ہلاکتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ پورا شہر عملی طور پر بند تھا۔ حکومت کی جانب سے شہریوں کو گھروں میں ہی رہنے کی ہدایت جاری کی گئی تھی۔ مارکیٹس، پارکس، سیر و تفریح کے مقامات، اسکول، کالجز، یونیورسٹیاں غرض یہ کہ ہر وہ جگہ جہاں زیادہ لوگوں کے ایک ساتھ جمع ہونے کے امکانات ہو سکتے تھے، اسے بند کر دیا گیا تھا۔

دوسری جانب اسپتالوں کی تعمیر تیزی سے جاری تھی۔ وائرس سے نمٹنے کے لیے پہلا مثالی سینٹر صرف دس روز میں تیار کر لیا گیا تھا۔ ساٹھ ہزار اسکوائر میٹر پر تیار ہونے والا یہ اسپتال ایک ہزار بستروں کی گنجائش رکھتا تھا۔ اس میں تیس آئی سی یو وارڈز تھے۔ درجنوں ہالز اور بے شمار کمرے تھے جہاں متاثرہ افراد کو قرنطینہ میں رکھنے کی سہولت موجود تھی۔ کئی ایمرجنسی وارڈز اور دیگر سہولیات فراہم کی جا رہی تھیں جب کہ دوسرے اسپتال کی تعمیر زور و شور سے جاری تھی۔ وائرس کو مزید پھیلنے سے روکنے کے لیے ہیلتھ وزیٹرز اور ڈاکٹرز کی ٹیمیں بنائی گئی تھیں جو گھر گھر جا کر لوگوں کا ٹمپریچر چیک کر رہی تھیں۔ متاثرہ شخص یا جس پر ذرا بھی شک ہو اسے اسپتال منتقل کیا جا رہا تھا۔ منفی رپورٹ آنے کی صورت میں بھی مریض کو دو ہفتے قرنطینہ میں رکھنے کی پالیسی اپنائی گئی تھی۔ اس سب کے باوجود وائرس کے عفریت پر قابو پانا خواب جیسا لگ رہا تھا۔

ڈاکٹر شہزاد آج صبح سے خود کو بہتر محسوس نہیں کر رہے تھے۔ یوں تو تھکن اور مسلسل اعصابی دباؤ نے انہیں کئی دنوں

سے متاثر کیا ہوا تھا مگر آج ان کی طبیعت خاصی ابتر تھی۔

''سر آپ کو آرام کرنا چاہیے۔'' ڈاکٹر یونگ ان کا جونیئر تھا مگر وہ انہیں مشورہ دیئے بغیر رہ نہیں سکا تھا۔

''لوگ اس قدر پریشان ہیں، موت کے اس فری بیلے ڈانس میں انسان کس طرح آرام کرسکتا ہے یونگ۔'' وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولے۔

''میں وارڈ سے ہو کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی سیٹ سے کھڑے ہوئے۔ چند قدم آگے جا کر وہ ڈگمگائے اور اس سے قبل کہ وہاں موجود لوگ انہیں سنبھال پاتے، وہ لڑکھڑا کر زمین پر آ گرے تھے۔

''ڈاکٹر شہزاد......'' ڈاکٹر یونگ اور وہاں موجود لوگ ان کی جانب لپکے تھے۔ ''اوہ ڈاکٹر شہزاد کا جسم تو تپ رہا ہے۔'' انہیں اٹھانے والے میڈیکل اسٹاف نے زور سے کہا۔ انہیں فوراً اسٹریچر پر منتقل کر کے کمرے میں لے جایا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد ان سب کے بدترین خدشات کی تصدیق ہوگئی۔

ڈاکٹر شہزاد وائرس کا شکار ہو چکے تھے۔

☆☆☆

ڈاکٹر اسٹیفن جونز اپنے کمرے میں تنہا تھا۔ اسے کسی فون کال کا انتظار تھا۔ بالآخر فون کی گھنٹی کی آواز نے اس کے انتظار کو ختم کیا۔

''ڈاکٹر جونز پروجیکٹ وائرس کی کامیابی مبارک ہو۔ اعلیٰ سطح پر اس پروجیکٹ کو سراہا جا رہا ہے۔ ہم اس سے مطلوبہ نتائج حاصل کر رہے ہیں۔'' دوسری جانب سے ایک بھاری آواز میں کہا جا رہا تھا۔

''شکریہ سر، یہ پہلا قدم ہے۔ ایک صاف دنیا جہاں سفید فام بستے ہوں، وسائل کی فراوانی ہو، وہی ہماری منزل ہے سر۔ اس طرح نہ صرف دنیا کے وسائل پر سے بوجھ ختم ہوگا بلکہ دنیا میں امن و آشتی بھی بڑھے گی۔''

''تم درست کہہ رہے ہو، یہ ہماری دنیا ہے۔'' دوسری جانب سے کہا گیا۔ ''یہاں یہ بھی سوچا جا رہا ہے کہ اس طرح ہم دنیا میں دہشت گردی کے منبع بھی ختم کر سکتے ہیں اور تم جانتے ہو کہ دنیا اور ہمیں سب سے زیادہ خطرات کس سے ہیں؟''

''مسلمان؟''

''ہاں......اور جب ہم اپنا رخ اس طرف کریں تو سب سے پہلا نشانہ مقابلے کی طاقت رکھنے والے ملک کو بننا چاہیے۔ مسلم دنیا میں صرف ایک ملک کے پاس ایٹمی طاقت ہے جس کی وجہ سے خطے میں طاقت کا توازن ہمارے حساب سے بگڑا ہوا ہے۔''

''پاکستان......؟''

''ہاں تمہارے لیے وہاں آپریشن کرنا خاصا آسان ثابت ہوگا۔''

''وہ تو ہمارے اہداف میں پہلے ہی شامل ہے۔ اگلے چند سالوں میں دنیا میں رنگ دار نسلوں میں اتنے ہی لوگ باقی رہیں گے جتنے ہمیں درکار ہوں گے۔'' ڈاکٹر جونز متکبرانہ لہجے میں بولا۔

''گڈ...... مجھے تمہارا یہ حوصلہ پسند ہے۔ کیپ اِٹ اَپ......تم اس حوالے سے اسٹریٹجی تیار کرنے میں آزاد ہو۔'' ان الفاظ کے ساتھ رابطہ ختم ہوگیا تھا۔

☆☆☆

''ریٹا ایک این جی او کے لیے کام کر رہی تھی۔ یہ دنیا میں وسائل کی بہتر تقسیم وغیرہ پر کام کرتی ہے، ڈاکٹر اسٹیفن جونز اس کے صدر ہیں۔ ریٹا ان کی سیکریٹری تھی۔ اس کے ماں باپ کا انتقال ہو چکا ہے ویسے بھی وہ ایک بروکن خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ ماں باپ کے درمیان اس کے بچپن میں ہی طلاق ہو چکی تھی۔ باپ کو اس نے برسوں سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کا کوئی بہن بھائی بھی نہیں ہے اور وہ کسی دوسری سرگرمیوں میں بھی حصہ نہیں لیتی تھی۔''

''اس کے بایوڈیٹا کے مطابق تو کوئی ایسی چیز نظر نہیں آرہی جس کی وجہ سے کوئی اس کی زندگی کا دشمن ہو جائے اور وہ سب ہو جو ہوا۔'' خضر نے بایوڈیٹا کے ساتھ موجود اس کی تصویر کو گھورتے ہوئے کہا۔

''پھر......؟''

''مجھے لگتا ہے کہ ہمیں اس کی تنظیم کے متعلق تھوڑی ریسرچ کرنی چاہیے۔'' خضر نے کہا۔ ''کہیں نہ کہیں کوئی بڑی گڑبڑ موجود ہے اور ہمارا مسئلہ تم ہو۔'' وہ بات کرتے کرتے پٹری سے اتر گیا۔

''میں......؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟'' خولہ نے اُسے گھورا۔

''تم یعنی تم مس خولہ......'' وہ مسکرایا۔ ''تم اس معاملے میں الجھ گئی ہو۔ ہمارے انجانے دشمن طاقتور ہونے کے ساتھ ساتھ کافی اثر و رسوخ کے مالک نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پولیس اسٹیشن سے نکلتے ہی ہم پر حملہ کیا۔ مجھے خوف ہے کہ یہ معاملہ یہاں نہیں رکے گا۔'' اس بار وہ سنجیدگی سے بولا۔ 'اور مسئلہ یہ ہے کہ ہم بالکل

اندھیرے میں ہیں۔ اگر ہم اسی طرح ریٹا تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں تو بھی کچھ معلومات مل سکتی ہیں۔''

''ویسے مجھے یہ لگتا ہے کہ وہ خود ہمیں اپنے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا موقع دیں گے۔'' خولہ نے کہا۔ ''یعنی وہ سکون سے بیٹھنے والے نہیں ہیں اس بار جب وہ کوئی کوشش کریں گے تو ہم اس کے لیے تیار رہنے کی کوشش کریں اسی طرح ہمیں ان کا سراغ مل سکتا ہے۔''

''ہاں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو لہٰذا آج اس لمحے کے بعد سے ہمارے درمیان چند باتیں طے ہو رہی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ تم مجھے مطلع کیے بغیر کہیں نہیں جاؤ گی...... کسی بھی نئی چیز یا مسئلے سے مجھے فوراً مطلع کرو گی۔''

''ٹھیک ہے۔ یوں بھی تم کو میرے ساتھ ہی تو رہنا ہے۔'' وہ گردن ہلا کر بولی۔ ''فی الحال مسئلہ یہ ہے کہ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔''

''ہیں، ابھی دو گھنٹے پہلے تو تم نے ناشتا کیا ہے۔'' خضر نے بھونچکا ہو کر اسے دیکھا۔

''ہاں مگر دماغی کام بھی تو بہت ہو رہا ہے پلیز تم میرے لیے برگر آرڈر کرو۔'' وہ مسکرائی اور اپنی میز کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

''ایک وائرس خواہ وہ کوئی بھی ہو...... ہماری ہمت اور کوشش کو شکست نہیں دے سکتا۔'' نائب وزیراعظم کے ان الفاظ پر کمرے میں تالیاں گونج اٹھی تھیں۔ حکومتی سطح پر بالآخر اس وائرس سے جنگ کا اعلان کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا گیا تھا اور اس کے لیے مشیروں کے مشورے پر ریاستی میڈیا کو طلب کر کے باقاعدہ پریس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا تھا۔

''مشکلات سے مقابلہ کرنے کے دو ہی راستے ہوتے ہیں یا تو ان کے آگے ہتھیار ڈال دیے جائیں یا پھر ان سے ڈٹ کر لڑا جائے۔'' انہوں نے مزید کہا۔ ''ہتھیار ڈالنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، نقصان تو ہمارا ہو ہی چکا ہے اور ہر دو صورتوں میں ہوگا ہی مگر مقابلے کی طاقت ہی ہمیں مشکلات سے باہر نکالنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔''

''ہماری معیشت پر اس کے بُرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔'' ایک صحافی کی رائے پر وہ سنجیدگی سے بولے۔ ''ہمارے کاروبار خراب ہو رہے ہیں، معاہدے ٹوٹ رہے ہیں، غیر ملکی دشمن کے پروپیگنڈے کی وجہ سے لوگ ہماری مصنوعات خریدنا کم کر رہے ہیں۔ لوگوں کی آمدورفت کم ہو گئی ہے اور ہمارے کروڑوں لوگ گھروں میں مقید ہیں مگر کیا ہم اس سب سے ٹوٹ جائیں گے؟''

''نہیں...... ہرگز نہیں...... کمرا مختلف ملی جلی آوازوں سے بھر گیا۔

''تو پھر آیئے، نئے جذبے سے کام شروع کرتے ہیں اور دنیا کو بتا دیتے ہیں کہ ہم ہارنے والے لوگ نہیں ہیں۔''

ہال ایک بار پھر تالیوں اور نعروں سے گونج اٹھا تھا۔

☆☆☆

متاثرہ شہر کے اس ہال سے پندرہ میل دور ایک عمارت میں نائب وزیراعظم کی یہ پریس کانفرنس بغور سنی جا رہی تھی۔ اس کمرے میں ایک ادھیڑ عمر خاتون اور چند نوجوان لڑکے لڑکیاں موجود تھے۔

''تم لوگ جانتے ہو نا کہ تمہیں کیا کرنا ہے؟'' تقریر ختم ہوتے ہی ادھیڑ عمر خاتون نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔

''یس میم! ہمیں اسٹوریز ڈھونڈ کر لانی ہیں۔'' ایک لڑکے نے جواب دیا۔

''صرف اسٹوریز نہیں دل پر اثر کرنے والی ہیومن اسٹوریز...... انہیں اتنا چارمنگ اور توجہ طلب ہونا چاہیے کہ انٹرنیشنل میڈیا اِن دعوؤں کو بھول جائے۔'' وہ نرمی سے بولیں۔

''اوکے میم......''

''تم میں سے ہر ایک دو اسٹوریز لانے کا پابند ہے۔'' وہ مسکرائیں اور اپنے سامنے رکھی کتاب پر نظریں جما لیں۔

☆☆☆

ریٹا مسلسل سوچ رہی تھی۔

اس کا ذہن کہہ رہا تھا کہ اسے حقیقت کو سب کے سامنے لے آنا چاہیے تاکہ لوگوں کے سامنے ڈاکٹر جونز اور اس کے ساتھیوں کا اصل چہرہ بے نقاب ہو جائے، وہ ایک سچی امریکن تھی۔ انسانیت سے محبت کرنے والی، دوسروں کے دکھ کو محسوس کرنے والی، اور وہ جانتی تھی کہ امریکا کا اصل چہرہ اس جیسے کروڑوں لوگوں سے بنتا ہے۔ ڈاکٹر جونز جیسے نسل پرست اور ظالم شاید ہزاروں میں دو یا تین ہوں مگر افسوس کی بات یہ تھی کہ ان چند لوگوں کے پاس طاقت بہت زیادہ تھی۔ اس نے گہری سانس لی۔

اسے اس حقیقت کو ماننے میں کوئی عار نہیں تھا کہ وہ خوف زدہ تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان سب سے مقابلہ کر سکے۔ مگر وہ کر سکتی ہے، ذہن میں آنے والے خیال

نے اسے ایک لمحے کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ خولہ کو ٹھیک سے نہیں جانتی۔ مصروفیت بھری مشینی زندگی نے اسے کبھی اپنے اردگرد رہنے والوں کی جانب متوجہ ہی ہونے نہیں دیا تھا مگر جس طرح اس نے بغیر کسی ہتھیار کے بِل جیسے طاقتور شخص کو پچھاڑ دیا تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ تو بہرحال تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ پاکستان سے آئی تھی جبکہ ڈاکٹر جونز کو پاکستان سے نفرت تھی۔ اگر اسے روکا نہ گیا تو وہ ان کے ملک کو بھی بڑا نقصان پہنچا سکتا تھا۔

''مجھے خولہ کو سب کچھ بتا دینا چاہیے۔'' اس نے سوچا۔ ''شاید وہ اس کی مدد بھی کر سکے۔''

اس کے پاس خولہ کا کوئی اور رابطہ نہیں تھا اور اپارٹمنٹ کی طرف جانے کا خطرہ وہ مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ پھر وہ خولہ تک کیسے پہنچ سکتی ہے؟ وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر اچھل کر کھڑی ہوگئی اس کے ذہن نے راستہ ڈھونڈ نکالا تھا۔ اگلے لمحے وہ فون پر کسی کا نمبر ملا رہی تھی۔

''یس اپارٹمنٹ مینٹی نینس سروس۔'' دوسری جانب سے نرم نسوانی آواز سنائی دی۔ ''میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟''

''مجھے مس خولہ سے رابطہ کرنا ہے' میں پاکستان سے آئی ہوں اور ان کی پرانی دوست ہوں، انہوں نے مجھے یہاں کا پتا دیا تھا..... مگر ان کا نمبر مجھ سے گم ہوگیا ہے۔'' اس نے لہجے میں حتی الامکان لجاجت پیدا کرتے ہوئے درخواست کی۔

''دیکھیے ہم عام طور پر کسی کا نمبر بغیر کنفرمیشن کے نہیں دیتے مگر مس خولہ کا معاملہ الگ ہوا ہے۔ وہ آج کل اپنے گھر پر نہیں ہیں۔ اگر آپ چند لمحوں بعد دوبارہ فون کریں تو میں ان سے اجازت لے کر آپ کا نمبر دے سکتی ہوں۔''

''کیا انہیں بتانا ضروری ہے؟ اصل میں، میں انہیں سرپرائز دینا چاہ رہی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''پلیز.....''

''اوہ میں سمجھتی ہوں مگر کسی کو پتا چلا کہ میں نے آپ کو اُن کا نمبر دیا ہے تو میرے لیے مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔'' وہ لڑکی پسیج گئی تھی۔ ریٹا اسے جانتی تھی اور اسے اندازہ تھا کہ وہ اس کی مدد کر دے گی۔

''آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں کسی کو کیا اسے بھی نہیں بتاؤں گی کہ میں نے آپ سے اس کا نمبر لیا ہے ویسے بھی ان کا نمبر تو میرے پاس تھا ہی، صرف کھو گیا ہے۔'' ریٹا نے لڑکی کا بتایا ہوا نمبر نوٹ کرتے ہوئے کہا۔

فون بند کر کے اس نے اطمینان کی سانس لی۔ چند لمحوں بعد اس نے خولہ کا نمبر ملایا۔

چند گھنٹیوں بعد اس نے فون ریسیو کر لیا تھا۔

''آپ خولہ بول رہی ہیں؟'' ریٹا نے آہستگی سے پوچھا۔

''ظاہر ہے کہ آپ نے میرا نمبر ملایا ہے تو میں ہی تو بولوں گی نا؟ آپ کون بول رہی ہیں......؟''

''میں..... خولہ یہ میں ہوں..... ریٹا.....'' اس نے قدرے شرمندگی سے کہا۔

''ریٹا..... تم' کہاں ہو تم؟ یہ تم نے کیا کیا میرے ساتھ؟ میں تو اب تک نہیں سمجھ سکی کہ تم ایسا کیسے کر سکتی ہو؟'' وہ پھٹ پڑی۔

''مجھے اندازہ ہے کہ تم ناراض ہو، ہونا بھی چاہیے..... میں نے کہا تھا نا کہ میں شرمندہ رہوں گی..... پلیز مجھے معاف کر دو۔''

''تم ہو کہاں؟ اگر چاہو تو مجھ سے اپنی پریشانی شیئر کر سکتی ہو۔ ویسے بھی میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں، جانتی ہو اسی رات ڈیڑھ دو بجے کے قریب مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔''

''کیا؟''

''ہاں، اب مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے، میں جاننا چاہتی ہوں کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟ کون ہے اس کے پیچھے؟ اور اس سب کی وجہ کیا ہے؟''

''میں بھی تم سے ملنا چاہتی ہوں۔'' ریٹا بولی۔ ''اسی لیے میں نے تمہیں فون کیا ہے..... یہ بہت بڑا مسئلہ ہے سیکڑوں لوگوں کی جان جا چکی ہے اور ہزاروں لاکھوں کی جان خطرے میں ہے خود تمہارا ملک بھی خطرے سے دوچار ہو سکتا ہے۔'' وہ بولی۔

''تم یہ سب کیا کہہ رہی ہو؟'' خولہ حیرت کے سمندر میں ڈوب گئی تھی۔ ''مجھے بتاؤ تم کہاں ہو......؟ ہم ابھی تمہارے پاس آ جاتے ہیں؟''

''ہم......؟'' ریٹا نے پوچھا۔

''ہاں، میرا کزن اور پارٹنر خضر میرے ساتھ ہوگا۔ وہ ہماری بہت مدد کر سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے..... پھر تم میرا پتا نوٹ کرو۔'' ریٹا نے اسے اپنے اپارٹمنٹ کا ایڈریس لکھواتے ہوئے کہا۔ ''خولہ بہت محتاط رہنا..... ہوسکتا ہے کہ اب بھی تمہارا تعاقب ہو رہا ہو۔''

''تم فکر مت کرو ریٹا..... کیا ہم فوراً آ جائیں؟''

''نہیں چار بجے تک۔'' اس نے کہا اور پھر دوسری نے رابطہ منقطع کر دیا۔

خولہ چند لمحوں تک فون کو حیرت زدہ نظروں سے گھورتی رہی تھی اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ریٹا سے اس کا رابطہ ہو گیا ہے۔ جو کچھ وہ کہہ رہی تھی اس نے اسے مزید پریشان کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ خضر پندرہ منٹ میں آفس پہنچنے والا ہے مگر بے چینی کی وجہ سے اس نے اس کا نمبر ڈائل کر لیا۔ حسب توقع فون ریسیو نہیں ہوا تھا۔ چند لمحے بعد اس کا میسج ضرور آگیا تھا۔

''پیٹیس لا رہا ہوں بھوکی حسینہ..... ٹریفک میں ہوں فون ریسیو نہیں کر سکتا۔''

خولہ نے گہری سانس لی اور فون ہاتھ سے رکھ دیا۔

☆☆☆

پی ینگ شی کی ساری زندگی بندرگاہ کے قریب موجود مچھیروں کی بستی میں گزری تھی۔ موجودہ حالات نے جہاں سب کچھ ہلا کر رکھ دیا تھا وہیں اس کی معیشت بھی زمیں بوس ہو گئی تھی۔ گھر میں اس کے علاوہ اس کے تین ذہنی معذور بچے اور شوہر موجود تھا۔ حکومت کی جانب سے ملنے والے راشن سے ان کے شب و روز جیسے تیسے گزر رہے تھے مگر پچھلی رات سے اس کے تینوں بچے بخار کا شکار تھے۔ وہ انہیں اسپتال لے جانا چاہتی تھی مگر عجیب سا خوف اس کے قدموں کی زنجیر بن رہا تھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے محلے میں سے کئی گھرانوں کے افراد اسپتال لے جائے گئے تھے اور ان میں سے چند ہی لوٹ کر آپائے تھے۔ وہ اس وقت اپنی بچپن کی دوست لی یا پانگ سے اسی بابت مشورہ کرنے آئی تھی۔

''دیکھ پی ینگ بیماری میں علاج تو کرانا ہی پڑتا ہے اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے تاکہ انہیں وائرس والا مسئلہ نہ ہو..... بخار تو یوں بھی آسکتا ہے لیکن اگر بخار تیز ہو جائے تو پھر مجبوری ہو گی۔'' لی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور ہاں تم نے انہیں ماسک وغیرہ پہنا دیا ہے اور تم اور تمہارا شوہر احتیاط کر رہے ہو نا؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں ابھی تو ماسک نہیں پہنایا؟''

''کمال کرتی ہو تم..... روز سب بتا رہے ہیں کہ یہ سب سے زیادہ ضروری ہے پھر بھی تم نے احتیاط نہ کی اور خود بھی بغیر ماسک کے یہاں چلی آئیں۔'' لی پانگ نے سرہانے پڑا ماسک چہرے پر لگاتے ہوئے کہا۔ پی ینگ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کا رویہ اس قدر سرد ہو رہا تھا کہ وہ اس سے اپنا خوف بھی بیان نہیں کر لی۔ اسے ڈر تھا کہ اس قدر رش اور افراتفری میں ٹھیک ٹھاک لوگ بھی نظر انداز ہو رہے تھے ایسے میں اس کے ذہنی معذور بچوں پر کون دھیان دے گا.....

''ٹھیک ہے لی میں چلتی ہوں۔'' وہ لاٹھی ٹیکتی ہوئی کھڑی ہو گئی تھی۔ ''ویسے تمہیں یاد ہے کہ ہم کب سے دوست ہیں کوئی چالیس سال تو ہو گئے ہوں گے نا؟''

''ہاں تینتالیس سال ہو جائیں گے اِس سال۔'' اس نے جواب دیا۔ ''یہ کیوں پوچھا تم نے؟''

''نہیں ایسے ہی..... تینتالیس سال کی محبت اور ساتھ کو ایک ماہ کا وائرس کیسے نگل گیا، یہ دیکھ رہی تھی۔'' وہ یہ کہتی ہوئی اس کے گھر سے نکل آئی۔ گھر پہنچ کر وہ ایک لمحے کو حیران ہوئی تھی۔ اسے یاد تھا کہ وہ دروازہ اچھی طرح بند کر کے گئی تھی جبکہ اس وقت دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو اسے عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا شوہر پہلے کمرے میں اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں بھیگی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے اندر جانے کے لیے قدم بڑھایا مگر اس کی آواز نے اسے روک لیا۔

''ینگ..... کمرے میں کوئی نہیں ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا۔'' اس نے مڑ کر شوہر کو گھورا پھر دوڑتی ہوئی بچوں کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہاں واقعی کوئی نہیں تھا۔ تینوں کے بستر خالی تھے۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ دوبارہ دوڑ کر کمرے سے نکلی۔

''بچے کہاں ہیں چینگ؟ میرے بچے کہاں ہیں..... جلدی بتاؤ..... وہ تو خود سے کہیں نہیں جا سکتے؟''

''ہیلتھ وزیٹرز کی ٹیم آئی تھی ینگ..... انہوں نے چیک کیا، بچوں کو بخار تو تھا ہی..... پہلا ٹیسٹ بھی پازیٹو تھا۔'' وہ دھیمے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ''وہ انہیں اسپتال لے گئے ہیں۔''

''کون سے اسپتال؟ مجھ سے پوچھے بغیر کیسے لے گئے، تم ہی بلا لیتے مجھے۔'' وہ بے حد بے چین ہو رہی تھی۔

''تم تو جانتے ہو وہ میرے بغیر نہیں رہتے، نہ کسی سے کچھ کھاتے ہیں۔''

''مجبوری ہے ینگ..... وہ کہہ رہے تھے اس طرح وائرس پھیلے گا۔ سٹی اسپتال میں لے گئے ہیں مگر ہم اُن سے مل نہیں سکتے۔'' اس کی آواز ڈوب سی گئی۔ ینگ اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ اس کا ایک ہاتھ سینے پر تھا اور آنکھوں سے

آنسو نکل رہے تھے۔

☆☆☆

ڈاکٹر جونز کا فون مسلسل بج رہا تھا۔ وہ اس وقت ایک اخبار کو عالمی مساوات کے موضوع پر انٹرویو دے رہا تھا مگر اسکرین پر نظر آنے والے نام کو دیکھ کر اس نے سب سے معذرت کی اور دفتر سے ملحق پرائیویٹ کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

''بولو مائیکل...... کیا خبر ہے؟'' اس نے فون ریسیو کرتے ہوئے پوچھا۔

''سر! آپ کا خیال بالکل درست ثابت ہوا، ہم نے اس لڑکی کے فون کو ٹریپ کرلیا تھا۔ آج ریٹا نے اس سے رابطہ کیا ہے۔''

''گڈ، تم کیا اس کی جگہ کو ٹریس کر پائے ہو؟'' ڈاکٹر جونز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''سر! اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس نے ملاقات کے لیے اپنا پورا ایڈریس لکھوایا ہے۔''

''واہ...... پھر تو اب کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے، تم جانتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور ہاں وہ اس سے ملنے نہ پائے۔'' ڈاکٹر نے سفاکی سے کہا۔

''اوکے سر...... وہ اس سے چار بجے ملے گی اور ابھی چار بجنے میں پورا ایک گھنٹا باقی ہے۔''

''شاباش مائیکل، مجھے اطلاع کر دینا۔'' ڈاکٹر جونز بولا اور مسکراتا ہوا دوبارہ آفس میں داخل ہوگیا۔

☆☆☆

''تم کچھ غیر مطمئن سے لگ رہے ہو......'' خولہ نے خضر سے پوچھا۔ وہ دونوں ریٹا کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچنے ہی والے تھے۔

''غیر مطمئن کا مسئلہ نہیں ہے مگر ایک سوچ یہ بھی آتی ہے کہ کہیں یہ کوئی چال نہ ہو...... ویسے بھی فی الحال ہم اس پر آنکھ بند کر کے بھروسا نہیں کر سکتے اسی لیے میں بیک اَپ بنا کر آیا ہوں۔'' وہ بولا۔

''مجھے نہیں لگتا کہ وہ ہمیں کوئی دھوکا دے رہی ہے۔'' وہ خوف زدہ ضرور ہے مگر ان حالات میں پھنسا کوئی بھی شخص سہما ہوا ہی ہوگا پھر وہ بالکل اکیلی ہے۔''

''تو تم کیا چاہ رہی ہو؟'' خضر نے ایک ابرو اچکا کر اس کی طرف دیکھا۔

''کچھ نہیں۔'' وہ گڑبڑا گئی۔ ''ویسے تم نے ہی تو کہا تھا کہ اس وقت وہ ہمارا واحد کلیو ہے جس سے ہمیں اس معاملے کی کچھ شد بد مل سکتی ہے۔''

''ہاں اسی لیے تو ہم وہاں جا رہے ہیں خولہ...... پھر اس نے جو کچھ فون پر کہا ہے، وہ بھی کم دھماکا خیز نہیں ہے۔ خون خرابا اور پھر پاکستان کے نام اور اس سے اس تعلق کو سمجھنا ضروری ہے...... یہ لو...... اس کا اپارٹمنٹ آگیا۔'' وہ گاڑی پارک کرتا ہوا بولا۔

یہ ایک جدید ہائی رائز بلڈنگ تھی۔ عمارت میں داخلے کے بعد ایک لمبا چوڑا سا اوپن ایریا تھا جس کے بعد ریسپشن اور پھر لفٹ اور سیڑھیاں موجود تھیں۔ اس وقت وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گیٹ پر ایک واچ مین موجود تھا۔ وہ اندر داخل ہوئے ہی تھے کہ یکدم اوپر سے کوئی تیزی سے نیچے گرتا نظر آیا۔

''ارے...... اوہ مائی گاڈ......'' خضر کے منہ سے نکلا، اس نے بے اختیار خولہ کو اپنے پیچھے کرلیا تھا۔ لمحہ بھر میں وہ دھپ کی آواز کے ساتھ ان سے کچھ فاصلے پر آگری تھی۔ وہ کوئی لڑکی تھی۔ خضر اور خولہ ایک لمحے کو بت بنے اسے گھورتے رہے پھر ایک ساتھ اس کی جانب لپکے...... اس کا چہرہ دوسری جانب تھا۔ خولہ نے اسے حتی الامکان آہستگی سے سیدھا کیا تو حیرت وخوف کے دوسرے دھچکے نے اس کے حواس اڑا ڈالے۔ وہ ریٹا تھی۔ اس کے سر اور منہ سے خون نکل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور اس کے ہونٹ دھیرے دھیرے حرکت کر رہے تھے۔

''خضر...... خضر یہ ریٹا ہے۔'' وہ بے اختیار چلّائی۔

''ریٹا...... ریٹا آنکھیں کھولو...... یہ زندہ ہے خضر...... ایمبولینس کو بلاؤ......'' وہ ہسٹریائی انداز میں بولی۔

''میں کال کر رہا ہوں۔'' خضر پہلے ہی نمبر ملا چکا تھا۔ اتنی دیر میں گارڈ اور ایک دو لوگ بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔

ریٹا کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ خولہ اس پر جھکی اور بولی۔ ''بولو ریٹا...... تم کچھ کہنا چاہ رہی ہو؟ کس نے کیا ہے یہ سب؟ کون ہے وہ؟ بولو پلیز۔''

''مم...... معاف کر دینا۔'' وہ بمشکل بولی۔

''پلیز ایسی باتیں مت کرو...... تم ٹھیک ہو جاؤ گی...... ایمبولینس آ رہی ہے۔''

اس کے الفاظ پر ریٹا کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دمکی۔ ''مشکل...... ہے۔''

''تم کچھ مت بولو......''

''بولنا ہے......'' وہ بہت ہی مدھم آواز میں بول رہی تھی۔ ''تم...... خطرہ...... وائرس...... وائرس......'' اس کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی۔ ''تمہارا...... تمہارا ملک...... خطرہ......''

"پُن...... بریڈ...... ڈاکٹر...... ڈاکٹر......" وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"ہاں، ڈاکٹر آیا ہے...... آرہا ہے ڈاکٹر ریٹا......"

خولہ نے اسے تسلی دی جواب میں اس نے مزید کچھ کہنا چاہا مگر ہونٹوں سے نکلنے والے خون اور پھر زوردار ہچکی نے اسے مزید کچھ بولنے کی مہلت نہیں دی اور وہ خولہ کے ہاتھوں میں بے جان ہو کر جھول گئی۔

"ریٹا...... ریٹا" خولہ نے اسے جھنجوڑا۔ پھر اس کی ناک کے پاس ہاتھ پھیلایا گردن پر ہاتھ رکھ کر سانس کو محسوس کرنا چاہا پھر مایوس ہو کر اسے زمین پر لٹا دیا اور خضر کی جانب دیکھا۔

"ایک منٹ...... شاید ہم اُسے پکڑ سکیں" خضر تیزی سے سیڑھیوں کی جانب لپکا، خولہ اس کے ساتھ تھی۔ اس نے لفٹ ایریا کا رخ کیا تھا۔ وہاں تین لفٹس موجود تھیں جن میں سے ایک اس وقت اوپر تھی۔ لفٹ نیچے آئی تو اس میں صرف ایک سن رسیدہ جوڑے کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ ریٹا کا فلیٹ تیسری منزل پر تھا۔ خضر اور خولہ آگے پیچھے وہاں پہنچے۔ کوریڈور میں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ خضر نے کوریڈور میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ لگا لی مگر وہاں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ دونوں تیزی سے ریٹا کے اپارٹمنٹ پہنچے۔ خضر نے اپنا ریوالور نکال لیا اور دروازے پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ اس کی توقع کے مطابق کھلا ہوا تھا۔ ہاتھ لگاتے ہی وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ دونوں محتاط انداز میں اندر داخل ہوئے۔ چھوٹے سے اپارٹمنٹ کا چکر لگانے میں انہیں ایک منٹ ہی لگا تھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا نہ ہی کہیں مزاحمت کے کوئی آثار نظر آرہے تھے۔ بیڈروم میں موجود لمبی سی کھڑکی کا شیشہ البتہ کھلا ہوا تھا۔ یہیں سے ریٹا کو نیچے دھکیلا گیا تھا۔ اس کے قریب رکھی کرسی الٹی ہوئی تھی۔ اس کرسی کے برابر میں رکھی میز پر ایک کاغذ رکھا تھا جس پر ایش ٹرے رکھا ہوا تھا۔

خضر نے جیب سے باریک دستانے نکالے۔ ایک جوڑی اس نے خولہ کی جانب بڑھا دی تھی۔ دستانے پہن کر اس نے کاغذ کو اٹھایا۔ اس پر چند ہی سطری تحریر تھیں۔

"مس ریٹا سالیوز اپنی مرضی سے اپنی جان لے رہی ہوں۔ میری زندگی میں کچھ باقی نہیں بچا ہے اور میں اس بے مقصد زندگی سے تنگ آکر اس کا خاتمہ کر رہی ہوں۔ اس کا الزام کسی اور کو نہ دیا جائے۔"

"اوہ...... یعنی انہوں نے سب کچھ اسی طرح کیا جیسے کہ وہ شخص کہہ رہا تھا۔" خولہ بڑبڑائی۔

"دیکھو شاید یہاں کوئی کام کی چیز مل جائے۔" خضر کاغذ کو اسی طرح ایش ٹرے کے نیچے رکھتے ہوئے بولا۔ دونوں نے تلاشی لینا شروع کی۔ بیڈ سائڈ، ڈریسنگ ٹیبل، میز کی درازوں، الماریوں غرضیکہ تمام جگہوں کی تلاشی کے بعد انہیں کہیں کچھ نہیں ملا۔ وہ احتیاط سے تمام چیزوں کو دیکھ رہے تھے۔ اول تو وہاں فرنیچر وغیرہ کے علاوہ ریٹا کا ذاتی سامان بہت ہی کم تھا۔ خضر نے باتھ روم کا رخ کیا۔ صاف ستھرے تقریباً غیر استعمال شدہ باتھ روم میں شیشے کے ساتھ ایک چھوٹی سی الماری موجود تھی۔ خضر نے اسے کھولا وہاں عام استعمال کی چیزوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس نے طائرانہ نظروں سے باتھ روم کا جائزہ لیا اور باہر آگیا۔

"یہاں کچھ نہیں ہے۔" اسے باہر نکلتا دیکھ کر خولہ نے مایوسی سے کہا پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ وہ کمرے سے نکلی اور لاؤنج کے ساتھ بنے چھوٹے سے کچن میں داخل ہوئی۔ اسے کسی مخصوص چیز کی تلاش تھی اور پھر وہ اسے نظر آگیا۔ نیچے سے اب ایمبولینس اور پولیس کار کے سائرن کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

"خولہ جلدی کرو......" خضر کمرے سے نکلتے ہوئے بولا۔

"ایک منٹ......" اس نے بریڈ باکس کا ڈھکن کھولتے ہوئے کہا۔ بریڈ کو اٹھاتے ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگی۔ نیچے ایک کاغذ تہ کر کے رکھا ہوا تھا۔ خولہ نے لپک کر اس کاغذ کو اٹھا کر اپنے بیگ میں ڈال لیا۔ اس کے بعد اس نے بریڈ باکس کو دوبارہ اس کی جگہ رکھ دیا۔

"خولہ......" خضر کی آواز پر وہ تیزی سے باہر کی جانب لپکی، لاؤنج میں رک کر وہ پھر مڑی اور میز پر رکھے سوسائیڈیکل نوٹ (خط) کو اٹھایا اور بیگ میں ٹھونستی ہوئی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

سٹی اسپتال یوں تو مسلسل ایک ماہ سے ایمرجنسی کی حالت میں تھا مگر اس وقت یہاں دہری ایمرجنسی ہوگئی تھی۔ اسپتال میں ایک چھبیس سالہ مریضہ کو نہایت بُری حالت میں لایا گیا تھا۔ اسے شدید بخار تھا اور تمام ٹیسٹ پوزیٹو تھے۔ وائرس اس پر بُری طرح سے حملہ آور ہوا تھا۔ اسپتال میں

سیکڑوں مریض موجود تھے مگر اس مریضہ کی خاص بات یہ تھی کہ وہ ماں بننے والی تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق ڈلیوری اسی ہفتے متوقع تھی۔ شدید بخار کی وجہ سے اب ماں کے ساتھ ساتھ بچے کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔

''آپ میرے بچے کو بچا لیجیے۔'' وہ ہر ڈاکٹر کی منتیں کر رہی تھی۔

بالآخر ڈاکٹرز نے اس کے آپریشن کا فیصلہ کیا۔ یہ آپریشن اس کے لیے نہایت خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

''یہ بات ہم آپ کی مسز کو بھی بتا چکے ہیں۔'' ڈاکٹر شین نے اس کے شوہر کو بتایا۔ ''ویسے اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی نظر نہیں آ رہا۔''

''کیا اس صورت میں ان دونوں کی زندگی کو خطرہ ہے۔'' اس نے پھر پوچھا۔

''خطرہ تو ویسے یہی ہے اور ہم سب کے لیے ہے۔'' ڈاکٹر شین بولیں۔ ''یہ صرف ایک کوشش ہے جس سے دونوں کی جان بچ بھی سکتی ہے۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر...... آپ جو مناسب سمجھتی ہیں، وہ کریں۔ میں یہاں گزشتہ ہفتے بھی آیا...... یہاں ایک ڈاکٹر تھے، ڈاکٹر شہزاد احمد...... انہوں نے مجھے سمجھایا تھا کہ ڈر کے آگے ہی جیت ہوتی ہے...... لڑنے سے پہلے ہار جانے والا شخص کبھی مشکلات سے نہیں نمٹ سکتا...... اس وقت مجھے شدید بخار تھا۔ میں خوف زدہ تھا مگر ان میں ایسی کوئی توانائی ہے کہ میں اپنا ڈر بھول گیا اور آج آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔ کیا آپ انہیں بلا سکتی ہیں؟''

''ڈاکٹر شہزاد شدید بیمار ہیں، اگر ہو سکے تو ان کے لیے دعا کیجیے۔'' ڈاکٹر شین یہ کہہ کر آپریشن تھیٹر کی طرف بڑھ گئیں۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد آپریشن تھیٹر کا دروازہ ایک بڑے ''واؤ'' کے ساتھ کھلا تھا۔

''امید زندہ ہے، امید زندہ رہے گی......'' باہر نکلنے والی ایک ینگ ڈاکٹر گنگناتی ہوئی باہر آئی تھی۔

''میری بیوی ٹھیک ہے؟'' مریضہ کے شوہر نے بے چینی سے پوچھا۔

''وہ بھی بہتر ہیں۔ انہیں آئی، سی، یو میں بھیج دیا گیا ہے۔ بچہ بالکل نارمل ہے۔ اسے بخار بھی نہیں ہے اس لیے اس کی دیکھ بھال الگ نرسری میں کی جا رہی ہے۔'' اس نے بتایا۔ اس بچے کی ولادت نے پورے اسپتال میں مسکراہٹ کی دمک پھیلا دی تھی۔ جنہوں نے اس بچے کو دیکھا بھی نہیں تھا، وہ بھی ایک دوسرے کو مبارک بادیں دے رہے تھے۔

آپریشن تھیٹر کے باہر بھیڑ لگ گئی تھی پھر جیسے یکدم بادل سورج کو چھپا لیتے ہیں اسی طرح منظر بدل گیا۔

ڈاکٹر شین کے فون کی گھنٹی بجی تھی۔

''ہیلو...... ہاں میں تھیٹر کے باہر ہوں...... تم بتاؤ...... کیا میری ضرورت ہے وہاں؟'' وہ ایک لمحے خاموش رہی تھیں پھر قدرے بلند آواز میں پوچھا۔ ''کیا......؟ اوہ...... ویری سیڈ......'' اتنا کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔ ان کے چہرے پر دکھ کا سایہ لہرا گیا تھا۔

''کیا ہوا ڈاکٹر......؟''

''ڈاکٹر شہزاد......'' وہ دھیرے سے بولیں۔ ''ڈاکٹر شہزاد نہیں رہے۔''

اس خبر نے ان سب کو اداس کر دیا تھا۔ پیدا ہونے والے بچے کا باپ بھی ان کے برابر ہی کھڑا تھا۔

''سیڈ نیوز...... بہت اچھے انسان تھے وہ...... میں اپنے بیٹے کا نام ان کے نام پر رکھوں گا...... وہ شہزاد لی ہوگا اور بڑا ہو کر ڈاکٹر بنے گا۔''

ڈاکٹر شین کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''واقعی امید زندہ رہتی ہے، امید زندہ ہے۔''

ڈاکٹر شہزاد کی حالت ایک روز پہلے ہی بہت خراب ہو چکی تھی مگر پھر بھی ان کی موت کی خبر نے سٹی اسپتال میں سوگ کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ وائرس کے خلاف انہوں نے ایک لمبی اننگ کھیلی تھی اور بالآخر وائرس ان کی زندگی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ حکومت نے ان کی تدفین سے قبل ہی انہیں خدمت گزاری کا ایوارڈ دینے کا اعلان کیا جبکہ نیشنل ہیلتھ کونسل نے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر وائرس سے متعلق نئے اسپتال کو ان کے نام کے ساتھ منسلک کر دیا تھا۔

وائرس کسی سونامی کے مانند تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا۔ اب صوبے کے زیادہ تر شہر اس کا نشانہ بن چکے تھے۔ صوبے کو دیگر صوبوں اور ملکوں سے مکمل طور پر کاٹ دیا گیا تھا مگر وہاں سے سفر کرنے والے بے شمار افراد دنیا بھر کے ممالک میں پھیل چکے تھے اور یوں وائرس بین الاقوامی طور پر وائرل ہو چکا تھا۔ اس کے اثرات اتنی تیزی سے پھیل رہے تھے کہ خوابِ خرگوش کے مزے لیتی اقوامِ متحدہ کا صحت سے متعلق ادارہ بھی بالآخر جاگ اٹھا اور اس نے اس وائرس کو دہشت گردی سے بھی بڑا خطرہ قرار دے دیا تھا۔

☆☆☆

خضر اور خولہ سامنے میز پر رکھے کاغذ کے اس صفحے کو گھور رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں تناؤ تھا اور دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ ’’یہ کیسے ہوسکتا ہے؟‘‘ بالآخر خولہ بولی۔ ’’آج کے دور میں لوگ اس طرح بھی سوچ سکتے ہیں؟‘‘

’’کیوں نہیں ہوسکتا؟‘‘ خضر نے تلخ لہجے میں کہا۔ ’’یہ کوئی پہلی بار تو نہیں ہوا، امیر اقوام ہمیشہ سے غریب قوموں پر تجربات کرتی آئی ہیں۔ البتہ یہ پہلی بار ہو رہا ہے کہ قوم پرستی کے جنون میں پوری پوری قوموں کو ہی صفحہ ہستی سے مٹا دینے کا انتظام کیا جا رہا ہو اور وہ بھی اس طرح کہ معلوم بھی نہ ہو کہ کون کیوں مارا جا رہا ہے۔‘‘

’’تم ٹھیک کہہ رہے ہو...... انسانیت اب شاید صرف کتابوں میں ہی رہ گئی ہے۔‘‘ خولہ نے میز پر رکھے صفحے کو اٹھایا اور ایک بار پھر پڑھنے لگی۔

’’ڈیئر خولہ! اگر یہ خط تمہارے ہاتھ میں ہے تو اس کا مطلب یہ ہی ہوسکتا ہے کہ میں اس دنیا سے جا چکی ہوں۔ تم نے مجھ سے اس روز کئی بار اصل مسئلے کے بارے میں پوچھا تھا مگر مجھے یوں لگا تھا کہ زیادہ جاننا تمہیں بھی خطرے کی اس منزل پر لے جائے گا جہاں آج میں کھڑی ہوں اسی لیے میں وہاں سے بھاگ آئی تھی۔ اب جب میں نے اس سب کا نتیجہ بھی دیکھ لیا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ اس معلومات کو کسی نہ کسی بااعتماد شخص تک پہنچانا بے حد ضروری ہوگیا ہے۔ خولہ میرا باس ڈاکٹر جونز درحقیقت ایک سفید فام نسل پرست تنظیم کا سربراہ ہے۔ وہ اور اس کے دوستوں کے مطابق اس دنیا میں جینے اور اس کے وسائل سے فائدہ اٹھانے کا حق صرف اور صرف ہم سفید فاموں کے پاس ہے۔ اسی لیے انہوں نے خاصی تحقیق اور ریسرچ کے بعد ایک وائرس تیار کیا ہے۔ اس وائرس کی کامیابی کے لیے اس پر بہت سے تجربات کیے گئے تھے اور اب اسے لانچ کر دیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم سمجھ گئی ہوگی۔ دنیا میں تباہی پھیلاتا یہ نیا وائرس نہیں...... بلکہ ایک ہتھیار ہے۔

اسے ان قوموں کو ختم کرنے کے لیے استعمال کیا جائے گا جنہیں سفید فام نسل پرست دنیا کے نئے نقشے میں نہیں دیکھنا چاہتے۔ ان میں پہلے نمبر پر سب سے زیادہ آبادی والا ملک ہے۔ اسے زک پہنچانا تجارتی بنیادوں پر بھی بہت ضروری تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور تمہارا ملک

باس! بے چارے کو معاف کردو، تنخواہ بڑھانے کے لیے نہیں، آدھے دن کی چھٹی کے لیے گڑگڑا رہا ہے۔

ہاہاہا...... میرا نام؟ پیٹر عرف سامی عرف شوکی عرف بنی عرف بوچ عرف ہیری......

ایٹمی طاقت ہونے کی وجہ سے سرفہرست ہے — میرے دل پر بہت بوجھ ہے۔ میں ایسے لوگوں کے ساتھ کام کرتی رہی۔ میری آنکھوں کے سامنے انسان تجربات کی بھینٹ چڑھتے رہے اور میں اسے انسانیت کی وسیع تر خدمت اور مفاد سمجھ کر خاموش رہی۔ شاید اسی لیے میرے ساتھ یہ سب ہو رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے لوگوں کو بچا سکو گی۔‘‘

اب سب کچھ سمجھ میں آرہا تھا۔ مرتے وقت اس نے جو الفاظ کہے تھے، ان کا یہ مطلب تھا اور ڈاکٹر سے مراد مدد نہیں، یہ ڈاکٹر تھا۔ خولہ چند لمحوں بعد بولی۔ ’’خضر ہمیں اس

کی اطلاع پولیس کو دینی چاہیے فوراً تاکہ اس ہونے والی تباہی کو روکا جاسکے۔''
''خولہ اگر یہ سب اتنا آسان ہوتا تو کیا ریٹا یہ سب نہیں کرسکتی تھی؟'' خضر نے اس کی جانب دیکھ کر دھیمے لہجے میں پوچھا۔
''کیا مطلب؟''
''مطلب یہ کہ وہ تمام حقائق سے آگاہ تھی۔ یقیناً اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اسے قتل کردیا جائے گا۔ اس کے باوجود اس نے پولیس کو مطلع نہیں کیا۔ کیوں؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ تنظیم کی طاقت سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ پولیس اس کے لیے کچھ نہیں کر پائے گی۔ اگر یہاں کے کسی ادارے سے بات کرنے میں خطرہ نہ ہوتا تو وہ تمہارے نام یہ خط لکھنے کے بجائے ان سے بات کرتی۔''
خضر نے نہایت باریک بینی سے تجزیہ کیا تھا۔
''تمہارا مطلب ہے کہ یہاں سب آپس میں ملے ہوئے ہیں؟''
''سب کا تو نہیں کہہ سکتے مگر یقیناً ہر ادارے میں ان کے لوگ موجود ہوں گے۔ میں تو ان کا پلان سن کر ہی لرز گیا ہوں۔ ترقی یافتہ ممالک جہاں ڈیزاسٹر مینجمنٹ کا پلان اوز پریکٹس ہوتی ہے، وہ جس وائرس کے معاملے میں پریشان ہیں تو اپنے ملک میں تو معاملات اتنے اچھے ہیں بھی نہیں...... اگر یہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گئے تو واقعی انہیں مزید بھی ہتھیار کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''
''دامن پر کوئی چھینٹ نہ خنجر پر کوئی داغ...... تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو'' خولہ بڑبڑائی۔
''واہ خولہ پہلی بار بالکل برمحل شعر لائی ہو۔'' خضر پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔
''تو پھر اب ہم کیا کریں گے؟'' خولہ آداب بجا لانے کے بعد بولی۔
''میرے ذہن میں ایک پلان ہے۔ ہمیں اس کے لیے کرنل حارث سے بات کرنا ہوگی۔''
''کرنل حارث...... یہ کہاں ہوتے ہیں؟'' خولہ نے پوچھا۔
''پاکستان میں ہوتے ہیں۔'' خضر اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''یہ آرمی کے کمانڈو گروپ میں تھے اب کسی ایجنسی کے ساتھ کام کررہے ہیں۔ میرے بہت اچھے دوست اور مربی رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں انہیں اس بارے میں بتانا چاہیے۔''

''ہاں ٹھیک ہے...... یہ ایک بڑا معاملہ ہے اور اس کے لیے ہمیں کسی ذمے دار ادارے کی مدد لینے کی ضرورت ہے۔'' خولہ نے سر ہلایا۔ ''تو پھر تم ان سے کب بات کرو گے؟''
''ابھی...... یہی مناسب وقت ہے۔'' خضر نے اپنا فون اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اوہو اس کی چارجنگ بالکل ختم ہے۔ کسی بھی وقت بند ہو جائے گا، تم مجھے اپنا فون دو۔'' وہ نمبر نکالتے ہوئے بولا۔
''یہ لو۔'' خولہ نے سیل اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے اعصاب پر اب تک ریٹا کے قتل کی وجہ سے بہت بوجھ تھا۔ ورنہ چارجنگ کا اس طرح ختم پایا جانا ایک چھوٹی موٹی جنگِ عظیم کی وجہ تو بہرحال بن سکتا تھا۔

☆☆☆

مائیکل اس وقت اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا ساتھی ایڈورڈ بھی تھا۔
''تم نے باس کو خبر کردی؟'' ایڈورڈ نے اس کی جانب کافی کا مگ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
''ہاں، میسیج کردیا ہے۔ یہ لو تھنک آف دی ڈیول اینڈ ڈیول از ہیئر (شیطان کو یاد کیا، شیطان حاضر) وہ فون کے بج اٹھنے پر اسکرین کو دیکھتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے فون کان سے لگالیا۔
''جی سر...... سب بحسن و خوبی ہو گیا۔ اس نے مزاحمت کی ہی نہیں...... یوں لگ رہا تھا جیسے اسے اپنے انجام کا انتظار ہو۔'' وہ اپنی ہی بات پر قہقہہ مار کر ہنسا۔
''کیا تم نے اس سے خودکشی کے بارے میں نوٹ نہیں لکھوایا تھا، میں نے تو اس کام کی تاکید کی تھی؟'' دوسری طرف سے ڈاکٹر جونز کی سرد آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔
''میں نے لکھوایا تھا سر اور پھر بالکل سامنے میز پر رکھ دیا تھا تاکہ پولیس کی نظر سب سے پہلے اس پر پڑے۔ اس پر ایش ٹرے بھی رکھ دی تاکہ وہ اِدھر اُدھر اُڑتا نہ پھرے۔''
''مسئلہ یہ ہے مائیکل کہ پولیس کو وہاں کوئی نوٹ نہیں ملا۔ دفتر سے کچھ آفیسرز آئے تھے اور وہ اس بارے میں تفتیش کا آغاز کررہے ہیں کہ یہ خودکشی ہے یا قتل...... وہ اس کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے تھے۔ اس حوالے سے دفتر آپہنچے تھے۔''
''سر میں نے نوٹ لکھوایا تھا۔ اس ذرا سی دیر میں

وہ نوٹ غائب نہیں ہوسکتا۔'' مائیکل نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''یہی سوچنے کی بات ہے۔ تمہارے بعد اس اپارٹمنٹ میں پولیس بھی آئی ہوگی اور انہیں وہ نوٹ نہیں ملا۔''

''سر وہ دونوں بھی وہاں پہنچے تھے۔ میں تو خیر ونیلا کے اپارٹمنٹ میں چلا گیا تھا اور پولیس کے جانے کے بعد وہاں سے نکلا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ لڑکی اور اس کا ساتھی اس کے اپارٹمنٹ میں بھی گئے ہوں۔''

''ممکن ہے۔'' ڈاکٹر جونز نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔''اس لڑکی کا فون ریکارڈ تمہارے پاس جمع ہو رہا ہے۔''

''جی، اس کی ہر کال ریکارڈ ہو رہی ہے۔'' مائیکل نے جواب دیا۔

''ریٹا کی موت کے بعد سے اب تک اس کے فون سے کتنی کالز ہوئی ہیں؟'' ڈاکٹر نے اچانک سوال کیا۔

''میں ابھی چیک کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔'' مائیکل گڑبڑا گیا۔

''یعنی تم اسے مانیٹر ہی نہیں کر رہے ہو؟'' ڈاکٹر غرایا۔

''کچھ دیر پہلے ہی واپس لوٹا ہوں سر......''

''فی الحال اس پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے اور اگر کچھ خاص معلوم ہو تو مجھے بھی اطلاع کر دینا۔'' اتنا کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ باس واقعی شیطان ہے۔'' وہ فون ٹیبل پر رکھ کر سامنے رکھے کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''پھر تو محتاط رہو، ایسا نہ ہو کہ وہ تمہاری یہ بات بھی سن لے۔'' ایڈورڈ مسکرایا۔

''یہ ایک لمبے فاصلے والی کال ہوئی ہے۔'' وہ چند لمحے بعد بولا اور کانوں پر ہیڈفون لگا لیا۔ چند گھنٹیوں کے بعد کسی مرد کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

''یس کرنل حارث ہیئر۔''

''حارث میں خضر بول رہا ہوں۔''

''اوہ ڈاکٹر خضر......کیسی جا رہی ہے تمہاری کرمنالوجی اور ایجنسی؟'' دوسری طرف سے خیر خیریت کے بعد سوال کیا گیا۔

''بڑھیا ہے سب......اس وقت ہم یہاں ایک مسئلے میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ انفرادی نوعیت کا یہ مسئلہ اب قومی ایشوز سے متعلق ہوتا نظر آ رہا ہے۔'' وہ اسے ریٹا سے ملاقات اور پھر اس کے قتل کی مختصر رُوداد سناتا ہوا بولا۔ ''اس نے خولہ کے لیے جو خط چھوڑا تھا، وہ میں آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اس نے مرتے ہوئے بھی غیر مبہم انداز میں یہی باتیں کی تھیں اور جو کچھ اردگرد ہو رہا ہے، وہ بھی اس کی سچائی کی عکاسی کرتا ہے۔''

''تم مجھے وہ خط بھیج دو......ہم نے بھی ایسی کچھ غیر مصدقہ رپورٹیں دیکھی ہیں مگر تم جو کہہ رہے ہو، یہ تو نیشنل ایمرجنسی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنا کام شروع کر چکے ہو گے۔ بہت محتاط رہو اور میرے فون کا انتظار کرو۔'' اس کے بعد کال بند ہو گئی تھی۔

مائیکل نے ہیڈفون اتار کر ایڈورڈ کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

''کیا ہوا ہے مائیکل......'' ایڈورڈ نے پوچھا۔ مائیکل نے جواب میں ہیڈفون اس کی جانب بڑھا دیا۔

☆☆☆

وہ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی عمر پینتالیس پچاس کے درمیان نظر آ رہی تھی۔ اس کے سامنے خصوصی میز پر لیپ ٹاپ رکھا ہوا تھا جس کی اسکرین روشن تھی۔ اس پر ایک مختصر سی ڈاکومینٹری چل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کافی کا مگ تھا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ مارگریٹ میری وڈ تھی۔ وہ صحافی تھی۔ پبلک ریلیشن کی مہارت اس کی خصوصیت تھی۔ اسے ہیرو کو زیرو اور زیرو کو ہیرو بنانا آتا تھا۔ متاثرہ ملک میں اس کے نوجوان رپورٹرز کی ٹیم اپنا کام کر رہی تھی اور وہ اس کام کو دنیا بھر میں دکھا رہی تھی۔

انٹرنیشنل میڈیا پر ڈاکٹر شہزاد احمد کی موت کے حوالے سے بنائی جانے والی ڈاکومینٹری وائرل ہو گئی تھی جس میں ان کی خدمات اور ان کی زندگی میں حکومت کے ان کے ساتھ رویے کی تفصیل پیش کی گئی تھی۔ ان کی گرفتاری کو بریکنگ نیوز بنا کر پیش کیا گیا تھا اور حکومت کے معاملات دبانے کی کوشش کو بالواسطہ طور پر ہزاروں افراد کی موت اور دنیا بھر کو وائرس کے خطرے میں دھکیلنے کا ذمے دار ٹھہرایا جا رہا تھا۔ بیرونِ ملک تو اس پر بہت بات ہو رہی تھی مگر مقامی طور پر بھی پورے ملک میں اس سب پر کھل کر بات ہو رہی تھی۔ لوگ فیصلوں اور ان پر عملدرآمد کے طریقوں پر سوشل میڈیا پر بھی بول رہے تھے۔ بے چینی بڑھ رہی تھی اور اسے صرف یہ ہی کرنا تھا۔

☆☆☆

جیکی کو اسپتال میں داخل ہوئے آج نواں دن تھا۔ اسے ٹمپریچر کی وجہ سے یہاں لایا گیا تھا۔ کیے جانے والے مختلف ٹیسٹ کے مطابق وہ اب ٹھیک تھی مگر پالیسی کے مطابق اسے کم از کم پندرہ دن یہاں اس اسپتال کے ہر طرف سے بند بورنگ کمرے میں گزارنے تھے۔ وہ یہاں سے نکلنا چاہ رہی تھی اور کئی بار ڈاکٹرز سے بحث بھی کر چکی تھی لیکن حکومت کی پالیسی تھی کہ ہر متاثرہ شخص کو پندرہ دن تک زیر مشاہدہ رکھا جائے گا۔ ''اگر تم ٹھیک رہیں اور کوئی نئی علامتیں نظر نہ آئیں تو تم گھر جا سکو گی۔''

''میرا گھر جانا ضروری ہے میرے والدین اور بہن بھائیوں کو میری ضرورت ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے انہیں کتنے ہی دنوں سے نہیں دیکھا۔ انہیں یہاں آنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔'' وہ غصے سے بولی۔

''تو یہ ان کے مفاد میں ہے۔ کیا تم یہ چاہتی ہو کہ وہ بھی بیمار ہو جائیں۔ ہم ایک بڑی ایمرجنسی سے گزر رہے ہیں۔ اسے سمجھنا ہوگا اور اپنے اور دوسروں کی بہتری کے لیے اصولوں پر چلنا ہوگا۔'' ڈاکٹر نے سرد لہجے میں کہا۔

''مگر آپ جانتی ہیں کہ میں ٹھیک ہوں۔ یہاں بہت سارے مریض ہیں جنہیں اسپتال میں جگہ ہونے کا انتظار ہوگا، آخر اصول انسانوں کے لیے بنتے ہیں، انہیں بہتر کیا جا سکتا ہے۔''

''جیکی میرے پاس بہت کام ہے اس وقت تم یہ دوا لو اور چپ چاپ سو جاؤ۔'' ڈاکٹر یہ کہہ کر باہر نکل گئی۔

جیکی چند لمحے ہوا میں دیکھتی رہی، اس نے ہتھیلی پر رکھی گولیوں کو نگلا اور بستر پر بیٹھ گئی۔ غصہ اس کے اندر ابل رہا تھا۔ ''اسے اس وائرس نے نشانہ بنا لیا تھا، اس میں اس کی غلطی تو نہیں تھی۔'' اس نے سوچا مگر ان لوگوں نے اسے اس جیل میں لا کر بند کر دیا تھا۔ اسے اپنے گھر والوں کی یاد ستا رہی تھی۔ کون جانے وہ سب کس حال میں ہوں۔ وہ اب یہاں نہیں رکے گی، اس نے فیصلہ کیا اور بستر سے کھڑی ہو گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ کمرے سے باہر تھی۔ اسپتال میں ہر طرف رش لگا ہوا تھا۔ دھیمی دھیمی آوازوں نے گویا ایک صوتی جال سا بنایا ہوا تھا جو کان کے قریب بھنبھنا سا رہا تھا۔ جیکی کے چہرے پر ماسک تھا۔ اس کے اردگرد چلنے پھرنے والے ہر بوڑھے، بچے، عورت، جوان، ڈاکٹر سب کے چہرے ماسک سے چھپے ہوئے تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے مگر تیز قدموں سے چلتی اسپتال سے باہر آ گئی۔ کسی کو بھی اس پر ذرا بھر بھی شک نہیں ہوا تھا۔ اس کے پاس پیسے نہیں تھے مگر سڑک پر ایک خاتون سے لفٹ مل گئی تھی۔ انہوں نے اسے اس کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر اتار دیا تھا جہاں سے وہ پیدل اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ اسے اپنے ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائی کی یاد آ رہی تھی۔ وہ دو بہنیں اور ایک بھائی تھے۔ ان کا خیال آتے ہی اس کے قدموں میں گویا نئی جان پڑ گئی۔ وہ سب اسے دیکھ کر کتنا خوش ہوں گے۔ اس نے سوچا اور تقریباً دوڑتی ہوئی اپنی گلی میں داخل ہوئی۔ دروازہ اس کی ماں نے کھولا تھا۔

''مام میں ہوں جیکی۔'' انہوں نے اسے لپٹا لیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''تم ٹھیک ہو گئیں؟'' انہوں نے اس کے سر اور چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''بالکل ٹھیک ہوں مام...... جونز...... چی چو اور ڈیڈ...... کہاں ہیں سب لوگ؟'' وہ بے چینی سے نظریں دوڑا کر بولی۔

''وہ یہاں نہیں ہیں۔''

ماں کے جواب نے اس کے وجود میں شعلے سے بھر دیے۔ ''پھر کہاں ہیں وہ؟ کیا ہوا ہے؟ مام بولیے تو......''

''تمہارے جانے کے دو دن بعد چی چو اور ڈیڈ کو بخار آ گیا تھا۔ انہیں اسپتال لے جانا پڑا تھا۔'' وہ اتنا کہہ چپ سی ہو گئیں۔

''اب...... اب کیا وہ اسپتال میں ہیں؟ کون سے اسپتال میں مام اور جونز...... وہ کہاں ہے؟''

''چی چو اور جونز دونوں اسپتال میں ہیں جیکی۔''

''اور ڈیڈ؟''

''وہ ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔'' وہ بالآخر بولیں۔ ''وہ جانبر نہیں ہو سکے۔''

''مام...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو بالکل ٹھیک تھے۔'' جیکی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وائرس نے اس کے گھر کو تباہ کر دیا تھا۔

''ہاں مگر ان کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔'' وہ بے بسی سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''وہ تمہارے جانے کے بعد سے روزانہ اسپتال کے باہر جا کر بیٹھ جاتے تھے۔ ملنے کی اجازت تو تھی نہیں...... شاید وہیں سے اس وائرس نے انہیں شکار بنا لیا۔'' وہ بے اختیار رونے لگیں۔

جیکی نے چند لمحے خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھا پھراُن سے لپٹ گئی۔ وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔

☆☆☆

مائیکل، ڈاکٹر اسٹیفن جونز کے سامنے کھڑا تھا۔ ڈاکٹر کے کانوں پر ہیڈفون موجود تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے ہیڈفون کو میز پر پٹخ دیا۔

''ریٹا...... کاش میں اُسے اس دن واپس ہی نہیں جانے دیتا۔ وہ سفید فام ضرور تھی مگر اس کی سوچ میں کم نسلی کی ملاوٹ نظر آتی ہے...... کاش یہ میں پہلے سمجھ جاتا تو ہمارے اگلے تجربے کی شکار وہ ہی ہوتی۔'' اس نے ایک ہاتھ کا مُکا دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارتے ہوئے کہا۔ ''وہ مرتے مرتے بھی ہمارے لیے مسائل کھڑے کر گئی۔''

''اب سوچنے کی بات یہ ہے ڈاکٹر کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔'' دوسرے صوفے پر ان کی تنظیم کا نائب صدر چارلس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ایک موٹا اور پستہ قامت شخص تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں میں بے چینی سے حرکت کر رہی تھیں۔

''ان دونوں کا خاتمہ۔'' ڈاکٹر نے حتمی انداز میں کہا۔

''مگر بات باہر نکل چکی ہے۔ یقیناً اب ان کی ایجنسیاں محتاط ہو جائیں گی اور ہمیں اس طرح کھل کر کھیلنے کا موقع نہیں ملے گا۔ یہاں بھی تنظیم کو مشکلات کا سامنا ہو سکتا ہے۔ ہمارے پاس بہترین سرپرست اور اسپانسرز ہیں مگر ڈاکٹر یہ سب تب تک ہے جب تک کوئی خطرہ سامنے نہیں آ جاتا۔ اگر معاملہ بگڑا تو یہ سب ہمارے مقصد کو چھوڑ کر بھاگنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔'' چارلس نے سنجیدگی سے کہا۔

''مگر ان کے پاس ہمارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ریٹا کوئی بیان ریکارڈ نہیں کروا پائی تھی، ایک خط بہرحال ثبوت نہیں ہو سکتا۔ وہ یہاں ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، میں انہیں اس قابل ہی نہیں چھوڑوں گا۔ ہم نے یہاں تک پہنچنے کے لیے بہت محنت کی ہے اور اب میں کسی براؤنی کو اس سب کو تباہ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔'' ڈاکٹر جونز غرایا۔

''تو اب ہمارا پہلا قدم کیا ہوگا؟'' چارلس نے پوچھا۔

''چارلس پلیز تم گلوریا، میری، ولیم اور فرینکی کو اطلاع کر دو۔ صبح انہیں ہنگامی بنیادوں پر ملنا ہوگا۔ اس کے بعد اپنی حکمتِ عملی طے کرلیں گے۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''اور ڈاکٹر......''

''مائیکل تم اور ایڈورڈ تیار ہو جاؤ۔ ہمیں فوری ایکشن کی ضرورت ہے۔''

''اوکے سر۔'' مائیکل نے سر ہلایا۔

☆☆☆

کرنل حارث نے دو گھنٹے بعد ہی ان سے رابطہ کرلیا تھا۔ اس بار ان کا پیغام خضر کے نمبر پر آیا تھا۔

''تم نے کام شروع کر دیا ہے، معاملات واقعی گڑبڑ ہیں۔ میں تم لوگوں کے پاس پہنچ رہا ہوں۔ اس وقت تک تم لوگوں کو بہت محتاط انداز میں کام کرنا ہوگا۔ ہم ڈاکٹر جونز کے بائیو ڈیٹا پر کام کر رہے ہیں، تم بھی چاہو تو معلومات شیئر کر سکتے ہو۔ میں وہاں پہنچتے ہی تم سے رابطہ کروں گا۔''

☆☆☆

خضر اور خولہ کافی دیر مصروف رہے تھے۔ ان کے پاس اب ڈاکٹر جونز اور اس تنظیم کے بارے میں خاصی معلومات جمع ہو چکی تھیں مگر حاصل ہونے والی تمام معلومات ان کی حقیقی سرگرمیوں اور مشن کے بارے میں کوئی خاص روشنی ڈالنے کے قابل نہیں تھیں۔

''خضر اس بارے میں کہیں کچھ ریکارڈ پر نہیں ہے۔'' خولہ بولی۔ ''سوائے اس کے کہ ڈاکٹر اسٹیفن جونز طالب علمی کے زمانے سے ہی نسل پرستی کے حوالے سے مصروف رہا ہے۔''

''ہاں...... مگر ہم اس کی توقع بھی نہیں کر سکتے۔'' خضر نے اسکرین پر سے نظر ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''ان کے بارے میں صحیح جانکاری کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ان کے کام کرنے والوں میں سے کسی تک پہنچ جائیں۔''

''مگر یہ کس طرح ہوگا خضر؟''

''اسی طرح جیسے وہ سارے کام کرتے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''ہمیں کل ان کے دفتر کی نگرانی کرنا ہوگی۔ یہ معلوم کرنا ہوگا کہ وہاں کون کون کیا کرتا ہے تب ہی ہم کسی درست فیصلے تک پہنچ پائیں گے۔''

''اور یہ کس طرح ہوگا؟''

''میں کل ورلڈ پیس آرگنائزیشن کے دفتر جاؤں گا

ایک صحافی بن کر...... تمہیں میں وہاں نہیں بھیج سکتا، وجوہات تم اچھی طرح جانتی ہو۔ تم باہر گاڑی میں میرا انتظار کروگی۔''

'اوکے......!'' خولہ نے سر ہلایا۔ ''چلو پھر گھر چلتے ہیں۔ کل ہمیں کام کا آغاز صبح سے ہی کرنا ہوگا۔''

وہ پانچ منٹ میں دفتر سے نکل گئے تھے۔ خضر کی گاڑی پارکنگ میں موجود تھی۔ وہ دونوں لفٹ سے پارکنگ ایریا میں پہنچے۔ پارکنگ میں کافی گاڑیاں موجود تھیں مگر ہمیشہ کی طرح پارکنگ ویران پڑی تھی۔ لفٹ سے نکل کر وہ کار کی طرف جانے کے لیے تھوڑا آگے گئے ہی تھے کہ اچانک خولہ کو کچھ نظر آیا۔ وہ ٹھٹک کر رکی اور پھر اس نے خضر کو زوردار دھکا دیا۔ خضر اس اچانک پڑنے والی افتاد کے لیے تیار نہیں تھا، وہ پلر سے ٹکرایا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔ خولہ خود بھی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی تھی اور اس نے جیب سے اپنا ٹورس جی 2 سی نکال لیا تھا۔

''کیا ہوا ہے خولہ؟'' خضر کو خولہ کے کچھ کہنے سے قبل ہی اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ ایک بے آواز گولی شائیں سے اس کے سر کے اوپر سے گزری تھی۔

''اس طرف کوئی ہے۔'' خولہ نے داہنی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس نے سیاہ ماسک پہن رکھا ہے۔''

''ہوں۔'' خضر بولا۔ اب اس کا بریٹا 92 بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ایک دوسرے کو کور کرتے ہوئے تیزی سے آگے کھسک رہے تھے۔ وہ اپنی گاڑی سے تھوڑا ہی دور تھے۔ اچانک بائیں جانب سے دوبارہ کئی فائر کیے گئے تھے۔ وہ دونوں ایک گاڑی کے پیچھے دبک گئے۔ فائر سائلینسر لگی گن سے کیے جا رہے تھے جس کی وجہ سے کسی کے اس طرف متوجہ ہونے کے امکانات نہیں تھے۔

''دائیں طرف بھی ہیں۔'' خضر نے سرگوشی کی۔ اب ان کی گاڑی بالکل سامنے تھی۔ ''تمہارا ٹارگٹ اپنی گاڑی تک پہنچنا ہے۔'' وہ چابی خولہ کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں یہاں دوسری طرف جاؤں گا اور وہاں ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کراؤں گا، تم اس دوران میں گاڑی اسٹارٹ کر کے تیزی سے یہاں پہنچوگی۔ یہاں پہنچ کر پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول دینا۔''

''یہ کئی افراد ہیں خضر۔'' خولہ نے قدرے پریشانی سے کہا۔ ''تم انہیں کیسے سنبھالوگے؟''

''ہوجائے گا۔ فکر نہ کرو، ڈھول ماہیا...... بس تم مجھے بھول کر سیدھی مت نکل جانا۔'' وہ ایک آنکھ دبا کر مسکرایا۔

''میں کوئی پاگل ہوں۔'' اس نے غصے سے اسے گھورا۔

''نہیں پاگل تو ہم ہیں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا اور آگے کی جانب کھسک گیا۔ خولہ نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر چاروں طرف نظر گھمائی۔ پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ بڑی سیاہ گاڑی کے پیچھے پہنچ گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے داہنی سمت فائر کیا۔ اس فائر کے فوراً بعد سیاہ گاڑی سے کئی فائر کیے گئے۔ اس گاڑی پر توجہ نے انہیں اس سمت سے تھوڑا سا بے پروا کر دیا تھا۔ خولہ پوری طرح چوکس تھی۔ اچانک اسے بائیں جانب سے کوئی کالی گاڑی کی پشت پر سرکتا نظر آیا۔ اس نے بے چینی سے گاڑی کی جانب دیکھا۔ پھر سائے کی جانب اندازے سے نشانہ لگایا اور ٹریگر دبا دیا۔ فائر کی تیز آواز کے ساتھ ہی ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی۔

''فرسٹ وکٹ ڈاؤن۔'' وہ مسکرائی۔ وہ جانتی تھی کہ خضر اس کی اس حرکت پر دانت پیس رہا ہوگا مگر وہ اسے خطرے میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس فائر کے جواب میں دو خاموش فائر کیے گئے تھے۔ خولہ بڑی گاڑی کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ ٹائر کے ساتھ سرکتی ہوئی آگے بڑھی، اچانک پھٹ کی آواز آئی اور پھر کسی کے دھپ سے گرنے کی آواز نے اسے ساکت سا کر دیا۔ اس نے ذرا فاصلے پر سیاہ گاڑی کی جانب دیکھا پھر زمین پر لیٹ گئی۔ گاڑی کے نیچے سے اسے خضر کے جوتے نظر آ رہے تھے، اسے تسلی سی ہوئی۔ اس نے پھر اپنی گاڑی کی جانب سرکنا شروع کیا۔ وہ اب کار کے دروازے کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اب بھی اس کے اندازے کے مطابق دو سے تین افراد وہاں موجود تھے۔ چند لمحوں سے بالکل خاموشی تھی جس کا مطلب یہ ہوسکتا تھا کہ وہ بھی کسی حکمتِ عملی پر کام کر رہے تھے۔ خولہ دو لمحے دروازے کے پاس ساکت پڑی رہی پھر اس نے لاک گھمایا۔ لاک کھلنے کے بعد وہ تیر کی سی تیزی سے دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ اس ایک لمحے میں گاڑی پر کئی فائر ہوئے تھے۔ وہ آس پاس کی گاڑیوں سے ٹکراتی تیزی سے آگے بڑھی۔ سیاہ کار کے پاس پہنچ کر اس نے ایک راؤنڈ سا کھایا۔ اس دوران وہ پسنجر سیٹ کا درواز

کھول چکی تھی۔ فضا میں اب فائرنگ کی آواز گونج رہی تھی۔ خضر مسلسل فائر کررہا تھا۔ گاڑی قریب آتے ہی وہ جست لگا کر سیٹ پر بیٹھ گیا اور کھلے دروازے سے نشانہ لگایا۔ اس بار پارکنگ لاٹ میں ایک زوردار چیخ گونجی تھی۔

خولہ کار کو گاڑیوں اور پارکنگ لاٹ میں موجود پلرز کے درمیان گھماتی ہوئی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اب وہ انڈر گراؤنڈ پارکنگ سے باہر آنے والے راستے پر تھی۔ انہیں گاڑی پر لگنے والے فائر صاف محسوس ہورہے تھے۔

''اوہ......شٹ......'' وہ بڑبڑائی۔

''کیا ہوا؟'' خضر نے اس کی طرف دیکھا۔

''ٹائر پر گولی لگ گئی ہے۔'' وہ چڑھائی پر تھی۔ اس نے ایکسلیٹر پر پیر دبایا انجن زور سے غرایا تھا اور پھر کار ریوالور سے نکلی گولی کے مانند پارکنگ سے نکل کر سڑک پر پہنچ گئی تھی۔ اس نے ٹائروں کے احتجاج کے باوجود کار نہیں روکی اور سڑک پر چلتی چلی گئی۔ اسے اب ٹائروں کے لیے قریبی پیٹرول پمپ کی تلاش تھی جب کہ خضر کار بک کرارہا تھا۔

☆☆☆

کمرے میں چار افراد موجود تھے۔ کرنل حارث انہیں وائرس کے حوالے سے اب تک کی تمام تر معلومات کی بریفنگ دے رہے تھے۔

''کرنل اس وائرس کے حوالے سے ہمیں شروع سے ہی تشویش ہے اور مختلف ایجنسیز کے پاس اس سے ملتی جلتی رپورٹیں پہنچی ہیں۔ یہ قدرتی آفت نہیں ہے، یہ ہم جانتے تھے مگر اس کا منبع کہاں ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اور وہاں پر کیا ہورہا ہے؟ یہ سب ہمارے علم میں نہیں آسکا تھا۔ آپ کی اس رپورٹ، اس لڑکی کے قتل اور اس خط نے بہت کچھ واضح کردیا ہے۔ یہ حیاتیاتی ہتھیار ہی ہے۔ ایسا ہتھیار جس کا شکار بننے والے آخر تک یہ حقیقت نہیں جان پاتے کہ ان پر یہ آفت آئی نہیں، لائی گئی ہے۔'' کمرے میں موجود انتہائی سینئر افسر نے کہنا شروع کیا۔ ''ہمیں یہ خطرہ بھی تھا کہ مسلمان ممالک خصوصاً ہمارا ملک اس کا نشانہ بنایا جاسکتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اب تک ہماری حکومتیں صحت یا کسی بھی مسئلے کو لے کر فول پروف سسٹم نہیں بنا پائیں...... یہاں آنے والی اس طرح کی کسی بیماری کی

شاید تم پہلے بھی یہاں تصویریں بنواتی رہی ہو۔

نشانہ ہی میں اتنی تاخیر ہوسکتی ہے کہ پھر ہمارے ہاتھ میں کچھ نہ رہے۔''

''ہمیں اس صورتِ حال پر ایکشن لینا چاہیے۔'' دوسرے سینئر افسر نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''مسئلہ یہ ہے کہ ہم سرکاری طور پر یہ نہیں کرسکتے، اول تو ہمارے پاس ثبوت نہیں ہے، دوسری بات یہ ہے کہ اس طرح زیادہ خطروں کو دعوت دینے والی بات ہوجائے گی۔ ہمیں خاموشی سے اس خطرے کا توڑ کرنا ہوگا اور وہ بھی خطرے کے ہماری طرف آنے سے پہلے اور یہ طے ہے کہ یہ جنگ ہماری سرزمین پر نہیں لڑی جائے گی۔ اس کے لیے ہمیں انہیں وہیں ان کے ٹھکانے پر ہی.... ٹھکانے لگانا ہوگا۔''

''بالکل ٹھیک ہے سر اور یہ ہی میرا پلان بھی ہے۔ خضر اور اس کی کزن خولہ وہاں اپنی ڈیٹیکٹو ایجنسی چلاتے ہیں۔ خضر کرمنالوجی میں ڈاکٹر ہے اور جرائم کی بیخ کنی کا ماہر ہے۔ وہ دونوں اس جنگ میں ہمارے بہترین سپاہی بن سکتے ہیں جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ وہ انجانے میں اس سب میں ملوث ہوچکے ہیں اب خود ان کی بقا بھی اسی بات میں مضمر ہے کہ وہ ان سب کا خاتمہ کریں۔ خولہ اس کی ساتھی ہے اور اس نے ان لوگوں کے اسنائپر کو بغیر کسی ہتھیار کے مارا تھا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کی اجازت سے میں ان کے پاس چلا جاؤں اور ان کی اس جنگ میں

ان کا ساتھی بن جاؤں تاکہ ہم اپنے نتائج حاصل کر سکیں۔''

''بہت اچھا پلان ہے۔ آپ چاہیں تو ایک دو ایجنٹس ساتھ لے جائیں یا پھر آپ کو وہاں بھی مدد مل سکتی ہے۔ ہم آپ کے اور ان دونوں کے لیے وسائل مہیا کرنے کے پابند ہیں۔ ہماری ساری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ مگر ایک بات واضح ہے کہ اگر آپ ناکام رہے اور کسی خطرے میں پڑ جاتے ہیں تو ہم آپ کی ذمّے داری نہیں لے سکیں گے کیونکہ اس صورت میں ملک براہِ راست خطرے کا نشانہ بن جائے گا۔''

''میں جانتا ہوں سر۔'' کرنل حارث نے کہا۔ ''یہ ایک سیکرٹ مشن ہے اور سیکرٹ ہی رہے گا۔''

''بس تو پھر بسم اللہ کریں، ہماری نیت صاف ہے۔ ہمارا فرض اپنی سرزمین اور اپنے لوگوں کی حفاظت ہے اور ہم دنیا کو ایسے لوگوں سے نجات دلانا چاہتے ہیں جو انسانیت کے دشمن ہیں، اللہ آپ کی حفاظت کرے۔'' وہ بولے اور کھڑے ہوگئے۔ کرنل حارث نے ایڑیاں جوڑ کر انہیں سیلیوٹ کیا اور پیچھے ہوگئے۔

☆☆☆

''کیا تم سب کو زنگ لگ گیا ہے؟ تم دو افراد کو قابو میں نہیں کر پائے اور خود زخمی ہو کر چلے آئے۔'' ڈاکٹر جونز غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔

''سر، میں شرمندہ ہوں۔'' مائیکل بولا۔ اس کے بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ خولہ کی گولی نے ہی اسے زخمی کیا تھا۔ ''وہ عام لوگ نہیں ہیں۔ ان کے پاس ہتھیار موجود تھے اور ان دونوں کا نشانہ بھی بہت پکا تھا۔ ہمیں اس کی توقع نہیں تھی۔''

''کیوں توقع نہیں تھی۔ جب وہ لڑکی بِل جیسے شخص کو نہتی حالت میں مار سکتی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ وہ دونوں یہاں ایک ڈیٹکٹو ایجنسی چلا رہے ہیں تو ان کے پاس ہتھیار بھی ہونے چاہئیں اور اچھا نشانہ بھی..... تمہیں ان کے لیے تیار ہو کر جانا چاہیے تھا۔ اب تمہاری اس احمقانہ کارروائی نے انہیں مزید محتاط کر دیا ہوگا اور انہوں نے تمہاری شکلیں بھی دیکھ لی ہوں گی۔''

''نہیں سر ہم سب نے ایک جیسے سیاہ ماسک پہن رکھے تھے۔''

''اوکے!'' اس نے گہری سانس لی۔ ''بہرحال اب تم جاسکتے ہو۔ اپنے روزمرہ کے کاموں اور گھروں تک محدود رہو۔ تمہیں جلد مستقبل کا لائحہ عمل بتا دیا جائے گا۔''

ان کے کمرے سے جانے کے بعد اس نے پھر گہری سانس لی۔ ''یہ دونوں پاکستانی۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''شاید یہ جانتے نہیں کہ ان کا ٹکراؤ کس سے ہے، مجھے ان کا کوئی پکا بندوبست کرنا ہوگا۔''

آج کی شام ورلڈ ہیپنس آرگنائزیشن کے چھ بنیادی افراد کی میٹنگ طے تھی جس کا بنیادی پوائنٹ ریٹا اور اس کی موت کے بعد پیش آنے والے مسائل تھے۔ ریٹا کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس معمولی لڑکی کی خوبی صرف اس کا سفید فام ہونا تھا مگر اس نے ڈاکٹر جونز کے مطابق تمام سفید فاموں سے غداری کی تھی۔

☆☆☆

''زندگی میں ایڈونچر کا ڈوز اچانک ہی کچھ زیادہ نہیں ہوگیا۔'' خضر، خولہ کے ہاتھ سے کافی کا مگ لیتے ہوئے بولا۔ ''لوگ جس طرح ہمیں فالو کر رہے ہیں، ہمیں جان سے مارنے کے لیے فضول منصوبے بنا رہے ہیں۔ گولیاں چل رہی ہیں۔ تم گاڑی فلائی کر رہی ہو، اس سے کچھ وی آئی پی اور سُپر ہیرو جیسی فیلنگ آ رہی ہیں نا۔''

''ہاں اور کیا.....؟'' خولہ زور سے ہنسی۔ ''007 والی، جبکہ ہم نے ایسا کچھ کیا بھی نہیں ہے بس سب کچھ خود بخود ہوتا جا رہا ہے مگر یہ غلط بات ہے کہ تمام ایکشن سُپر ہیرو مردوں ہی کو بنایا جاتا ہے۔ میں اس کے خلاف اپنا احتجاج ریکارڈ کراتی ہوں۔''

''خیر اب ایسا بھی نہیں ہے میڈم..... ایونجر سیریز ہی کو دیکھ لو اس میں مردوں کے برابر ہی عورتیں بھی سُپر ہیرو ہیں۔'' خضر بولا۔

''خیر باس تو پھر بھی آئرن مین ہی تھا نا اب دیکھو ''اینڈ گیم'' کے بعد کون آتا ہے۔'' وہ کافی کا سپ لیتے ہوئے بولی۔

''تم جانتی ہو، مجھے تمہاری یہ جرأت اور بہادری بہت پسند ہے اگر تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید اتنا کچھ ہونے کے بعد اسے سنبھالنا ہی مشکل ہوتا۔'' خضر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا.....؟ میری جگہ کوئی لڑکی ہوتی ہی کیوں؟ تم نے ایسا سوچ کیسے لیا؟'' وہ تمام تعریف و توصیف کو یکسر نظرانداز کر کے ہمیشہ کی طرح ایک جملہ پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''ارے میں تو مثال دے رہا تھا یار......'' خضر نے اسے گھورا۔

''وہی تو...... ایسی مثال دے ہی کیوں رہے تھے، تم کچھ اور بھی تو کہہ سکتے تھے؟''

''مثلاً کیا؟''

''مثلاً...... مثلاً...... تمہاری جیسی دنیا میں کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی خولہ......'' وہ اداکاری کرتے ہوئے بولی۔

''او کے تو اب میرے ڈائیلاگ بھی تم ہی طے کرو گی...... تو چلو بتاؤ مجھے اور کیا کیا بولنا چاہیے۔'' وہ اس کے چہرے پر نظریں جما کر بولا۔

''کچھ بھی نہیں۔'' وہ گڑبڑا گئی۔

اس سے پہلے کہ خضر کچھ کہتا، اس کے فون کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔

''حارث...... کرنل حارث کا فون ہے۔'' خضر بولا۔ کال ریسیو کی۔ خضر نے مختصر الفاظ میں انہیں نئی اَپ ڈیٹس سے آگاہ کر دیا۔

''اوہ...... تو تم لوگ ابھی کہاں ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''اپنے گھر پر...... اور کہاں جا سکتے تھے؟''

''یہ محفوظ نہیں رہے گا جو لوگ تمہارے آفس کی پارکنگ میں آسکتے ہیں۔ ان کے لیے اس گھر کے بارے میں جاننا اور یہاں حملہ کرنا کیا مشکل ہے؟''

''پھر آپ کے خیال میں ہمیں کسی ہوٹل میں جانا چاہیے؟'' خضر نے پوچھا۔

''نہیں...... ہوٹل میں نہیں...... تم ذرا دیر رکو، میں تمہیں ابھی کال بیک کرتا ہوں۔'' انہوں نے یہ کہہ کر رابطہ کاٹ دیا۔

آدھے گھنٹے بعد ان کا فون دوبارہ آیا تھا۔

''سب خیر ہے؟'' انہوں نے سلام کے بعد پوچھا۔

''جی سر......'' خضر نے جواب دیا۔

''خضر میں نے تمہارے لیے محفوظ رہائش کا بندوبست کر دیا ہے ابھی کچھ دیر بعد رفاقت حسین تم سے رابطہ کریں گے۔ وہ تمہیں تم لوگوں کی نئی رہائش گاہ تک لے جائیں گے۔''

''مگر سر......'' خضر نے کچھ کہنا چاہا۔

''یہ ضروری ہے خضر۔ وہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔ اگر تمہیں ان سے مقابلہ کرنا ہے تو اپنے گھر کو محفوظ بنانا ہو گا۔ میں تمہیں جس جگہ بھیج رہا ہوں اسے ہم لوگ وہاں سیف ہاؤس کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ وہاں تمہیں مکمل سیکیورٹی ملے گی اور ہر طرح کا آرام بھی...... تم لوگ اپنی پیکنگ کر لو۔ وہاں پہنچ کر مجھے فون کر لینا...... اور ہاں میں تم سے ایک ضروری بات پوچھنا چاہ رہا تھا۔''

''جی کرنل صاحب......''

''تم نے مجھے پہلی بار کس نمبر سے کال کی تھی؟''

''وہ...... میں نے خولہ کے فون سے کال کی تھی...... کیوں؟'' خضر کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

''اصل میں مجھے اس فون میں کچھ گڑبڑ محسوس ہوئی تھی۔ آج وہ مسئلہ نہیں ہے......''

''کیسی گڑبڑ؟''

''اصل میں میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر کوئی فون ریکارڈر پر یا بگ ہوا ہوتا ہے تو اس میں آواز کے پیچھے ہلکی سی لرزش محسوس ہوتی ہے اور میں نے اس فون پر یہ محسوس کیا تھا۔ اگر تم مناسب سمجھو تو رفاقت سے اس فون کو چیک کروا سکتے ہو۔'' انہوں نے کہا۔ ''یہ میرا خیال ہے مگر تصدیق کرانے میں کوئی نقصان نہیں ہے۔''

''بالکل...... مجھے بھی کچھ خیال آرہا ہے...... ٹھیک ہے ہم یہ کرالیں گے اور اب پیکنگ شروع کرتے ہیں۔''

''ویل بیسٹ آف لک...... ہاں میں کل کی فلائٹ سے آرہا ہوں۔''

''اوہ، یہ تو بہت زبردست خبر ہے۔ خدا کا شکر ہے، کافی عرصے بعد ملاقات ہو گی۔'' خضر واقعی بہت خوش ہوا تھا۔

فون بند کر کے اس نے خولہ کی طرف دیکھا، فون کا اسپیکر کھلا ہوا تھا اس لیے اس نے کرنل حارث سے کی جانے والی پوری گفتگو سنی تھی۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

''تمہیں کیا ہوا؟'' وہ اس کا چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

''میرا فون ٹیپ ہوا ہو گا...... یہ سچ ہے اسی وجہ سے وہ ماری گئی۔ انہیں اس کا پتا میری کال سے ملا ہو گا...... خضر، ریتا میری وجہ سے ماری گئی۔ اس نے مجھ پر اعتماد کیا، مجھے کال کی اور میرے فون کی وجہ سے انہیں اس کا پتا مل گیا......'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''خولہ...... پلیز خود کو سنبھالو......'' خضر اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ''اس میں تمہارا کیا قصور ہے...... تمہیں کون سا معلوم تھا یا معلوم ہے اب بھی...... اور جس چیز کی

بابت ہمیں علم نہ ہو اس کی ذمے داری بھی نہیں ہوتی۔ بات اب سمجھ میں آرہی ہے۔ ہم ریٹا سے ملنے جارہے تھے مگر وہ ہم سے پہلے وہاں پہنچ گئے...... کرنل حارث سے ہماری گفتگو ہوئی اور وہ ہمارا معاملہ ختم کرنے پہنچ گئے۔"

"چلو پیکنگ کرلیں۔" خولہ کھڑی ہوگئی۔ انہیں اپنی سب اہم چیزیں ساتھ لے کر جانا تھا۔

☆☆☆

"ہمارا پروجیکٹ سو فیصد کامیاب رہا ہے۔ ہماری دنیا پر بہت سارا غیر ضروری دباؤ اور بوجھ کم ہوا ہے۔ ہم نہ صرف اپنے بنیادی مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں بلکہ ہم نے اپنے ٹارگٹ کی معاشی سرگرمیوں کو ریورس گیئر لگا دیا ہے۔ اسے دنیا سے کاٹنے میں کامیابی ہماری منزل بنی ہے۔ وائرس کا خوف اب لوگوں کو ان کے بنائے پہیے تک استعمال کرنے نہیں دے رہا اور یہ ہماری جیت ہے۔" وہ مسکرایا۔ ڈاکٹر جونز کے سامنے اس تنظیم کے کرتا دھرتا موجود تھے۔ "ان کے لوگ مر رہے ہیں۔ باقی لوگ گھروں میں بند ہیں۔ بندرگاہ بند پڑی ہے، جہاز، ٹرینیں اور بسیں رک گئی ہیں جس انڈسٹری کا پہیا شب و روز چلتا تھا، اب وہ بند پڑا ہے۔ ہم یہ مثال اس ماڈل کو اسی کامیابی سے دنیا کے کسی بھی ٹارگٹ پر فٹ کر سکتے ہیں اور ابھی یہ شروعات ہے۔"

وہاں موجود پانچ افراد نے ڈاکٹر کی اس بات پر تالیاں بجا کر داد دی تھی۔ "ہم نے اس ہفتے گرینڈ جشن کی تیاریاں شروع کردی تھیں مگر کچھ ناخوشگوار واقعات نے ہمیں ڈسٹرب کردیا ہے۔" اس نے انہیں ریٹا کی حالت، اپنے فیصلے اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کیا۔

"ہمارا اگلا ٹارگٹ ان کا ملک ہی ہونا چاہیے اور آپ یقین کریں ڈاکٹر کہ وہ خود اپنا دفاع نہیں کر پائیں گے۔ ان کے پاس نہ تو بہتر اسپتال ہیں اور نہ ہی کوئی سسٹم...... اس کے باوجود یہ دنیا کے ہر معاملے میں اپنی ٹانگ اڑاتے ہیں اور سب کچھ بگاڑ دیتے ہیں۔" ولیم نے نخوت سے اپنی ٹائی درست کرتے ہوئے کہا۔

"تم درست کہہ رہے ہو ولیم۔" گلوریا مسکرائی۔

"تو اب پلان کیا ہے؟" فرینکی نے پوچھا۔

"پلان تو صرف ایک ہی ہے۔" ڈاکٹر جونز نے کرسی سے پشت لگاتے ہوئے کہا۔ "ہمیں اپنا کام ہر صورت میں پورا کرنا ہے اور اس راستے میں کوئی رکاوٹ برداشت نہیں کی جاسکتی۔ ہمیں ان دونوں سے اور وہاں سے آنے والے اس آفیسر سے نمٹنا ہوگا۔"

"مگر کیسے؟ کیونکہ ہم اس کام میں دو بار ناکام ہو چکے ہیں ڈاکٹر......" سرخ بالوں والی میری نے کہا۔

"ان کی مکمل چھٹی کردی جائے گی۔ قسمت ہمیشہ ان کا ساتھ نہیں دے گی۔ اس لڑکی کے موبائل کو ریکارڈ کیا جارہا ہے، اس طرح ہم ان کے بارے میں سب کچھ جانتے رہیں گے۔"

"ٹھیک ہے یہ آپ کا کام ہے......اس سلسلے میں ہم کوئی بھی مدد کرسکیں تو حاضر ہیں۔" چارلس مسکرایا۔

"کیا اب ہمیں ٹارگٹ پر مزید ہتھیار بھیجنے کی ضرورت ہے؟"

"نہیں، اب تو وہاں خود فصل تیار ہوگئی ہے۔" ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا۔ "بہت جلد یہ دنیا بہت خوب صورت ہونے والی ہے جہاں کسی رنگ دار نسل کا کوئی شخص نظر نہیں آئے گا اور سب کو ہر سہولت حاصل ہوگی۔"

"یقیناً۔" وہ سب ایک ساتھ بولے۔ ان کی نگاہوں میں نفرت کے شعلے سلگ رہے تھے۔

☆☆☆

خضر اور خولہ سیف ہاؤس منتقلی کے بعد سے اپنے مشن پر لگ گئے تھے۔ انہوں نے وائرس، اس کے اثرات اور متاثرین کے بارے میں اچھی خاصی ریسرچ کرڈالی تھی اور اب ان کا پلان ایکشن کے لیے تیار تھا۔

"کیا تمہارے خیال میں کرنل حارث ہم سے اتفاق کریں گے۔" خولہ نے پوچھا۔

"خولہ یہ اس کا واحد حل ہے۔ یہ موذی ہیں انسانیت کے دشمن ہیں اگر ان سے نہ نمٹا گیا تو یہ دوسروں کو جینے نہیں دیں گے۔ ہم ان کے خلاف اگر سب کچھ باقاعدہ طور پر ثابت کرنے کے چکر میں پڑیں گے تو کچھ بھی نہیں کر پائیں گے۔ اس کھیل کو انہوں نے شروع کیا ہے، اب ہم اسے ان کے طریقے سے ختم کریں گے۔"

خضر نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم اپنا کام شروع کرو، میں رفاقت صاحب سے بات کرکے آتا ہوں۔ ہمیں شام کو ان کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔" خولہ کے سر ہلانے پر وہ دروازے کی طرف چل دیا۔

خولہ نے ورلڈ ہیپنس آرگنائزیشن کا لینڈ لائن نمبر ڈائل کیا۔

"ورلڈ ہیپنس آرگنائزیشن" دوسری جانب سے نرم

نسوانی آواز سنائی دی۔ ''میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟''

''دیکھیے میں ایک اسٹوڈنٹ ہو اور دنیا میں وسائل کی مساوات پر ریسرچ کر رہی ہوں۔ آپ کا ادارہ ایک خاص نام رکھتا ہے۔ کیا آپ اپنے پریذیڈنٹ یا ان کی سیکریٹری سے میری بات کرا سکتی ہیں۔'' اس نے پوچھا۔

''کیوں نہیں...... ڈاکٹر جونز دفتر میں نہیں ہیں، وہ شام تک آئیں گے۔ مس جولیا ڈاکٹر جونز کی سیکریٹری ہوں۔ آپ لائن پر رہیں، میں آپ کو ان سے کنکٹ کرتی ہوں۔''

وہ یہ بات پہلے ہی سے جانتے تھے اور ان کا ٹارگٹ جولیا ہی تھی۔ خولہ کو پروگرام کے مطابق اسے طالب علموں کے ایک چھوٹے سے پروگرام میں شرکت اور لیکچر کے لیے دفتر سے باہر نکلنے پر آمادہ کرنا تھا۔ یہ ان کی تنظیم کے ظاہری کاموں میں سے ایک تھا۔

''دیکھیے مس نمرتا...... آپ کو اس کے لیے پہلے سے میل کرنی چاہیے تھی۔ میں آج بہت مصروف ہوں۔''

''میڈم اگر آپ لنچ آور میں ہمیں صرف 20 منٹ دے سکیں تو ہم بہت ممنون ہوں گے۔'' اس کے مسلسل اصرار پر وہ بالآخر 20 منٹ کے لیے آنے پر تیار ہوگئی تھی۔

''میڈم آدھے گھنٹے میں ڈرائیور آپ کو پک کر کے لے آئے گا آپ لنچ ہمارے ساتھ کریں گی دیکھیے انکار مت کیجیے گا پلیز...... آپ کا آنا ہی ہماری عزت افزائی کے لیے کافی ہے۔'' خولہ نے اس سے ایک اور بار کنفرمیشن لے کر فون بند کیا اور خضر کی جانب دیکھا۔ اسے دفتر سے یہاں لانے کا کام اسی کا تھا۔

☆☆☆

سٹی اسپتال کے اس بڑے سے ہال میں کئی ماہرین اور ڈاکٹرز مسلسل ریسرچ اور تجربات میں مصروف تھے۔ وہ کسی مریض کا علاج نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ اس وبا یا آفت سے نمٹنے کا طریقہ ڈھونڈنے میں مصروف تھے۔

''یہ دیکھیے ڈاکٹر......'' ڈاکٹر میچنگ شی نے اپنے انچارج کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کی ہنس مکھ چہرے والی خاتون تھیں۔ ''میں اسی پر آپ کی توجہ چاہتی ہوں۔ میں نے صحت یاب ہونے والے کئی مریضوں کے بلڈ سمپلز لے کر یہاں ان کی تفصیل تیار کی ہے۔ ان کے مطابق جن صحت مند جرثوموں کی موجودگی نے وائرس کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا تھا، ہم مریضوں کو وہ جرثومے انجیکٹ کر کے ان کی صحت یابی کا ریشو (اوسط) بڑھا سکتے ہیں۔''

ڈاکٹر یونگ نہایت توجہ سے ان کے کمپیوٹر پر موجود رپورٹس کو دیکھ رہے تھے۔

''شاباش ڈاکٹر تم نے بڑا کام کیا ہے۔ آج ہم سب ڈاکٹر میچنگ کی فائنڈنگس پر کام کریں گے اور کل اس کے نتائج جمع کیے جائیں گے۔ اگر تمہارا آئیڈیا کام کر گیا تو واقعی مسیحا کہلائی جاؤ گی...... ہزاروں، لاکھوں افراد کو موت کے منہ سے بچا لانے والی مسیحا......'' انہوں نے اسے داد دینے والے لہجے میں کہا۔

☆☆☆

جولیا کی آنکھ کھلی تو وہ ایک صوفے پر لیٹی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کہاں اور کیوں ہے پھر جیسے ہی اسے سب یاد آیا، وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ طالب علموں سے ایک میٹنگ کے لیے اس کار میں بیٹھی تھی اور پھر...... اس کے بعد اس کی آنکھ یہاں کھلی تھی۔ اس کے سامنے والے صوفے پر ایک خوب صورت لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جبکہ کچھ دور دو افراد کرسیوں پر بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے۔

''کک کون ہو تم لوگ؟ مجھے یہاں اس طرح کیوں لایا گیا ہے؟ تم اس کی سزا جانتے ہو؟''

''جی مس جولیا بالکل جانتے ہیں۔'' لڑکی مسکرائی۔ ''آپ کو یہاں لانے کا مقصد بھی یہی ہے۔''

''سزا حاصل کرنا......؟''

''نہیں...... جاننا...... ہم آپ سے کچھ ضروری باتیں جاننا چاہتے ہیں۔''

''کیسی باتیں؟'' وہ اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھتی رہی۔

''آپ کے بارے میں؟ آپ کی تنظیم کے اصل کام اور ڈاکٹر جونز کے اصل مشن کے بارے میں...... اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں، بس کُل ملا کر یہی کچھ......''

''تو اس کے لیے تم کو یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''جولیا...... ہمیں جو جاننا ہے، وہ تم بہ خوبی جانتی ہو...... ہم ان کے وائرس پروجیکٹ اور ان کی ٹیم کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔''

وائرس کا لفظ سنتے ہی اُس کے چہرے پر سایہ سا آکر چلا گیا مگر وہ جواباً خاموش رہی تھی۔ ''تم ریٹا کے بارے میں جانتی ہو نا؟'' کرسی پر بیٹھا ہوا شخص بولا۔
''وہی اسے یہاں لایا تھا اور اس کے انجام کے بارے میں بھی......''
''دیکھیے مس جولیا......'' اب کی بار تیسرا شخص بولا تھا۔ ''مجھے یہ کہتے ہوئے بالکل اچھا نہیں لگ رہا مگر جو کچھ آپ لوگ کر رہے ہیں، اس کے بعد یہ معمولی سی بات لگتی ہے۔ ہمارا ایک ساتھی اس وقت آپ کے گھر پر ہے جہاں آپ کی بیٹی اور آپ کی ماں کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ اگر آپ انہیں خیریت سے دیکھنا چاہتی ہیں تو اس کا واحد طریقہ ہماری بات ماننا ہے۔''
''نہیں، نہیں، تم میری بیٹی کو کچھ نہیں کر سکتے۔'' وہ یک دم چلا پڑی تھی۔
''تم امر درست کرلیں میڈم...... کر سکتے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ کرنا نہیں چاہتے...... آپ اگر سب ٹھیک رکھنا چاہتی ہیں تو اپنا منہ کھولیں ورنہ......'' خولہ نے درشتگی سے کہا۔ ''ویسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ جو لوگ دوسروں کو زندگی، رشتوں اور ہر چیز سے بڑی آسانی سے دور کر دیتے ہوں انہیں اپنے رشتوں کی اتنی فکر ہے۔''
''میں تو صرف...... ڈاکٹر جونز کی سیکریٹری ہوں، اپنی ملازمت کر رہی ہوں۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولی۔
''جولیا، ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ دو منٹ میں سچ بولیے ورنہ ہمارا ایک فون آپ کی زندگی کی خوشیوں میں وائرس بن کر پھیل جائے گا۔''
جولیا چند لمحے اُن کی جانب دیکھتی رہی پھر اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

☆☆☆

''جو کچھ جولیا نے بتایا ہے، اس کے مطابق ان کا اگلا نشانہ ہمارا ملک ہی ہے۔ اس کے لیے وہ زندہ ہتھیار تیار کرنے کا پلان بنا رہے ہیں۔ وہ ہم جیسے ''رنگ دار'' افراد میں وائرس انجیکٹ کر کے انہیں وہاں بھیجیں گے...... یہ اُن کا منصوبہ ہے۔ ان کی سرپرستی تو کافی لوگ کر رہے ہیں مگر اس تنظیم میں ڈاکٹر جونز کے ساتھ پانچ اہم افراد ہیں جو یہ سارا کھیل کھیل رہے ہیں۔ یہ سب بدترین نسل پرست کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ اپنے اس ''عظیم مقصد'' کے حصول کے ساتھ ساتھ انہیں اس سے آمدنی بھی مل رہی ہے انہیں گرانٹ بھی ملتی ہے اور تجربات کے لیے علیحدہ سے وسائل بھی......'' خضر نے کہا۔ کرنل حارث کو یہاں پہنچے چند گھنٹے ہوئے تھے۔
''یہ وائرس کسی سوئے ہوئے جن کے مانند ہوتے ہیں جب تک انہیں ان کا میزبان نہیں ملتا، وہ بے ضرر ہوتے ہیں مگر ایک بار انسانی جسم میں سرگرم ہوتے ہی وہ خود کو ضرب دینا شروع کر دیتے ہیں۔'' خولہ نے کہا۔ ''اگر ایک بار ان کے لیے جیتے جاگتے ٹائم بم وہاں پہنچ گئے تو پھر اس سب پر قابو پانا ناممکن ہو جائے گا۔''
''اسی لیے ہمیں انہیں یہیں ختم کر دینا ہے اس طرح کہ وہ حملہ کے بجائے دفاع کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس کے بعد ان کی مکمل تباہی ہی ہزاروں انسانوں کی بقا کے لیے ضروری ہے۔'' کرنل حارث نے کہا۔
''ہمارے پاس ان کی تمام مکمل معلومات موجود ہیں۔ بس آپریشن شروع کرنے کی دیر ہے۔'' خضر بولا۔
''جولیا فی الحال یہیں رہے گی۔ وہ صرف ایک مہرہ ہے۔''
''مگر جولیا کی گمشدگی انہیں فوری طور پر چوکنا کر دے گی، اس کی زندگی کی قیمت یہی ہے کہ وہ اب وہاں ہماری انفارمر کے طور پر کام کرے۔'' حارث نے کہا۔
''کیا ہم اس پر اعتبار کر سکتے ہیں؟'' خولہ نے پوچھا۔
''نہیں، رفاقت اس کی بیٹی اور ماں کو کہیں اور منتقل کر دے گا اور وہ ان کی خاطر ہمارے لیے کام کرے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم اس میں ایک چپ پلانٹ کر دیں گے جس سے اس کے محلِ وقوع اور بولی گئی ہر بات یہاں مانیٹر ہو سکے گی۔ اسے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا جائے گا۔ اس وقت معاملہ دنیا بھر کے لاکھوں، کروڑوں بے گناہ افراد کی زندگیوں اور صحت کا ہے اور اس میں ہم کوئی رسک نہیں لے سکتے۔'' حارث نے کہا۔
''ٹھیک ہے۔'' رفاقت نے سر ہلایا۔ ''میں یہ کرواتا ہوں۔''
''ہمیں ڈاکٹر کو ذہنی طور پر اس قدر ہراساں کرنا ہے کہ وہ غلطیاں کرنا شروع کرے اور اپنے آپریشن کو بھول کر خود کو بچانے کی فکر میں لگ جائے۔''

☆☆☆

میری اینڈریو ایک بڑے بیوٹی سیلون کی مالک تھی۔ اس کے والد لندن سے امریکا آئے تھے اور اب بھی خود کو لارڈ کہلواتے تھے۔ میری کی عمر پینتیس سال کے

سر! میری بیوی کی تصویر ہے۔ دیر تک کام کرنا ہو تو اسے سامنے کر لیتا ہوں...... خوشی ہوتی ہے کہ گھر سے دور ہوں۔

میرا بچہ! آج تم پندرہ سال کی قید کے بعد گھر لوٹے ہو!

لگ بھگ تھی۔ وہ دو بار شادی کر چکی تھی۔ دونوں بار اس کا اختتام طلاق کی صورت میں ہوا تھا۔ اس کے دوست اور ملازمین اسے آتش فشاں کہا کرتے تھے۔ غصہ ہر وقت اس کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ سیلون کی ایک ورکر پر برس رہی تھی۔

''تمہیں کام کرنے کی تمیز نہیں ہے اصل میں تم جیسے کم نسل افراد کا مسئلہ یہی ہے۔'' وہ ورکر فلپائن سے تعلق رکھتی تھی اور سر جھکائے اس کی تقریر سن رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس وقت کسی بات کا جواب دینا یا تشریح کرنا بھی اس کی ملازمت کے لیے خطرناک ہو سکتا تھا اس لیے وہ ساری ذلت برداشت کر رہی تھی۔

میری اس سے فارغ ہو کر سیلون سے نکلی اور اپنی بی ایم ڈبلیو میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئی۔ آج اس کا ڈرائیور چھٹی پر تھا۔ اسے آج کی شام اپنے فارم ہاؤس میں گزارنا تھی۔ کل وہ یہ بات ڈاکٹر جونز کی سیکریٹری کو بھی بتا چکی تھی۔ اس کا فارم ہاؤس شہر کے قریب ترین مضافات میں تھا۔ شہر سے باہر نکل کر اس نے گہری سانس لی۔ وہ تھوڑا دور ہی گئی تھی کہ اسے اپنی گاڑی میں کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔

وہ بریک پر پیر رکھ رہی تھی تو بریک از خود نیچے جا کر پھنستا جا رہا تھا۔

''کیا مصیبت ہے۔'' وہ بڑبڑائی اور ایک بار پھر بریک دبا کر رفتار کم کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اسی وقت اس کا فون بجا۔

''ہیلو۔'' اس نے بٹن دبایا اور بولی۔

''مس میری اینڈریو...... امید ہے کہ آپ ڈرائیو کو انجوائے کر رہی ہوں گی۔'' دوسری جانب سے انجان آواز سنائی دی۔

''کون ہے؟ کیا بکواس ہے یہ؟ کیا میں تمہیں جانتی ہوں۔'' اس نے فون کان سے ہٹا کر اسکرین پر نظر ڈالی۔ وہاں کوئی نمبر نہیں تھا۔

''نہیں مگر میں تمہیں جانتا ہوں...... تمہارے ہاتھ دنیا کے سیکڑوں ہزاروں بے گناہ افراد کے خون سے رنگے ہوئے ہیں اور اس جرم میں تمہیں آج سزائے موت دی جاتی ہے۔'' دوسری جانب سے سرسراتی آواز میں کہا گیا۔ ''اگرچہ تم موت کے بعد کے حساب پر یقین نہیں رکھتیں مگر مجھے یقین ہے کہ تمہارا نامۂ اعمال اتنا لوڈڈ ہے کہ شاید تم یہیں اپنی دوسری دنیا کے سفر سے قبل ہی جہنم کی تپش محسوس

کرنے لگو۔‘‘

’’بکواس بند کرو۔‘‘ اس نے فون پٹخ دیا اور دوبارہ بریک پر پیر رکھا...... گاڑی تو نہیں رکی تھی البتہ ایک لمحے بعد ہی ایک زوردار دھماکا سنائی دیا تھا۔ میری کی گاڑی دیکھتے ہی دیکھتے شعلوں میں لپٹ کر آگ کا گولا بن گئی تھی۔

☆☆☆

ولیم پیٹرسن ایک بینکر تھا۔ اسے صفائی کا خبط تھا۔ اس کا دفتر شیشے کے مانند چمکتا رہتا تھا۔ کہیں بھی گرد کا ہلکا سا دھبا اس کے اردگرد کے لوگوں کے لیے مصیبت بن جاتا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ مٹی اور کسی رنگ دار نسل کو اپنے گھر یا دفتر کے قریب بھی برداشت نہیں کرتا تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ ہر ماہ ایک نئی گرل فرینڈ بنانا اور پھر آگے بڑھ جانا، اس کا مشغلہ تھا۔ اس وقت وہ اپنے پُرتعیش دفتر میں بیٹھا اپنے ایک نئے کلائنٹ سے بات کر رہا تھا۔

’’میں اپنا کوئی بندہ آپ کی سائٹ پر بھجوا دیتا ہوں اگر کوئی مسئلہ نہیں ہے تو ہم آپ کے ساتھ ضرور کام کریں گے۔‘‘ چند لمحوں بعد اس نے فون بند کیا اور گھڑی دیکھی۔ اس کے دفتر سے نکلنے کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ دفتر سے سیدھا اپنے جم جاتا ہے۔ آج اس کا سوانا کا دن تھا۔ اسے بذاتِ خود سوانا باتھ زیادہ پسند نہیں تھا مگر سوانا کا دھواں صحت مند جِلد کے لیے اچھا ہوتا ہے اس لیے وہ اس معمول کو اپنائے ہوئے تھا۔

وہ سوانا روم میں پہنچا تو وہاں ایک اور شخص پہلے سے موجود تھا۔ وہ سفید فام نہیں تھا۔ ولیم نے اسے دیکھ کر نفرت سے ناک سکیڑی۔ اس وقت اسے وہاں دہی کمرا میسر تھا اس لیے وہ دل پر جبر کر کے اس کے سامنے والی بینچ پر بیٹھ گیا۔

’’کیا حال ہے ولیم؟‘‘ وہ شخص چند لمحوں بعد اس سے مخاطب ہوا۔

’’تم مجھے کیسے جانتے ہو؟‘‘ ولیم نے نخوت سے پوچھا۔

’’تم ایک بڑے آدمی ہو تم سے کون واقف نہیں ہے۔‘‘ وہ مسکرایا۔

’’خیر...... میں سوانا کے دوران بات نہیں کیا کرتا۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’اچھا کرتے ہو...... ویسے شاید اب تمہارے لیے کبھی بھی بات کرنا آسان نہ ہو۔‘‘ وہ پُراسرار انداز میں بولا۔

’’کیا بکواس ہے یہ......؟‘‘ اس نے غصے سے کہا۔

اس سے قبل کہ وہ کھڑا ہو پاتا، وہ شخص اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔ اس نے نہ جانے کس انداز میں اس کی گردن کو پشت سے دبایا تھا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی حرکت نہیں کر پا رہا تھا۔

’’دیکھا...... کتنے بے بس ہو تم...... سفید فام ہونے کے باوجود...... ایک رگ کے دبنے سے، بولنے، حرکت کرنے سے بھی معذور......‘‘ وہ اسی طرح مسکرا رہا تھا۔

ولیم کے حواس پر اب خوف بُری طرح حاوی ہو چکا تھا۔ وہ اس سے معافی مانگنا چاہتا تھا۔ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر اب سب کے لیے بہت دیر ہو چکی تھی۔

’’گڈ بائے ولیم...... جہنم میں میری تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔‘‘ اور اس نے یہ کہہ کر اس کی گردن پر ایک کھڑا ہاتھ مارا...... وہ اوغ کی کریہہ آواز کے ساتھ بینچ سے زمین پر جا گرا تھا...... اس کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ خضر نے بوتھ سے باہر نکل کر بھاری دروازے کو دوبارہ لاک کیا۔ باہر موجود میٹر کی گرمی کو انتہا پر پہنچا کر وہ چینجنگ روم کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

’’یہ...... یہ ہو کیا رہا ہے۔ اچانک یہ حادثات شروع ہو گئے ہیں۔ پہلے میری کی گاڑی کا گیس ٹینک پھٹ گیا اور اب ولیم...... مجھے یہ سب ٹھیک نہیں لگ رہا ڈاکٹر!‘‘ گلوریا، ڈاکٹر جونز سے فون پر گفتگو کر رہی تھی۔

’’یہ حادثات ہیں گلوریا...... کبھی بھی کسی کے بھی ساتھ ہو سکتے ہیں۔ تم ولیم کو دل میں جگہ نہ دو۔‘‘ ڈاکٹر نے اسے تسلی دی۔ ’’ہمارا پیکیج تیار ہے ہمیں اب دس پندرہ لوگ ہائر کرنے ہیں اور اس کے بعد انہیں وہاں اس طرح بھیجنا ہے کہ ان کی تکلیف میں شدت وہاں پہنچ کر پیدا ہو۔‘‘ وہ اپنے جنون میں غرق تھا۔

’’ٹھیک ہے میں دیکھتی ہوں۔ ویسے میرے ایک دوست کی میڈ وہیں کی رہنے والی ہے۔ اسے کسی بہانے سے ٹکٹ دے کر بھیجا جائے تو خوشی خوشی جانا چاہے گی۔‘‘ گلوریا نے کہا۔

’’تم کیریرز پر توجہ دو...... یہ بھی اچھا آپشن ہے۔ انہیں آخری دن انجکشن لگایا جائے گا۔‘‘ اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ گلوریا کی تشویش خود اس کے ذہن کو بھی

متاثر کر رہی تھی مگر اس کے لیے یہ بات ہی غور طلب نہیں تھی کہ کوئی انہیں نقصان پہنچانے کی ہمت بھی کر سکتا ہے۔ تکبر بڑھنے لگے تو دماغ کے کام کرنے کی رفتار یوں بھی رکنے لگتی ہے۔

☆☆☆

چارلس آسٹریلیا سے گزشتہ رات ہی لوٹا تھا۔ اسے آتے ہی میری اور ولیم کی موت کی خبر مل گئی تھی۔ وہ تھکا ہوا تھا۔ اس نے اگلے روز ڈاکٹر سے ملنے کا ارادہ کیا تھا۔ ڈاکٹر کا فون مسلسل نو رپلائی پر تھا۔ اس نے جولیا کو اپنی آمد سے البتہ مطلع کر دیا تھا۔ وہ پراپرٹی کا بزنس کرتا تھا۔ اپنے پُرتعیش پینٹ ہاؤس میں وہ تنہا ہی رہتا تھا۔ اس کی بیوی سے اس کی کبھی نہیں بنی۔ اگر اس کے لیے نقصان کا سودا نہ ہوتا تو وہ اسے شادی کے ایک سال بعد ہی طلاق دے دیتا مگر وہ اس کے کاروبار کی بڑی انویسٹر تھی اس لیے اس نے اسے آٹھ سال برداشت کیا اور جب ہر چیز اس کی مٹھی میں آ گئی تو اس سے جان چھڑا لی۔ وہ وقتی نتائج پر یقین نہ رکھنے والا آدمی تھا اس لیے اس نے جھگڑا، عدالت، طلاق ادائیگیوں کے مسائل میں اُلجھنے کے بجائے ایک رات اس کے منہ پر تکیہ رکھ کر اسے دنیا جہان کی پریشانیوں سے آزاد کر دیا تھا۔ وہ ویسے بھی دمے کی مریضہ تھی۔ سب کچھ بہ آسانی حل ہو گیا تھا۔ کچھ عرصہ وہ غمزدہ شوہر کی اداکاری کرتا رہا۔ اب اس کی زندگی میں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اچھا کھانا اس کی کمزوری تھی جو رفتہ رفتہ اس کی جسامت کو گولائی میں تبدیل کرتی جا رہی تھی۔ آج جولیا نے اس کے لیے خصوصی ڈنر پارسل کی آفر دی تھی جو اس نے بخوشی قبول کر لی تھی کیونکہ اس کا بٹلر بھی کل صبح ہی واپس آنے والا تھا۔ دوسرے جزوقتی ملازم کو اس نے اس کے کوارٹر میں جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اس وقت وہ گرم شاور سے لطف اندوز ہونے کے بعد ڈنر کا ہی منتظر تھا۔

ڈنر وقت پر پہنچ گیا تھا۔ اس میں تمام ڈشز اس کی پسندیدہ تھیں۔ اس نے ڈنر کے بعد جولیا کا شکریہ ادا کرنے کا فیصلہ کیا اور کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ کھانے کے بعد وہ سکون سے اپنی آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا...... چند لمحوں بعد اسے کچھ بے چینی کا احساس ہوا تھا۔ چند لمحے وہ خاموشی سے لیٹا رہا پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''شاید میں نے زیادہ کھا لیا ہے۔'' وہ بڑبڑایا اور ملازم کو کال کرنے کے لیے انٹرکام کی جانب بڑھا۔ مگر پیٹ میں اٹھنے والے درد کی تیز لہر نے اسے وہاں تک پہنچنے نہیں دیا۔ وہ کرسی کے قریب ہی لڑکھڑا کر گر پڑا تھا۔ اس کے پیٹ، سینے اور گلے میں گویا آگ سی لگی ہوئی تھی۔ وہ چند لمحے زمین پر تڑپتا رہا پھر ساکت ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں سے خون کی پتلی سی لکیر گال پر اپنے نشان چھوڑتی ہوئی دبیز قالین میں پیوست ہو گئی تھی۔ اس کی بے چین آنکھیں چھت پر ٹکی ہوئی تھیں اور چہرے پر اذیت کے نشان ثبت ہو گئے تھے۔

☆☆☆

گلوریا جانسن کا شمار شہر کی امیر خواتین میں ہوتا تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد اس کا زیادہ تر وقت سیاحت اور پارٹیوں میں گزرتا تھا۔ دیکھنے میں وہ پینتیس سے زیادہ کی نظر نہیں آتی تھی مگر اس میں بہترین دیکھ بھال اور بیوٹی ایکسپرٹس کا بھی بڑا کمال تھا۔ درحقیقت وہ پینتالیس سال کی ہو چکی تھی۔ وہ روزانہ بہت جلد اٹھ کر یوگا کی عادی تھی مگر آج وہ ابھی تک بستر میں تھی۔ کل رات وہ بہت دیر تک جاگتی رہی تھی۔ گزشتہ تین دنوں میں میری، ولیم اور چارلس کی اموات نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اُس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ حادثات نہیں تھے۔ ان کے ساتھ کچھ تو غلط ہوا تھا۔ وہ سخت خوف زدہ تھی اگر یہ حادثات نہیں تھے تو اگلی باری اس کی بھی ہو سکتی تھی اور وہ مرنا نہیں چاہتی تھی۔

وہ کل شام سے ڈاکٹر جونز کو کال کر رہی تھی مگر اس کا فون ریسیو نہیں ہو رہا تھا۔ تنظیم نے تین بنیادی ممبران کے جانے کے بعد ان کا ملنا نہایت ضروری تھا مگر وہ نہ جانے کہاں مصروف تھا۔

وہ بالآخر بستر سے باہر نکلی۔ اس نے دل بہلانے کے لیے کلب جانے کا فیصلہ کیا...... تھوڑی دیر میں وہ اپنی لیموزین میں کلب کی جانب روانہ ہو چکی تھی۔ واپسی میں اس نے تنظیم کے دفتر جانے کا ارادہ کر کے ایک بار پھر ڈاکٹر کا نمبر ملایا۔ اس کا فون اب بھی دسترس سے باہر ہے۔ کا ریکارڈ بجا رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے دفتر کال ملائی۔

''جولیا...... ڈاکٹر جونز کہاں ہیں؟ کیا تم مجھے اس بارے میں کچھ بتا سکتی ہو؟''

''گلوریا میڈم وہ پرسوں رات سے لیب میں ہیں۔ وہاں کوئی خاص کام ہو رہا ہے۔ شاید آپ کے علم میں ہو۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان کا فون بھی ریسیو نہیں ہو رہا۔''

''ہاں میں بھی اسے مسلسل کال کر رہی ہوں، تم نے چارلس کے بارے میں سنا؟''

''جی بہت افسوس ہوا شاید کھانے میں کوئی خراب چیز شامل ہوگئی تھی۔'' جولیا نے سادگی سے کہا۔ ''آپ کتنے بجے تک دفتر آئیں گی۔''

''اگر وہ نہیں ہے تو پھر میں کلب سے گھر چلی جاؤں گی۔ اصل میں میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔''

''او کے میڈم اپنا خیال رکھیے گا۔'' جولیا نے کہا اور میز پر وائبریٹ ہوتے موبائل کی جانب دیکھا۔ اسکرین پر اس کی بیٹی کی تصویر چمک رہی تھی۔ وہ لوگ وعدے کے مطابق روزانہ اس کی اس کی بیٹی سے بات کروا رہے تھے۔

''بولو میری جان۔'' اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

''مما آپ لندن میں مزے کر رہی ہوں گی مگر میں یہاں بہت زیادہ مزے کر رہی ہوں...... آپ کو معلوم ہے کہ انکل نے مجھے جی ایس 4 پروگیم اسٹیشن گفٹ کیا ہے۔ وہی جو میں آپ سے مانگ رہی تھی...... میں رات سے اس پر گیم کھیل رہی ہوں گرینڈ ما بھی کھیل رہی ہیں بہت مزہ آرہا ہے۔'' اس کی دس سالہ بیٹی خوشی سے پاگل ہو رہی تھی۔ ''اور مما آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے کہا ہے کہ آپ کی واپسی کے بعد میں اسے گھر لے جا سکتی ہوں، یعنی یہ میرا ہو گیا ہے۔''

''واہ...... یہ تو بہت زبردست بات ہوگئی۔ آپ بھی انکل کو بالکل پریشان مت کیجیے گا اور سب کا کہنا مانیے گا۔''

''مما میں ہمیشہ کہنا مانتی ہوں اچھا آپ گرینڈ ما سے بات کیجیے۔''

''موم سب کچھ ٹھیک ہے؟'' جولیا نے اپنی ماں کی آواز سنتے ہی پوچھا۔

''بالکل ٹھیک ہے...... تمہارے دوست بہت اچھے ہیں۔ تم نے اچھا کیا کہ ہم دونوں کو یہاں بھیج دیا۔ ہماری پکنک ہوگئی اور زینی تو اتنی خوش ہے کہ بس......''

''ٹھیک ہے موم...... جلد ملتے ہیں۔'' اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس کے دل کو ہر گزرتا دن یہ یقین دلا رہا تھا کہ اب جو وہ کر رہی ہے، وہ واقعی درست ہے۔

☆☆☆

گلوریا کلب سے نکلی تو وہ قدرے نشے میں تھی مگر اسے اس طرح کی حالت میں گاڑی چلانے کی عادت تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی پارکنگ میں داخل ہوئی...... گاڑی کے قریب پہنچ کر اسے لگا کہ اس کی گاڑی کے قریب کوئی موجود تھا۔ وہ قدرے بھاری بھر کم جسامت والا شخص تھا۔

''یہ آپ کی گاڑی ہے میڈم؟'' وہ اسے دیکھ کر بولا۔

''جی ہاں...... آپ کون ہیں؟ ارے یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے اسے اپنی کار کی ڈکی کھولتے دیکھ کر پوچھا۔ ''آپ کے پاس چابی کہاں سے آئی؟''

''ارے یہ کون سی مشکل بات ہے؟ آپ ناراض نہ ہوں...... یہ میں آپ کے لیے ہی کر رہا ہوں۔''

''کیا مطلب......؟''

''میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ڈکی آرام دہ تو ہے نا؟'' وہ مسکرایا۔

''مگر کیوں؟ آپ کو اس سے کیا مطلب ہے؟''

اب اس پر غصہ حاوی ہوتا جا رہا تھا۔

''مجھے نہیں...... میں نے کہا نا آپ کو مطلب ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو تکلیف نہ ہو۔'' وہ اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔

''نن...... نہیں......'' اس کی آنکھیں خوف سے پھیل سی گئیں۔ پیچھے ہٹی اور مڑ کر وہاں سے نکلنے کی کوشش کی۔ اتنی دیر میں وہ اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے اسے دبوچ لیا پھر ایک باریک سی تار اس کے گلے میں پھنس سی گئی...... وہ کوشش کے باوجود چیخ تک نہیں پا رہی تھی۔

''میڈم خود مرنا کافی مشکل ہوتا ہے جن لوگوں کو تم لوگ تڑپا تڑپا کر مارتے رہے ہو، یقین کرو کہ انہیں بھی اس سے اتنی ہی تکلیف ہوتی ہوگی...... جہنم میں خوش رہنا۔'' اس نے اتنا کہہ کر تار کو پوری طاقت سے کھینچ لیا۔ گلوریا کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا پھر اس کی گردن ڈھلک گئی۔ اس شخص نے اسے گھسیٹ کر اس کی کار کی ڈکی میں ڈالا۔ ڈکی کو بند کیا اور ہاتھ جھاڑتا ہوا باہر کی طرف نکل گیا۔

☆☆☆

''حالات اب قدرے بہتر ہیں۔'' نیشنل ہیلتھ کمیشن کے سربراہ کے اس جملے کے ساتھ میٹنگ میں چہ میگوئیاں شور کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔

''آپ کس کو اطمینان دلا رہے ہیں۔'' ایک خاتون ممبر نے کہا۔ ''وہ خطرناک وائرس خوف اور دہشت کی علامت بن کر ہمارے لوگوں، معیشت اور سکون کو نگل رہا ہے۔ ہر روز اتنے ہی لوگ مر رہے ہیں۔ مریضوں کی

تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے کام بند پڑے ہیں سر اور دوسرے ممالک ہم سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ حالات بہتر ہیں۔''

''میں دوبارہ یہی کہہ رہا ہوں کیونکہ میرے پاس اس کی وجوہات ہیں۔'' اس نے پھر نرمی سے کہا۔ ''آپ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ میں جانتا ہوں اور اتنا ہی دکھی بھی ہوں مگر آپ جانتے ہیں کہ اینٹی وائرس جرثوموں کی دوا بن چکی ہے جو اس کے اثرات کو رفتہ رفتہ مٹا دیتی ہے۔ ہمارے ماہرین نہایت تیزی کے ساتھ ویکسین پر بھی کام کر رہے ہیں اور بہت جلد دنیا کے بتائے ہوئے وقت سے بہت پہلے ہم یہ ویکسین تیار کر لیں گے۔ ایک اور بات جو میں کہہ رہا ہوں، وہ یہ ہے کہ بُرے وقت کے بعد اچھا وقت آتا ہے ہم اپنی حالیہ تاریخ کے بدترین دن گزار چکے ہیں، اس کے بعد یقیناً اچھا وقت آئے گا۔ ماہرین ایک اور بات بھی کہہ رہے ہیں ان کے مطابق گرمی آتے ہی یہ وائرس خود یہ خود مرتا جائے گا......اور موسم بدل رہا ہے۔''

''ایسا ہی ہو یہ ہم سب کی دعا ہے۔'' ایک اور ممبر نے کہا۔

''سننے میں تو اور بھی کچھ آ رہا ہے...... بتایا جا رہا ہے کہ اس بات کے شواہد ملے ہیں کہ یہ وبا آئی نہیں، پھیلائی گئی ہے۔'' کسی نے پوچھا۔

''ہم اس بارے میں کوئی رائے دینے کے مجاز نہیں ہیں۔'' سربراہ نے کہا۔ ''یہ جن لوگوں کے دائرۂ اختیار میں آتا ہے، وہ اس سے یقیناً نمٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر ایسا کچھ ہوگا تو مجرم کوئی بھی ہو اسے اس سے بدترین جواب ضرور ملے گا۔''

☆☆☆

وہ بڑی سیاہ وین تیزی سے ہائی وے پر دوڑی جا رہی تھی۔ اسے رفاقت حسین چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر جولیا موجود تھی۔ پچھلی درمیانی سیٹ پر خولہ، خضر اور کرنل حارث بیٹھے ہوئے تھے۔

''جولیا تمہیں یقین ہے کہ وہ وہیں ہے؟'' خولہ نے اس سے پوچھا۔

''جی ہاں...... وہ فارم ہاؤس تنظیم کی باقاعدہ لیب ہے۔ ڈاکٹر جونز وہاں نئے پروجیکٹ کی تیاری کر رہے ہیں اور وہ اس کے اختتامی تمام مراحل میں خود شامل ہونا چاہتے ہیں۔''

''پروجیکٹ کی تیاری......مطلب......'' رفاقت حسین نے پوچھا۔

''مطلب......'' وہ ایک لمحے کو ہچکچائی۔ ''وہ اس وائرس کو تیار کروا کر دس افراد کے جسموں میں انجکیٹ کریں گے اور پھر انہیں تمہارے ملک روانہ کر دیا جائے گا۔''

''اوہ خدا یہ شخص بدترین موت کا حق دار ہے۔'' خضر بڑبڑایا۔

''کیا اس نے اب تک یہ کام کر لیا ہوگا؟'' اس نے جولیا سے پوچھا۔

''نہیں خضر صاحب!'' وہ بولی۔ ''اس وائرس کی تباہ کاری میں مزید اضافہ کیا گیا ہے......ڈاکٹر کے پروگرام کے مطابق آج رات تک وائرس تیار ہو جائے گا جس کے بعد کل پہلے شخص پر اس کا تجربہ ہوگا۔ اس کے بعد دس افراد میں انجکیٹ کے فوری بعد انہیں بھیج دیا جائے گا تاکہ وہ اس کا اثر ہونے تک وہاں پہنچ جائیں۔''

''وہ اپنا یہ خواب کبھی پورا نہیں کر سکے گا۔'' کرنل حارث نے کہا۔ اس کے بعد وین میں خاموشی چھا گئی تھی۔

☆☆☆

فارم ہاؤس کے بڑے سے ہال میں حفاظتی ملبوسات میں ملبوس ڈاکٹرز اپنا کام تقریباً ختم کر چکے تھے۔ ڈاکٹر اسٹیفن جونز بھی وہیں موجود تھا۔ ڈاکٹرز کے اشارے کے بعد وہ ہال سے نکل کر ملحقہ لاؤنج کی جانب بڑھا وہاں اس نے اپنا حفاظتی لباس اتار کر رکھا، ماسک اور ہیلمٹ بھی اتارا اور صوفے پر گر پڑا۔ اس کے دماغ میں دوہری ریل چل رہی تھی۔

وہ آج کی کامیابی سے بہت خوش تھا۔ اب ان کا تخلیق کردہ وائرس پہلے سے بہت زیادہ خطرناک ہو گیا تھا۔ اس بار اموات کی شرح پوری دنیا کے ہوش اُڑا دینے والی تھی۔ وہ مسکرایا۔ دوسری جانب اس کی تنظیم کے پرخچے اُڑ چکے تھے۔ اس کے سارے ساتھی مارے جا چکے تھے اور گلوریا غائب تھی۔ ویسے اب اس کی جانب سے بھی کوئی خاص خوش فہمی نہیں تھی۔ ایک طرح سے یہ بھی اس کے لیے کسی حد تک اچھی خبر تھی کہ ان سب کی جائدادیں اب ان کے مقصد کے لیے استعمال ہو سکتی تھیں۔

''میں ان کی قربانی ضائع نہیں جانے دوں گا۔ دنیا سے مسلمانوں کا نام مٹا دوں گا۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''وہ میرے معاملات میں مداخلت کی سزا بھگتیں گے۔ ان کے پھٹیچر

ملک کو برباد کرنے کے لیے اس کا وائرس بہت کافی تھا۔‘‘ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

’’ڈاکٹر جونز......‘‘ جولیا کی آواز نے اسے اچھل جانے پر مجبور کردیا۔

’’تم......تم یہاں کیا کررہی ہو؟‘‘ وہ اسے گھورتے ہوئے کھڑا ہوگیا۔

’’ایک ایمرجنسی ہوگئی ہے سر......جس کی وجہ سے مجھے یہاں آنا پڑا ہے۔‘‘

’’ایمرجنسی......؟‘‘ اس نے دہرایا۔ ’’کیا ہوا ہے جولیا؟‘‘

’’ہم......ہم ہیں وہ ایمرجنسی......‘‘ خولہ اور خضر ایک ساتھ لاؤنج میں داخل ہوئے تھے۔ وہ ڈاکٹر اور اس کے بندوں کو یہاں مصروف رکھنے والے تھے۔ اس دوران کرنل حارث اور رفاقت حسین نے فارم ہاؤس کی تلاشی کا کام کرنا تھا۔ وہ کسی بے گناہ کے خون سے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پیٹرول کے بڑے بڑے کین تھے۔ وہ اسے فارم ہاؤس کے مختلف حصوں میں چھڑکتے جارہے تھے۔

’’تم......تم یہاں......؟‘‘ ڈاکٹر جونز کا چہرہ غصے اور خوف سے مسخ سا ہوگیا۔ ’’تو انہیں یہاں لائی ہے ان کم نسلوں کو۔‘‘ وہ جولیا کی طرف مڑ کر چلایا۔

’’اور آپ کیا ہیں؟‘‘ جولیا نے اسے گھورا۔ ’’خونی قاتل انسانیت کے دشمن......بے گناہوں کا خون بہانے والے اگر آپ عظیم سفید فام ہیں تو مجھے اپنے سفید فام ہونے پر بے حد افسوس ہے۔‘‘

’’تم پاگل ہوگئی ہو۔ اور تم لوگ......تم یہاں سے بچ کر نہیں جاسکو گے۔‘‘ وہ اپنے کوٹ کی جانب لپکا ہی تھا کہ خضر کی فلائنگ کک نے اسے ہوا میں اچھال دیا۔ خضر نے اسے دوبارہ کالر سے پکڑ کر اٹھایا۔ ’’تم جانتے ہو کہ تمہارے لیے بہترین سزا کیا ہے کہ تمہیں تمہارے تیار کردہ وائرس کا نشانہ بنا کر تنہا چھوڑ دیا جائے تاکہ تم تڑپ تڑپ کر آنے والی موت کا ذائقہ چکھ سکو مگر ہم تمہاری طرح نہیں ہیں اور ہم مزید کسی کے لیے بھی خواہ وہ سفید فام ہو یا کوئی اور کسی خطرے کو زندہ چھوڑنا نہیں چاہتے۔‘‘ اس نے اتنا کہہ کر اس کے منہ پر زوردار مُکا رسید کیا۔ ’’یہ ریٹا کے لیے ہے......جسے تم نے موت کے منہ میں اتار دیا۔‘‘ اور پھر اس نے اس پر مُکوں کی بارش کردی۔

’’خضر......چھوڑ دو......‘‘ کرنل حارث نے اسے کھینچ کر اس سے الگ کیا۔ ’’یہ اپنے انجام تک پہنچنے والا ہے......چلو......‘‘ وہ اس کا بازو کھینچتے ہوئے بولے۔ ڈاکٹر جونز انہیں ڈوبتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا......آخر ان کی اس بات کا مطلب کیا ہے؟‘‘ یہ سوال اس کے ذہن میں گونج رہا تھا مگر وہ اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

وہ سب تیزی سے فارم ہاؤس سے باہر نکلے تھے۔ کرنل حارث نے گاڑی کے قریب پہنچ کر ہاتھ میں پکڑی کوئی چیز پوری طاقت سے فارم ہاؤس کی جانب اچھال دی۔ اس کے بعد وین تیزی سے سڑک کی جانب مڑ گئی۔ ان کے ہائی وے پر چڑھتے ہی ایک فلک شگاف دھماکا سنائی دیا۔ فارم ہاؤس آگ کا بہت بڑا شعلہ بن کر بھڑک اٹھا تھا۔

’’خس کم جہاں پاک......‘‘ خضر بولا۔ ’’اس کے ڈاکٹرز، اس کا وائرس اس کی لیب اور سب کچھ اس آگ میں جل کر خاک ہوا۔

’’ہاں مگر کہیں اس کی جگہ دوسرا شخص آکر یہ سب تو نہیں کرپائے گا۔ میرا مطلب ہے کہ کہیں اور کوئی فارمولا یا کچھ باقی تو نہیں۔‘‘ خولہ نے پوچھا۔

’’نہیں۔‘‘ جولیا بولی۔ ’’ڈاکٹر دفتر سے وائرس وغیرہ سے متعلق ہر چیز، فائل، ثبوت سب کچھ ہٹا چکا تھا۔ اسے آپ لوگوں کے حوالے سے کچھ خطرات تھے۔ ریٹا کی موت کے فوراً بعد وہاں سے ہر چیز فارم ہاؤس منتقل کردی گئی تھی۔‘‘

’’شکر ہے۔‘‘ کرنل حارث نے کہا۔ ’’جب تک دنیا ہے شیطان بھی نئے نئے ناموں سے آتے رہیں گے مگر جب وہ ہوگا تب ہر بار کوئی نہ کوئی خضر اور خولہ بھی ان کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں گے......وہ ہماری سرزمین پر موت کا جال بچھانے جارہا تھا۔ اس کے لیے تو ہمارے یہ دو شیر ہی کافی رہے۔‘‘

’’آپ کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا کرنل حارث۔‘‘ خضر بولا۔

’’مگر سوال یہ ہے کہ آپ نے صرف شیر کہا آخر شیرنی بھی کہنے میں کیا مسئلہ تھا۔‘‘ خولہ ناک پھلا کر بولی۔

’’اوہ یس مائی مسٹیک......میری غلطی ہے میڈم شیرنی۔‘‘ کرنل حارث بھی مسکرادیے۔

❖❖❖

عذاب

عکسِ فاطمہ

ہر جرم کی سزا تو جھیلنی پڑتی ہے... اس نے جرم کرنے کا سوچا تھا... تو سزا تو بنتی تھی... ایک سیدھے سادے نوجوان لڑکے کی کہانی... اس کا قصور یہ تھا کہ وہ اپنے دادا کو مشکل وقت میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا... وہ ان کی مدد کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھا... مگر اچانک ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا...

لوگوں میں خوشیاں بانٹنے والے سانتا کلاز کا پُرلطف ماجرا...

مڈپورٹ مشی گن کے مضافات میں بہت سے لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ سانتا کلاز کو کسی نے چلتی ہوئی کار سے گولی ماردی۔ خوش قسمتی سے یہ واقعہ دسمبر کے آخر میں پیش آیا اور اس وقت وہاں کوئی بچہ اسے دیکھنے کے لیے موجود نہیں تھا۔ اس کے نتیجے میں ستاسی سالہ فیرس کریلی کے کندھے میں معمولی زخم آیا جو کرسمس کے دوران مال پر سانتا کا روپ دھار کر اپنی گزراوقات کے لیے چار پیسے کما لیتا تھا۔ بہرحال اس کا پڑوسی جیف فرینکلن جو اس واقعے کا عینی

شاہد تھا اور اس کے بارے میں فیرس کی رائے کچھ اچھی نہ تھی، وہ اس کے دخل در معقولات کو پسند نہیں کرتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ جیف کو اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ اس نے نو گیارہ کو فون کر دیا۔

آپریٹر نے متاثرہ شخص سے بات کرنا چاہی تو جیف نے زبردستی سیل فون فیرس کو پکڑا دیا۔ اس نے سخت لہجے میں ہیلو کہا تو آپریٹر نے اس سے پوچھا کہ کیا اسے درد ہو رہا ہے۔ وہ اپنے ہوش و حواس میں ہے یا کوئی اور تکلیف تو نہیں۔ فیرس نے بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے اور گولی اس کے کندھے کو چھوتی ہوئی گزر گئی ہے۔ یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی کوریا میں اسے گولی لگ چکی تھی۔ اس لیے یہ اس کے لیے نیا واقعہ نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ اسے جوابی کارروائی کا موقع نہیں ملا کہ وہ اپنی بندوق کے بٹ سے حملہ آور کی پٹائی کر دیتا۔

آپریٹر نے اسے بتایا کہ پولیس کو اطلاع دے دی گئی ہے اور وہ راستے میں ہے۔ اس پر فیرس نے کہا کہ پولیس واپس چلی جائے۔ وہ خود اپنے طور پر اس صورتِ حال سے نمٹ سکتا ہے۔ آپریٹر نے قانون اور ضابطوں کا حوالہ دیا اور کہا کہ وہ پولیس کو واپس آنے کے لیے نہیں کہہ سکتا۔ وہ بہرحال اپنی کارروائی پوری کریں گے۔ اس پر فیرس جھنجلا گیا اور بولا کہ ٹھیک ہے انہیں آنے دو۔ وہ اپنی بات ختم کر چکا ہے اور گھر جا رہا ہے۔ اسے بیئر کی طلب ہو رہی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنا پسندیدہ شوٹا ٹیگرز گیم دیکھے گا۔ آپریٹر نے فون بند کر دیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے متاثرہ شخص سے بات کی ہے یا وہ کسی فلم کا کردار تھا۔

سراغ رساں مولی فیرلی، پیزا اور بیئر کے لیے بیٹھنے ہی والی تھی کہ اسے اسٹیشن سے فون پر اس واقعے کی اطلاع ملی۔ اس نے اپنے اپارٹمنٹ کو تالا لگایا اور امپالا میں بیٹھ کر جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہو گئی۔ اس کے دماغ میں ایک ہی بات آ رہی تھی کہ وہ کون بے وقوف تھا جس نے اس کے انکل پر گولی چلائی؟ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے کسی ریچھ پر جلتا ہوا بٹاخہ پھینکا جائے۔ کوئی بھی صحیح الدماغ یہ حرکت نہیں کر سکتا لیکن بہت جلد وہ اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ ہر کوئی صحیح الدماغ نہیں ہوتا، ان میں کچھ سرپھرے بھی ہوتے ہیں اور اگر ان کے ہاتھ کوئی ہتھیار آ جائے تو وہ کسی کو بھی نشانہ بنا سکتے ہیں چاہے وہ سانتا کلاز کے روپ میں ہی کیوں نہ ہو۔

شام کا اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا اور عام طور پر سنسان رہنے والی چالمرز روڈ پولیس کاروں، آگ بجھانے والے ٹرکوں اور ایک ایمبولینس کی ہیڈ لائٹس سے روشن ہو رہی تھی۔ مولی نے اپنی کار فیرس کے ڈرائیو وے میں روکی۔ وہ گاڑی سے باہر آئی اور وہاں موجود پولیس کو اپنا شناختی کارڈ دکھا کر اپنے انکل کی طرف دوڑی جو ایمبولینس کے پیچھے کھڑا اس میں بیٹھنے سے انکار کر رہا تھا۔

''فیرس!'' مولی نے آواز لگائی۔

''اوہ میرے خدا! تمہیں کس نے فون کیا؟''

اس نے اپنی گردن موڑ کر پولیس والوں، فائرمینوں اور طبی عملے کی طرف دیکھا اور غصے سے بولا۔ ''تم میں سے کس بے وقوف نے میرے کہنے پر عمل نہیں کیا اور میری بھتیجی کو اطلاع دے دی؟''

سب لوگوں کو سانپ سونگھ گیا۔ کسی نے بھی ایک لفظ نہیں کہا۔

وہ اس کی طرف بڑھی۔ فیرس اس کے مقابلے میں عمر رسیدہ تھا اور اس کی کمر میں بھی تھوڑا خم تھا۔ اس کے باوجود وہ قد میں مولی سے اونچا تھا۔ پولیس کار کی گھومتی ہوئی سرخ لائٹ اس کے چہرے اور سر پر پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے نسبتاً زیادہ غصہ، جھنجلاہٹ اور ناراض نظر آ رہا تھا۔

''پرسکون ہونے کی کوشش کریں انکل۔'' مولی نے کہا۔

''میں پرسکون ہوں۔'' فیرس نے کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ ڈپورٹ پولیس کے بہترین لوگ ایک غیر اہم معاملے کے لیے پریشان ہوں۔'' پھر وہ مجمع کی طرف دیکھ کر چلایا۔ ''تم لوگوں کا شکریہ، اس کام کے لیے جو تم نے نہیں کیا۔''

''یہ غیر اہم معاملہ نہیں ہے۔'' مولی نے اعتراض کیا۔ ''تم پر گولی چلائی گئی ہے۔''

''برائے نام۔'' وہ مینڈک کی طرح ٹرایا۔ ''ایک سیسے کا ٹکڑا مجھے لگا۔ میری بات کا یقین کرو۔ اس سے زیادہ خون تو اس وقت نکل جاتا ہے جب میں فلاس سے دانتوں کی صفائی کرتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ مولی کے پاس گیا اور آہستہ سے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولا۔ ''تم گھر جاؤ۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''میڈم۔'' ایک میڈیکل ٹیکنیشن بولا۔ ''ہمیں اس کو اسپتال لے جانا چاہیے۔''

''میں نے کہا نا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' فیرس

نے احتجاج کیا۔

''کیا میں تمہارے ساتھ جا سکتی ہوں؟'' مولی نے پوچھا۔

''بالکل۔'' ٹیکنیشن بولا۔ ''ایمبولینس میں بیٹھ جاؤ۔''

''میں ٹھیک ہوں فیرس چلایا۔ ''تم لوگ میری بات کیوں نہیں سن رہے ہو؟'' اس کا احتجاج اور چیخنا چلانا بیکار گیا اور اسے زبردستی ایمبولینس میں سوار کرادیا گیا کیونکہ مولی کو بھی غصہ آگیا اور اس نے دھمکی دی کہ اگر وہ اسپتال نہ گیا تو دوسری بار وہ اسے گولی ماردے گی۔ اسے اسٹریچر پر ڈال کر ایمبولینس میں سوار کرادیا گیا اور وہ اسپتال کی جانب روانہ ہوگئے۔

''تمہیں معلوم ہے کہ اگلا مرحلہ کیا ہے؟'' مولی نے پوچھا۔

فیرس نے آنکھیں بند کرلیں اور بولا۔ ''خدا ہی جانتا ہے۔''

''مجھے تم سے کچھ سوالات پوچھنے ہیں انکل۔''

''ٹھیک ہے پوچھو۔''

''تم گھر سے باہر کیا کررہے تھے؟''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں ناچ رہا تھا؟''

''میں نہیں جانتی اسی لیے پوچھ رہی ہوں۔''

''کل کچرا اٹھانے والی گاڑی آئے گی۔ میں ردی سامان لے کر گاربیج اسٹیشن پر جارہا تھا پھر میں نے مڑ کر گھر کی جانب دیکھا۔ اسی وقت گولی چلنے کی آواز آئی۔''

''کیا تم نے گولی چلانے والے کو دیکھا؟''

''نہیں۔''

''کار تو دیکھی ہوگی؟''

''مجھے اس کا پچھلا حصہ نظر آیا۔ وہ سیاہ رنگ کی سیڈان تھی۔ وہ ایک ٹرک کی طرح لگ رہی تھی۔''

''کیا اس کی رفتار زیادہ تھی؟''

''ہاں۔''

''اگر اس کی رفتار زیادہ تھی تو کیسے......؟''

اسی وقت ایمبولینس ایک گڑھے سے ٹکرائی اور فیرس اسٹریچر پر لیٹے لیٹے اچھل پڑا اور مولی بھی تقریباً اپنی نشست سے پھسل گئی۔ فیرس نے ڈرائیور کو ڈانٹا۔ ''دیکھ کر گاڑی چلاؤ۔''

''معافی چاہتا ہوں جناب۔'' ڈرائیور نے کہا۔

''حال ہی میں تم نے کسی کو دشمن بنایا ہے؟'' مولی نے فیرس سے پوچھا۔

''اس بے وقوف کے علاوہ جو یہ گاڑی چلا رہا ہے۔ میں کسی اور کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔''

''کیا کسی شخص نے تمہیں نقصان پہنچانے کی دھمکی دی تھی؟''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''ہاں، پچاس کی دہائی میں تقریباً آدھے براعظم ایشیا نے۔''

''کیا تم کسی کے مقروض ہو؟''

اس سوال کے جواب میں فیرس نے اسے قہرآلود نظروں سے دیکھا کہ اگر وہ اس کی بھتیجی اور قانون کی محافظ نہ ہوتی تو وہ اس کی ریڑھ کی ہڈی نکال کر اسے چھڑی کی طرح استعمال کرتا۔ مولی نے بھی اس پیغام کو سمجھ لیا اور وہ بولی۔ ''ٹھیک ہے، میرا خیال ہے کہ ہماری گفتگو ختم ہوگئی۔''

☆☆☆

اگلے روز سہ پہر میں سراغ رساں جم بیگن، مولی کے دفتر میں اس کی میز کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا کافی پی رہا تھا۔ ''کیا میں نے تمہیں کبھی بتایا کہ میں نے پندرہ سال پہلے تمہارے انکل کو ایک بار سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا؟'' اس نے مولی سے پوچھا۔

''ہاں۔'' مولی نے کہا۔ ''ہاں کم از کم آٹھ مرتبہ۔''

''میں اس وقت پٹرولنگ پر تھا اور میری رات کی شفٹ تھی۔''

''یہ بات تم نویں بار بتا رہے ہو۔''

''میں نے گاڑی پارک کے قریب کھڑی کی اور گردوپیش کا جائزہ لینے لگا۔ تبھی میں نے فیرس کو ایک خوش شکل عورت کے ساتھ بار سے باہر آتے دیکھا۔''

''یہ بھی میں سُن چکی ہوں۔''

''پھر ایک نوجوان شخص دروازے سے نکل کر سڑک پر آیا اور فیرس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ لگتا تھا کہ وہ عورت اس آدمی سے ملنے ڈیٹ پر آئی تھی اور فیرس نے اسے باتوں میں لگا لیا۔''

''اچھا۔''

''پھر اس آدمی نے گن نکال لی۔''

''اوہ نہیں۔''

''میں اپنی کار سے باہر آیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا، فیرس نے اس شخص کے ہاتھ سے گن چھین کر گلی میں پھینک دی اور اس آدمی کے جبڑے پر زوردار ضرب لگائی۔ وہ زمین پر گر گیا۔''

''اونہہ۔'' اس نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے بھی بتا چکے ہو مولی نے چڑ کے کہا۔''

''فیرس وہیں کھڑا اس آدمی کو دیکھتا رہا پھر اس شخص نے مجھے پٹرول کار کے پاس کھڑا ہوا دیکھ لیا۔ وہ روتا ہوا میرے پاس آیا اور بولا کہ میں فیرس کو گرفتار کرلوں۔''

''میں شرطیہ کہتی ہوں کہ یہ سن کر تم نے قہقہہ لگایا ہو گا۔''

''ہاں، میں نے اسے بتایا کہ اگر کبھی میں نے فیرس کو گرفتار کرنے کا خواب دیکھا تو میں جاگنے کے بعد اس سے معافی مانگ لوں گا۔''

''مجھے یقین ہے کہ یہ بہت ہی......''

''ہاں، یہ بہت ہی حیرت انگیز بات تھی جو میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی۔''

مولی نے لیپ ٹاپ کھولا اور اس کی انگلیاں کی بورڈ پر چلنے لگیں۔ جم نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''تم کیا کررہی ہو؟''

''کام۔'' مولی نے جواب دیا۔ ''جس کے لیے میں دفتر آتی ہوں۔''

''تم نے جن ویڈیوز کے لیے کہا تھا، وہ مل گئیں؟ تم کہو تو میں اس کام کے لیے کسی کی گردن پکڑوں؟''

مولی نے لیپ ٹاپ کا رخ اس کی جانب کردیا تاکہ وہ بھی دیکھ سکے۔ اسکرین پر سیکیورٹی کیمرے کی ساکت فوٹیج نظر آرہی تھی۔ ''کسی کی گردن پکڑنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے فوٹیج مل چکی ہے۔''

''کیا کوئی نئی بات معلوم ہوئی؟''

''کوئی خاص نہیں لیکن فیرس اور مسٹر فرینکلن نے کار کے بارے میں جو بتایا تھا، وہ چیک ہوگیا ہے۔ وہ گہرے نیلے رنگ کی سیڈان تھی جو دیکھنے میں فورڈ جیسی لگتی ہے۔'' یہ کہہ کر مولی نے پلے کا بٹن دبا دیا۔ اس فوٹیج میں وہ کار مشرق سے مغرب کی طرف جارہی تھی۔

''یہ مڈپورٹ بینک کے کیمرے سے لی گئی ہے۔''

اس نے ایک اور ویڈیو چلائی جو میکلنٹن فارمیسی کے کیمرے سے لی گئی تھی۔ ''اس ویڈیو میں کار ٹیلی گراف سے چالمر روڈ پر جنوب کی طرف جارہی ہے۔'' پھر اس نے میراتھن گیس اسٹیشن کے کیمرے سے لی گئی ویڈیو چلائی جو انکل کے گھر سے آدھ میل کے فاصلے پر ہے۔ ''یہی کار چالمر روڈ سے 175 جنوب کی طرف جارہی ہے۔''

''لائسنس پلیٹ؟''

''نہیں، فوٹیج ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔''

''دفع کرو، کیا ہمیں جائے وقوعہ سے کوئی کارآمد چیز ملی؟''

''ایک کارتوس کا خول۔ نائن ایم ایم۔ اس پر کسی کی انگلیوں کے نشان نہیں ہیں۔ ہمیں کیا، کہاں، کب اور کیسے کا جواب تو مل گیا۔ اب صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کون تھا اور اس نے کیوں گولی چلائی؟''

''تم جانتی ہو کہ اس ساری صورت حال کے بارے میں مجھے کیا چیز پریشان کررہی ہے؟''

مولی نے لیپ ٹاپ دوبارہ اپنی طرف کرلیا اور بولی۔ ''کیا؟''

''فیرس جیسا چڑچڑا بوڑھا سانتا کلاز کا روپ دھار کر ہر سال کرسمس پر شور مچاتے بچوں سے نمٹتا ہے؟''

مولی نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہم یہاں معمے حل کرنے نہیں بیٹھے۔''

جم نے تائید میں سرہلا دیا۔ ''لیکن کچھ ایسے معاملات ہیں جو ہمیں دیکھنے ہیں۔'' مولی نے کہا۔ ''لہٰذا میں یہ جاننے کے لیے جارہی ہوں کہ کس نے میرے انکل کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔''

''نہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' وہ وہیں بیٹھا کافی پیتا رہا۔

مولی نے ٹھنڈی سانس بھری اور چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔ ''شکریہ جم۔''

☆☆☆

ایک ہفتے بعد بھی فیرس کا بازو سلنگ میں تھا بلکہ اسے سلنگ میں ہی ہونا چاہیے تھا۔ اس کے بجائے وہ برش اور چھڑیوں کا بنڈل اٹھائے عقبی صحن میں واقع گڑھے کی طرف لے جارہا تھا۔ جب مولی وہاں پہنچی اور دیکھا کہ وہ کیا کررہا ہے تو اسے ڈانٹنے کے بارے میں سوچنے لگی لیکن اس وقت اس کے پاس اسپرین نہیں تھی جو بحث کے نتیجے میں ہونے والے سردرد کو دور کرنے میں کام آتی۔ لہٰذا اس نے خاموشی اختیار کرلی۔

فیرس نے اس کا خوش دلی سے استقبال کیا اور بولا۔ ''اس طرف آجاؤ۔''

''کیسا چل رہا ہے؟''

''کچھ برا نہیں ہے۔'' فیرس نے وہ بنڈل گڑھے میں پھینکتے ہوئے کہا پھر اس نے اپنے گنجے سر پر سے ٹوپی اتاری اور ماتھے کا پسینا پونچھنے لگا۔ اس کے بعد اس نے اپنی جینز کی

جیب سے لائٹر نکالا اور برش کو آگ لگا دی۔ فوراً ہی لکڑی اور پتوں نے آگ پکڑ لی۔ اسے دیکھ کر مولی کو بہت سی باتیں یاد آ گئیں کہ کس طرح وہ اور اس کی فیملی آگ کے گرد بیٹھ کر ہاٹ ڈاگ اور کباب بھونتے، قصے کہانیاں اور لطیفے سناتے تھے۔ اس دوران نہ جانے کتنے گیلن شراب اور بیئر پی جاتی اور درجنوں پیکٹ سگریٹ پھونکے جاتے۔

چند منٹوں میں وہ بنڈل جل گیا۔ اب وہاں انگاروں، راکھ اور دھوئیں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ وہاں سے واپس مڑے اور سامنے والے صحن کی طرف چل دیے۔ فیرس نے کچرے کا ایک تھیلا اٹھایا جو اس نے پورچ کے باہر رکھا ہوا تھا اور سڑک کی جانب چل دیا۔ مولی بھی اس کے پیچھے تھی۔ وہ مڑا اور بھتیجی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے کسی محافظ کی ضرورت نہیں۔''

''تمہیں یقین ہے؟ گزشتہ بار بھی تم اسی طرح سے باہر آ گئے تھے اور گولی کا نشانہ بن گئے۔''

اس نے قہقہہ لگایا۔ ''ہاں، میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اپنی آنکھیں کھلی رکھو، میں اپنا کام ختم کر لوں۔''

اس نے تھیلا سڑک پر میل باکس کے برابر رکھ دیا پھر اس نے پہلے سڑک کے شمال اور پھر جنوب کی طرف دیکھا اور آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن اگلی بار اپنا ہتھیار لے کر آنا۔''

مولی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں ایسا ہی کروں گی۔''

اچانک اس کی نظر کسی چیز پر گئی جو سڑک کے کنارے گڑھے میں پڑی ہوئی تھی۔ وہ سیاہ رنگ اور ایل کی شکل کی تھی۔ مولی گڑھے کے کنارے پر گئی اور جھک کر نیچے دیکھنے لگی۔

''کیا ہے؟'' فیرس نے پوچھا۔

مولی کی آنکھیں اس چیز پر جم گئی تھیں۔

''مولی؟'' فیرس نے دوبارہ پوچھا۔

وہ نیچے کی جانب جھکی۔ اپنا ایک ہاتھ گھاس پر رکھا اور گڑھے میں کود گئی۔

''تم گڑھے میں کیا چیک کر رہی ہو؟''

مولی نے جھک کر وہ چیز اٹھائی اور کھڑے ہو کر فیرس کی طرف مڑی۔ اس کے ہاتھ میں نائن ایم ایم کا بریٹا پستول تھا۔

سوری جم! میں تمہاری انگوٹھی نہیں لوٹا سکتی، وہی بیچ کر میں نے البرٹ سے شادی کی ہے۔

''اوہ۔'' فیرس نے اپنے کولھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں پاگل ہو جاؤں گا۔''

☆☆☆

''یہ اتنا آسان نہیں ہو سکتا۔'' جم نے کہا۔

''واقعی یہ آسان نہیں تھا۔'' مولی نے جواب دیا۔ ''کیا تم جانتے ہو کہ مجھے اس کے لیے کتنی چھان بین کرنی پڑی اور حوالے دیکھنے پڑے؟''

''ایسا لگتا ہے کہ وہ ہم سے التجا کر رہے ہیں کہ آؤ اور گرفتار کر لو اور میں یہاں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے۔''

''اس بہانے تم دفتر سے باہر نکل کر تازہ ہوا میں سانس لے سکتے ہو۔ اس کے علاوہ تمہاری کچھ ورزش بھی ہو جائے گی۔''

''یہ بدتمیزی ہے۔''

''نہیں، یہ سچ ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' اس نے کہا۔ ''میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تحقیقاتی ٹیم نے کیسے گڑھے میں پڑی ہوئی گن کو نظرانداز کر دیا؟''

''جب فیرس کو گولی لگی تو اس سے ایک رات پہلے طوفان آیا تھا۔'' مولی نے کہا۔ ''اس لیے یہ گن دو دن تک بارش کے پانی میں پڑی رہی۔ اسی وجہ سے اس پر کسی کی نظر نہیں گئی۔ اس کے علاوہ جب یہ معلوم ہوا کہ چلتی گاڑی سے گولی چلائی گئی تھی تو یہ فرض کر لیا گیا کہ گولی چلانے والا اپنے ساتھ ہی ہتھیار لے گیا ہوگا۔''

جم نے کہا۔ ''اچھا پوائنٹ ہے۔''

کار ریڈیو پر پٹرول مین نے بتایا کہ وہ اس جگہ موجود ہیں جہاں سڑک ختم ہوتی ہے اور ایک بلاک کے فاصلے پر مشتبہ شخص کا انتظار کر رہے کہ شاید وہ اس طرف آئے۔ یہ سنتے ہی مولی، جم کے ساتھ اپنی کار سے باہر آئی اور وہ دونوں پیدل ہی اس طرف چل دیے جہاں گہرے نیلے رنگ کی فورڈ فوکسی، موبائل ہوم پارک کے ایک ڈرائیو وے میں کھڑی تھی۔ اس گھر اور کار کے مالک کا نام مسٹر فلپ ڈیوس تھا اور بریٹا نائن ایم ایم بھی اسی کی ملکیت تھا۔

''تم سامنے والے دروازے پر جاؤ۔'' مولی نے جم سے کہا۔ ''میں عقبی دروازے کی طرف جا رہی ہوں۔''

جب وہ پچھلے دروازے کے قریب پہنچی تو اس نے جم کی دستک کی آواز سنی۔ اندر سے کسی نے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ جم نے اپنا تعارف کروایا اور جواب دینے والے شخص سے پوچھا کہ ڈرائیو وے میں کھڑی ہوئی کار اسی کی ہے۔ اس کا جواب ہاں میں ملا۔ اس کے بعد ان دونوں کے درمیان کچھ بات ہوئی۔ اس کے بعد گھر کے اندر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھلا اور ایک نوجوان شخص نکل کر پڑوسی کے صحن کی طرف جانے لگا۔

''رک جاؤ۔'' مولی نے چلّا کر کہا اور وہ نوجوان پتھر کے مجسمے کی طرح اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ وہ اس کے قریب گئی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''کیا کوئی مسئلہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

مولی نے کوئی جواب دیے بغیر اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی۔

☆☆☆

''اگر تم سب کچھ سچ سچ بتا دو تو اس میں تمہارے لیے آسانی رہے گی۔'' مولی نے کہا۔

پال ڈیوس نے کمرائے تفتیش میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا۔

''پال! تم نے میری بات سن رہے ہو؟'' مولی بولی۔

پال نے اپنا گلا صاف کیا اور مشروب کا ایک گھونٹ لیا جو مولی اس کے لیے لائی تھی۔ اس نے مولی کے سامنے رکھے ہوئے فولڈر کو دیکھا پھر اس کی نظریں اس پلاسٹک کی تھیلی پر جم گئیں جس میں پستول رکھا ہوا تھا۔

پال کا دادا اس کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے میز پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''اس کی بات کا جواب دو۔''

''میں...... ایک بینک کو لوٹنے جا رہا تھا'' لڑکے کو بالآخر بولنا پڑا۔

فلپ ڈیوس نے اپنی کمر کرسی کی پشت سے لگائی اور اپنے دونوں بازو سینے پر باندھ لیے۔ مولی نے اس کے کھردرے چہرے پر غصے کے آثار دیکھے۔ اس کے جبڑے بھینچ گئے تھے اور اس کی کنپٹی کے نزدیک ایک رگ ابھر آئی تھی۔

مولی دوبارہ پال کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''اپنی بات جاری رکھو۔''

''میرا ارادہ اندرونِ شہر واقع فرسٹ نیشنل بینک کو لوٹنے کا تھا۔ میں وہاں ان سے یہ کہنے جا رہا تھا کہ وہ بینک میں موجود تمام رقم ایک تھیلے میں بھر کر میرے حوالے کر دیں۔''

بوڑھے شخص نے اسے غصے سے دیکھا اور طنزیہ انداز میں ہنسنے لگا۔

''لیکن میں خوف زدہ ہو گیا۔ میں......'' لڑکے نے ایک بار پھر گلا صاف کیا اور مشروب کا ایک اور گھونٹ لیا پھر اس نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھے اور ایک ہلکی سی ڈکار لی پھر معذرت کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے اپنے آپ کو روک لیا۔ جب مجھے احساس ہوا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ یہ میری حماقت تھی۔ لہٰذا میں واپس مڑ گیا اور شام تک سوچتا رہا۔''

''تمہیں یہ خیال نہیں آیا کہ کوئی بھی تمہارے دادا کی کار دیکھ سکتا ہے یا اس کی لائسنس پلیٹ کا نمبر نوٹ کر سکتا ہے؟'' مولی نے کہا۔ ''تم نے یہ نہیں سوچا کہ اس طرح وہ مشکل میں پڑ جائے گا؟''

''میں نے سوچا تھا۔''

''اوہ، کیا واقعی؟'' اس کے دادا نے ایک بار پھر طنز کیا۔

''میرا مطلب ہے کہ جب مجھے حقیقت کا احساس

ہوا۔‘‘

’’پال، یہ شخص تمہارا قانونی سرپرست ہے۔‘‘ مولی نے فلپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’میں جانتا ہوں۔‘‘

’’یہ تمہاری دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس نے تمہیں رہنے کے لیے گھر دے رکھا ہے اور تم اسے تقریباً ایک بینک ڈکیتی میں ملوث کرنے والے تھے؟‘‘

پال کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ آدھ منٹ بعد اس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور اپنے دادا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’اس نے ساری زندگی بہت محنت کی ہے۔ یہ ایک کسان کے گھر پیدا ہوا۔ اس کی جوانی کھیتی باڑی میں گزری اور گزشتہ برس تک ایک کاغذ کے کارخانے میں کام کرتا رہا۔ اس نے ساری عمر بڑی مشقت کی ہے۔‘‘

’’اپنا منہ دیکھو۔‘‘ فلپ نے ایک بار پھر طنز کیا۔

’’اس نے جو کمایا، وہ جمع کرتا رہا۔‘‘ پال اس کے ہاتھوں کو دیکھتا رہا۔ ’’لیکن گزشتہ موسم گرما میں یہ بیمار ہوگیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں کینسر تھا۔ ساری جمع پونجی اس کی بیماری میں خرچ ہوگئی۔‘‘ اس نے آستین سے اپنی آنکھیں پونچھیں۔

’’میں کوئی ملازمت کرنا چاہ رہا تھا تاکہ اس کی مدد کر سکوں۔‘‘

مولی نے دیکھا کہ بوڑھے فلپ کے چہرے کا تناؤ کچھ کم ہوگیا۔ اب اس نے اپنے بازو سینے سے ہٹا کر زانو پر رکھ لیے تھے۔

’’میں جہاں کام کرتا تھا، وہ بہت کم معاوضہ دیتے تھے۔‘‘ پال نے ایک بار پھر آستین سے آنکھیں پونچھیں۔ ’’وہ رقم ہمارے اخراجات کے لیے ناکافی تھی۔ ہمیں کچن کا خرچہ چلانے اور بلوں کی ادائیگی میں مشکل پیش آرہی تھی۔ قرض خواہ بار بار اسے فون کر کے پیسوں کا مطالبہ کرتے۔ مجھ سے یہ سب نہیں دیکھا گیا۔ میں نے سوچا کہ اب مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ تب میں نے بینک لوٹنے کا منصوبہ بنایا۔ میں جانتا تھا کہ یہ غلط ہے اور مجھے ایسی کوئی حماقت نہیں کرنی چاہیے لیکن میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔‘‘

اس نے مولی کے چہرے پر اپنی سیاہ آنکھیں گاڑ دیں۔ ’’یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ ایک شخص جس نے ساری زندگی کام کیا ہو اور جب وہ بیمار پڑ جائے تو میں اس کی مدد کے لیے کچھ نہ کروں۔‘‘

مولی نے بوڑھے فلپ کی طرف دیکھا لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ لگتا تھا کہ وہ خیالوں میں کھویا ہوا ہے۔ وہ ایک بت کی طرح خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

’’جب میں بینک جانے کا ارادہ ملتوی کر کے واپس آرہا تھا تو مجھے احساس ہوا کہ پستول میرے برابر میں پڑا ہوا ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر کوئی پولیس والا مجھے روک لیتا تو کیا ہوتا؟ کسی بھی صورت اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلنا تھا۔ میں گھبرا گیا اور کھڑکی کا شیشہ کھول کر اسے باہر پھینک دیا۔‘‘

مولی نے برابر رکھے ہوئے پلاسٹک بیگ پر ہاتھ مارا۔ ’’میں سمجھتی ہوں کہ تم ہتھیار کے معاملے میں زیادہ پُرجوش نہیں ہو؟‘‘ اس نے بوڑھے فلپ سے پوچھا۔

’’نہیں۔‘‘ وہ بے حسی سے بولا۔ وہ اب بھی خلا میں گھور رہا تھا۔ ’’میں نے اسے گھر کی حفاظت کے لیے رکھا ہوا تھا۔ مجھے اس کی کبھی خواہش نہیں تھی۔ البتہ میری بیوی چاہتی تھی کہ ہمارے پاس حفاظت کے لیے کوئی ہتھیار ہو۔ میری بیوی کو مرے ہوئے دس سال ہوچکے ہیں۔‘‘

’’اور میرا خیال ہے کہ اس کے بعد تم نے فائر کرنا تو درکنار کبھی اسے دیکھا بھی نہیں ہوگا؟‘‘

فلپ نے سر ہلا دیا۔ ’’اور نہ ہی کبھی اس کی صفائی کی؟‘‘ مولی نے پوچھا۔ فلپ نے دوبارہ سر ہلا دیا۔

’’میں اس پر یقین کرسکتی ہوں جب ایک پستول کافی عرصے تک پڑا رہے۔‘‘ اس نے اپنے فولڈر سے ایک تصویر نکالی اور پال کے سامنے رکھ دی۔ ’’تو وہ بڑی آسانی سے ڈسچارج ہوسکتا ہے۔ خاص طور پر جب اسے گرایا جائے یا کار کی کھڑکی سے باہر پھینکا جائے۔‘‘

’’یہ کیا ہے؟‘‘ پال نے تصویر پر جھکتے ہوئے کہا۔

’’یہ میرے انکل کے بازو کا زخم ہے جو تمہارے پستول کی گولی لگنے سے آیا ہے۔‘‘

بوڑھے فلپ کے چہرے کا خون خشک ہوگیا۔ ’’اوہ میرے خدا پال......‘‘ اس کی آواز بھرّا گئی۔

’’اس کی سمت میں فائر ہونے اور اس زاویے پر گولی لگنے کے امکانات بہت کم تھے لیکن ایسا ہوگیا۔‘‘ مولی نے کہا۔ ’’اور اس کی وجہ سے وہ مر بھی سکتا تھا۔ تم میری بات سن رہے ہو؟‘‘

پال کا پورا جسم کپکپا رہا تھا اور وہ ہچکیوں سے رو رہا تھا۔

’’یقیناً اس کی نظر اس پر نہیں گئی اور اسے سنبھلنے کا موقع نہیں ملا لیکن وہ ستاسی سال کا بوڑھا ہے اور ایک چھوٹا سا زخم یا معمولی خراش بھی اس عمر کے آدمی کے لیے نقصان دہ ہوسکتی ہے۔‘‘

”میرا یہ مقصد نہیں تھا۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ میں......“ پال نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

مولی نے کہا۔ ”میں سرکاری وکیل سے بات کروں گی اور دیکھوں گی کہ اس معاملے پر کوئی تصفیہ ہوسکتا ہے۔“

پال نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

”اس کے علاوہ میں ہیلتھ اینڈ ہیومن سروسز ڈپارٹمنٹ میں اپنی ایک دوست سے بات کروں گی کہ تمہاری کس طرح مدد کی جاسکتی ہے۔“ اس نے بوڑھے فلپ سے کہا جس نے بڑبڑاتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔

”ہاں۔“ پال نے بھی کہا۔ ”تمہارا بہت بہت شکریہ۔“

”میرا شکریہ ادا مت کرو۔“ مولی نے کہا۔ ”اگر سرکاری وکیل سمجھتا ہے کہ ہمیں الزامات پر زور نہیں دینا چاہیے تو تم جیل جانے سے بچ جاؤ گے۔“

☆☆☆

ایک ہفتے بعد فیرس اپنے پورچ میں کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دونوں انگوٹھے کمر کی پیٹی میں ڈالے اور بولا۔ ”یہی احمق ہے جس نے مجھے مارنے کی کوشش کی تھی؟“

پال ڈیوس، مولی کے برابر کھڑا ہوا تھر تھر کانپ رہا تھا۔

فیرس نے چلاتے ہوئے کہا۔ ”سامنے آؤ۔“

پال نے بے بسی سے مولی کی طرف دیکھا۔ ”وہ چاہتا ہے کہ تم اس کے سامنے کھڑے ہو جاؤ۔“ مولی نے نرمی سے کہا۔

پال اس جانب چل دیا۔ جہاں فیرس کھڑا ہوا تھا۔ اس نے پال کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے دادا نے مجھے فون کر کے کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ جو چاہوں سلوک کروں۔“ اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ”تھنڈر ہوم میں خوش آمدید۔ اپنے قیام کا لطف اٹھاؤ۔“

پال کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری آواز جانی پہچانی لگتی ہے۔“

فیرس پہلے مسکرایا پھر قہقہے لگانے لگا۔ پال کو جیسے ہی اس کا احساس ہوا۔ وہ اپنے گال پر تھپڑ مارتے ہوئے بولا۔ ”اوہ، میرے خدا۔“

”ہاں، تم نے سانتا کلاز کو تقریباً مار ہی دیا تھا۔ اس کی کچھ نہ کچھ سزا تو ملنی ہی چاہیے۔ گیرج میں جاؤ۔ وہاں سے گھاس کاٹنے والی مشین لے کر آؤ۔ سامنے والے لان سے شروع کرنا پھر مکان کے دونوں طرف اور اس کے بعد پیچھے والا لان۔ تمہیں یہ یقین ہونا چاہیے کہ پوری طرح گھاس کی صفائی ہوگئی ہے۔ میں محدب عدسے سے تمہارے کام کا معائنہ کروں گا۔“

پال نے مولی کی طرف دیکھا۔ اس کا منہ بن گیا تھا۔

”وہ مذاق نہیں کر رہا۔“ مولی نے کہا۔ ”وہ ایسا ہی کرے گا۔“

پال نے گیرج کی طرف اس طرح چلنا شروع کیا جیسے کوئی مجرم پھانسی کے تختے کی طرف جاتا ہے۔

مولی اپنے انکل کے گلے لگ گئی اور اس سے کہا کہ وہ اس لڑکے پر ہلکا ہاتھ رکھے۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ”بچوں کے ساتھ نرمی کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ بینک لوٹتے اور معصوم لوگوں پر گولی چلاتے ہیں۔“

”اس نے کوئی بینک نہیں لوٹا۔“ مولی نے اسے بتایا۔ ”اور تم بھی اتنے معصوم نہیں ہو۔“

فیرس نے اس کے الفاظ پر غور کیا اور بولا۔ ”ہاں یہ سچ ہے۔“ پھر اس نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ اس کا پڑوسی چیف فرینکلن اپنی کھڑکی سے جھانک رہا ہے۔ اس نے فیرس کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ اسے یہ دخل در معقولات پسند نہ آئی اور اس نے اس کے مکان کی طرف مڑ کر اس کا منہ چڑا دیا۔ فرینکلن اس کے غصے سے بہت ڈرتا تھا اس لیے فوراً ہی کھڑکی سے ہٹ گیا۔

پال گھاس کاٹنے والی مشین لے کر آیا اور اسے چلانے سے پہلے اس نے مولی سے پوچھا۔ ”کیا میں اب بھی جیل جا سکتا ہوں؟“

”کیوں؟ تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟“

”میرا خیال ہے کہ وہ جگہ یہاں سے بہتر ہوگی۔ وہاں مجھے کوئی ڈر نہیں ہوگا۔“

مولی اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی۔ ”شاید نہیں۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔“

اس کے بعد کئی روز تک چالمر روڈ پر مشین چلنے اور ایک بوڑھے شخص کے چلانے کی آواز آتی رہی جسے شکایت تھی کہ پال ڈیوس نے پوری طرح گھاس کی کٹائی نہیں کی ہے اور پال پچھتا رہا تھا کہ اگر وہ اپنا پستول سڑک کے کنارے نہ پھینکتا یا مولی اسے جیل بھیج دیتی تو اسے یہ عذاب نہ سہنا پڑتا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے کب تک یہ مشقت اور بوڑھے فیرس کی ڈانٹ ڈپٹ برداشت کرنی ہوگی؟

❖❖❖

سازش

اعزاز سلیم وصلی

نیک نیتی کو ثمر آور ہونے کے لیے سچ سے سیراب کرنا پڑتا ہے۔ سچ کی اپنی روشنی ہوتی ہے... اپنی حکمرانی ہوتی ہے... ایک ایسا ہی سنچ جو منصفانہ نگاہوں سے اوجھل تھا... مگر ایک بیدار مغز نے اس کا نشان پالیا تھا... وہ محتاط تھا... مگر سچائی کے دشمنوں نے اسے دربدر کردیا تھا... اسے ایک جائے پناہ کی تلاش تھی... وہ اپنے ہی آشیانے میں بے سائبان تھا... تجسس... سنسنی سے بھرپور شاہکار...

سرزمین وطن کے لیے کی جانے والی تباہ کن سازشوں کے تانے بانے

واشنگٹن، اگست 2018

ہفتے کی رات تھی۔

اس رات یہ شہر ساری رات جاگتا تھا۔ دوسرے دن چھٹی کی نوید لاتے سورج کو دیکھنا کسی کے نصیب میں نہ ہوتا تھا کیونکہ شہر بھر کی نوجوان نسل ساری رات سڑکوں پر، نائٹ کلبوں میں اور بار میں آوارہ گردی کرتی تھی۔ شہر کے وسط میں ایک گول عمارت تھی جس کی طرز تعمیر کسی فٹ بال کے اسٹیڈیم کی طرح تھی۔ اس عمارت کی تیسری منزل پر ایک...
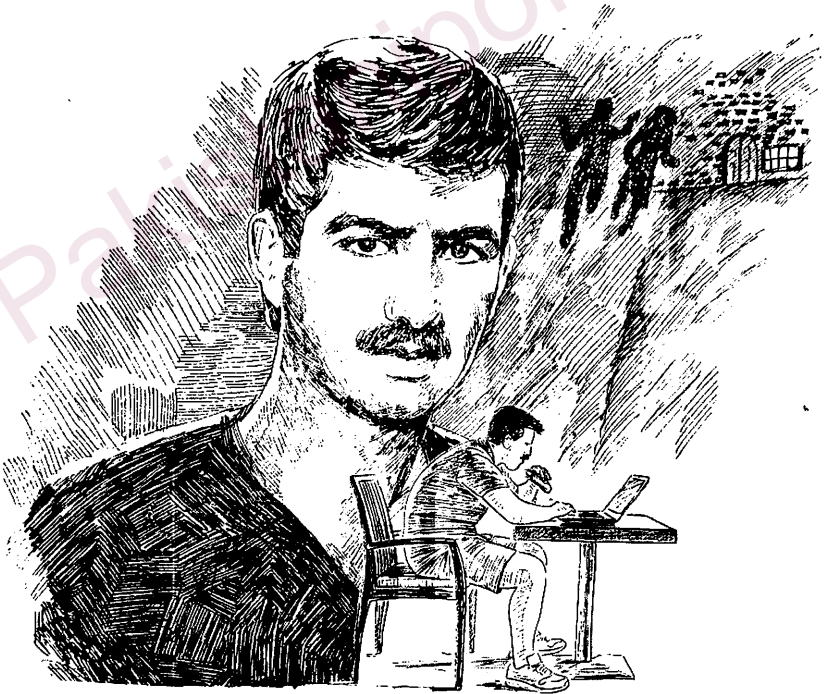
دفتر تھا جو دیکھنے میں عام سا تھا مگر اس وقت وہاں کے انتظامات دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس رات وہ کمرا ہرگز عام نہیں۔ دفتر میں سجی شیشے کی میز پر وائن کی بوتل کے ساتھ سادہ ڈیزائن کا گلاس بھی رکھا ہوا تھا۔ کمرے میں موجود دونوں افراد فی الحال وائن میں دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ ایک شخص کے چہرے پر تناؤ تھا جبکہ دوسرا اس سے مرعوب نظر آتا تھا۔ دو تین منٹ گہری خاموشی کے بعد سفید فام شخص اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

''منصوبے کی کامیابی کا انحصار مکمل طور پر آپ لوگوں پر ہے۔ ہم صرف پیسے خرچ کر سکتے ہیں بس...... باقی کا کام آپ کے ذمے ہوگا مسٹر شرما۔'' اس نے گہری نظروں سے راہول شرما کی طرف دیکھا جو فی الحال جواب دینے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ اس کی نظریں سیکیورٹی کیمرے پر جمی ہوئی تھیں۔ سفید چمڑی والے کا رعب ضرور تھا مگر سیکیورٹی کیمروں کی موجودگی میں وہ آرام محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس بار یہ خاموشی طویل تھی۔ آخر راہول شرما کی کھنکھارنے کی آواز نے کمرے میں موجود زندگی کا احساس جگایا۔

''سر ڈیوڈ...... مجھے کہا گیا تھا، یہ بات چیت حکومت کی طرف سے ہے لیکن ہماری یہ میٹنگ آف دی ریکارڈ ہوگی۔ ایسے میں ان سیکیورٹی کیمروں کی موجودگی کیا معنی رکھتی ہے؟'' ڈیوڈ کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''فضول بات...... سیکیورٹی کیمروں کی موجودگی سیکیورٹی کے لیے ہے اور اس کی ریکارڈنگ کل صبح تک ضائع کر دی جائے گی۔'' شرما مطمئن نہیں تھا۔ اس نے بات کرنے میں وقفہ لیا اور کچھ دیر بعد دوبارہ کھنکھار کر وائن کے ساتھ پڑی پانی کی بوتل اٹھائی اور گلاس کو تکلیف دیے بغیر دو گھونٹ حلق سے اتارے۔ اس کے تاثرات کچھ معمول پر آتے دکھائی دیے۔

''وہاں اب نئی حکومت ہے۔ حالات بدل رہے ہیں...... ہمارا کنٹرول پہلے کی طرح نہیں ہے۔''

''یہ بہانے سننے کے لیے آپ کو یہاں آنے کی دعوت نہیں دی گئی ہے۔'' ڈیوڈ نے بات کاٹ کر خشک لہجے میں کہا۔ شرما بُرا نہیں منا سکتا تھا۔

''یہ بہانے نہیں، حقیقت ہے جس تیزی سے حالات تبدیل ہوئے ہیں، وہ آپ سب کے سامنے ہیں مسئلہ یہ ہے کہ پیسے کی خاطر ہمارے ساتھ مل جانے والے چند لوگ بھی اب خوفزدہ ہیں۔''

''تو صاف بتائیں، آپ نہیں کر سکتے یہ کام۔''

''میں نے یہ نہیں کہا۔''

''آپ کا مطلب تو یہی ہے......'' وہ ہنسا۔

''ہم کریں گے ضرور مگر انہیں کہیں اور الجھا کر۔ اس کام کے لیے محنت کی ضرورت ہوگی۔ جس اقلیت کو ہم نشانہ بنانا چاہتے ہیں، وہ اس ملک کی آبادی کا دو فیصد ہے اور پھر جو آپ کا منصوبہ ہے اس کے لیے ہمیں اس آبادی کو اس طرح ٹارگٹ کرنا ہوگا کہ وہ کیس وائرل ہو جائیں۔''

''سوشل میڈیا کے اس دور میں تمہارے خطے کے دو ممالک میں کوئی بھی چیز وائرل کرنا مشکل نہیں، وہاں تو لوگ بڑے شوق سے ویڈیو بنا کر اپلوڈ کرتے ہیں اور جتنی پڑھی لکھی وہاں کی عوام ہے......'' وہ چند لمحوں کے لیے رکا اور اپنی مخصوص طنزیہ مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بات مکمل کی۔ ''یہ عوام بھی سیاست، مذہب اور علاقے کی بنیاد پر اس چیز کو مزید وائرل کرنے میں ہماری مدد کرے گی۔'' راہول شرما نے بائیں کان کی لو کو پکڑ کر کھینچا۔

''آپ کی باتیں کافی حد تک درست ہیں لیکن......''

''لیکن کو چھوڑیں مسٹر شرما......'' ڈیوڈ نے ہاتھ کھڑا کیا۔ ''ہمیں اگلے چند ماہ میں ٹارگٹ مکمل کرنا ہے، کام کر سکتے ہیں تو بتائیں۔'' راہول نے گہری سانس لی اور سر ہلا کر بولا۔

''ٹھیک ہے، ڈن۔'' ڈیوڈ کی مسکراہٹ میں خوشی نمایاں ہوگئی۔ وہ کچھ اور کہنے لگا تھا کہ پیچھے موجود کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس نے ناگواری سے آنے والے شخص کی طرف دیکھا۔

''دو منٹ سر، پلیز...... ایمرجنسی۔'' آنے والے کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔ ڈیوڈ کھڑا ہوا۔

''آپ بیٹھیں مسٹر شرما...... میں آیا ابھی۔'' کمرے میں راہول اکیلا رہ گیا۔ ڈیوڈ دوسرے کمرے میں آکر سیکیورٹی پر برس پڑا۔

''اتنی اہم میٹنگ چل رہی ہے اور تم وہاں دخل دے رہے ہو، کیا مصیبت ہے؟''

''سر...... سیکیورٹی سسٹم ہیک ہو گیا ہے۔'' ڈیوڈ کا سر گھوم گیا۔ وہ اس جملے کا مطلب بخوبی سمجھتا تھا۔ وہ لپک کر ماسٹر کمپیوٹر کے پاس آیا جس سے پوری سیکیورٹی کنٹرول ہو رہی تھی۔ کمپیوٹر آپریٹر کنٹرول واپس حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف تھا مگر ابھی تک وہ ناکام دکھائی دیتا تھا۔ ڈیوڈ کو دیکھ کر اس کی زبان بھی چل پڑی۔

''مجھے خطرہ محسوس ہوا تھا۔ میں نے پاسورڈ تبدیل کیا

مگر تب تک جو کوئی بھی تھا، اپنا کام مکمل کر کے نکل چکا تھا۔ مجھے نہیں لگتا یہ کسی نے پلان کے تحت کیا ہے، کوئی غلطی سے گھسا ہے کمپیوٹر سسٹم میں۔‘‘

’’کیسے؟‘‘ ڈیوڈ غرایا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ ابھی وہاں کھڑے تمام افراد کو گولی مار دیتا۔

’’اگر وہ پلان کر کے ہیک کرتا تو لازمی بات ہے اسے ہماری غلطی کا انتظار کرنا پڑتا مگر......‘‘ ڈیوڈ کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ آپریٹر کو بات ادھوری چھوڑنی پڑی مگر اتنی دیر میں وہ کنٹرول واپس حاصل کر چکا تھا۔ ہیکر اپنا نشان چھوڑ گیا تھا۔ اس نے جلدی سے کی بورڈ پر ہاتھ چلائے اور وہ نشان حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لوکیشن تیزی سے شو ہو رہی تھی...... ڈیوڈ کال بند کر کے واپس آیا۔

’’اب کیا کر رہے ہو؟‘‘

’’سر ہیکر کی لوکیشن مل گئی......‘‘ آپریٹر کی آواز میں جوش تھا۔ ڈیوڈ کی نظریں لوکیشن پر جم گئیں۔ الفاظ ظاہر ہوئے، یہ چین کا کوئی علاقہ شو ہو رہا تھا۔

☆☆☆

شنگھائی، جولائی 2018

کئی کروڑ آبادی کا شہر رات کے اس پہر خاموش تھا۔ یونیورسٹی آف ٹیکنالوجی جسے دنیا یونیورسٹی آف شنگھائی کے نام سے جانتی ہے کہ سامنے موجود بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں لائٹ آن تھی اور وہ لیپ ٹاپ کے سامنے نظریں جما کر بیٹھا تھا۔ کافی کا کپ لیپ ٹاپ کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یونیورسٹی کا کوئی محنتی اسٹوڈنٹ رات کے اس وقت ایگزامز کی تیاری میں مصروف ہے مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ وہ اسٹوڈنٹ ضرور تھا مگر اس وقت وہ پڑھنے کے بجائے ایک خفیہ ویب سائٹ پر اپنا اکاؤنٹ لاگ ان کر کے اپنی پچھلی کارکردگی پر لوگوں کے تبصرے پڑھ کر خوش ہو رہا تھا۔ ’’چیلنج ورلڈ‘‘ کے نام کی یہ ویب سائٹ یونیورسٹی آف شنگھائی کے ایک پروفیسر، ژونگ نے بنائی تھی جس کے ممبر پوری دنیا میں موجود بہترین ہیکرز تھے۔ اس کی ممبرشپ کی سالانہ فیس کافی زیادہ تھی مگر پروفیسر ژونگ کا پسندیدہ اسٹوڈنٹ ہونے کی وجہ سے اس کو یہ ممبرشپ فری ملی تھی۔ یہاں ہیکرز ایک دوسرے کو چیلنج کے طور پر ٹاسک دیتے تھے۔ چیلنج دینے والا اگر ہار جاتا تو اسے ٹاسک پورا کرنے والے کو مقررہ رقم ادا کرنا پڑتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ہیکرز دنیا کے اس کھیل میں ایک چیلنج پر لاکھوں ڈالرز کا جوا بھی لگتا تھا۔ پروفیسر ژونگ کی اس ویب سائٹ پر اشتہارات اس درجہ مہنگے تھے کہ ایک کلک کا ریٹ کئی ڈالرز تھا۔ اس کے اکاؤنٹ میں کچھ دیر پہلے پانچ ہزار ڈالرز جمع ہوئے تھے۔ خوشی اس کے چہرے پر نمایاں تھی کہ اس کی نظر ایک اور چیلنج پر پڑی۔ یہ ایک انڈین ہیکر نے کیا تھا جس نے اس کا یوزرنیم ٹائپ کر کے لکھا تھا۔

’’مسٹر اے ایچ زی، میں تمہیں پچاس ہزار ڈالرز دوں گا اگر تم میرا ایک ٹاسک پورا کر دو۔‘‘ انڈین ہیکر کا یوزر نام ’ایم ڈبلیو‘ لکھا ظاہر ہوا۔ پچاس ہزار ڈالرز بہت بڑی رقم تھی۔ اس طرح کا چیلنج قبول کرنا مشکل تھا کیونکہ ناکامی کی صورت میں اسے آدھی رقم ایم ڈبلیو کے اکاؤنٹ میں جمع کروانی پڑتی۔

’’کچھ دن میں مصروف ہوں۔ بعد میں بتانا۔‘‘ اس نے بہانہ بنانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ایک طنزیہ ایموجی کے ساتھ لکھا نظر آیا۔

’’ڈر گئے؟ ویسے مجھے اندازہ تھا کہ تم قبول نہیں کرو گے کیونکہ پچھلے دنوں تمہاری اصل شناخت ڈھونڈنے کی کامیاب کوشش کی تھی میں نے۔ معلوم ہوا تم اسی ملک سے ہو جہاں تم جیسے غریبوں کو بھیک دے کر بیرونِ ملک پڑھایا جاتا ہے۔ بھکاری سالا......‘‘ کسی کو غصہ چڑھانے کا روایتی طریقہ تھا۔ وہ جانتا تھا اس ویب سائٹ پر کئی اچھے ہیکر دوسرے ہیکر کی شناخت جان جاتے ہیں مگر اس انڈین ہیکر کی بات سن کر وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا۔

’’اگر شناخت کی ہے تو اتنا بھی علم ہوگا کہ صرف ہمارے ملک سے نہیں، تمہارے ملک سے بھی کئی لوگ یہاں اسکالرشپ...... بقول تمہارے، بھیک پر پڑھنے آتے ہیں۔‘‘

’’رومت...... دم ہے تو چیلنج قبول کر۔‘‘ اس نے گہری سانس لی۔ انڈین اسے جذباتی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

’’ٹاسک بتا۔‘‘ اس کے جواب میں انڈین نے لکھا۔

’’ٹاسک یہاں نہیں...... انباکس کروں گا۔ قبول کر میسج ریکوئسٹ۔‘‘ اس نے ویب کے ساتھ جڑی مخصوص میسج ایپ کھولی اور انڈین کو ٹاسک بھیجنے کا میسج کیا۔ کچھ دیر بعد اس کے انباکس میں تصویر ظاہر ہوئی۔ یہ گول عمارت کی تصویر تھی جو دیکھنے میں ایک عام سے کاروباری مرکز کی عمارت لگتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایم ڈبلیو کا میسج ظاہر ہوا۔

’’اس عمارت کے تیسرے فلور کا سیکیورٹی سسٹم ہیک کر کے دکھانا ہوگا...... اس کے سیکیورٹی کیمروں کی ویڈیوز،

اس منزل کے کمروں کی تفصیل...... ایک ایک چیز۔'' ٹاسک دیکھ کر وہ الجھ گیا۔ اس نے عمارت کے بارے میں مزید سرچ کرنا شروع کر دیا۔ اگر یہ کاروباری مرکز تھا تو اس کا سیکیورٹی سسٹم ہیک کرنا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا مگر وہ جانتا تھا انڈین اتنا بے وقوف ہرگز نہ تھا کہ اسے اتنا آسان ٹاسک دے کر پچاس ہزار ڈالر کی شرط لگا دیتا۔ پانچ منٹ میں ہی وہ اس عمارت کے بارے میں مکمل جان گیا تھا۔ یہ عمارت امریکی حکومت کی خفیہ سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ اس کی جدید سیکیورٹی کا مکمل کنٹرول کسی ایجنسی کے آئی ٹی سیل کے ہاتھ میں تھا۔ یہ کام ناممکن حد تک مشکل تھا۔ ابھی وہ کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ انڈین کی ایک اور پوسٹ اس کی نظروں سے گزری۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ لکھا تھا......

''اے ایچ زی نے میرا چیلنج قبول کر لیا ہے۔ دیکھتے ہیں اب اس کی کامیابی اور ناکامی پر کون پیسے لگاتا ہے؟''

اس کے ساتھ ہی اس نے چیلنج کی مکمل تفصیل شیئر کر دی۔ اس کے پاس ایک ماہ کا وقت تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور دماغ کو سوچوں سے آزاد کر کے لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ سونے کے لیے بستر پر جاتے ہوئے اس کا دماغ بالکل صاف تھا۔

ایک ہفتے بعد اس نے دیکھا...... اس کی کامیابی یا ناکامی پر تقریباً دو سے تین لاکھ ڈالرز کا جوا لگ چکا تھا۔ اب یہ عزت کا معاملہ تھا۔ اس نے کوشش شروع کر دی۔ سب سے پہلا مشکل ٹاسک اس سیکیورٹی سسٹم تک رسائی تھی۔ پاسورڈ توڑ کر ڈیٹا حاصل کرنا بہت بعد میں آتا تھا۔ اس کے پاس اس سسٹم کے متعلق معلومات صفر کے برابر تھی۔ اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ عمارت کی دوسری منزل پر کسی اخبار کا دفتر تھا۔ اس نے پوری عمارت کی سیکیورٹی کنٹرول کرنے والے مین کمپیوٹر تک رسائی حاصل کی اور ڈیٹا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا مگر یہ دیکھ کر اس کا منہ بن گیا کہ اس ڈیٹا میں تیسری منزل کے بارے میں معلومات کا خانہ خالی تھا۔

پروفیسر ژونگ سے اس کی اچھی دوستی اور بے تکلفی تھی۔ اس نے پروفیسر سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دوسرے دن شام سات بجے وہ پروفیسر کے گھر اس سے ملنے چلا گیا۔ اس دن اتوار تھا اور یونیورسٹی آف تھی۔ پروفیسر حسبِ معمول اپنے گھر میں بنائے گئے کمپیوٹر لیب میں مصروف تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

''کیسے ہو اے ایچ؟'' وہ اسے یوزر نیم سے ہی پکارتا تھا۔

''ٹھیک ہوں سر، آپ کیسے ہیں؟'' وہ یہاں اکثر آتا رہتا تھا۔ پروفیسر کے گھر والوں سے بھی اس کی اچھی دوستی تھی۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے دلچسپی سے ایل سی ڈی کی طرف دیکھا جس پر کسی نئے پروگرام کی پروگرامنگ تیزی سے ظاہر ہو رہی تھی۔

''میں بھی ٹھیک ہوں...... کافی؟''

''ضرور۔'' اس کا جواب سن کر پروفیسر نے بیل بجائی۔ دو منٹ بعد اس کا ملازم اندر داخل ہوا۔ پروفیسر نے اسے کافی لانے کا کہا اور اے ایچ کی طرف دیکھ کر بولا۔

''ایم ڈبلیو کے چیلنج سے پریشان ہو؟'' اس کی بات سن کر وہ چونک گیا۔ پروفیسر ہنسا۔ اپنی ویب پر ہونے والی ہر بات کا علم اسے ہوتا تھا۔

''ہاں...... اصل میں۔'' ابھی وہ کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ پروفیسر نے اس کی بات کاٹ دی۔

''اس عمارت کا سیکیورٹی سسٹم ہیک کرنے کے لیے روایتی طریقے کامیاب نہیں ہوں گے۔ تمہارے پاس پوری سیکیورٹی میں سے کسی شخص کا ای میل ایڈریس تک نہیں ہوگا۔ یہ کوئی بینک اکاؤنٹ تو ہے نہیں کہ جس کے مالک کو ٹریس کر کے تم اس کے پیسے چرا لو گے۔ یہ خفیہ ادارے کا سیکیورٹی سسٹم ہے۔''

''مطلب میں اپنے اکاؤنٹ میں سے پچیس ہزار ایم ڈبلیو کو دینے کے لیے تیار ہو جاؤں؟'' اس نے ہلکے انداز میں کہا۔ پروفیسر ہنس پڑا۔

''دو سال ہو گئے ہیں تمہیں یہاں۔ اتنا تو میں دو سالوں میں جان چکا ہوں کہ تم ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہو، ڈھیٹ ہڈی ہو۔'' وہ مسکرا دیا۔ پروفیسر نے بات بڑھائی۔ ''میرے پاس مدد کے لیے آئے ہو تو بھول جاؤ۔ میں کسی کے چیلنج میں دخل نہیں دے سکتا، چاہے میرا سگا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔''

''پھر وقت ضائع کرنے کے بجائے میں اپنا لیپ ٹاپ سنبھالنا پسند کروں گا۔'' وہ کھڑا ہوا۔ ژونگ نے اس سے ہاتھ ملایا۔

''ایک بات یاد رکھنا...... امریکی قوم دنیا کی عیار ترین قوموں میں سے ایک ہے، اگر انہیں شک بھی پڑ گیا کہ یہ سسٹم اڑانے کی کوئی کوشش کر رہا ہے تو ان کا تم تک پہنچنا آسان ہوگا۔ ایک دن بھی نہیں لگے گا...... چیلنج ضرور پورا کرو مگر اپنی شناخت خفیہ رکھنا۔''

''ڈرائیں مت......''

''تم ڈرنے والی قوم سے نہیں دوست۔'' ژونگ کی بات مکمل ہونے کے بعد وہ واپس مڑا تھا کہ اس کے کندھے پر دباؤ پڑا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ ژونگ نے ایل سی ڈی کی طرف اشارہ کیا۔

''ہیکنگ میں ایسے پروگرام بنانا تمہیں پہلے قدم پر سکھائے جاتے ہیں جن کو صرف پہلی ہدایت کی ضرورت ہوتی ہے اس کے بعد وہ خود بخود رن ہو جاتے ہیں اور نیکسٹ کو ہدایت بھی وہ خود دیتے ہیں...... جب کوئی کام مشکل لگے تو اس کی بنیاد کی طرف لوٹ کر حل تلاش کرتے ہیں......''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پروفیسر کی بات دماغ میں رکھ کر اس نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اگلے بیس دن وہ دن رات ایک کر کے اس کام میں لگا رہا۔ اپنے بنائے گئے سوفٹ ویئر اور پروگراموں کی مدد سے اس نے سیکیورٹی سسٹم کو ٹریس کرنا شروع کر دیا۔ اس دن چیلنج کی آخری تاریخ تھی جب ایم ڈبلیو کا میسج شو ہوا۔

''تو کب آ رہے ہیں پچیس ہزار ڈالرز...... میرے اکاؤنٹ میں؟''

☆☆☆

سندھ، اکتوبر 2018ء

''سنوری...... سنوری۔'' اماں کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ اس نے اپنی دلہن بنی گڑیا کے چھوٹے سے گھر کو جلدی سے سمیٹا اور گڑیا کے سر پر سے دوپٹہ اتار کر بولی۔

''چلو لاڈلی اب اماں نے بلا لیا ہے باقی کل کھیلیں گے۔'' سنوری آٹھ سال کی سانولی رنگت کی مالک خوبصورت بچی تھی۔ اس کے گھنگریالے بال اس وقت ریت کی وجہ سے خشک ہو رہے تھے۔ اس بستی کے اردگرد ویسے بھی صحرائی علاقہ تھا اور شہر یہاں سے کوئی پچاس کلومیٹر دور تھا۔ بستی میں زیادہ تعداد ہندوؤں کی تھی۔ یہ محنتی لوگ تھے اور شہر جا کر محنت مزدوری کر کے اپنی گزر بسر کرتے تھے۔ سنوری کا باپ بھی شہر میں ایک ہوٹل پر کام کرتا تھا۔ سنوری اس کی اکلوتی اولاد تھی۔

سنوری بھاگتی ہوئی کچے گھر میں داخل ہوئی اور ماں کی آواز سن کر گھر کے واحد کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے دیکھا۔ ماں کی کھانسی نہیں رک رہی تھی۔ ''کیا ہوا......'' اس نے پوچھا۔

''پپ...... پانی دے مجھے۔'' کھانسی کے درمیان بمشکل بولے گئے الفاظ کا مطلب سمجھ کر وہ ایک طرف پڑے گھڑے کی طرف بھاگی اور جلدی سے پیالے میں پانی بھر لائی۔ پانی پی کر ماں کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی۔ اس نے پیار سے سنوری کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

''بابا کب آئے گا؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''پیغام بھیجا تھا۔ آ جائے گا ایک دو دن میں......''

سنوری کی ماں کو ٹی بی تھی۔ بہت پہلے تو شاید یہ مرض ناقابلِ علاج تھا مگر آج کے دور میں اس کا علاج انتہائی آسان ہے۔ اس علاقے میں قریب قریب کوئی اسپتال نہ تھا اس لیے سنوری کی ماں کو ہر ماہ شہر جا کر سرکاری اسپتال سے دوا لینی پڑتی تھی۔ نو ماہ کا کورس تھا جس میں سے چھ ماہ گزر چکے تھے۔ اب اس کی حالت بہتر ہو رہی تھی۔ اس ماہ کی دوا ختم ہونے والی تھی اس لیے اس نے شہر میں موجود راگیش کو گھر واپس آنے کا پیغام بھیجا تھا۔

راگیش دو دن بعد لوٹا تو اس کے ساتھ دو اور افراد تھے۔ تیس بتیس سال کا سادہ سے کپڑوں میں ملبوس شخص جس نے اپنا نام عباد احمد بتایا تھا، اس نے اپنا تعارف ایک صحافی کے طور پر کروایا تھا جبکہ اس کے ساتھ ہی ہاتھ میں کیمرا لیے نوجوان کا نام تو کچھ اور تھا مگر وہ اسے نواب کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ نجانے کیوں سنوری کی ماں پوجا کو وہ لوگ پسند نہیں آئے۔ ناپسندیدگی کے اظہار پر راگیش نے اسے جھڑک دیا۔

''یہ بڑے لوگ ہیں۔ ادھر ہمارے حالات پر پروگرام بنا کر ٹی وی پر دکھائیں گے تو حالات سدھر جائیں گے۔ مجھے انہوں نے کھانے پینے کا خرچ بھی دیا ہے، یہ دیکھ۔'' اس نے ہزار ہزار کے دس نوٹ دکھائے۔ پوجا کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''دس ہزار صرف کھانے پینے کا خرچ؟'' وہ بڑبڑائی۔ بات اس کی محدود سوچ میں نہیں آ رہی تھی لیکن بات کی تہ تک پہنچنا اس کے لیے ضروری نہ تھا، شوہر کی بات سن کر وہ خاموش ہو گئی۔ عباد اور نواب نے ایک دن میں ہی پورا علاقہ گھوم پھر کر دیکھ لیا تھا۔ اس رات وہ اس کچے مکان کے صحن میں چارپائی ڈال کر لیٹے ہوئے تھے جبکہ سنوری اپنے ماں باپ کے ساتھ اندر کمرے میں موجود تھی۔ نواب نے ان تینوں کو باہر بلایا اور کہا۔

''کل ہمارا یہاں آخری دن ہے۔ اس کے بعد چلے جائیں گے۔ آپ لوگوں نے ہماری خدمت کی، اس کے

لیے شکریہ۔‘‘

’’شکریہ کی بات نہیں، مہمان تو بھگوان کا روپ ہوتے ہیں۔‘‘ راگیش نے سادگی سے جواب دیا۔

’’آئیں، آج میں اپنے مہمانوں کو چائے بنا کر پلاتا ہوں۔‘‘ اس نے بیگ سے چائے بنانے کا سامان نکالا۔ کچھ دیر بعد اس نے سب کو چائے کا ایک ایک کپ دیا۔ سنوری نے البتہ پینے سے انکار کردیا۔

’’یہ چائے نہیں پیتی۔‘‘ پوجا نے بتایا۔ چائے کا کپ ختم ہوتے ہی راگیش اور پوجا وہیں چارپائیوں پر ڈھیر ہو گئے۔ نواب نے پھرتی سے سنوری کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی چیخ حلق میں دبادی۔ وہ بے ہوش پڑے ماں باپ کو دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ عباد نے ان دونوں کو گھسیٹ کر کمرے میں ڈالا اور دروازے کو باہر سے کنڈی لگادی۔ اس نے سنوری کو خود قابو کرلیا اور نواب کو اشارہ کیا۔

’’کیمرا نکال۔‘‘ اگلے چند لمحات سنوری کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھے۔ وہ معصوم اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کی اصلیت سے واقف نہ تھی۔ نواب اور عباد باری باری ویڈیو ریکارڈ کرتے رہے اور اپنی شیطانیت دکھاتے رہے۔ مہمان جنہیں راگیش نے بھگوان کا روپ قرار دیا تھا، اب شیطان کے پیروکار بنے ہوئے تھے۔ اس کا منہ باندھ کر کے اس کی چیخوں کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ ماں باپ کی اکلوتی لاڈلی سنوری مسلسل دو گھنٹوں تک یہ ظلم سہتی رہی اور ایک آخری ہچکی لے کر ظالم دنیا سے روٹھ گئی...... کبھی نہ ماننے کے لیے۔

ان دونوں نے اپنا کام مکمل کر کے سامان سمیٹا اور راتوں رات غائب ہو گئے۔ اگلی صبح راگیش اور پوجا کے لیے قیامت لائی تھی۔ پوجا کی آنکھ میں آنسو نہیں تھے، وہ بس خالی خالی نظروں سے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ پوری بستی اکٹھی تھی۔ کچھ نوجوانوں نے نواب اور عباد کو ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر ان کا نام ونشان نہ مل سکا۔ راگیش کو لوگ سنبھالنے کی کوشش کررہے تھے مگر وہ بار بار ان کے ہاتھ سے نکل کر اپنا سر دیوار پر مارتا۔

’’میرے لالچ نے میری بچی کی جان لے لی۔‘‘

بات سنوری کی موت پر ختم نہیں ہوئی تھی۔ خبر جنگل میں لگی آگ کی طرح پھیل گئی۔ سنوری کے ساتھ کی گئی زیادتی کی ویڈیو وائرل ہوگئی۔ اس سے پہلے فیس بک، واٹس ایپ سے یہ مکمل طور پر ڈیلیٹ کی جاتی، ملک میں زیادہ استعمال کی جانے والے فحش ویب سائٹس پر یہ ویڈیو اپلوڈ کردی گئی۔

اس میں زیادتی کرنے والے دونوں افراد کا چہرہ واضح نظر نہیں آرہا تھا۔

دوسرے دن میڈیا کی کئی گاڑیاں اس چھوٹی سی بستی کے اس کچے گھر کے سامنے موجود تھیں۔ صحافیوں کے سوالات ان دونوں کی روح پر لگنے والے زخم کو کھرچ رہے تھے۔ صحافی کیمرے کے سامنے کھڑا بلند آواز میں چیخ رہا تھا۔

’’ملک میں موجود نئی حکومت کے اس دور میں اقلیت برادری پر ہونے والے اس ظلم کی جتنی مذمت کی جائے، کم ہے۔ معصوم سنوری کی دردناک موت نے جہاں حکومتی کارکردگی پر سوالیہ نشان لگا دیے ہیں وہیں اور بہت سے سوالات جنم لیتے ہیں۔ کیا یہ بارڈر پر کشیدہ حالات کی کوئی انتقامی یا جذباتی کارروائی ہے یا کسی نفسیاتی مریضوں کا نشانہ بنی ہے سنوری یا پھر باقاعدہ کسی سازش کے تحت ویڈیو بنا کر انٹرنیٹ پر اپلوڈ کی گئی ہے؟ اقلیتوں کے تحفظ کے لیے یہ حکومت کیا قدم اٹھائے گی، اس سوال کا جواب تو آنے والا وقت ہی دے سکے گا۔‘‘

اس کے ساتھ موجود کئی صحافی بھی اسی طرح کے سوالات اٹھانے میں مصروف تھے۔ بستی کے اردگرد عجیب طرح کا اسرار تھا۔ خوف نے پورے ماحول کو جکڑ رکھا تھا......

☆☆☆

چیلنج ورلڈ کے کئی ہیکرز اس مقابلے کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ آخری دن ختم ہونے میں بس چند گھنٹے باقی تھے جب اے ایچ زی نے اچانک اعلان کیا تھا۔ ’’میں نے سیکیورٹی سسٹم ہیک کرلیا ہے۔‘‘ ایم ڈبلیو کی جانب سے ثبوت پیش کرنے کا کہا گیا تھا۔ اس نے ویک اینڈ رات میں پوری سیکیورٹی کی تفصیل اور ایک تیس سیکنڈ کی ویڈیو اپلوڈ کردی جس میں سیکیورٹی گارڈز کے چہرے نظر آرہے تھے۔ ایم ڈبلیو نے شکست تسلیم کرلی۔

’’میں تمہارے اکاؤنٹ میں پچاس ہزار ڈالرز بھیج دیتا ہوں۔‘‘۔ یہ بات سن کر اسے خوش ہونا چاہیے تھا مگر وہ ہرگز خوش نہ تھا۔ کوئی چیز بار بار اس کے دماغ میں کھٹک رہی تھی۔ کسی بات کی وجہ سے وہ الجھن کا شکار دکھائی دیتا تھا۔ اس نے اکاؤنٹ کی تفصیل چیک کی، وہاں پچاس ہزار ڈالرز جمع ہو چکے تھے۔ چیلنج ورلڈ کی ویب سائٹ بند کر کے اس نے ہیک کیے گئے سیکیورٹی سسٹم کا مکمل ڈیٹا دوبارہ دیکھنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے وہ سیکیورٹی سسٹم کے ساتھ ماسٹر

کمپیوٹر کا مکمل ڈیٹا بھی حاصل کر چکا تھا۔ اب کی بار اس نے کچھ فائلز کو دیکھنا شروع کر دیا۔ یہاں ایک فائل موجود تھی جس پر اس کے ملک کا نام لکھا تھا۔ تجسس سے مجبور ہو کر اس نے وہ فائل اوپن کی...... جیسے جیسے وہ پڑھتا چلا گیا، حیرت کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔ فائل پڑھنے کے بعد اس نے تیزی سے ڈیٹا میں موجود ویڈیوز دیکھیں۔ اس کے پورے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس نے لیپ ٹاپ کے ساتھ یو ایس بی اٹیچ کی اور مکمل ڈیٹا اس پر کاپی کر لیا۔

دوسرے دن اس کا ارادہ پروفیسر ژونگ سے ملنے کا تھا مگر وہ کام کے سلسلے میں کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ شام تک وہ یونیورسٹی میں بیٹھا، ڈیٹا میں موجود ویڈیوز اور فائلز کے بارے میں سوچتا رہا۔ دل و دماغ کی ایک جنگ سی جاری تھی۔ دل اسے واپس ملک کی جانب کھینچ رہا تھا جو ایک سازش کا شکار ہونے والا تھا جبکہ دماغ گزرے وقت کی تکلیفیں یاد کر کے اسے روکنے میں کامیاب تھا۔ اندھیرا چھاتے ہی وہ اپنے فلیٹ کی طرف بڑھ گیا جہاں اس کے ساتھ ایک بنگلہ دیشی طالب علم، ناظم الدین رہتا تھا۔ ناظم سے اس کی اچھی دوستی تھی اور وہ ایک سمجھدار لڑکا تھا۔ اسے اپنے اسے پوری بات بتائے بغیر مشورہ لے سکتا تھا۔ ابھی وہ فلیٹ کے دروازے پر کھڑا تھا کہ پڑوس میں رہنے والے ایک اور پاکستانی نے اسے پکارا۔

''علی حسن...... یار ناظم سے کوئی کام تھا مگر وہ تو لگتا ہے گھوڑے بیچ کر سو رہا ہے۔ دروازہ ہی نہیں کھول رہا۔''
علی حسن چونکا۔ کچھ بھی ہو جاتا، ناظم کا اس وقت سونا ناممکنات میں سے تھا۔

''ناظم اس وقت کیسے سو سکتا ہے؟''

''تم خود پتا کرو۔ جاگ جائے تو مجھے بلا لینا۔''
پاکستانی اپنے فلیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ علی حسن کی چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجائی۔ فلیٹ پر اس کی غیر موجودگی میں کوئی واقعہ پیش آ چکا تھا۔ اس نے اطلاعی گھنٹی بجائی، حسب توقع دروازہ بند رہا۔ اس نے جیب میں موجود چابی نکال کر لاک کھولا۔ سگار کی مہک پورے فلیٹ میں پھیلی ہوئی تھی۔ ناظم سگریٹ پیتا تھا، اس لیے وہ اس مخصوص برانڈ کی بو سے آشنا تھا۔ سگار ناظم یا اس کا کوئی بھی دوست نہیں پیتا تھا۔ علی حسن تیزی سے ناظم کے بیڈروم کی جانب بڑھا۔ ناظم کی لاش بیڈ پر موجود تھی اور اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی گواہی دے رہی تھی۔ ناظم کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ مارنے سے پہلے اسے بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ علی حسن کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھا۔ پورے فلیٹ میں ہر طرف سامان بکھرا پڑا تھا۔ علی کا کمپیوٹر آن تھا جس پر لگا ڈبل پاسورڈ کسی نے توڑ کر اس کا ڈیٹا حاصل کیا تھا۔

''چیلنج ضرور پورا کرو مگر اپنی شناخت خفیہ رکھنا۔''
اس کے دماغ میں پروفیسر کی بات گونجی۔ امریکی پہنچ چکے تھے، اس کی سوچ سے بھی زیادہ تیزی سے۔ وہ غلطی کر بیٹھا تھا۔ اس کی لوکیشن ٹریس ہو چکی تھی۔ اگلے دو منٹ میں اس نے تیزی سے سامان سمیٹا۔ فلیٹ سے باہر آ کر وہ بس میں سوار ہو گیا۔ اس کی منزل دوسرا شہر تھا...... لیکن وہ وہاں بھی رکنے والا نہیں تھا۔ وہ واپس جانے والا تھا۔ قرض چکانے...... وطن کی مٹی کا قرض چکانے......

☆☆☆

ڈیفنس، لاہور

''زیدی...... زیدی۔'' اس کے کانوں میں کرخت آواز گونجی۔

''جی پاپا۔'' کمبل میں سے اس کی بیزار آواز سنائی دی۔

''اٹھو، نماز پڑھو پھر ورزش کرنی ہے۔'' کرنل صاحب نے سخت لہجے میں حکم دیا۔

''اتنی صبح پاپا......''

''فجر کی نماز صبح صبح ہی ہوتی ہے گدھے...... دوپہر بارہ بجے نہیں۔'' اس نے کمبل اٹھا کر پھینکا اور جھنجلاتا ہوا بستر سے باہر آ گیا۔ زیدی سیکنڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ ماں کی وفات کے بعد کرنل صاحب نے اسے ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا تھا۔ کہنے کو تو وہ سخت گیر باپ تھے مگر حقیقت میں زیدی میں ان کی جان تھی۔ کرنل شعیب اپنے وقت کے بہترین آرمی آفیسر تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی آرمی میں رہنے کا اثر تھا جو انہوں نے زیدی کو بھی اپنے معمول کا عادی بنا رکھا تھا۔ سخت سردی میں بھی ان کا یہ معمول برقرار تھا۔
نماز کے بعد قریب ہی موجود پارک کے چکر کاٹتے ہوئے انہوں نے زیدی سے پوچھا۔

''تمہارے ایگزامز کب سے شروع ہو رہے ہیں؟''

''دو ماہ بعد......''

''تیاری کیسی ہے؟ آئی ایس ایس بی کے ٹیسٹ کے لیے کم از کم ساٹھ فیصد نمبر کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ میرٹ بنانے کے لیے تمہیں اسّی فیصد سے زیادہ لینے چاہئیں۔''

''اتنے تو آ جائیں گے پاپا۔'' اس نے سر ہلایا۔ پاس

سے گزرتے ہوئے زیدی کے ہم عمر لڑکے نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلا کر پکارا۔
''زیدی...... تم بھی جلدی اٹھتے ہو؟''
''ہاں۔'' باپ کی موجودگی میں اس نے کچھ اور کہنے سے گریز کیا۔
''ہائے انکل۔'' لڑکے نے کرنل صاحب کو سلام کیا۔ انہوں نے ناگواری سے اس کا جواب دیا اور آگے بڑھ گئے۔ زیدی ایک دو منٹ لڑکے کے پاس رک کر ان کی طرف چلا آیا۔ انہوں نے پوچھا۔
''یہ تمہارا دوست کیسے؟''
''کالج میں میرے ساتھ پڑھتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔
''یہ شہباز اکبر کا بیٹا ہے ناں؟ بہتر ہے کہ تم اس سے دور رہو۔''
''کیوں؟ زبیر میں ایسی کیا خامی ہے؟'' وہ حیران ہوا۔ کرنل صاحب عام طور پر اس کے دوستوں کے متعلق بات نہیں کرتے تھے۔ آج پہلی بار انہوں نے کسی کی دوستی سے ٹوکا تھا۔
''کچھ باتوں کی وضاحت ضروری نہیں ہوتی۔'' وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ زیدی چند لمحوں کے لیے اپنی جگہ پر رکا اور پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ شہباز اکبر اس علاقے کا مشہور سیاست داں تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کی پارٹی ہمیشہ حکومت کرتی یا پھر وہ ہمیشہ اس پارٹی کے ساتھ ہوتے جس کو اقتدار مل جاتا۔ زیدی کی زبیر کے ساتھ بنتی تھی۔ دونوں کا مزاج ایک جیسا تھا۔ اس لیے کرنل صاحب کے ٹوکنے کے باوجود وہ خود کو اس کی دوستی سے روک نہ سکا۔ امتحانات کی تیاری کے دوران وہ کالج لائبریری میں اکٹھے پائے جاتے تھے۔ دو ماہ کا وقت تیزی سے گزر گیا۔ زیدی کے امتحانات قریب آئے تو اسے کھانے پینے کا ہوش نہ رہا۔ یہ بات اسے کرنل صاحب نے گھول کر پلا دی تھی کہ اسے مستقبل میں آرمی میں جانا ہے اس لیے وہ انٹر میں اتنے مارکس حاصل کرے جس سے اس کا داخلہ ٹیسٹ کے بعد آسان ہو جائے۔ اس دن زیدی کا فزکس کا پیپر تھا جب زبیر نے اسے اپنے گھر بلا لیا۔ اتفاق سے کرنل صاحب زمین کے کسی کام کے سلسلے میں گاؤں گئے ہوئے تھے۔ اس لیے زیدی کا جانا آسان ہو گیا۔ وہ ڈرائنگ روم میں زبیر کے ساتھ بیٹھا تھا جب زنیرا کی آمد ہوئی۔ اس نے دلچسپی سے زیدی کو دیکھا اور زبیر سے پوچھا۔
''یہ کرنل انکل کا بیٹا ہے نا؟'' زبیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ زیدی نے غور کیا، وہ اس کی ہم عمر ہی تھی۔ زنیرا، زبیر سے صرف ایک سال چھوٹی تھی۔ اس نے اچھا قد نکالا تھا اور جوانی کا رنگ اس پر خوب چڑھا تھا۔ ''مجھے مما نے بتایا تھا تمہارے بارے میں۔'' اس نے زیدی کو بتایا۔
''کیا بتایا تھا؟'' وہ حیران ہوا۔ وہ پہلی بار ان کے گھر آیا تھا اور ان کی مما سے اس کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔
''وہ......'' زنیرا کچھ کہنے لگی تھی جب زبیر نے اسے گھورا۔
''تم اپنے کمرے میں جاؤ۔'' وہ خاموش ہو گئی اور اٹھ کر چلی گئی۔ نجانے کیوں زیدی کو اس کا جانا اچھا نہیں لگا۔
''کیا بات ہے زبیر؟'' اس نے کھوجتی نظروں سے زبیر کی طرف دیکھا۔
''یہ کچھ بھی بولتی رہتی ہے یار...... اگنور کر، ذرا یہ تھیوری سمجھا۔'' زبیر نے اس کی توجہ ہٹانی چاہی۔
''پہلے مجھے تم سمجھاؤ۔'' زیدی نے ضد کی۔
''یارر......'' وہ جھنجلایا۔
''ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں۔'' زیدی کھڑا ہو گیا۔
''اچھا رک...... بیٹھ جا، بتاتا ہوں۔'' زبیر نے ہار مان لی۔ زیدی بیٹھ گیا۔ زبیر نے ہچکچاتے ہوئے جو کچھ اسے بتایا تھا، وہ اس کے لیے انکشاف تھا......

☆☆☆

کراچی، اکتوبر 2018

''تم قتل ہونے والی ہو......'' ہوٹل میں آرام سے بیٹھ کر کھانا کھاتے کسی بھی شخص کو یہ کہا جاتا تو ایک لمحے کے لیے ضرور چونک جاتا، سمرن تو پھر لڑکی تھی۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے اچانک سامنے آ کر بیٹھ جانے والے شخص کی طرف دیکھا جس کی عمر چھبیس ستائیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے وہ ذرا بھی مذاق کے موڈ میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔
''کیا بکواس ہے؟ تم ہو کون...... دفع ہو جاؤ۔'' سمرن نے سنبھل کر اسے بلند آواز میں سنانا شروع کر دیں۔ رش زیادہ تھا اس لیے ان دونوں پر ابھی کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔
''محترمہ، میں آپ کی جان بچانے کے لیے آیا ہوں، اگر سنوری کی طرح تم کو بھی مرنا ہے تو ٹھیک ہے، میں

چلا جاتا ہوں۔'' وہ کھڑا ہوا۔ سمرن کو سنوری کے کیس کی تفصیل معلوم تھی۔ وہ اس سلسلے میں سرچ بھی کر رہی تھی اور جس چینل میں وہ کام کرتی تھی، اس چینل سے حقائق سامنا لانا چاہتی تھی۔

''کیا مطلب سنوری کی طرح؟'' وہ حیران ہوئی۔ اجنبی دوبارہ کرسی سنبھال کر بیٹھ گیا۔

''ذرا غیر محسوس انداز میں اپنی ظالم نظروں کو گھماؤ اور ہوٹل کے گیٹ پر دیکھو، نیلے رنگ کی کیپ پہنے جو شخص اخبار ہاتھ میں لیے کھڑا ہے، اسے تم نے کہاں دیکھا تھا؟'' سمرن نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس شخص کا نصف چہرہ دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کے نصف چہرے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے سمرن کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔

''تین سے چار بار...... پچھلے ایک ہفتے میں۔'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''گیٹ کے باہر روڈ پر اس کا دوسرا ساتھی بائیک پر موجود ہے۔ یہ سنوری والے واقعے کے بعد تمہارے پیچھے پڑے ہیں، ان کا اگلا نشانہ تم ہو۔'' سمرن کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

''مگر تم یہ سب کیسے جانتے ہو؟'' اس کا سوال سن کر اجنبی نے گہری سانس لی۔

''یہ سب سازش کا نتیجہ ہے مس سمرن، اس ملک میں موجود اقلیت کو ٹارگٹ کر کے پوری دنیا میں اسے بدنام کیا جانا ہے...... اور ساتھ ساتھ یہاں موجود اقلیتی برادری کو یہ یقین دلوایا جائے گا کہ یہ ملک ان کے لیے محفوظ نہیں۔ بارڈر پر بھی حالات خراب ہیں ایسے میں لوگوں کے ذہن کو بھٹکانا بہت آسان ہے۔''

''تمہیں کیسے علم ہوا میں ان کا اگلا نشانہ ہوں؟''

''بہت آسانی سے...... سنوری کیس میں تم اس کی بستی گئی تھیں اور وہاں تم نے تفصیل اکٹھی کی۔ ظاہر ہے تمہارے پاس بہت سے حقائق جمع ہوئے ہوں گے۔ ان کے لیے اگلا ٹارگٹ چننا آسان ہو گیا کیونکہ تم جیسے پڑھے لکھے لوگوں کو ختم کر کے وہ سوچ نام کی صلاحیت کو ختم کر دیتے اور باقی موجود ان پڑھ لوگ ان کے فساد کے لیے کام آتے۔ اس لیے یہ دونوں تمہارے پیچھے پڑ گئے۔ اس میں سے ایک کا فرضی نام عباد ہے جبکہ نیلی ٹوپی والا نواب کہلاتا ہے۔'' تفصیل سن کر وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی...... ہوٹل میں رش بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ بولی تو اس کے لہجے میں خوف ہرگز نہ تھا۔ ''اب کیا کریں؟''

''تمہارے پاس وومین ہوسٹل کے علاوہ کوئی اور رہنے کی جگہ ہے؟'' وہ لمحہ بھر کے لیے اس کی معلومات پر حیران ہوئی اور پھر سنبھل کر بولی۔

''ہاں...... ڈیفنس میں چار کنال کا بنگلا ہے وومین ہوسٹل میں شوق سے رہتی ہوں ورنہ ہر شہر میں بھگوان نے میرے لیے بنگلے اتارے ہیں۔'' اس کا جواب سن کر وہ ہنس پڑا۔

''مطلب کوئی جگہ نہیں...... چلو تم ایسا کرو، چینل سے چھٹی لو ایک ہفتے کی اور میرے ساتھ چلو۔''

''چھٹی تو میں لے لوں گی مگر تمہارے ساتھ جانا ممکن نہیں۔''

''کیوں، اعتبار نہیں؟'' اس نے سمرن کی آنکھوں میں جھانکا۔

''نہیں...... اعتبار نہ ہوتا تو تمہاری یہ لمبی چوڑی بکواس نہ سنتی۔ کچھ ہے تمہاری باتوں میں جو یقین کرنے کا من کیا۔ میں دوست کے فلیٹ پر چلی جاؤں گی، وہ قریب ہی رہتی ہے۔ ویسے ہم اس نواب اور عباد سے چھپنے کے بجائے انہیں پولیس سے پکڑوا دیتے ہیں۔''

''کوئی فائدہ نہیں۔ یہ صرف کٹھ پتلیاں ہیں، ان کی ڈور کس کے ہاتھ میں ہے، ابھی یہ معلوم کرنا باقی ہے۔''

''چلو، وقت ضائع نہ کرو...... نکلنا کس طرف ہے؟''

''پچھلے گیٹ سے۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے باہر لے آیا۔ دوسرے گیٹ سے باہر اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ سمرن کو بٹھا کر اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد اس نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھائی۔

''میری زندگی میں پہلا موقع ہے جب ایک انجان شخص کے ساتھ کار میں بیٹھی ہوں اور اس کا نام تک نہیں معلوم۔'' سمرن نے اردگرد بھاگتی گاڑیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نام پوچھنا تھا تو سیدھی طرح پوچھ لیتی...... اتنا لمبا چوڑا بہانہ گھڑنے کی کیا ضرورت مس صحافی؟'' اس کے طنز کے جواب میں وہ خاموش ہو گئی۔ سمرن سے راستہ پوچھ کر اس نے اسے بلڈنگ کے سامنے اتارا۔ گاڑی سے اترنے کے بعد سمرن نے شیشے سے جھانک کر کہا۔

''اب تو نام بتا دو۔ وعدہ کرتی ہوں کسی پروگرام یا رپورٹ میں تمہارا نام نہیں لوں گی چینل پر۔''

''میرا نام......'' وہ ہچکچایا۔

’’بتا بھی دو۔‘‘ سمرن جھنجلائی۔
’’میرا نام مسیحا ہے۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھالی۔ سمرن نے مسکراتے ہوئے گاڑی کا نمبر نوٹ کیا اور گیٹ پر کھڑے سیکیورٹی گارڈ کی گھورتی نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے دوست کے فلیٹ کی جانب قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

ہوٹل میں بیٹھ کر اس نے لیپ ٹاپ آن کیا۔ علی حسن جانتا تھا، اب اس لیپ ٹاپ پر انٹرنیٹ استعمال کرنے سے وہ خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ جس تیزی سے امریکیوں نے اس کی لوکیشن ٹریس کی تھی، اب ان کا اس تک پہنچنا جلد ممکن تھا۔ اس لیے اس نے لیپ ٹاپ پر پہلے سے موجود تمام ڈیٹا فارمیٹ کیا اور ایک نئے ای میل اکاؤنٹ سے لاگ ان کر کے ہوٹل کے وائی فائی سے انٹرنیٹ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ شنگھائی بینک کی برانچ میں موجود تمام رقم اس نے واپس اپنے ملک کے بینک میں موجود اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دو دن بعد کے واپسی کی ٹکٹ کنفرم کی۔

ویٹریس نے پاس آکر آرڈر لیا۔
’’ایک کافی اور آدھے گھنٹے بعد لنچ۔‘‘ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ویٹریس پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔
’’اوکے سر۔‘‘ اس کے ساتھ ہی وہ واپس مڑ گئی۔ علی حسن کی جیب میں موجود سیل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے گہری سانس لی۔ اس کال کی اسے توقع تھی۔ یہ نمبر صرف پروفیسر ژونگ کے پاس تھا۔
’’تم کہاں ہو علی حسن؟‘‘ اس کے ہیلو کے جواب میں پروفیسر کی لرزتی آواز سنائی دی۔
’’میں دوسرے شہر ہوں۔‘‘ اس نے محتاط انداز میں جواب دیا۔
’’میں نے تمہیں کہا تھا اپنی شناخت خفیہ رکھنا...... ایک بے قصور مارا گیا تمہاری جگہ۔‘‘
’’میں جانتا ہوں۔ امریکی پہنچ چکے ہیں یہاں، میں دبئی جا رہا ہوں، دو دن بعد کی ٹکٹ کنفرم ہو چکی ہے۔‘‘
’’یہ دو دن کہاں گزارو گے؟‘‘
’’ہوٹل میں......‘‘ اس نے مختصر جواب دیا۔
’’دیکھو علی...... تمہارے لیے فی الحال کوئی جگہ محفوظ نہیں۔ ایسا کرو میرے پاس آجاؤ۔ محفوظ ٹھکانا ہے میرا پاس۔ دو دن گزار کر چلے جانا دبئی۔‘‘ پروفیسر ژونگ کی آواز میں خوف تھا۔
’’آپ مشکل میں پڑ جائیں گے سر، میں نہیں چاہتا ناظم کے بعد میرے کسی قریبی دوست تک وہ پہنچیں۔‘‘
’’کچھ نہیں ہوگا مجھے۔ یونیورسٹی کا پروفیسر ہوں کوئی معمولی چیز نہیں۔‘‘
’’ٹھیک ہے سر، میں شام تک آجاؤں گا۔‘‘ علی حسن نے بات ختم کی۔ کال بند کرنے کے بعد اس نے موبائل سے سم نکالی اور توڑ کر پھینک دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کافی کا بل ادا کیا اور بیگ اٹھا کر باہر آگیا۔ آرڈر لینے والی ویٹریس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ تو کچھ دیر بعد لنچ کرنے والا تھا مگر ایمرجنسی میں اب باہر بھاگ رہا تھا۔ اس نے کندھے اچکا دیے۔
علی بس میں سوار ہوگیا۔ سیٹ پر بیٹھتے وقت تک وہ چوکنا تھا۔ اس کے جسم کی ساری حسیات بیدار تھیں۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے ٹیک لگالی۔ اس کے ماتھے پر موجود لکیریں اس کے دماغ میں موجود پریشانی کا ثبوت تھیں۔ منظر بھاگ رہے تھے۔ بس کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ جلد اختتام تک پہنچ جاتا مگر علی کے لیے ابھی فرار کا سفر شروع ہوا تھا۔

☆☆☆

جینی نے پروفیسر ژونگ کے ہاتھ سے موبائل چھینا۔
’’اتنی بات کافی ہے ڈیئر پروفیسر۔‘‘ اس کا ہاتھ گھوما اور پروفیسر کے پہلے سے زخمی چہرے کو مزید تکلیف دے گیا۔
’’جینی...... بس کرو۔‘‘ اس کا بھائی جیک اب اس مار پیٹ سے بور ہو چکا تھا۔ وہ دونوں امریکن ایجنٹ تھے اور ڈیوڈ کی طرف سے انہیں پوری معلومات مل چکی تھی۔ اب ان کا مشن علی حسن کو ڈھونڈنا تھا۔
’’سر تو کہہ رہے تھے چینی ڈھیٹ ہڈی ہوتے ہیں، یہ تو ریت کی دیوار ثابت ہوا۔‘‘ اس نے مسکراتے ہوئے جیک کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔ وہ خاموش رہا۔ جینی کی نسبت وہ کم گو تھا۔ پروفیسر کی بیوی اور بچے انہیں خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پروفیسر خاموش تھا۔ اس قسم کی صورتِ حال کا اسے پہلی بار سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔
کل شام تک وہ معمول کے مطابق زندگی گزار کر رہا تھا۔ کالج میں کلاس لینے کے بعد اپنی لیب میں نئی پروگرامنگ پر تجربہ کرنے میں مصروف رہا۔ شام کے بعد اس کی بیوی روحشی کے ساتھ جینی گھر میں داخل ہوئی۔ جینی کو دیکھ کر پروفیسر کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ جینی نے اس سے ہاتھ ملا کر کہا۔

''میں آپ کے ملک میں نئی ہوں۔ ٹیکنالوجی یونیورسٹی کی شہرت سنی ہے تو داخلہ لینے کا سوچ رہی تھی۔'' اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پروفیسر کو عجیب کھردرے پن کا احساس ہوا۔

''مشکل زندگی گزاری ہے شاید اس نے۔'' اس نے سوچا اور زبان سے کہا۔ ''خوش آمدید، آپ کے امریکا میں بھی ٹیکنالوجی کی بہت سی یونیورسٹیز ہیں۔ ہماری یونیورسٹی کے لیے اعزاز کی بات ہے جو امریکن اس کی تعریف کر رہے ہیں۔'' جینی کو صوفے پر بٹھا کر اس نے ملازم کو کافی لانے کا کہا اور وہ باتوں میں مصروف ہو گئے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اطلاعی گھنٹی بجی۔

''میرا خیال ہے میرا بھائی آیا ہوگا۔'' جینی اٹھ کر باہر گئی۔ دو تین منٹ بعد جیک اندر داخل ہوا۔ اس کے بعد صرف دس منٹ میں پروفیسر کی زندگی میں طوفان آ گیا۔ انہوں نے تیزی سے اپنا کام مکمل کیا۔ جیک کے ہاتھ میں ریوالور تھا جو اس نے بچوں کے سر پر رکھ کر انہیں مزاحمت سے روکا۔ اس کے بعد انہوں نے پروفیسر کو لیب میں جا کر باندھ دیا۔ گیٹ بند کر کے تمام لائٹس آف کر دیں۔ باہر سے کوئی بھی آتا تو اسے یہی لگتا جیسے گھر کے مکین کہیں گئے ہوئے ہیں۔ لیب میں پروفیسر کو باندھنے کے بعد اس کے چہرے پر جینی نے چاقو سے نقشے بنانے شروع کر دیا۔ روحشی اور بچوں کی چیخوں کے ساتھ پروفیسر بھی کئی گھنٹے چیختا رہا۔ وہ رات اس گھر کے لیے عذاب تھی۔ انہوں نے کسی کو سونے نہ دیا۔ ان کا بس ایک سوال تھا۔

''علی حسن کہاں ہے؟'' پروفیسر اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ علی اسے بتائے بغیر غائب ہو گیا تھا۔ پولیس بھی اسے ڈھونڈ رہی تھی کیونکہ ناظم کے قتل کا شک اس پر جا رہا تھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' ہر مرتبہ سوال کے جواب میں وہ بس ایک بات دہراتا رہا۔ آخر وہ تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو گیا۔ اسے ہوش میں لا کر جینی نے نیا مطالبہ کیا۔

''علی حسن سے رابطہ کرو۔''

''نمبر ملاؤ۔'' اس نے علی حسن کا نمبر بتایا مگر وہ نمبر بند ملا۔

''یہ بند ہے۔''

''پھر مجھے نہیں معلوم ہو سکتا، وہ کہاں ہے۔'' ژونگ نے مردہ لہجے میں جواب دیا۔

''ڈیوڈ کو ناکامی پسند نہیں ڈیئر پروفیسر۔'' جینی نے کہا اور اس کے سب سے چھوٹے بیٹے کو پکڑ لائی۔ اس بار چاقو اس نے گردن پر رکھا تھا۔ روحشی نے لپک کر بیٹے کو چھڑانا چاہا، جینی نے اسے دھکا دیا۔ وہ پیچھے جا گری۔

''میرے بیٹے کو چھوڑ دو۔'' وہ چیخی۔

''انہیں چھوڑ دو، وہ بے قصور ہیں۔'' پروفیسر نے التجا کی۔

''قصور صرف تمہارا ہے پر سزا سب بھگتیں گے۔''

''میں نے تمہارے سامنے پوری کوشش کی ہے رابطے کی، پلیز اسے چھوڑ دو۔'' ژونگ کی آنکھ میں آنسو آ گئے۔ بچہ خوفزدہ نظروں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔

''پروفیسر...... علی حسن سے رابطہ کرواؤ ابھی دو منٹ میں ورنہ ایک ایک کر کے سب کو مار دوں گی۔'' جینی کا لہجہ سفاک ہو گیا۔

''کر لیں...... پلیز۔'' روحشی نے شوہر کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''کرتا ہوں...... کرتا ہوں۔'' پروفیسر نے جلدی سے ایک اور نمبر بتایا۔ ''یہ ملاؤ۔'' اس بار کامیابی ہوئی۔ علی حسن سے بات کر کے اسے گھر آنے پر آمادہ کرنے کے بعد ژونگ نے اپنے ہاتھ نیچے گرا دیے جنہیں چند لمحے پہلے جینی نے آزاد کیا تھا۔ پروفیسر نڈھال نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھ میں آنسو تھے۔ جینی اور جیک کی باتیں جاری تھیں۔

''جیک ایک کام کرو۔''

''کیا؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے جینی کو دیکھا۔

''جس نمبر پر پروفیسر نے کال کی ہے، اسے ٹریس کرو۔'' لیب میں جدید انٹرنیٹ کی ساری سہولیات موجود تھیں۔ جیک نے چند لمحوں میں ہی علی حسن کا نمبر ٹریس کر لیا۔

''نمبر آف ہے، آخری کال ہوٹل سے کی گئی تھی۔'' جیک نے مکمل پتا بتایا۔ پروفیسر کے چہرے پر رونق آ گئی۔ جینی کچھ دیر سوچتی رہی پھر غور سے پروفیسر کو دیکھ کر بولی۔

''کیا گیم کھیلی ہے تم نے؟ اسے کیسے شک ہوا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' جینی کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ واپس مڑی اور ریوالور نکال کر پروفیسر کے دونوں بچوں کو گولی مار دی۔ لیب روحشی اور پروفیسر کی چیخوں سے گونج اٹھی مگر یہ چیخیں زیادہ دیر بلند نہ رہ سکیں۔ جینی نے روحشی کے حلق میں بھی گولی اتار دی۔ لیب کا منظر خوفناک ہو چکا تھا۔ پروفیسر نے چہرہ بازوؤں میں چھپا لیا۔

''اب بتاؤ کیا گیم کھیلی تم نے؟''

''میں نے اسے علی حسن کہہ کر پکارا تھا......''

"تو؟"

"اسے شک ہو گیا کیونکہ میں ہمیشہ اسے اے ایچ کہتا تھا۔ اس کا یوزر نیم تھا میری ویب پر۔" اس کی بات مکمل ہونے پر جینی نے ریوالور سیدھا کیا۔ پروفیسر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"اب تم بھی بیوی بچوں کے پاس جاؤ۔" اس کے ساتھ ہی گولی نے پروفیسر کے ماتھے میں سوراخ کر دیا۔

☆☆☆

"تیاری کیسی جا رہی ہے زیدی؟" کرنل شعیب نے بیٹے کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ وہ جھجک کر پیچھے ہو گیا۔ کچھ دنوں سے اس کا رویہ عجیب ہو رہا تھا۔ کرنل صاحب جتنا اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتے، وہ اتنا اس سے دور بھاگتا۔

"میں آرمی میں نہیں جانا چاہتا۔" اس کی بات سن کر انہیں جھٹکا لگا۔ زیدی کے ہوش سنبھالتے ہی یہ بات اسے اچھی طرح رٹائی گئی تھی کہ اسے آرمی جوائن کرنی ہے۔ خود اس نے بھی آج سے پہلے کبھی انکار نہیں کیا تھا۔

"کیوں؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ان کی نظریں اس کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ انہیں تبدیلی کا احساس شدت سے ہو رہا تھا۔

"میں یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا چاہتا ہوں۔"

"مگر تم نے پہلے تو کبھی آرمی میں جانے سے انکار نہیں کیا؟"

"بس اب میرا موڈ بدل چکا ہے۔" موڈ کے علاوہ کیا کچھ بدل چکا تھا، اس بات سے کرنل صاحب بے خبر تھے۔

"تمہاری مرضی۔" وہ یہ کہہ کر چلے گئے۔ زیدی جانتا تھا، وہ خفا ہو کر گئے ہیں مگر اسے زیادہ پروا نہ تھی۔ اس کے دل و دماغ میں جنگ کی کیفیت تھی۔ وہ عجیب کشمکش کا شکار دکھائی دیتا تھا۔ اگلے چند ماہ میں باپ بیٹے میں دوری مزید بڑھ گئی۔ کرنل صاحب نے کئی بار اسے زبیر اور زنیرا کے ساتھ دیکھا تھا۔ انہیں کچھ غلط ہونے کا احساس ہو رہا تھا مگر اکلوتے لاڈلے بیٹے کی سرکشی انہیں کوئی سخت قدم اٹھانے سے روک رہی تھی۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی وہ دونوں اجنبیوں کی طرح رہتے تھے۔ ضرورت کے وقت ہی کچھ بات ہوتی ورنہ وہ دونوں اپنے الفاظ کو ضائع کرنے کے بجائے سنبھال کر رکھنا پسند کرتے تھے۔

کرنل شعیب سے غلطی ہوئی تھی۔ بیٹے کے پاس وقت گزار کر وہ خرابی کی جڑ تک پہنچ سکتے تھے مگر ان کی فوجی انا نے انہیں روک کے رکھا تھا۔ باپ بیٹے کے رشتے کی جڑیں انا نے کھوکھلی کر دیں۔ کرنل شعیب اس دن دکھ کے سمندر میں ڈوب گئے جب رزلٹ آنے کے بعد زیدی نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ ان کا برسوں پہلے دیکھا گیا خواب تعبیر حاصل نہ کر سکا۔ کہیں نہ کہیں یہ دکھ زیدی کو بھی تھا مگر کچھ وجوہات تھیں جو وہ اس دکھ کا اظہار نہ کر سکا۔

گھر میں چھائے اُداسی اور تنہائی کے سائے گہرے ہوتے چلے گئے۔ کرنل صاحب زیادہ وقت اپنی بنائی گئی چھوٹی سی لائبریری میں گزار دیتے جبکہ زیدی گھر آ کر ایک دو گھنٹے آرام کرتا پھر باہر نکل جاتا اور اس کے بعد اس کی واپسی رات گیارہ بارہ بجے ہوتی۔ کرنل صاحب جو کبھی جوان نظر آتے تھے، بڑھاپے نے انہیں تیزی سے لپیٹ میں لے لیا۔ بالوں میں سفیدی تو بہت پہلے اتر آئی تھی، اب چہرے پر جھریوں کی تعداد میں بھی کافی اضافہ ہو چکا تھا۔

وہ ہفتے کی شام تھی۔ زیدی گھر پر تھا جب کرنل صاحب اس کے کمرے میں آئے۔ کئی ماہ بعد انہوں نے اس کے کمرے کی حالت دیکھی تھی۔ دیواریں جن پر کبھی وطن کی سلامتی پر جان قربان کرنے والے فوجی جوانوں کی تصویریں تھیں، اب خالی نظر آ رہی تھیں۔ ایک طرف چھوٹے سے کاغذ پر ٹائم ٹیبل جبکہ دوسری طرف کیلنڈر لگا تھا جس میں مہینے کی آخری تاریخ پر سرخ نشان لگا ہوا تھا۔

"زیدی؟" انہوں نے پکارا۔ وہ لیپ ٹاپ پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔

"جی۔" انہیں دیکھ کر لیپ ٹاپ سائڈ پر رکھا اور کھڑا ہو گیا۔

"بیٹھو۔" وہ اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئے۔

"پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟"

"ٹھیک جا رہی ہے۔" اس نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

"تمہیں نہیں لگتا، ہمارے گھر کی رونق غائب ہو گئی ہے؟"

"جی۔" وہ کچھ حیران ہوا مگر یک لفظی جواب کے سوا کچھ کہہ نہ سکا۔ ان کی کمرے میں آمد سے اب تک ان کا لہجہ عجیب سا تھا۔

"میں چاہتا ہوں رونق بحال کی جائے۔" انہوں نے گہری سانس لی۔ "تم شادی کر لو زیدی۔" ان کی بات سن کر وہ چونک گیا۔

''پر ابھی تو میری پڑھائی......''

''وہ شادی کے بعد جاری رہے گی۔'' انہوں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''ویسے بھی پڑھائی وغیرہ کا ایشو انہیں ہوتا ہے جنہیں شادی کے بعد پیسے وغیرہ کے مسئلے کا ڈر ہو۔ تمہارے پاس تو جائداد ہے، میری زمینیں ہیں...... تمہیں کیا مسئلہ؟''

''ٹھیک ہے...... کر لیتا ہوں شادی۔'' کرنل صاحب کو اتنی جلدی ہاں کی توقع نہ تھی۔

''شکریہ...... بات ماننے کے لیے، میں جلد کوئی رشتہ ڈھونڈتا ہوں۔''

''رشتہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پاپا، آپ شہباز انکل سے زنیرا کا ہاتھ مانگ لیں۔'' زیدی نے بم پھوڑا۔ چند لمحوں کے لیے شعیب صاحب ساکت رہ گئے۔ کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔

''تم جانتے ہو میں شہباز کو پسند نہیں کرتا۔''

''تو کیا ہوا؟ شادی مجھے زنیرا سے کرنی ہے، شہباز انکل سے نہیں۔''

''زیدی...... تم حد سے بڑھ رہے ہو۔'' ان کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

''اگر آپ کی حد اتنی جلدی ختم ہو جاتی ہے تو مجھے اس سے آگے بڑھنا منظور ہے...... شادی میں زنیرا سے کروں گا بس اور وہ دیکھیں۔'' اس نے سرخ نشان کے نیچے موجود تاریخ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اگر زنیرا سے شادی کرنی ہے تو میں رک جاتا ہوں ورنہ میں ملک سے باہر جا رہا ہوں پڑھنے کے لیے۔''

''آپ جو مرضی کر لیں علی حسن زیدی صاحب...... اس گھر میں زنیرا ابھی بہو بن کر نہیں آئے گی۔'' وہ اپنا فیصلہ سنا کر پلٹ گئے۔ علی حسن نے انہیں پکارا۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔

''صرف اس لیے نہیں آئے گی کیونکہ وہ آپ کے کزن شہباز اکبر کی بیٹی ہے...... اس شہباز کی جس کے ساتھ آپ کا زمینوں کا جھگڑا تھا جو ماما کو پسند کرتے تھے اور آپ نے زبردستی ماما سے شادی کر لی۔'' کرنل شعیب نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ خلافِ معمول ان کو اتنا غصہ نہیں آیا تھا جتنے غصے کی توقع علی کو تھی۔

''تمہیں یہ سب شہباز کے گھر سے علم ہوا ہوگا؟''

''ظاہر ہے وہیں سے ہوا ہے کیونکہ میں جب سے پیدا ہوا ہوں اور ہوش سنبھالا ہے نہ تو آپ مجھے گاؤں جانے دیتے ہیں نہ ہی کبھی کسی رشتے دار سے ملنے دیا۔ میں تو زبیر کی زبانی یہ سن کر حیران رہ گیا کہ آپ کے علاوہ بھی اس دنیا میں میرا کوئی رشتے دار ہے...... آپ نے ایسا کیوں کیا پاپا؟''

''میں مجبور تھا......'' وہ بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ گئے۔ انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''یقین رکھو مجھ پر زیدی...... میں نے صرف اور صرف تمہاری بھلائی کے لیے سب کیا ہے۔''

''یہ کیسی بھلائی ہے پاپا؟ میں کزن سے بھی اجنبیوں کی طرح ملتا رہا...... کیوں مجھے تنہا رکھا؟'' وہ رو رہا تھا۔ اس کا دکھ سمجھتے تھے کرنل صاحب۔ وہ بولتا چلا گیا۔ ''دکھ تو اس بات کا ہے کہ حقیقت کا علم بھی کسی اور سے ہوا۔ مجھے سب جاننا ہے پاپا؟ کیا ہوا تھا؟ کیوں آپ نے ماما سے زبردستی شادی کی؟ کیا صرف ایک رشتے کے لیے آپ نے اتنے لوگوں کو چھوڑے رکھا، وہ بھی کئی سالوں سے......''

''یہ سب حقیقت نہیں زیدی...... سمجھنے کی کوشش کرو۔'' شعیب زیدی نے اس سے زیادہ بے بسی کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

''مجھے حقیقت جاننی ہے۔''

''میں نہیں بتا سکتا۔''

''پھر میری بھی سن لیں پاپا...... میں چائنا جا رہا ہوں داخلہ ہو گیا ہے میرا۔'' اور وہ چلا گیا...... مہینے کی آخری تاریخ کو لیکن وہ تنہا گیا تھا۔ کرنل صاحب کی دعائیں اس کے ساتھ نہ تھیں۔ دعائیں دیتا بھی کون؟ اس کے جانے سے صرف ایک ہفتہ پہلے کرنل شعیب زیدی کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ یہ اتنا شدید تھا کہ وہ اسپتال پہنچنے سے پہلے اپنے علی حسن کو تنہا چھوڑ گئے...... وہ ایک ہفتہ علی نے کیسے گزارا تھا، یہ بس وہی جانتا تھا۔ زبیر، زنیرا، شہباز اور شہباز کی بیوی رقیہ...... سب اس کے ساتھ تھے مگر وہ تنہا تھا۔ اپنے اندر خالی پن محسوس کر رہا تھا۔ چائنا جاتے وقت اس نے گھر کو تالے لگا دیے اور چابیاں اپنے دوست کے حوالے کر دیں۔ اس کے بعد وہ واپس نہ آیا۔ کمپیوٹر کی تعلیم میں اس نے خود اس طرح غرق کر لیا تھا کہ حقیقی دنیا اس کے لیے بے معنی تھی۔ پروگرامنگ اور ہیکنگ میں مہارت حاصل کر کے وہ نئے جہان دریافت کرتا چلا گیا۔ نئی دنیا...... نئے لوگ، اس کی طرح سرد جذبات اور مصنوعی شناخت لیے۔ وہ ہنستا تھا۔ یونیورسٹی میں ہنس مکھ مشہور تھا لیکن سوائے دو تین لوگوں کے، اس کا کوئی دوست نہ تھا۔ اس کے قہقہوں کے پیچھے چھپے

کئی سالوں کے دکھ تک کوئی پہنچ نہ سکا۔ زندگی شاید ایسے ہی چلتی رہتی اگر دنیا کی عیار ترین قوم اس کے پیچھے نہ پڑ جاتی......

☆☆☆

''تو وہ چائنا سے بھی غائب ہو گیا۔'' ان کے سامنے ویڈیو کال پر ڈیوڈ موجود تھا۔ جینی اور جیک کا سر جھکا ہوا تھا۔

''جی سر۔''

''اگلا نشان؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔

''اس نے کال پر دبئی جانے کا کہا تھا۔'' جیک نے گفتگو میں حصہ لیا۔ ''یعنی اس کی اگلی منزل دبئی ہو گی۔''

''غلط......وہ جان چکا تھا کہ پروفیسر ٹریس ہو چکا ہے اس لیے وہ فرار ہوا ہے، دبئی کا نام بھی اس نے جان بوجھ کر لیا تھا تم لوگوں کو بھٹکانے کے لیے......'' ڈیوڈ نے نفی میں سر ہلایا۔

''پھر وہ کہاں ہو سکتا ہے؟'' جینی بڑبڑائی۔

''میرا خیال ہے وہ پاکستان پہنچ چکا ہے۔ اگر وہ کسی ایجنسی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو ہمارا وہ منصوبہ ناکام ہو جائے گا۔''

''ایسی بھی بات نہیں...... معمولی ہیکر ہے وہ۔''

''وہ معمولی ہیکر تم لوگوں کو دوبار دھوکا دے چکا ہے۔'' ڈیوڈ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اس نے شنگھائی بینک اکاؤنٹ سے اپنی ساری رقم پاکستان بینک میں ٹرانسفر کی ہے۔ اب تم دونوں کی اگلی منزل پاکستان ہے جہاں اسے ڈھونڈنا اور بھی مشکل ہو گا کیونکہ وہ اس کا اپنا ملک ہے، تم دونوں بینک میں اس کے اکاؤنٹ کی نگرانی کرو گے کیونکہ یہ واحد ذریعہ ہے اس تک پہنچنے کا۔ جیسے ہی وہ رقم نکالے گا میں اس کی لوکیشن ٹریس کروانے کی کوشش کروں گا...... اس کے علاوہ تم لوگ انڈینز کی مدد بھی حاصل کر سکتے ہو جن کا پورا سیٹ اپ ہے وہاں۔'' ڈیوڈ نے مزید تفصیل بتائی۔ ''وقت کم ہے جلد سے جلد اس تک پہنچنے کی کوشش کرو کیونکہ کھیل کا آغاز ہو چکا ہے۔'' جینی اور جیک نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں تیار تھے۔

ٹھیک سات دن بعد وہ پاکستان میں موجود تھے۔ اسلام آباد سے وہ لاہور آئے اور علی حسن کے پتے پر آ گئے۔ گھر خالی تھا اور کوئی موجود نہ تھا۔ انہوں نے اپنی تسلی کے لیے گھر کی پوری تلاشی لی اور اس کے بعد باہر آ گئے۔ اگلے چند دن انہوں نے لاہور، ڈیفنس اور اردگرد کا علاقہ چھان مارا مگر علی حسن کا کہیں نشان نہ ملا۔ ڈیوڈ کی ہدایت کے مطابق انہوں نے وہاں موجود انڈین ایجنٹ سے رابطے کا فیصلہ کیا۔ وہ سیاحوں کے روپ میں تھے اس لیے سفر کرنا آسان تھا۔ لاہور سے کراچی آ کر انہوں نے ایک دوسرے درجے کے ہوٹل میں قیام کیا۔ شام کے بعد جینی باہر نکل گئی۔ اس کا رخ کاؤنٹر کی طرف تھا۔ اس نے استقبالیہ پر موجود لڑکی سے پوچھا۔

''مجھے ہوٹل منیجر سے ملنا ہے۔'' لڑکی نے منیجر کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ کچھ دیر بعد وہ منیجر کے سامنے موجود تھی۔

''جی؟'' منیجر نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''آر ایچ ون ٹو سکس۔'' اس نے بغیر کوئی لفظ ادا کیے کوڈ دہرایا۔ منیجر چونک گیا۔ اس نے اٹھ کر جلدی سے دروازہ لاک کیا اور پوچھا۔

''آپ کے ساتھ کون ہے؟''

''میرا بھائی......''

''راجیو سر، کل سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں...... میں گاڑی نکالتا ہوں آپ آ جائیں۔'' جینی واپس جا کر جیک کو لے آئی۔ کچھ دیر بعد ان کا رخ ایک دوسرے ہوٹل کی طرف تھا۔ اس ہوٹل کے ایک کمرے میں چالیس سال کا شخص موجود تھا۔ ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے ہوٹل منیجر کو جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے جاتے ہی راجیو نے پوچھا۔

''کیا لیں گے آپ لوگ؟''

''کچھ نہیں...... کام کی بات کریں۔'' باقی لوگوں کی نسبت راجیو اس سے اتنا مرعوب نظر نہیں آ رہا تھا۔ جیک خاموش تھا۔ جینی کی نظریں راجیو پر جمی ہوئی تھیں۔

''ٹارگٹ اسی شہر میں ہے۔''

''آپ لوگوں کے ہاتھ میں ہے تو ہمارے حوالے کر دیں۔''

''ایسا اب ممکن نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں؟ آپ لوگ جانتے ہیں وہ ہمارا شکار ہے۔'' جینی نے خشک لہجے میں کہا۔

''وہ آسان شکار نہیں ہے جس پر جال پھینک کر قید کیا جا سکے۔ چالاک شخص ہے لیکن مار کھا گیا ہے۔ امید ہے جلد ہم پکڑ لیں گے۔''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں مسٹر آر ایچ ون ٹو سکس، میں نے کہا ہے آپ ہمارا شکار ہمارے حوالے

کریں، اس کی لوکیشن دیں، اگلا کام ہمارا ہے۔'' اس کا لہجہ تیز ہوا۔ ماحول خوشگوار ہرگز نہیں تھا۔ جیک کو دخل دینا پڑا۔

''یہ آپس میں الجھنے کا وقت نہیں۔'' اس نے جینی سے کہا اور پھر راجیو کی طرف مڑا۔ ''مسٹر راجیو، اے ایچ نے ہمیں نقصان پہنچایا ہے اس لیے ہم اس کا پتا مانگ رہے ہیں...... آپ باتوں میں الجھانے کے بجائے صاف صاف بات کریں۔''

''میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ ایسا اب ممکن نہیں کہ میں اے ایچ کو آپ کے حوالے کر دوں۔ وہ ہمارے مشن میں مداخلت کر رہا ہے اس کی سزا ہم خود منتخب کریں گے۔'' راجیو ان سے الجھنا نہیں چاہتا تھا مگر جینی کے رویے نے اسے مجبور کر دیا تھا۔ شاید اس کی مردانہ انا ایک عورت کے سامنے جھکنے پر توہین محسوس کر رہی تھی۔ جینی کے چہرے پر غصے کے تاثرات تھے۔ کچھ دیر خاموشی رہی، جیک کی بھاری آواز نے اس خاموشی کے وقت کو طویل ہونے سے بچایا۔

''میرا خیال ہے ہمارا مشن ایک ہی ہے اور اے ایچ ہمیں تم لوگوں سے پہلے نقصان پہنچا چکا ہے، سو یہ بحث تو تقریباً فضول ہے۔''

''سوری...... لیکن ابھی کچھ بتانے یا کہنے سے قاصر ہوں۔ ہمارا ایک ایجنٹ اے ایچ کا اعتماد حاصل کر چکا ہے اس لیے اس موقع پر غلطی کی گنجائش نہیں...... مجھے سات دن کا وقت دیں تب تک میں سرراہول سے بھی مشورہ کر لوں گا۔'' راجیو نے بات ختم کی۔ اس کے ساتھ ہی وہ کھڑا ہو گیا۔ جینی کو توہین کا احساس شدت سے ہوا۔ وہ کھڑی ہو کر غرائی۔

''وقت ملا تو میں بتاؤں گی ضرور تمہارے سرراہول کو بھی اور تمہیں بھی۔'' یہ کہہ کر وہ باہر چل دی۔ جیک اس کے پیچھے تھا۔ راجیو کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔

☆☆☆

''سورج ڈوب رہا ہو اور خزاں کی اداس شام اپنی جوانی پر ہو، کسی ہجر کے مریض یا مریضہ کے لیے اس سے بہتر منظر کوئی نہیں ہو سکتا۔'' وہ اس کے سامنے آ بیٹھا تھا۔ زنیرا نے مڑ کر اسے دیکھا۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے اور اسی رنگ کی ٹی شرٹ پہنے وہ اچھا لگ رہا تھا۔

''شام کبھی جوان نہیں ہوتی علی......'' وہ حیران دکھائی دیتی تھی۔ ہلکے پھلکے لہجے میں جواب دیتے ہوئے اس نے علی کو دوبارہ غور سے دیکھا۔ ''اور میں ہجر کی نہیں، تمہاری مریضہ ہوں۔ کتنے سال ہو گئے ہیں تمہیں؟ اب اپنا چہرہ دکھا رہے ہو، کبھی ایک کال یا میسج ہی کر دیا ہوتا۔'' اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ علی پارک میں لگی پتھر کی بینچ پر زنیرا کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپایا۔ زنیرا کے آنسو بہنے لگے۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ طویل خاموشی کے بعد زنیرا کچھ سنبھلی اور بولی۔ ''یہ تمہارا حلیہ کیوں بدلا ہوا ہے؟ لیکن اچھے لگ رہے ہو۔'' وہ ہنس پڑا۔

''شکریہ...... کچھ مجبوریاں ہیں جس کی وجہ سے اچانک تمہارے سامنے آنا پڑا۔ زیادہ تفصیل بتا کر تمہیں پریشان نہیں کروں گا، یہ بتاؤ انکل شہباز کہاں ہیں؟''

''آج رات شاید آٹھ نو بجے تک اسلام آباد سے واپس آ جائیں گے۔ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''مجھے ان سے بہت ضروری کام ہے۔ یہ میرا ایڈریس لو اور صرف انہیں دے کر کہنا مجھے ملیں، رازداری سے۔'' اس نے زنیرا کو مزید ہدایات دیں۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

''اتنا عجیب رویہ کیوں ہے تمہارا؟''

''وقت ملا تو ضرور بتاؤں گا۔''

''ابھی کیوں نہیں؟'' اس کا انداز ضد کرنے والا تھا۔

''مجھے دیر ہو رہی ہے پھر ملتے ہیں۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔ زنیرا ناراض نظروں سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ علی پارک سے نکلنے کے بعد اس کی نظروں سے اوجھل ہوا تو وہ کھڑی ہو گئی۔

شہباز اکبر اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے جب وہ دروازے پر ہولے سے دستک دے کر اندر چلی گئی۔ شہباز کے ہاتھ میں کتاب تھی۔ اسے دیکھ کر انہوں نے کتاب بند کی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ''جی بیٹا؟''

''ڈیڈ، آج علی حسن ملا تھا۔'' اس کی بات سن کر شہباز اکبر چونک گئے۔

''علی؟ کب کہاں؟''

''شام کو، پارک میں...... اس نے یہ ایڈریس دیا ہے اور کہا ہے کہ رازداری سے اس سے ملیں۔'' شہباز نے ایڈریس پر غور کیا۔ یہ ایک دوسرے درجے کے ہوٹل کا کمرا تھا۔ ایڈریس کے نیچے لکھا تھا۔

''میں صرف چوبیس گھنٹے آپ کا انتظار کروں گا۔ اس کے بعد کمرا خالی ملے گا آپ کو۔'' انہوں نے گہری سانس لی۔

''ڈیڈ، اس کا رویہ اتنا عجیب کیوں تھا؟'' زنیرا نے

سوال کیا۔

''بس کچھ مجبوریاں ہیں اس کی۔ دعا کرو اس کے لیے'' شہباز نے کہا اور کھڑے ہو گئے۔ ''مجھے ابھی جانا ہے، ڈرائیور کو کہو گاڑی نکالے'' یہ کہہ کر وہ واش روم کی طرف بڑھ گئے۔ کچھ دیر بعد ان کی گاڑی علی حسن کے دیے گئے ایڈریس کی جانب بڑھ رہی تھی۔

انہیں وہاں پہنچنے میں تقریباً چالیس منٹ لگے۔ مطلوبہ کمرے تک پہنچنے میں انہیں کوئی دشواری نہیں آئی۔ علی کمرے میں ہی تھا۔ کی ہول سے انہیں دیکھ کر اس نے دروازہ کھولا اور ان کے گلے لگ گیا۔

''مجھے معلوم تھا آپ جلد سے جلد آنے کی کوشش کریں گے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میرا بیٹا مشکل میں ہو اور میں نہ آؤں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' انہوں نے پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائی۔

''تو بات حکومت تک پہنچی ہوئی ہے......'' علی ہنسا۔

''ہاں بالکل...... لیکن مکمل تفصیل نہیں۔ اتنا علم ہے کہ تمہاری تلاش میں دو بڑی طاقتوں کے چار پانچ لوگ یہاں سرگرم ہیں۔'' انہوں نے کہا۔

''اوہو...... یعنی ہماری اتنی مانگ ہے۔''

''تم پریشان نہیں ہو؟''

''پریشان وہ ہوتا ہے جس کے پاس کھونے کے لیے کچھ ہو۔ ہمارے پاس تو بس زندگی ہے، چلی گئی تو ملک پر قربان ورنہ ان کا مشن ناکام بنا دوں گا۔'' اس کے لہجے میں عزم تھا۔ شہباز اکبر متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔

''کرنل شعیب کے اکلوتے بیٹے ہونے کا ثبوت دیا ہے تم نے۔'' انہوں نے گہری سانس لی۔ ''اب مجھے تفصیل بتا دو۔'' ان کے کہنے پر علی نے چیلنج ورلڈ سے لے کر سنوری کے قتل تک مکمل کہانی انہیں بتا دی۔ وہ غور سے سنتے رہے۔

بات کے اختتام پر علی نے کہا۔

''انڈین ہیں یا امریکن، وہ شاید مجھے جان سے نہیں مارنا چاہتے، میں کئی بار ان کے نشانے پر آیا ہوں، ممکن ہے وہ مجھے پکڑ کر عبرت کا نشان بنانا چاہتے ہوں......'' وہ خاموش رہے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد انہوں نے کہا۔

''تو اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''میرا پلان الگ ہے۔ میں چاہتا ہوں ہم دو الگ طریقوں سے ان کی اس سازش کا جواب دیں...... ظاہر ہے اقلیتوں کو نشانہ بنایا جائے گا تو میڈیا توجہ دے گا، میں نے ایک ہندو صحافی کا اعتماد جیت لیا ہے۔ اس کی جان بھی خطرے میں تھی، اس کے ذریعے میں سوشل اور الیکٹرونک میڈیا پر انڈین اور امریکیوں کے خلاف مہم چلاؤں گا جبکہ آپ حکومت میں ہیں تو ایجنسیوں تک بات پہنچانے میں میری مدد کریں۔'' وہ خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی اور فضا میں دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔

''یہ سب اتنا آسان نہیں جتنا تمہیں لگ رہا ہے، خیر میں کوشش کروں گا۔''

''شکریہ۔'' علی نے کہا تو وہ مسکرا دیے۔ ''یہ میموری کارڈ لیں۔'' اس نے جیب سے عام موبائل میں استعمال ہونے والا میموری کارڈ نکالا۔ ''اس میں مکمل ویڈیو اور ڈیٹا ہے جو میں نے ہیک کیا تھا اور میرا نمبر سیو کر لیں، رابطہ کر لیجیے گا۔'' انہوں نے میموری کارڈ لے کر جیب میں ڈال لیا۔

''اپنا خیال رکھنا'' ان کے جانے کے بعد علی نے سامان سمیٹا۔ اس نے کاؤنٹر پر بل دیا اور مین گیٹ کے بجائے پچھلے گیٹ سے نکل گیا۔ جاتے وقت اس نے سیاہ کیپ پہن رکھی تھی۔

☆☆☆

''یقیناً میری جان پھر خطرے میں ہوگی۔'' سمرن کی دوست رخشندہ فلیٹ پر نہیں تھی۔ اتوار کی رات تھی، وہ اپنے گاؤں گئی ہوئی تھی۔ اسے کل صبح واپس آنا تھا۔ سمرن باتھ روم سے جیسے ہی باہر آئی، اس کی نظر صوفے پر بیٹھے علی پر پڑی۔ مسکراتے ہوئے اس نے اپنے گیلے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

''نہیں، ابھی تک تو تم محفوظ ہو...... ہاں جس دن میں نہیں آؤں گا تب ٹی وی چینل کی بریکنگ نیوز میں تمہارا نام ضرور گونجے گا۔''

''اچھی باتیں کیا کرو مسٹر اے ایچ۔''

''نام معلوم کر لیا میرا۔'' وہ مسکرایا۔

''ظاہر ہے میرے اپنے بھی کچھ ذرائع ہیں آخر اتنے دنوں سے صحافت میں ہوں۔'' اس نے کندھے اچکا دیے۔

''آمد کا مقصد جان سکتی ہوں؟''

''تمہیں بتانے آیا ہوں کہ تم خوبصورت لگ رہی ہو اور یہ کپڑے کچھ زیادہ باریک ہیں۔'' اس نے غور سے سمرن کی طرف دیکھا۔

''نئی بات کرو۔'' وہ بُرا منائے بغیر بولی۔ اسے علی کا اس طرح تعریف کرنا اچھا لگا تھا۔ ''یہ تو مجھے بھی علم ہے کہ

میں خوبصورت ہوں۔''

''مجھے تم سے ایک کام ہے...... کام ذرا مشکل ہے بہادری دکھانی ہوگی تمہیں۔'' علی نے رک کر اس کے چہرے کے تاثرات پر توجہ دی۔

''بولتے جاؤ۔''

''میرے پاس کچھ ویڈیوز اور ڈیٹا ہے جو امریکی عہدیدار اور انڈین حکومت کے ایک اہم بندے کی میٹنگ کا ہے۔ سوشل میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا پر یہ دونوں چیزیں میں وائرل کرنا چاہتا ہوں تاکہ ساری دنیا کو ان دو ممالک کا اصل چہرہ دکھا سکوں، کیا تم یہ کام اپنے چینل کے ذریعے کر سکتی ہو؟ سوشل میڈیا پر بھی تمہارا رابطہ ایسے لوگوں سے ضرور ہوگا جن کی باتیں آج کل زیادہ سنی اور سمجھی جاتی ہیں۔'' اس نے تفصیل بتائی۔

''کرنا تو میں ضرور چاہوں گی مگر......'' اس نے بات ادھوری چھوڑی۔

''دیکھو اے ایچ...... ہمارا میڈیا وہ چیزیں دکھاتا ہے جو مرچ مسالے کے ساتھ عوام دیکھنا چاہتی ہے حقائق ان سب چیزوں سے مختلف ہیں اور صاف الفاظ میں کہوں تو پیسے کا لالچ ہے انہیں، ملک کے لیے کوئی کچھ نہیں کرنا چاہے گا۔''

''تم کوشش تو کرو۔'' علی نے اصرار کیا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا اور جیب سے سیل فون نکال کر نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے کال ریسیو ہوتے ہی اس نے کہا۔ ''ارسلان صاحب؟''

''جی بات کر رہا ہوں۔'' ارسلان صاحب کی بھاری آواز اسپیکر سے نکل کر علی کے کانوں تک پہنچی۔

''سر، سمرن بات کر رہی ہوں مجھے آپ سے ایک کام ہے۔''

''ہاں سمرن، کیا کام ہے؟'' جواب میں سمرن نے سنوری قتل کیس اور علی کی بتائی گئی باتوں کو دہرایا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے، ہم چاہیں تو اس چیز پر فوکس کر سکتے ہیں۔''

''سوری سمرن...... یہ جذباتی باتیں ہیں، اول تو اس ویڈیو اور ریکارڈ کے اصل ہونے کا ثبوت نہیں ہمارے پاس اور کوئی مانے گا بھی نہیں، دوسرا میں اتنا بڑا رسک......''

ارسلان کی آواز فائرنگ کے شور میں دب گئی۔ گولیوں کی بوچھاڑ سامنے لگی تصویر میں کئی سوراخ کر گئی۔

''سمرن جھک جاؤ۔'' علی چلّایا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور نظر آ رہا تھا۔ سمرن نیچے جھکی اور گھٹنوں کے بل فرش پر گھسٹ کر دیوار کے ساتھ ہوگئی۔ جس کھڑکی کے ذریعے گولیاں اندر داخل ہوئی تھیں، اس کے اردگرد شیشے کے ٹکڑے پڑے تھے۔ سمرن نے مڑ کر دیکھا، علی فرش پر لگا دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے چیخ کر علی کو روکنا چاہا مگر اتنی دیر میں وہ دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا۔ سمرن کا اندیشہ درست ثابت ہوا، سامنے ہاتھ میں پسٹل پکڑے نواب کھڑا تھا۔ اس نے گولی چلانا چاہی لیکن علی نے موقع نہ دیا۔ ریوالور سے چلائی گئی گولی اس کا پیٹ پھاڑ گئی۔ ایک بلند چیخ گونجی۔ سمرن نے اٹھنا چاہا مگر علی نے اسے روک دیا۔

''کھڑکی کے سامنے عباد موجود ہے...... اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف ہے، سامنے والی چھت پر...... ابھی نہ اٹھو۔''

سمرن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ خوف سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ علی نے دروازہ کھلا چھوڑا اور بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کی منزل چھت تھی۔ ایک ساتھ کئی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا وہ جیسے ہی چھت پر پہنچا، عباد غائب ہو چکا تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور نیچے اتر گیا۔ سمرن نے جیسے ہی اسے دیکھا، بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔ علی نے اسے تسلی دی۔ ''بھاگ گیا ہے وہ۔''

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''اور مجھے تم اچھی لگ رہی ہو۔'' اس کی بات سن کر وہ سٹپٹا کر اس سے الگ ہوگئی۔

''آؤ میرے ساتھ......'' وہ اسے اپنے ساتھ لے کر باہر گیا۔ اس کی گاڑی پارکنگ کے بجائے ایک دکان کے سامنے کھڑی تھی۔ پولیس کی گاڑیاں بلڈنگ کے سامنے جمع ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ علی ان پر توجہ دیے بغیر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سمرن بھی اس کے ساتھ تھی۔

''رخشندہ پھنس جائے گی۔'' وہ پریشان ہوئی۔

''اسے کال کر کے کہہ دو ابھی کچھ دن غائب رہے یہاں سے۔'' اس نے گاڑی موڑی اور سڑک پر لے آیا۔

''تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟''

''اپنے گھر۔'' سمرن نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ سنجیدہ تھا۔

☆☆☆

''شہباز اکبر کا رشتے دار ہے وہ۔'' جیک نے جینی کے سامنے علی حسن کی پوری تفصیل رکھی۔ وہ تین دن سے مسلسل اس کام میں لگا ہوا تھا۔ آخر پوری معلومات حاصل

کر کے واپس آیا تھا۔ مسلسل تین دن سے لاہور ڈیفنس اور کرنل شعیب کے گاؤں کے چکر کاٹنے کے بعد یہ معلومات حاصل ہوئی تھی۔ ''اس کا باپ ریٹائرڈ کرنل تھا اور میرا خیال ہے شہباز اکبر سے اس کی نہیں بنتی تھی۔''

''یہ کیسے حاصل ہوئیں معلومات؟'' جینی نے علی حسن اور شعیب کی تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایک اولڈ مین کو اٹھایا تھا ان کے گاؤں سے...... شعیب کا کوئی کزن وغیرہ تھا، اب نہیں رہا۔'' جیک کے ہونٹ بھنچ گئے۔ وہ بہت کم مسکراتا تھا۔ جینی نے شہباز اکبر کی فیملی کی تفصیل دیکھی۔

''اس پر ہاتھ ڈالنا مشکل ہوگا۔ یہ تو موجودہ حکومت کا بندہ ہے اور اس کی سیکیورٹی بھی سخت ہوگی۔'' جیک نے کہا۔

''ہاں مگر ہم اس کی فیملی پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ ظاہر ہے جب اے ایچ کے خاندان تک بات پہنچے گی تو اسے تکلیف تو ہوگی۔''

''مگر یاد رکھو...... راجیو نے ابھی اس معاملے میں ہاتھ ڈالنے سے منع کیا ہے۔ اے ایچ ہوشیار ہوگیا تو ان کے ہاتھ سے بھی نکل جائے گا۔''

''اس کمینے کا نام نہ لو میرے سامنے، ان کو جو ٹاسک دیا گیا ہے، وہ خود پورا کریں۔ مجھے تو اے ایچ کو زندہ یا مردہ ڈیوڈسر کے پاس لے جانا ہے۔'' وہ غرائی۔ جیک خاموش ہو گیا۔ جینی اندر گئی اور کچھ دیر بعد واپس آئی۔ اس نے جیک کے سامنے کافی کا کپ رکھا۔ ''تمہاری دی گئی معلومات کے مطابق شہباز اکبر کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے۔ ہم اس کی بیٹی کو اٹھائیں گے۔''

''فائدہ کیا ہوگا؟ اے ایچ سے تو رابطہ ممکن نہیں، جینی ہم اس طرح حکومت کو ملوث کرلیں گے معاملے میں۔'' اس نے دوبارہ سمجھانے کی کوشش کی مگر راجیو کے ہتک آمیز رویّے کے بعد جینی کچھ سمجھنے کے لیے تیار نہ تھی۔

''ہونے دو حکومت کو ملوث، ہم شہباز کی بیٹی کو اٹھائیں گے اور شہباز کے سامنے اے ایچ کو لانے کا مطالبہ رکھیں گے۔ کوئی راستہ نکل آئے گا۔'' اس نے سیل فون اٹھایا اور کال پر کہا۔ ''گاڑی لے آؤ۔'' کال بند کرنے کے بعد اس نے جیک کی طرف دیکھا۔ ''آؤ، ذرا ان کے معمولات کا جائزہ لے لیں۔'' جیک نے گہری سانس لی اور کھڑا ہوگیا۔

اگلے دو دن انہوں نے زنیرا کا تعاقب کیا۔ اس کے ساتھ کوئی خاص سیکیورٹی نہیں تھی۔ ان کے لیے یہ بہت آسان ٹارگٹ تھا۔ تیسرے دن شام کے وقت جب وہ پارک سے واپس اپنی گاڑی میں گھر جا رہی تھی، جینی نے اس کے سامنے کار روکی۔ جیک نیچے اترا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی زنیرا کو دیکھا جو اچانک روکے جانے پر حیران دکھائی دیتی تھی۔ جیک نے شیشے پر ہاتھ مارا۔ زنیرا نے شیشہ نیچے کر لیا۔

''یس؟''

''ہم راستہ بھول گئے ہیں، کیا آپ بتا سکتی ہیں ڈیفنس کا بلاک اے کس سائڈ پر ہے؟''

''جس سائڈ سے آپ آئے ہیں......'' ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ جیک کا ریوالور شیشے سے اندر داخل ہوا۔

''باہر آجاؤ۔'' خوف کے مارے زنیرا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے لاک کھولا اور باہر آگئی۔ جیک اسے اپنی گاڑی کی طرف لے آیا اور اچانک اس کے سر پر وار کیا۔ وہ گر گئی۔ اس نے تیزی سے اسے پچھلی سیٹ پر ڈالا۔ جینی نے گاڑی آگے بڑھا لی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ڈیفنس کا علاقہ پیچھے چھوڑ کر دور نکل گئے تھے۔ جیک زنیرا کی آنکھوں پر پٹی باندھ چکا تھا۔ وہ مسلسل کانپ رہی تھی اور اس کے دماغ میں ماں باپ کی دی گئی ہدایات گھوم رہی تھیں جو بار بار اسے باڈی گارڈ ساتھ رکھنے کا کہتے تھے مگر وہ ان کی باتوں پر دھیان نہ دیتی۔ گاڑی کئی موڑ کاٹ کر آخر ایک گھر میں داخل ہوئی۔ یہ علاقہ کچھ دن پہلے آباد ہوا تھا اس لیے یہاں زیادہ گھر نہ تھے۔ جیک نے زنیرا کو نیچے اتارا اور اسے لے کر ایک کمرے میں جا کر بند کر دیا۔ وہ اتنی ڈری ہوئی تھی کہ اس کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ جینی مسلسل سیل پر لگی ہوئی تھی۔ لاؤنج میں بیٹھ کر اس نے ٹی وی آن کیا۔ ابھی تک زنیرا کے اغوا کی خبر نہیں آئی تھی۔ وہ کچھ سوچ کر اندر بڑھ گئی۔ جیک نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''میں ذرا لڑکی سے دو چار سوال کرلوں۔'' اس نے بتایا اور اندر بڑھ گئی۔ اسے دیکھ کر کرسی پر بیٹھی زنیرا کھڑی ہوگئی۔

''کون ہو تم لوگ؟ کیوں لائے ہو مجھے یہاں؟ میرے پاپا چھوڑیں گے نہیں تمہیں۔'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ جینی نے آگے بڑھ کر پوری قوت سے تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس کے ہونٹوں سے خون رسنے لگا۔

''علی حسن کہاں ہے؟'' جینی نے سوال کیا۔
''مم مجھے نہیں پتا۔'' زنیرا کے جواب کے بعد لگنے والا تھپڑ اس کا گال سرخ کر گیا۔ جینی کی انگلیوں کے نشان اس کے چہرے پر ثبت ہو گئے تھے۔ زنیرا مسلسل کانپ رہی تھی۔
''بتانا ہے یا جیک کو بلاؤں؟'' اس کے الفاظ میں چھپی دھمکی زنیرا سمجھتی تھی۔
''وہ ملا تھا پاپا سے...... ہوٹل میں، اس کے بعد کچھ علم نہیں کہاں ہے۔'' زنیرا نے تمام تفصیل بتادی۔
''ہمم۔'' جینی کو اس کے لہجے میں سچائی محسوس ہوئی۔
''کرتی ہوں تمہارے پاپا سے رابطہ۔'' یہ کہہ کر وہ باہر آگئی۔ زنیرا وہیں بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

☆☆☆

''زنیرا غائب ہے۔'' شہباز اکبر کو سنائی دینے والی آواز زبیر کی تھی۔ چند لمحوں کے لیے انہیں کچھ سمجھ نہ آیا۔ انہوں نے دوبارہ سیل فون کی طرف دیکھا اور بولے۔
''کیا مطلب؟ کدھر غائب ہے؟''
''زنیرا کو اغوا کرلیا گیا ہے ڈیڈ۔'' یہ سنتے ہی ان کے ہاتھ سے موبائل گر گیا۔ وہ بھاگتے ہوئے باہر نکلے۔ ڈرائیور پہلے گاڑی نکال چکا تھا۔ سیکریٹری نے موبائل اٹھا کر ان کی گاڑی میں رکھا۔ چند لمحوں بعد ان کی گاڑی تمام مناظر پیچھے چھوڑتی ہوئی ان کے بنگلے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی رقیہ روتے ہوئے ان سے لپٹ گئی۔ انہوں نے اسے تسلی دی اور زبیر کی طرف بڑھ گئے جو سیڑھیوں پر کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔
''کیسے علم ہوا اغوا کا؟ ہوسکتا ہے کسی دوست کے گھر گئی ہو۔'' ان کے لہجے میں امید تھی مگر زبیر نے نفی میں سر ہلا دیا۔
''اسے اغوا کرنے والوں کی کال آئی تھی۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' اندر جا کر وہ فون کے پاس بیٹھ گئے۔ رقیہ مسلسل رو رہی تھی۔
''پولیس سے رابطہ کیا تم نے؟'' انہوں نے زبیر سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
''آپ کا انتظار کر رہا تھا۔'' وہ خاموش ہو گئے۔ مسلسل دو گھنٹے وہاں بیٹھے رہنے کے بعد آخر انہیں کال موصول ہوئی۔ دوسری طرف سے کوئی لڑکی تھی جو انگلش میں بات کر رہی تھی۔ اپنا نام سنتے ہی انہوں نے کہا۔

''جی بات کر رہا ہوں۔''
''زنیرا ہمارے پاس ہے یہ علم تو ہو چکا ہے آپ کو...... اب کرتے ہیں کام کی بات۔''
''تم ہو کون؟''
''یہ سوال غیر ضروری ہے، میں چاہتی کیا ہوں یہ ضروری ہے۔'' دوسری طرف موجود لڑکی کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جو انہیں دھمکی دینے سے روک رہی تھی۔
''میرے صرف دو چھوٹے سے مطالبے ہیں، نمبر ایک...... علی حسن کہاں ہے، اس کا پتا دیا جائے اور نمبر دو، علی حسن کے پاس موجود ڈیٹا کی کوئی کاپی آپ کے پاس ہے وہ ہمارے حوالے کردیں۔''
''مجھے نہیں معلوم...... علی حسن کہاں ہے نہ ہی ڈیٹا میرے پاس ہے۔'' ان کا دماغ گھوم رہا تھا۔ علی حسن کی وجہ سے زنیرا کا اغوا ہونا معمولی بات نہیں تھی۔ یہ کوئی اغوا برائے تاوان کا کیس نہیں تھا۔ اس میں بڑی طاقتوں کے ایجنٹ شامل تھے۔
''ٹھیک ہے پھر، زنیرا کی لاش کل میں بھیج دوں گی، ڈاک سے بھیجوں یا ای میل کردوں؟'' لڑکی ہنس پڑی۔
''تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔'' انہوں نے طیش میں آ کے کہا۔
''میں گورنمنٹ کی کوئی معمولی ملازم نہیں مسٹر اکبر...... جسے تم دھمکا سکو۔ جو کہا ہے وہ کرو، ورنہ میں نے جو کہا ہے وہ کرنے میں مجھے وقت نہیں لگے گا، کل ٹھیک اسی وقت رابطہ کروں گی۔'' کال بند ہو گئی۔ شہباز سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ علی کی وجہ سے اس کے خاندان تک بات آجائے گی، یہ انہوں نے کبھی سوچا نہ تھا۔
''پولیس سے رابطہ کریں؟'' زبیر نے پوچھا۔
''نہیں۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ کافی دیر سوچنے کے بعد وہ اٹھ کر اندر آ گئے۔ اس بار انہوں نے دو تین موبائل نمبرز پر رابطہ کیا۔ آخر میں انہوں نے علی کو کال ملائی۔ اس کی آواز سنائی دیتے ہی انہوں نے پوچھا۔
''علی تم کہاں ہو؟''
''اپنے گھر۔''
''کیا مطلب؟ تم پاگل ہو جو اپنے گھر بیٹھے ہو؟''
''نہیں انکل، یہ محفوظ جگہ ہے یہاں سے ایک بار تلاشی لے کر گئے ہیں دوسری بار نہیں آئیں گے۔'' اس نے جواب دیا اور پھر پوچھا۔ ''خیریت؟ کیسے رابطہ کیا؟''
''مجھے تم سے ابھی ملنا ہے علی، میں آ رہا ہوں۔''

انہوں نے یہ کہہ کر کال بند کر دی اور کچھ سوچتے ہوئے باہر کی طرف چل دیے۔

☆☆☆

علی کال بند کر کے واپس مڑا۔ وہ دونوں کرنل شعیب کی بنائی گئی چھوٹی سی لائبریری میں موجود تھے۔ جیسے ہی علی واپس داخل ہوا، اس نے دیکھا سمرن بھی کسی سے کال پر بات کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے کال کاٹ دی اور علی سے پوچھا۔ ''کون تھا اے ایچ؟''

''انکل شہباز۔'' اس نے جواب دے کر کھوجتی نظروں سے سمرن کو دیکھا۔ ''تم کس سے بات کر رہی تھیں؟''

''رخشندہ سے۔''

''اس سے تو راستے میں بات ہو چکی تھی۔''

''ہاں لیکن اب پھر کال پر پوچھ رہی تھی۔ پریشان ہے بے چاری۔'' اس کی بات سن کر علی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پوری کوٹھی کی لائٹس بند تھیں۔ گیٹ پر بھی لاک تھا۔ وہ دونوں اندرونی حصے میں بنی اس لائبریری میں وقت گزار رہے تھے۔ علی کھانے پینے کا سامان ساتھ لایا تھا۔ شہباز کی کال کے تقریباً ایک گھنٹے بعد علی کو کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے سمرن کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر موجود تین، چار لوگوں کو حرکت کرتا دیکھ رہا تھا۔ یہ سائے تیزی سے کوٹھی کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ایک سائے پر غور کرنے کے بعد اس پر انکشاف ہوا...... وہ عباد تھا۔ باقی سب کے برعکس اس نے چہرہ چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ علی نے منہ پر ہاتھ رکھا...... اس کی لوکیشن ٹریس ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے سمرن کا چہرہ گھوم گیا۔ اس کے فلیٹ پر بھی حملہ ہوا تھا مگر اسے نشانہ نہیں بنایا گیا تھا۔ علی نے گہری سانس لی۔ وہ دھوکا کھا گیا تھا۔ اب بچ نکلنا مشکل تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا لائبریری کی طرف بڑھ گیا جہاں سمرن موجود تھی۔ ''کون تھا باہر؟'' علی کو دیکھتے ہی اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''وہی جنہیں تم نے بلایا ہے۔'' علی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' وہ چونکی۔

''ڈراما مت کرو سمرن، باہر انڈین موجود ہیں۔''

''تو تم بھاگ کیوں نہیں رہے؟ وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔'' وہ چیخی۔ علی نے خاموشی سے اسے دیکھا۔

''یہ لو۔'' علی کی جیب میں دو ریوالور تھے۔ اس نے ایک نکال کر سمرن کو دے دیا۔ سمرن نے خاموشی سے پکڑ لیا۔ ''جا رہا ہوں میں، اگر چاہو تو گولی مار دینا۔'' یہ کہہ کر علی کا ہاتھ گھوما اور سمرن کے منہ پر پڑا۔ وہ ابھی تک شاک میں تھی۔ وہ پیچھے گری اور ٹیبل سے ٹکرائی۔ ٹیبل الٹ گئی۔ کئی کاغذات ایک ساتھ نیچے گرے۔ یہاں ایک فائل بھی تھی۔ مدھم روشنی میں علی کی نظر اس پر لکھے الفاظ پر پڑی جو کرنل شعیب کی لکھائی سے لکھے گئے تھے۔

''زیدی کے لیے۔'' اس فائل پر اس کی نظر پہلی بار پڑی تھی۔ علی نے فائل اٹھائی اور باہر نکل گیا۔ فائل اس نے جینز کے ساتھ اڑس لی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ سمرن کی آنکھ میں آنسو تھے۔ علی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا چھت کی طرف بڑھ گیا۔ چھت پر آتے ہی اس نے دیکھا، یہاں جو نقاب پوش موجود تھا، وہ دوسری طرف منہ کیے گیٹ کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اسنائپر دکھائی دیتی تھی۔ علی اپنے جوتے سیڑھیوں پر چھوڑ آیا تھا۔ اس لیے اس کے قدموں کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ سامنے والا اتنا محتاط نہیں تھا۔ علی چند قدم اٹھا کر اچانک تیزی سے بھاگا اور اسے پوری قوت سے دھکا دیا۔ ایک چیخ بلند ہوئی اور وہ سر کے بل نیچے گرا۔ پختہ فرش پر سر ٹکرانے کے بعد اس کا بچ جانا ممکن نہیں تھا۔ علی نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اسے ایک مضبوط رسی دکھائی دی۔ شاید اسی کے ذریعے اس کا شکار بننے والا شخص چھت پر چڑھا تھا۔ علی اسی رسی سے چھت سے نیچے اترا۔ اس کے ہاتھ زخمی ہو گئے تھے مگر جان بچانے کے لیے ان زخموں کی پروا کرنا بے معنی تھا۔ کوٹھی کے عقب میں کوئی موجود نہ تھا...... یہی وقت تھا جب کوٹھی میں فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ علی کچھ دور بھاگتا ہوا ایک بلڈنگ کے سامنے رک گیا جس کے چوکیدار کو پیسے دے کر اس نے اپنی گاڑی یہاں کی پارکنگ میں کھڑی کی تھی۔ گاڑی نکال کر وہ سڑک پر لے آیا اور اپنے ایک اور محفوظ ٹھکانے کا رخ کیا۔

چائنا سے پاکستان آتے ہوئے اس نے سوچ لیا تھا، وہ انڈین یا امریکیوں کے لیے آسان شکار ثابت نہیں ہوگا۔ اس نے اب تک جتنے قدم اٹھائے تھے، بہت سوچ سمجھ کر مکمل پلاننگ کے ساتھ اٹھائے تھے۔ اس کے پاس پیسہ تھا اس لیے اپنے ملک میں اس کے لیے کچھ خریدنا مشکل نہ تھا۔ اس لیے اب تک وہ ان سے بچتا آ رہا تھا لیکن سمرن کے جال میں پھنسنا شاید اس کی بہت بڑی غلطی تھی۔

''تم نے بہت بُرا کیا سمرن...... بہت برا۔'' وہ

بڑبڑایا۔ وہ چاہتا تو اسے گولی مار سکتا تھا مگر نجانے کیوں وہ رک گیا تھا۔ ان دو تین ماہ کے ہنگاموں کے درمیان وہ خود کو پہلی بار تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ شاید ہارا ہوا بھی...... اب کی بار اس کی منزل ایک دوسرے درجے کی عمارت میں موجود فلیٹ تھا۔ فلیٹ میں داخل ہوتے ہی اس نے فائل نکال کر بیڈ پر پھینکی۔ موبائل صوفے پر رکھ کر وہ باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ گرم پانی سے نہانے کے بعد وہ باہر آیا تو اس کا دماغ فریش ہو چکا تھا۔ اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ سمرن کی تین چار مس کالز آچکی تھیں۔ وہ اس کی ڈھٹائی پر حیران تھا۔ سچ کھل جانے کے باوجود وہ ابھی تک اس سے رابطہ کر رہی تھی۔ علی نے موبائل پھینک کر فائل اٹھالی۔ یہ پندرہ بیس صفحات پر مشتمل فائل تھی جو کسی اسپیشل برانچ کی فائل سے کاپی کی گئی تھی۔ علی کو بیس منٹ لگے تھے اسے پڑھنے میں...... اور یہ بیس منٹ اس کا سر گھومتا رہا تھا۔ ''سازش۔'' اس کے دماغ میں بار بار یہ لفظ گونج رہا تھا...... فائل مکمل پڑھتے ہی وہ بیڈ سے نیچے گر گیا۔ اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ رہے تھے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے موبائل اٹھایا۔ ٹھیک اسی وقت بیل بجی۔ سمرن کی کال تھی۔ اس نے ریسیو کی۔

''ہیلو...... سمرن۔''

''اے ایچ......'' اس کی سرگوشی سنائی دی۔

''تم کہاں ہو سمرن؟''

''ادھر ہی...... میں غدار نہیں اے۔'' وہ اس کا پورا نام نہ لے سکی۔ اس کی آواز کمزور پڑ رہی تھی۔

''میں جانتا ہوں سمرن...... میں آرہا ہوں۔''

''کک کوئی فائدہ......'' اس کے الفاظ ٹوٹ گئے ''آئی لو......'' آواز ختم ہوگئی۔ شاید سمرن بھی۔

''ہیلو...... سمرن......'' وہ چیخا۔ ''سمرن۔'' مگر کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے موبائل پوری قوت سے دیوار میں دے مارا۔ وہ ہار گیا تھا...... زندگی میں دوسری بار دھوکا گیا تھا اور پہلا دھوکا؟

☆☆☆

''تم عقل سے پیدل ہو، جاہل ہو تم، بیوقوف ہو۔'' ڈیوڈ کے منہ سے نکلنے والی گالیاں جینی اور جیک دونوں سن رہے تھے۔ جینی کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ جیک خاموش تھا مگر بہن کی ہونے والی بے عزتی اسے یقیناً اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

''سس سوری۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے بس اتنا کہا مگر ڈیوڈ کچھ سننے کے موڈ میں نہ تھا۔

''تم ابھی واپس آ جاؤ اس مشن سے۔ میں کسی اور کو بھیج دوں گا۔''

''یہ مشن میں ہی مکمل کروں گی باس، اب یہ میری ضد بن چکا ہے۔'' اس نے سر اٹھا کر جواب دیا۔ ڈیوڈ کا بس چلتا تو وہ لیپ ٹاپ کی اسکرین سے باہر آ کر اس کا سر پھاڑ دیتا۔

''تمہیں کس نے کہا تھا شہباز اکبر کی بیٹی اغوا کرو؟ انڈینز کے مشن میں وہ ان کا ساتھی ہے۔ ہر سال کروڑوں روپے حاصل کرتا ہے وہ۔ الیکشن انہی پیسوں سے جیت جاتا ہے...... علی کا رشتے دار ضرور ہے مگر وہ جلد علی کو ان کے حوالے کرنے والا تھا۔ ہر لمحے کی تفصیل دے رہا تھا انہیں، ابھی راہول سے میری بات ہوئی ہے۔ راجیو نے تمہاری شکایت کی ہے۔''

''اس راجیو کا رویہ میرے ساتھ اچھا نہیں تھا۔'' جینی نے ایک بار پھر صفائی دینے کی ناکام کوشش کی۔

''اس کا حل بعد میں نکالا جاتا مگر تم نے یہاں بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ علی حسن غائب ہے کل سے، ایسا کرو...... زنیرا کو چھوڑ آؤ واپس پھر میں بتاتا ہوں کیا کرنا ہے۔'' یہ کہہ کر کال ڈس کنیکٹ کر دی گئی۔ جینی واپس مڑی اور زنیرا کو باہر لے آئی۔ اس کی آنکھوں پر اسی طرح پٹی باندھ کر اسے کار میں بٹھایا اور واپس چھوڑنے چلی گئی۔ اسے چھوڑ کر وہ واپس آئی تو جیک وہیں لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھا تھا۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' اس نے جیک کی طرف دیکھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ کسی مشن میں اس طرح ناکام ہوئی تھی۔ یہ ناکامی اب اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بیٹھنے کے بجائے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔

''ڈیوڈ سر کا آرڈر آیا ہے۔''

''کیا؟'' جینی کو جیک کی آنکھوں میں چمک دکھائی دی۔

''علی کو پکڑنے کے بجائے مار دو...... یہ اس کی آخری کال کی لوکیشن، وہ اسی ہوٹل میں ہے ابھی تک۔'' وہ خوش ہو گئی۔

''یہ ہوئی نا بات......'' دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ کھیل اب اختتام کی جانب بڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

دور تک پھیلے سمندر پر سورج کی روشنی مدھم پڑ رہی تھی۔ وہ آج رات ہی یہاں پہنچا تھا۔ خاموشی سے اترتی شام نے رفتہ رفتہ سمندر کے کنارے کو سنسان کرنا شروع

دیا۔ رش کم ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد یہاں بہت کم لوگ تھے۔ ''کیا میں ہار چکا ہوں؟'' اس نے خود سے پوچھا۔ اس کے سامنے سنوری کی شکل گھوم گئی...... سمرن، پروفیسر ژونگ، ناظم...... کئی لوگ تھے جو اس سازش کا نشانہ بن چکے تھے۔ اسے لگا وہ سب اس سے پوچھ رہے ہیں۔ خاص طور پر سمرن...... جس کو بہت اذیت دے کر مارا گیا تھا۔ آخری لمحات میں اس کی ٹانگوں کو گولیوں سے چھلنی کرنے کے بعد اسے موبائل پکڑا کر چلے گئے تھے کہ جس سے مرضی سے رابطہ کرلو اور وہ علی سے رابطہ کرتی رہی۔

یہی وقت تھا جب اس کی نظروں کے سامنے پروفیسر ژونگ کے گھر کا منظر گھوم گیا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھا، اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

''کیا تم جانتے ہو اے ایچ...... انسان شکست کب کھاتا ہے؟''

''کب؟''

''جب وہ اُس کام کو کرنے کی کوشش کرتا ہے جو نہیں کرسکتا۔''

''مگر زندگی میں کچھ بھی ناممکن نہیں سر۔''

''ایسا بالکل ہے مگر معلوم ہے کیسے؟''

''کیسے؟''

''اپنی طاقت استعمال کر کے...... کبھی جب تم ہارنے لگو گے کسی میدان میں تو تم یہ دیکھنا، تمہاری طاقت کیا ہے، صلاحیت کیا ہے...... ہاں تم ایک زبردست ہیکر ہو، ذہین ہو تو جس مخالف سے شکست کھا جاؤ، اسے اپنے میدان میں گھسیٹ لو۔'' شاید پروفیسر نے ایسے ہی حالات کے لیے اسے یہ کہا تھا۔ وہ اب تک بھارتیوں اور امریکیوں سے لڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مسلسل بھاگ رہا تھا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جان بچانے کی کوشش میں چھپتا پھر رہا تھا۔ جو کام وہ کرنے آیا تھا، ابھی تک اس میں بھی تقریباً ناکامی ہوئی تھی۔

شہباز اکبر کے بارے میں جان کر اسے جھٹکا لگا تھا۔ کرنل شعیب کی اس لیے شہباز سے نہیں بنتی تھی کیونکہ وہ غدار تھا۔ اس فائل میں اس کے کارناموں کی مکمل تفصیل تھی۔ حکومتی پارٹیوں میں ہونے کی وجہ سے وہ ہر بار بچ جاتا تھا۔

''اس بار تم نہیں بچو گے شہباز۔'' اس نے سوچا۔

رات دس بجے وہ اپنے ہوٹل میں واپس آگیا۔ لیپ ٹاپ کھولا اور اس کے ساتھ ایک ہائی اسپیڈ انٹرنیٹ ڈیوائس جوڑ دی۔ اس کے بعد اس نے ڈیٹا محفوظ رکھنے والی ایک ویب سائٹ پر اپنا پرانا اکاؤنٹ کھولا۔ یہاں پورا ڈیٹا اور ویڈیوز محفوظ پڑی تھیں۔ اس نے وہ تمام ڈیٹا لیپ ٹاپ کی ہارڈ پر کاپی کرلیا۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے شہباز اکبر کا ای میل کھنگالنا شروع کر دیا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد وہ اس کے تمام اکاؤنٹس تک پہنچ چکا تھا۔ اس کے پاس مکمل تفصیل جمع ہو چکی تھی۔ یہاں قسمت نے اس کا ساتھ دیا۔ شہباز اکبر کا ای میل جہاں جہاں لاگ ان تھا وہاں سے اس کا پورا ڈیٹا چراتے ہوئے اسے کئی ریکارڈنگز ملیں۔ اس کے پاس تمام ثبوت جمع ہو چکے تھے۔ اس میدان میں وہ ان سے کہیں آگے تھا...... تھوڑی دیر بعد یہ تمام ڈیٹا مختلف جگہ پر اپلوڈ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

''شہباز اکبر کی ویڈیوز سامنے آئی ہیں اس کے علاوہ کئی ایسے ثبوت ملے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دشمن ملک کے لیے کام کرتا تھا۔ جائداد اور اکاؤنٹس کی تفصیل بھی سامنے آچکی ہے مگر ابھی تک شہباز اکبر کی طرف سے کوئی بیان سامنے آیا ہے نہ ہی حکومت نے اپنے عہدیدار کے خلاف کسی قسم کی کارروائی کا اعلان کیا ہے۔'' زنیرا ساکت بیٹھی وہ خبریں سن رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم میں جان نہیں۔

''امی...... زبیر۔'' پوری خبر سننے کے بعد اس کے ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ زبیر بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔

''کک کیا ہوا؟'' رقیہ بھی اس کے پیچھے تھی۔ نیوز کاسٹر اب کسی سینئر صحافی سے بات کرنے میں مصروف تھی۔ صحافی بڑی سنجیدگی سے پوری صورت حال کا تجزیہ کر رہا تھا۔

''اسے اپوزیشن کی کوئی سازش سمجھا جاسکتا تھا مگر ایسا نہیں ہے کیونکہ ویڈیو نامعلوم ذرائع سے حاصل ہوئی ہے اور کسی قسم کے شک کی کوئی گنجائش نہیں، شہباز اکبر ویسے بھی الیکشن سے صرف چند ماہ پہلے اس پارٹی میں شامل ہوئے تھے۔ ماضی میں بھی ان پر منی لانڈرنگ کا الزام تھا مگر حالات اتنے خراب ہیں، یہ کسی کو اندازہ نہ تھا۔ امید کی جاسکتی ہے وزیراعظم خود اس پورے معاملے کا نوٹس لیں گے۔''

''او میرے خدا۔'' رقیہ نے منہ پر ہاتھ رکھا۔ زبیر خاموش تھا جبکہ زنیرا اماں کو سنبھالنے میں لگی ہوئی تھی۔ یہی وقت تھا جب انہیں باہر شور سنائی دیا۔ پتھر شیشے توڑتے ہوئے اندر آگرے۔ عوام کے نعروں کی آواز سنائی دے

رہی تھی۔ پولیس کی کئی گاڑیاں ان کے گیٹ کے سامنے آرکیں۔ انہوں نے اس مشتعل ہجوم کو روکنے کی کوشش شروع کردی۔ دو اہلکار اندر داخل ہوئے اور انہیں اندرونی کمروں میں جانے کا کہا۔

''ڈیڈ کہاں ہیں؟'' زنیرا نے ماں سے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم، صبح سے غائب ہیں۔''

''ان کی گاڑی تو گیراج میں موجود ہے۔'' زبیر نے کہا۔ وہ سب حیران تھے...... ''کیا بنے گا ہمارا؟ پاپا کی غداری ثابت ہوگئی تو یہ لوگ ہمارا جینا حرام کردیں گے۔''

''اور کیسے ثابت ہونی ہے غداری؟'' زنیرا نے تلخی سے کہا۔ ''مجھے تو شرم آرہی ہے انہیں اپنا باپ کہتے ہوئے۔'' رقیہ خاموشی سے بیٹے اور بیٹی کی باتیں سن رہی تھی۔ خود اس کا دماغ بند ہو چکا تھا۔ کوئی سوچ دماغ میں داخل ہونے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ ابھی وہ بیڈروم میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک سب انسپکٹر نے آکر کہا۔

''ہم تمام کمرے بند کر رہے ہیں، آپ لوگ پلیز کسی اور جگہ چھپ جائیں، عوام قابو سے باہر ہو رہی ہے۔'' انہوں نے خاموشی سے اس کی بات سنی۔ شہباز اکبر کے گھر میں کبھی ایس پی سے کم آفیسر نہیں آیا تھا اور آج ایک سب انسپکٹر آکر ان کی فیملی کو تحفظ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اسٹور روم میں چلے جاتے ہیں۔'' زبیر نے کہا۔ وہ تینوں کھڑے ہوئے اور اسٹور روم کی طرف بڑھ گئے۔ زبیر نے دروازہ کھول کر لائٹ جلائی۔ ایک کرسی پر شہباز اکبر بیٹھا تھا...... اس کے ہاتھ میں پسٹل تھا اور کنپٹی سے خون بہہ رہا تھا۔

''پاپا۔'' زنیرا چیخی...... لیکن شہباز اب بات سننے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ کہانی ختم ہو چکی تھی......

☆☆☆

''اس نے اپنی ساری رقم اسٹیٹ بینک سے نکلوالی ہے۔'' ڈیوڈ ایک بار پھر ویڈیو کال پر ان کے سامنے تھا۔ ''اور وہ خود بینک گیا تھا۔ منیجر کو میں نے پہلے اس کام کے پیسے دے دیے تھے کہ وہ علی کی آمد کی اطلاع اور بینک اکاؤنٹ کی تفصیل مجھے دے...... منیجر نے اسے باتوں میں پھنسا کر اس کا ایڈریس لے لیا ہے۔ اب وہ اس پتے پر ہے......'' اس نے پتا بتایا۔ ''یہ شہر سے ہٹ کر ایک کمرے کا مکان ہے...... یہاں تم لوگ اسے آسانی سے قابو کر سکتے ہو۔'' جینی اور جیک نے خاموشی سے پوری بات سنی۔ بات اختتام پر جینی بولی۔

''کیا وہ رات کو یہیں رکے گا؟''

''منیجر کے مطابق وہ دو دن مزید یہاں ہے اس کے بعد وہ لاہور چلا جائے گا۔''

''ہم اسے دیکھتے ہی گولی ماردیں یا......؟'' اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑی۔

''میرا خیال ہے اب اسے ماردینا بہتر ہے۔'' ڈیوڈ کے چہرے پر سوچ کے تاثرات تھے۔ ''میں پہلے اسے زندہ پکڑنا چاہتا تھا اور تمام ڈیٹا حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ ڈیٹا اس نے نجانے کس کس کو دے دیا ہے تو یہ چیز اب خفیہ نہیں رہی۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے سر ہلا دیا۔ کال کاٹنے کے بعد دونوں نے تیاری پکڑی۔ وہ ایک دن پہلے کراچی آچکے تھے کیونکہ انہیں یقین تھا سمرن اور شہباز کے بعد علی حسن لاہور نہیں رکے گا۔ ہوٹل سے بھی وہ غائب ہو گیا تھا۔

گاڑی کرائے پر حاصل کرنے کے بعد وہ ڈیوڈ کے دیے گئے ایڈریس پر چل پڑے۔ یہ علاقہ شہر سے بیس پچیس کلومیٹر دور تھا۔ ڈبل روڈ کے ذریعے وہ اس ایڈریس تک پہنچ گئے۔ گیٹ پر تالا لگا ہوا تھا۔

''یہ تو بند پڑا ہے؟'' جیک نے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں، یہ صرف لوگوں کو دکھانے کے لیے بند ہے۔ کوئی ہے اندر، وہ دیکھو۔'' جینی نے اشارہ کیا۔ ''ٹائروں کے نشان، یہاں کچھ دیر پہلے ہی گاڑی اندر آئی ہے شاید۔''

اس کے ساتھ ہی دونوں نے پسٹل ہاتھ میں لیے۔ منہ پر نقاب چڑھایا۔ پلان کے مطابق جینی سامنے سے اور جیک گھر کی پچھلی طرف سے اندر داخل ہوا۔ دونوں کا ٹارگٹ وہ اکلوتا کمرا تھا جو کھلا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دروازے کی دونوں طرف کھڑے ہو کر سانس روک کر انہوں نے اندر کسی کی موجودگی محسوس کرنے کی کوشش کی۔ یہی وقت تھا جب جینی کا صبر جواب دے گیا۔ اس نے گھوم کر دروازے پر لات ماری اور پسٹل سامنے کیا مگر اندر کوئی بھی نہ تھا...... بس ہلکی سے بیپ سنائی دے رہی تھی...... جیک کی چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجادی۔

☆☆☆

اسٹیٹ بینک کی مین برانچ کے منیجر خرم شہزاد کی گاڑی گھر میں داخل ہوئی۔ گیراج میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد وہ اندر بڑھ گیا۔ ڈرائنگ روم میں اس کے بیٹے کے ساتھ ایک خوش شکل نوجوان موجود تھا۔ اس کا بیٹا فرسٹ ایئر میں تھا اور ذہین طالب علم تھا۔ اس کی نوجوان کے ساتھ کسی

بات پر گفتگو جاری تھی۔ وہ نوجوان خرم شہزاد کے لیے اجنبی تھا۔ اس کا بیگ سامنے میز پر رکھا تھا۔ خرم کو دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا اور اس سے ہاتھ ملایا۔ خرم کی بیوی سعدیہ ڈرائنگ روم میں چائے لے کر داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی وہ بولی۔ ”شکر ہے آپ جلدی آگئے، یہ آپ کے کسی دوست کے بیٹے ہیں۔ کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے تھے۔“

”میرے دوست کے؟“ خرم نے الجھی نظروں سے اجنبی کی طرف دیکھا۔ ”میں تو شاید پہلی بار انہیں دیکھ رہا ہوں۔“

”جی تب میں بہت چھوٹا تھا جب آپ ہمارے گھر آتے تھے۔“ اس نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”خرم صاحب مجھے آپ سے ضروری کام ہے کچھ دیر کے لیے، ہم تنہائی میں بات کر سکتے ہیں؟“

”جی ضرور۔“ خرم نے سر ہلا دیا۔ اس نے سعدیہ کو اشارہ کیا۔ وہ ماں بیٹا بیڈ روم میں چلے گئے۔ ”جی بیٹھیں اور فرمائیں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟“ اس نے نوجوان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”سب سے پہلے تو میں اپنا تعارف کروا دوں۔“ نوجوان نے بیگ سے لیپ ٹاپ باہر نکالا۔ ”میرا نام علی حسن ہے...... وہی علی حسن جس کا بینک اکاؤنٹ آپ کے بینک میں ہے اور اس کی معلومات دینے کے لیے آپ نے ایک امریکی سے کوئی دس لاکھ روپے لیے ہیں۔“ خرم چونک گیا۔

”کک...... کیا مطلب؟“

”ٹھنڈا پانی پی لیں پھر بتاتا ہوں۔“ علی نے جگ اٹھا کر اسے گلاس میں پانی ڈال کر دیا۔ اس کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا۔ پانی کا گلاس ایک سانس میں پینے کے بعد اس نے دوبارہ علی کی طرف دیکھا جو اب اسے اب بھوت لگ رہا تھا۔ ”تو جی خرم صاحب، یہ رہی آپ کے اکاؤنٹس کی مکمل تفصیل اور آپ کی حرکات کا ثبوت۔“ اس نے لیپ ٹاپ پر مکمل تفصیل اسے دکھائی۔ ”یہ ای میل میں نے تیار کی ہے اور یہ ساری تفصیل صرف ایک کلک پر اسٹیٹ بینک ایریا منیجر اور ڈائریکٹر سے لے کر حکومتی اداروں تک پہنچ جائے گی۔ کیا خیال ہے پھر؟“

خرم مکمل تفصیل دیکھ چکا تھا۔ اس نے ٹشو اٹھا کر پسینہ صاف کیا اور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”کیا چاہتے ہو؟“

”چھوٹا سا کام ہے...... زیادہ مشکل نہیں تمہارے لیے۔“

”کیا کام؟“

”امریکیوں کو میرا ایڈریس دے دو۔“ اس لمحے خرم کو اس کی دماغی حالت پر شک ہوا تھا۔

☆☆☆

ریموٹ کنٹرول بم تھا۔ صرف ایک یا دو سیکنڈ لگے تھے ایکٹیویٹ ہونے میں۔ گھر کے سامنے موجود علی نے ریموٹ توڑ کر دور پھینک دیا۔ اکلوتے کمرے سے اٹھنے والے شعلوں نے ماحول کو روشن کر دیا تھا۔ کافی دنوں بعد اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ امریکیوں کی مکاری کے جواب میں اس نے اپنا دماغ استعمال کر کے انہیں شکست دے دی تھی۔ شہباز اکبر کے بعد جینی اور جیک کے بوجھ سے بھی دھرتی آزاد ہو گئی تھی مگر ابھی چند لوگ باقی تھے۔

گاڑی موڑ کر اس نے شہر کا رخ کیا۔ یہاں ایک ہوٹل میں رکنے کے بعد وہ اندر بڑھ گیا۔ حسبِ معمول اس کے بیڈ پر لیپ ٹاپ اور ہائی اسپیڈ انٹرنیٹ ڈیوائس پڑی تھی۔ ایک بار پھر کی بورڈ پر اس کی انگلیاں پھرتی سے چل رہی تھیں۔ اپنے میدان میں ایک بار پھر وہ ان لوگوں سے آگے تھا۔ اب کی بار اس نے شہباز اکبر کے ڈیٹا سے حاصل کی گئی معلومات استعمال کرنا شروع کر دی۔ جن لوگوں سے اس کا رابطہ تھا یہ پاکستان میں موجود وہ لوگ تھے جو در اصل انڈیا کے لیے کام کر رہے تھے۔ ان سب کی پروفائل میں اسے عباد کی تصویر بھی دکھائی دی۔ اس کا اصل نام وجے تھا اور وہ کافی عرصے سے پاکستان میں بھیس بدل کر موجود تھا۔ علی حسن پاکستان میں انڈین سیٹ اپ کے انچارج تک پہنچنا چاہتا تھا، ابھی تک شہباز اکبر کے ڈیٹا میں اسے انچارج کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ملی تھی۔

☆☆☆

”وہ ڈیل کرنے کے لیے تیار ہے۔“ راجیو نے راہول شرما کی طرف دیکھا۔ لیپ ٹاپ پر نظر آنے والے راہول کے چہرے پر سوچ کے تاثرات تھے۔

”وہ حرامی ہے...... امریکی اس سے شکست کھا چکے، ہمارے ساتھ کیسے ڈیل کرے گا؟“

”اس نے خود رابطہ کیا ہے وجے سے، وہ چاہتا ہے اسے پانچ لاکھ ڈالرز دیے جائیں اور وہ پاکستان چھوڑ کر چلا جائے گا۔“ راجیو خود الجھن میں تھا۔ اس طرح اچانک علی کا رابطہ کرنا سمجھ سے بالاتر تھا۔

”وجے سے رابطہ کیا؟ مطلب وہ وجے کو ٹریس کر چکا ہے؟“

”ہاں، وجے کو بھی اس نے ایک سوشل میڈیا سائٹ

پر کسی فیک اکاؤنٹ سے میسج کیا ہے...... ہم نے اکاؤنٹ کی کھوج لگانا چاہی مگر نا کام رہے۔''

''تو یہ کیسے یقین ہوگا کہ وہ واقعی علی ہے؟'' راہول کی نظروں کے سامنے جیک اور جینی گھوم گئے۔ ان کی موت کی اطلاع سب تک پہنچ چکی تھی۔ وہ علی سے خوفزدہ تھے۔

''یہ تصدیق تو میں کرلوں گا۔'' اس نے غور سے لیپ ٹاپ پر نظر آنے والے باس کے چہرے کو دیکھا ''لیکن آپ بتائیں اگر وہ واقعی علی حسن ہے تو کیا اس سے ڈیل کرنا مناسب ہے؟'' راہول نے چند لمحے سوچنے میں لگا دیے۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں تھکن تھی۔

''میرا خیال ہے یہ مناسب رہے گا...... ہم اسے نہیں پکڑ سکتے۔'' راجیو نے سر ہلا دیا۔ مزید ہدایات کے بعد راہول شرما آف لائن ہو گیا۔ اس کے بعد راجیو نے وجے کو بلایا۔

''تم علی حسن سے بات کرو، وہ پیسے کیسے حاصل کرنا چاہتا ہے ہم دینے کو تیار ہیں۔''

''میں کوشش کرتا ہوں۔'' اس نے سر ہلایا۔ علی حسن کے ساتھ چیٹ کو دوبارہ اوپن کر کے اس نے اسے میسج بھیج دیا۔ جواب کے لیے اسے رات ایک بجے تک انتظار کرنا پڑا۔ اس بار علی کا میسج شو ہوا۔

''اس نمبر کو محفوظ کرلو، واٹس ایپ پر بات ہوگی۔'' آگے چین کے کوڈ کے ساتھ نمبر شو ہوا۔ وجے نے غور سے دیکھنے کے بعد راجیو کو اطلاع دی۔

''یہ علی حسن ہی ہے کیونکہ اس کا واٹس ایپ نمبر چائنا کا ہے کوئی مقامی نہیں۔''

''دھوکا ہو سکتا ہے...... خیر تم رابطہ کرو اس سے۔''

وجے نے اس سے دوبارہ رابطہ کیا۔ اس بار کال پر بات ہوئی تھی۔ علی نے صاف الفاظ میں اپنا مطالبہ پیش کیا۔ اسے پانچ لاکھ ڈالرز کی ضرورت تھی۔

''پانچ لاکھ ڈالرز کے بعد میں تمہارے کام میں دخل نہیں دوں گا چاہے ہندو برادری کے ساتھ باقی سارے پاکستانی بھی مار دو۔'' اس کے لہجے میں بے پروائی تھی۔ وجے کو حیرت ہوئی۔ یہ وہی بندہ تھا جو ان کا مشن ناکام بنانے چین سے پاکستان آیا تھا اور اب بس پانچ لاکھ ڈالرز میں ان کے ساتھ ڈیل کرنے پر تیار تھا۔

''اس میں دھوکا ہے مسٹر علی حسن، ہم کیسے اعتبار کریں؟''

''کیونکہ اعتبار کرنا تم لوگوں کی مجبوری ہے ڈیئر وجے عرف عباد...... جس سم سے تم رابطہ کر رہے ہو، یہ جس موبائل میں استعمال ہو رہی ہے اس کا سارا ڈیٹا میرے سامنے آہستہ آہستہ شو ہو رہا ہے اب انڈیا میں موجود تمہارے خاندان کی تصویریں شیئر کروں یا تمہاری گرل فرینڈ کی؟...... ٹیشا...... نائس نیم۔'' وجے کے پورے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔ علی حسن ان کی توقع سے زیادہ چالاک تھا۔

''یہ تو بچوں کا کھیل ہے سم نمبر سے یا ای میل اکاؤنٹ سے ڈیٹا چرانا، اس کی دھمکی دینے کی ضرورت نہیں۔''

''اچھا پھر تم کر کے دکھا دو۔'' وہ ہنسا۔ ''میں اس کھیل سے اکتا گیا ہوں اس لیے سکون چاہتا ہوں...... مجھے پیسے دو، میں جاؤں کسی اور ملک، باقی تمہارا کام...... جو مرضی کرو۔''

''میں سر سے بات کرتا ہوں۔''

''کون سے والے سر سے؟ راجیو یا راہول؟ راجیو کا نمبر یہی ہے ناں؟'' علی نے نمبر بولنا شروع کر دیا۔ اس نے کال بند کر دی۔ وہ علی سے مزید بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

علی کافی دیر سے ان کی حرکات دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت بلڈنگ کی چھت پر موجود تھا اور دوربین سے نیچے دیکھنے میں مصروف تھا جہاں پانچ لاکھ ڈالرز لے کر وجے گاڑی میں بیٹھا تھا۔ اس نے کال ملائی۔ ''وجے...... گاڑی یہیں پارکنگ میں کھڑی کر کے خود چلے جاؤ، پندرہ منٹ بعد گاڑی لے جانا۔''

''ٹھیک ہے۔'' وجے نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ ٹھیک اسی وقت جب وجے کار سے اتر کر سڑک کراس کر رہا تھا۔ علی کے سیل فون کی بیل بجی۔ اس نے سیل جیب سے نکالنا چاہا مگر اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے سر پر کسی نے پیچھے سے وار کیا تھا۔ وہ نیچے گر گیا۔ آخری منظر جو اس نے اندھیرے میں دیکھا تھا، کوئی شخص اسے اپنے کندھوں پر لاد رہا تھا۔ اس کے بعد اس کا ہوش کی دنیا سے رابطہ کٹ گیا۔

اسے ہوش آیا تو اس کے جسم پر کپڑے نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ پیروں سے جوتے تک اتار لیے گئے تھے۔ وہ ایک کرسی پر بندھا پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ کرسی کی پچھلی طرف سے گھما کر رسی سے باندھے گئے تھے۔ منہ پر ٹیپ لگی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد اسے وجے اور راجیو کی شکل دکھائی دی۔ ان کے پیچھے ایک اور شخص موجود تھا جس کی شکل اسے جانی پہچانی محسوس ہوئی۔ یہ شاید وہی تھا جس نے اسے بے ہوش کیا تھا۔ وجے نے آگے بڑھ کر ٹیپ اس کے منہ سے اتاری اور ایک زوردار مکا اس کے منہ پر مارا۔

''آ گیا ناں ہمارے ہاتھ میں، سالا...... کتی کا......''

اس کے منہ سے ایک ساتھ کئی گالیاں نکلیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک لات اس کے سینے پر جمائی۔ کرسی الٹ گئی۔ اس کا سر فرش سے ٹکرایا۔

''بس وجے...... راہول سر نے اسے زندہ رکھنے کا حکم دیا ہے۔'' راجیو نے وجے کو روکا اور دوسرے شخص کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر علی کی کرسی سیدھی کی۔ علی مسکرا رہا تھا۔ ہونٹوں سے بہنے والے خون کی وجہ سے یہ مسکراہٹ کافی عجیب لگ رہی تھی۔

''تم شاید اس لیے مسکرا رہے ہو کہ امریکیوں کی طرح ہمیں بھی دھوکا دے کر بچ نکلو گے۔'' راجیو ہنسا۔ ''تمہاری ساری چالاکی سمجھ گیا تھا میں، تمہارے کپڑوں اور جوتوں میں موجود تمام ڈیوائسز اس وقت کپڑوں سمیت نہر میں ڈوب چکی ہیں، لوکیشن ٹریس کرنے والے کہیں اور بھٹک جائیں گے۔''

اس کی بات سن کر بھی علی کے اعتماد میں کوئی فرق نہ آیا۔

''تو کیا ہوا راجیو سر...... ویسے تم لوگوں نے ابھی تک مجھے قتل کیوں نہیں کیا؟'' راجیو مسکرا دیا۔

''یہ تو راہول سر کا حکم تھا ورنہ تمہیں ایسی موت دیتا کہ آئندہ اس نسل سے کوئی تیرے جیسا کمینے پیدا نہ ہوتا۔''

''تم جیسے کمینوں کے لیے کوئی نہ کوئی پیدا ہوتا رہے گا، فکر نہ کرو۔'' علی حسن اپنی بات پر خود ہنس دیا۔ ''ویسے راجیو تمہیں کیا لگتا ہے، میں اتنی آسانی سے ہاتھ کیوں آیا؟''

''تم آسانی سے ہاتھ نہیں آئے، وہ پورا علاقہ ہماری نگرانی میں تھا جہاں تم پیسے لینے آئے تھے، حلیہ جتنا مرضی بدل لیتے، پہچان تو ہم نے لینا ہی تھا......''

''اور اگر میں پیسے لینے کسی اور کو بھیج دیتا تو......؟''

''باس، وقت ضائع مت کریں...... راہول سر سے بات کریں۔'' وجے نے اکتا کر راجیو کی طرف دیکھا۔

''ہم کہاں ہیں اس وقت کہاں؟'' علی نے دوبارہ دخل دیا۔

''تم خاموش رہو۔'' وہ غرایا۔

''غصہ کیوں کرتے ہو برو؟'' وہ پھر ہنسنے لگ گیا۔

راجیو اور وجے نے الجھن سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ علی کا یہ اعتماد بلاوجہ نہ تھا۔ یہی وقت تھا جب دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ آنے والے ایک دو نہ تھے، وہ کئی تھے۔

''خبردار، کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔'' وہ سب ساکت رہ گئے۔ صورتِ حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا تو صرف علی۔ راجیو اور اس کے دو ساتھیوں پر قابو پانے کے بعد آنے والوں نے علی کو کھول کر اسے کپڑے پہنائے۔ وہ ہاتھوں کو حرکت دیتا ہوا راجیو کی طرف آیا۔

''تم لوگ کی حد جہاں پر ختم ہوتی ہے، میری کمینگی وہاں سے شروع ہوتی ہے۔'' اس نے وجے کے ساتھ کھڑے ان کے تیسرے ساتھی کی جیکٹ میں ہاتھ ڈالا اور چھوٹی سی ڈیوائس برآمد کی۔ یہ وہی شخص تھا جس نے اسے بے ہوش کر کے کندھے پر اٹھایا تھا۔

☆☆☆

میڈیا تک بات پہنچی ضرور مگر اصل خبر کو چھپالیا گیا۔ علی حسن ملک کی خدمت کرنے والی اس خفیہ ایجنسی کے ساتھ کئی دن رہا۔ اقلیتوں کو نشانہ بنانے کی یہ سازش ناکام رہی تھی۔ سوائے ایک دو کیس کے، کوئی اور بات سامنے نہ آئی۔ راہول اور ڈیوڈ کے خلاف عالمی سطح پر بات کرنے کا فیصلہ ہوا تھا مگر علی حسن جانتا تھا، یہ سب باتیں بے معنی ہوں گی کیونکہ ڈیوڈ جس ملک سے تعلق رکھتا ہے، وہ ایک عرصے سے سازشیں کر رہا ہے اور ہماری حکومتیں جان کر بھی انجان ہیں۔

اس شام وہ زنیرا کے سامنے موجود تھا۔ وہ مسلسل اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ''میں تمہارے باپ کا قاتل ہوں۔ کیا سزا دو گی؟''

''نہیں علی...... ہمارے گھر سے تمہیں بہت دکھ ملے ہیں۔ ڈیڈ کی سزا انہوں نے خود منتخب کر لی تھی......'' اس نے علی کا ہاتھ تھام لیا۔ ''اپنا کام تو تم نے مکمل کر لیا۔ اب آگے کیا ارادہ ہے؟''

''جن دو ممالک کو میں نے نقصان پہنچایا ہے، وہ اتنی آسانی سے مجھے چھوڑیں گے نہیں، اس لیے کسی اور ملک میں رہنے کا سوچ رہا ہوں۔''

''جس ایجنسی کی تم نے پہلے مدد حاصل کی تھی۔ اس سے تحفظ بھی مانگ سکتے ہو۔''

''نہیں...... یہ پوری عمر کا عذاب ہے۔ کسی اور محفوظ جگہ جانا ہوگا، نئی شناخت کے ساتھ۔''

''اور میں؟'' زنیرا نے ایک امید سے پوچھا۔ علی نے اس کی طرف دیکھ کر نظریں جھکا لیں۔

''میں نہیں چاہتا تمہیں میرے ساتھ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگنا پڑے۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑا ہوا اور پاس پڑا بیگ اٹھا کر باہر چل دیا جہاں ایک گاڑی اسے لینے آئی تھی۔ زنیرا اسے جاتا دیکھ رہی تھی...... نہیں معلوم تھا وہ کب واپس آئے گا؟

❖❖❖

کٹھ پتلی

عمران قریشی

جرم کرنے کے لیے باریک بینی سے منصوبہ ترتیب دینا پڑتا ہے... تبھی کامیابی کا چہرہ دکھائی دیتا ہے... ایک ایسی ہی عورت کی فطرت و عادات کی عجیب و غریب جھلکیاں... اس کی طبیعت میں محبت... وفاپرستی کے بجائے بے اعتباری کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھی... مال و دولت کی طمع نے اسے بار بار زندگی کے فیصلے بدلنے پر مجبور کیا...

وسیع و عریض سٹنگ روم کے سامنے والی دیوار پر پینتالیس سالہ مہر علی عباسی کی قدِآدم تصویر لگی ہوئی تھی۔ رنگ سانولا، چہرہ بیضوی، بال سیاہ اور قد لمبا تھا۔ مسرور صاحب ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولے۔ ''میری زندگی کی پہلی اور آخری غلطی اس کے ساتھ شادی تھی۔ نوجوانی کا دور تھا۔ ہر چمکتی چیز ان دنوں سونا لگتی تھی۔ غلطی کر بیٹھا۔ خمیازے کے طور پر مجھے وہ تلخ ترین دن نہایت صبر کے ساتھ گزارنے پڑے۔ جن میں لڑنا جھگڑنا، تُوتُو، میں میں،

تلخ کلامیوں کا سلسلہ، ضد بازی اور ایک دوسرے کو تنگ کرنا معمولی باتیں تھیں۔ وہ فطرتاً پارا صفت تھی۔ جلد ہی کسی بھی کام سے اکتا جاتی تھی۔ مجھ سے بھی اکتا گئی۔ مجھے صحیح طور یاد نہیں۔ شاید ہماری ازدواجی زندگی کا عرصہ گیارہ مہینوں پر محیط رہا پھر طلاق کے بعد ختم ہوگیا۔‘‘

ان کے خاموش ہونے پر کمال احمد بولے۔ ’’یہ شاید آپ سے طلاق کے بعد کی بات ہے۔ مجھے میرج بیورو کے ذریعے اس کے متعلق معلوم ہوا۔ ہم نے چند دنوں کے دوران ایک دوسرے کو پسند کیا۔ پھر چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مترادف رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔ وہ اپنی ذات میں مکمل تھی۔ اسے کسی کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ شادی کرنا اور پھر طلاق دے کر رشتے کو ختم کر دینا، اس کی نگاہوں میں معمولی بات تھی۔ وہ حکم دینا جانتی تھی اور اپنی بات کو منوانے کے لیے آخری حد تک جاسکتی تھی۔ آپ کے برخلاف میں نے اسے چھ مہینے برداشت کیا اور ساتویں مہینے ہم دونوں کے درمیان طلاق ہوگئی۔ چند عرصہ قبل میرج بیورو میں کام کرنے والے دوست کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ اس نے کروڑ پتی نوجوان سے شادی کرلی ہے۔‘‘

مسرور بولے۔ ’’ایسی عورتوں کو مرد مل ہی جاتے ہیں۔ مجھے تو اپنے بیوی بچوں کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ پستول کی نال نے سوچنے سمجھنے کی حس ضبط کرلی۔ انہیں دلاسا دینے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ بارش لگاتار ہو رہی ہے۔ اگر سیلابی ریلے کی وجہ سے راستے بند ہوگئے۔ تب پھر مہینے بھر کے لیے اس ویران فارم ہاؤس میں قید ہو کر رہنا پڑے گا۔‘‘

کمال بولے۔ ’’نہ جانے ہمیں یہاں کیوں بلایا گیا ہے۔ شاید رقابت وغیرہ کا چکر ہے۔ اس کا تیسرا شوہر کروڑ پتی انسان ہے۔ ایسے سرپھروں کا دماغ گھومتے دیر نہیں لگتی۔‘‘

کمرے کا دروازہ کھول کر مہر علی عباسی کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ نفیس شیشوں والی نازک سی عینک لگائے ہوئے تھیں جو ان کے چہرے پر نہایت جچ رہی تھی۔ بال کاندھے تک کٹے ہوئے تھے اور انگلیوں میں مہنگے برانڈ کا سگریٹ دبا تھا۔ انہیں کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ دونوں اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑے ہوگئے۔

مسز عباسی نے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا پھر ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے شرمندہ لہجے میں بولیں۔ ’’تم دونوں کو زبردستی فیض پور لانے کے لیے میں پیشگی معافی چاہتی ہوں۔ تاہم معاملہ حساس ہونے کی وجہ سے مجھے مجبوراً یہ قدم اٹھانا پڑا۔ اگر تم دونوں کو کوئی تکلیف پہنچی ہو تو میں اس کی تلافی کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔‘‘ وہ چند لمحے کے لیے سانس لینے کے بہانے رکیں۔ سگریٹ کا طویل کش لیا پھر دھواں باہر اگلتے ہوئے گویا ہوئیں۔ ’’مجھے یقین ہے کہ تم دونوں اپنی ازدواجی زندگی میں خوش اور مطمئن ہوگے۔ پچھلی یادوں کو یاد رکھنے کی ضرورت بھی نہیں لیکن میں ان دنوں کو کبھی بھی بھلا نہیں پاؤں گی۔ مسرور تمہیں شاید پچاس ہزار کی اس چوری کے متعلق یاد بھی نہیں ہوگا جو تم نے اپنی ماں کے لیے سنبھال کر رکھے تھے اور وہ سیف سے چوری ہوگئے تھے تم بہت سیدھے سادے انسان ہو۔ یہ جان ہی نہیں پائے کہ سیف کی چابی کے متعلق تمہارے اور میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا اگر تم نے رقم نہیں نکالی تھی تب پھر یقیناً مجھے ہی نکالنی چاہیے تھی۔‘‘

مسرور کا چہرہ متغیر ہوا۔ آنکھیں غصے سے سکڑنے لگیں لیکن انہوں نے تحمل مزاجی سے کام لیتے ہوئے اپنے غصے پر قابو پالیا پھر زہرخند لہجے میں بولے۔ ’’رقم کی گمشدگی کے بعد میری والدہ کا علاج نہیں ہوسکا اور ان کی موت واقع ہوگئی۔ تم وحشی جانور ہی نہیں قاتل بھی ہو۔ میں اس کے لیے تمہیں تمام زندگی معاف نہیں کروں گا۔‘‘

مسز عباسی قہقہہ لگاتے ہوئے بولیں۔ ’’مجھے تمہاری معافی کی قطعاً ضرورت نہیں جس کا وقت پورا ہوگیا ہو‘ اسے رقم کی زیادتی بچا نہیں سکتی۔‘‘ انہوں نے سگریٹ کا دھواں باہر اگلا پھر کمال سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔ ’’تم سے پچیس لاکھ کے زیورات گن پوائنٹ پر ہتھیا لیے گئے۔ یہ کوئی معمولی واردات نہیں تھی لیکن مسرور کی طرح تم نے بھی میری طرف توجہ نہیں دی۔ وہ زیورات میں نے بیس لاکھ میں فروخت کیے۔ میں ان دنوں تم سے طلاق لینے کے متعلق سنجیدگی کے ساتھ غور کر رہی تھی اور مجھے تگڑی رقم کی اشد ضرورت تھی۔‘‘

کمال کے چہرے پر غصے کے بجائے تاسف بھرے تاثرات ابھرے پھر رنجیدہ لہجے میں بولے۔ ’’یہ تم نے کیا غضب کیا۔ وہ زیورات ہمارے خاندان کی دیرینہ نشانی تھے۔ نسل در نسل منتقل ہوتے ہوئے مجھ تک پہنچے تھے۔ تم نے انہیں بیس لاکھ میں بیچ کر نہایت گھاٹے کا سودا کیا۔‘‘

’’مجھے اس کی پروا نہیں۔‘‘ مسز عباسی نے کش لیتے ہوئے کہا۔ ’’بتانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ مجھے وقتاً فوقتاً رقم

کی ضرورت پڑتی رہتی ہے اور رقم کے حصول کے لیے میں کچھ بھی کرسکتی ہوں۔ تاہم تم دونوں سے طلاق کے بعد میں محتاط ہوگئی تھی۔ مجھے ایک ایسے طاقتور سہارے کی ضرورت تھی جو میری خواہشات کو پورا کر سکے۔ فہیم ملک میں وہ سب کچھ تھا جو میں چاہتی تھی۔ میں نے اس سے شادی کرلی۔ شادی کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس کے پاس سب کچھ ہونے کے باوجود بھی کچھ نہیں تھا۔ اس کا باپ ایک سخت گیر انسان تھا......"

مسز عباسی کی بات درمیان میں رہ گئی۔ سٹنگ روم کا دروازہ کھول کر ایک بوڑھا شخص اندر داخل ہوا اور مسز عباسی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "میں نے الٹرا ساؤنڈ مشین کو جنریٹر پر منتقل کرنے سے قبل استعمال کر کے دیکھ لیا ہے، وہ بخوبی کام کر رہی ہے۔"

مسز عباسی اس کا تعارف کرواتے ہوئے بولیں۔ "ان سے ملو، یہ میرے فیملی ڈاکٹر عاصم مجتبیٰ ہیں۔ انہیں مختصر کام کے لیے فیض پور فارم ہاؤس میری درخواست پر بلایا گیا ہے۔" انہوں نے انگلیوں میں دبے ہوئے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا پھر ڈاکٹر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔ "آپ الٹرا ساؤنڈ مشین کو جنریٹر کے ساتھ منسلک کر دیں۔ میں جلد اگلی کارروائی سے آپ کو مطلع کروں گی۔"

ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد مسز عباسی نے دوسرا سگریٹ سلگایا اور ہم کلام ہوئیں۔ "فیض پور کا قصبہ بجلی کی سہولت سے محروم ہے یا یوں سمجھ لیجیے کہ الیکٹرک سٹی والے مخصوص اوقات میں بجلی فراہم کرتے ہیں۔ کیونکہ زیادہ تر رہائشی بجلی کی چوری میں ملوث ہیں۔ فارم ہاؤس کی بجلی بہت بڑے اور قیمتی جنریٹروں کی مرہونِ منت ہے اور آج تو صبح سے بارش ہورہی ہے۔ بجلی آنے کی توقع بالکل بھی نہیں ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے میرے نوکر نے مجھے بتایا کہ دریا کا پاٹ سیلابی ریلے کی بدولت بھر گیا ہے اور فارم ہاؤس کا رابطہ شہر سے کٹ گیا ہے۔ تاہم تم دونوں کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس کھانے پینے اور ضروریاتِ زندگی کا سامان وافر مقدار میں موجود ہے۔"

مسرور غصیلے لہجے میں بولے۔ "شہر میں ہمارا گھر بار اور بیوی بچے ہیں۔ ان کی ذمے داریاں اور کچھ حقوق ہیں۔ تم نے ہمیں یہاں قید کر کے ان سب کو چند دنوں کے لیے لاوارث کر کے رکھ دیا ہے۔"

کمال بولے۔ "تم ان ذمے داریوں اور حقوق کے متعلق بھلا کیا جانو۔ بے پروائی تمہاری فطرت کا خاصہ ہے۔ ایک گھر چھوڑا اور دوسرا بسا لیا۔ لیکن ہماری ازدواجی زندگیاں ان چند دنوں کے دوران متاثر ہوکر رہ جائیں گی۔ ہمیں جلد از جلد گھر پہنچانے کی کوشش کرو۔"

مسز عباسی نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں جھاڑا اور سرد لہجے میں بولیں۔ "میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ اس لیے فضول باتوں سے اجتناب کرو۔ میں بات کو وہیں سے شروع کرتی ہوں جہاں سے سلسلہ منقطع ہوا تھا۔ فہیم ملک ایک ڈمی کی طرح تھا۔ اسے ٹوائلٹ جانے سے قبل بھی باپ کی اجازت درکار ہوتی تھی۔ اس کے باپ کے متعدد جوئے خانے، ریس کورس کا وسیع و عریض اسٹیڈیم، بازارِ حسن کی آمدنی اور اسمگلنگ کا کروڑوں پر مشتمل کاروبار تھا۔ وہ انڈر ورلڈ کا بے تاج بادشاہ تھا۔ بات اگر یونہی چلتی رہتی تب بھی مضائقہ نہیں تھا۔ مجھے اور فیمی کو وہ سب کچھ مل رہا تھا جس کی تمنا عام زندگی میں کرنا ممکن نہیں تھی۔ ہمارے اوپر حیرت کا پہاڑ تو تب ٹوٹا جب فیمی کے باپ نے ہمیں بتایا کہ وہ بازارِ حسن کی خوب صورت رقاصہ سے شادی کرنے والا ہے۔ میں نے اس عورت سے ملاقات کی۔ وہ نہایت جہاندیدہ اور گھاگ قسم کی چلتی پھرتی عورت تھی۔ اگر فیمی کے باپ کی جائداد میں حصے دار بن جاتی تب ہمیں کچھ بھی ملنے کی توقع نہیں رہتی۔ میں ان دنوں کافی حد تک فیمی کے دل و دماغ پر قبضہ جما چکی تھی۔ میں نے اسے باپ کے متعلق ورغلانا شروع کیا۔ یہ صرف چند باتوں پر مشتمل سبق تھا۔ مثلاً وہ ایک طوائف سے شادی کرنے والا ہے۔ اس کی نظر میں اولاد کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس کے شادی کرنے سے قبل فیمی کو اگر چند روپوں کے لیے مجبور و لاچار انسان کی طرح باپ کے سامنے ہاتھ پھیلانے پڑتے ہیں۔ تب پھر ایک بازاری عورت کے کوٹھی میں آنے کے بعد شاید اسے اس عورت سے بھی کسی بھی کام کی اجازت لینی پڑے۔ وہ حسبِ توقع مشتعل ہوگیا اور غصے میں چیختے چلاتے ہوئے باپ کو گالیاں دینے لگا۔ میں نے اسے صبر و تحمل کی تلقین کی اور جائداد پر قبضہ کرنے کی مختصر پلاننگ سے آگاہ کیا۔ وہ بہ خوشی راضی ہو گیا اور اس پلاننگ کے مطابق ہم فیمی کے باپ کو بارش کے دنوں میں زبردستی فارم ہاؤس لے آئے۔ دریا میں طغیانی کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ جب اس سلسلے نے شدت اختیار کی تو ہم دونوں نے اس کے باپ کے سر پر ضرب لگا کر اسے بے ہوش کیا اور گاڑی میں ڈال کر طوفانی لہروں کے سپرد کر دیا۔"

مسرور صاحب اور کمال کے چہروں پر پہلی دفعہ خوف

بھرے تاثرات پیدا ہوئے۔ تاہم ان کی دماغی کیفیت سے قطع نظر مسز عباسی روانی کے عالم میں بولے چلی جارہی تھیں۔ ”فیض پور دریا میں سیلابی ریلا گزرنے کے باعث اس کی طرف جانے والے راستوں کو چند دنوں کے لیے بند کردیا جاتا ہے لیکن مخالف جانب فارم ہاؤس کے راستوں پر اس بندش کا اطلاق نہیں ہوتا اور راستے بند ہوجانے کے باوجود بھی بہت سی جانیں سیلابی ریلے کی نذر ہوتی ہیں۔ اس لیے ہم دونوں پر کسی کو شک نہیں ہوا اور کیس کو حادثے کی صورت دینے کے بعد بند کردیا گیا لیکن یہ سن کر تم دونوں کو حیرت ہوگی کہ میرے پاس اس قتل کی مختصر مووی موجود تھی جو فہمی کی لاعلمی میں میرے دستِ راست نے بنائی تھی اور جس میں فہمی اپنے باپ کو دریا میں پھینکتے ہوئے صاف دیکھا جاسکتا تھا۔“

مسز عباسی نے ختم ہوجانے والے سگریٹ کو ایش ٹرے میں ڈال دیا اور تیسرے کو سلگانے لگیں۔ باہر زور سے بادل گرجے اور بجلی بند ہوگئی۔ لائٹر کی خفیف روشنی مسز عباسی کے چہرے پر رقص کررہی تھی۔ انہوں نے معذرت خواہانہ لہجے میں دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جنریٹروں پر ابھی کچھ کام باقی ہے۔ مکمل ہونے کے بعد خفیف وقفہ پیدا نہیں ہونے پائے گا۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔ بعداز قتل میں نے اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ میرے پاس وہ مووی تھی جس میں وہ اپنے باپ کو دریا میں پھینکتے ہوئے دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ بہ آسانی گرفتار ہوجاتا۔ عدالت اسے پھانسی سے کم کی سزا نہیں دیتی لیکن وہ گرفتاری سے قبل ملک چھوڑ کر فرار ہوگیا۔ میرے نام اس نے تین سطروں پر مشتمل خط چھوڑا۔ جس میں صرف اتنا لکھا گیا تھا کہ بہ حالتِ مجبوری ملک چھوڑ کر جارہا ہوں جلد بھیس بدل کر واپس آؤں گا اور اپنی تمام جائداد تم سے لے کر اپنے نام کروں گا۔“

مسرور بولے۔ ”بھیس بدلنے کے لیے نہایت جدید اور مہنگا ترین سامان مارکیٹ میں آچکا ہے۔ پلاسٹک ماسک کے ذریعے چہرے کے خدوخال حسبِ منشا تبدیل کیے جاسکتے ہیں۔“

مسز عباسی نے جواب دیا۔ ”اسے میک اپ کی ضرورت نہیں تھی۔ پلاسٹک سرجری سب کچھ کرسکتی ہے۔“

کمرے کا دروازہ کھول کر ایک نوکر اندر داخل ہوا۔ اس نے ہاتھوں میں موم بتیوں پر مشتمل اسٹینڈ پکڑا ہوا تھا۔ اس نے اسٹینڈ کو میز پر رکھتے ہوئے مسز عباسی کو بتایا کہ ”فیض پور دریا نے اردگرد کے علاقوں میں تباہی مچادی ہے۔ فارم ہاؤس کے قریب پکی سڑک پانی میں ڈوب گئی ہے اور گورنمنٹ نے ایمرجنسی نافذ کردی ہے۔ تاہم فارم ہاؤس کی عمارت چونکہ پہاڑی ٹیلے کے اوپر واقع ہے۔ اس لیے پانی کی تباہ کاریوں سے محفوظ ہے۔“

مسز عباسی نے اسے آتش دان میں لکڑیاں ڈالنے کے لیے کہا اور دونوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔ ”فارم ہاؤس کے تہ خانے میں وافر مقدار میں کھانے پینے کا سامان موجود ہے۔ لکڑیوں کا ذخیرہ بھی کافی دنوں کے حساب سے رکھ چھوڑا گیا ہے۔ یہاں میں یہ بھی بتاتی چلوں کہ ان دنوں کا انتخاب میں نے جان بوجھ کر کیا ہے۔ اب تم دونوں میرے رحم وکرم پر ہو۔ میں تم سے جو چاہوں اگلوا سکتی ہوں۔ میرے کام میں دخل اندازی کرنے والا یہاں کوئی نہیں ہے۔“

مسرور نے پریشان لہجے میں پوچھا۔ ”مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ تم ہم سے کیا چاہتی ہو؟ ملک فہیم کی طرح ہمارے پاس کروڑوں کی جائداد نہیں ہے۔ کمال صاحب مقامی کالج میں لیکچرار ہیں اور میں معمولی گورنمنٹ سرونٹ ہوں۔ روپے پیسے کے لحاظ سے ہمارے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔“

مسز عباسی نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور بولیں۔ ”مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ فہمی کے باپ کا چھوڑا ہوا بہت ہے۔ میں اگر تمام زندگی بھی اسے دونوں ہاتھوں سے لٹاؤں تو ختم نہیں ہونے پائے گا۔ میں وہیں سے بات شروع کرتی ہوں جہاں تک بتا چکی تھی۔ فہمی کے ملک سے فرار ہونے کے بعد میں نے اس کی مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث تنظیم کی باگ ڈور سنبھالی۔ یہ ایک منظم اور نہایت فعال تنظیم تھی جس کی جڑیں ملک کے علاوہ بیرونِ ملک تک پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے تنظیم کے گرگوں کو استعمال کرتے ہوئے بہ آسانی پتا لگا لیا کہ وہ کون سی ائرلائن کو استعمال کر کے کس ملک کی طرف فرار ہوا ہے۔ اس سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے اپنا اصلی پاسپورٹ استعمال کیا تھا۔ میں نے ملک کے متعلق معلوم ہونے پر وہاں موجود تنظیم کے افراد کو اس کی تلاش پر مامور کردیا۔ جلد ہی انہوں نے مجھے بتایا کہ اس نے پلاسٹک سرجری کے لیے کس سرجن کا انتخاب کیا تھا۔“ مسز عباسی نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا پھر گویا ہوئیں۔ ”مجھے سب کچھ بہ آسانی معلوم ہوگیا۔ تاہم ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ وہاں سے آگے فرار ہوگیا اور فرار ہونے سے

قبل اس نے سرجن کو بھی قتل کر دیا۔ ہمارے آدمیوں کو سرجن کے گھر سے ایک فائل دستیاب ہوئی جس میں سرجری سے متعلق مریضوں کے کوائف مع اس تصویر کے جس کی مناسبت سے سرجری تکمیل پائی تھی، موجود تھے۔ میں نے فائل کا مطالعہ کیا تب مجھے معلوم ہوا کہ اس نے پلاسٹک سرجری کروا کر شکل وصورت کو تبدیل کر لیا تھا۔'' وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئیں۔ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بولیں۔ ''تم یقین کرو گے کہ اس نے کس کی صورت اختیار کی۔''

مسرور اور کمال خاموش رہے۔ بجلی جھماکے کے ساتھ واپس آئی۔

مسز عباسی بولیں۔ ''بالکل اسی طرح میرے دماغ میں بھی جھماکا ہوا تھا۔ فائل میں تم دونوں کی تصاویر موجود تھیں۔''

وہ دونوں حیرت کی شدت سے اچھل پڑے۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ تم دونوں کی تصاویر نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ تاہم مجھے یہ معلوم نہیں ہو پایا کہ اس نے تم دونوں میں سے کس کے چہرے کا انتخاب کیا تھا۔ فائل نامکمل تھی۔ سرجن کو اسے مکمل کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔''

کمال نے پوچھا۔ ''تو ہمیں یہاں بلانے کا مقصد اپنے شوہر کی تلاش ہے۔ بالفرض اگر وہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہے تب پھر اس تک پہنچنے کے لیے تم مزید کیا کرو گی؟''

مسز عباسی بولیں۔ ''میرے پاس اس کی ایک ایسی نشانی موجود ہے کہ اگر وہ سات پردوں میں بھی چھپنا چاہے تو چھپ نہیں سکتا۔ میں اس نشانی کی بدولت اسے بہ آسانی شناخت کر لوں گی۔ تم دونوں کو یہاں بلانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ اسے تم دونوں کے درمیان تلاش کیا جا سکے۔ تاہم اس کے ملک واپس آنے کے شواہد ہمیں نہیں مل سکے۔ مجھے اس بات پر تاعمر حیرانی رہے گی۔ اگر وہ بحری یا فضائی راستے سے ملکی حدود میں داخل ہوا ہے تب پھر وہاں تم دونوں میں سے کسی ایک کے نام کا پاسپورٹ یا دیگر کوائف موجود ہونا چاہیے تھے لیکن اندرون یا بیرون ملک کی سب فلائٹوں کے کوائف معلوم کرنے پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ ان راستوں کے ذریعے ملک میں داخل نہیں ہوا۔ زمینی راستوں کو چیک کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ غیر قانونی طور پر ملک میں داخل ہو سکتا تھا۔ ہمارے پاس اس کی آمد کا کوئی حتمی ثبوت موجود نہیں ہے۔ تاہم تم دونوں تک رسائی ہمارے لیے مشکل نہیں تھی۔ وہ اگر ملک میں داخل ہوا ہے تو اس کا ہدف تم دونوں میں سے کوئی ایک ہے۔''

مسرور نے پوچھا۔ ''تم نے اس نشانی کے متعلق نہیں بتایا جو تمہارے لحاظ سے حتمی ہے۔ اگر فنگر پرنٹ یا جسم پر موجود زخم کے نشان اور تل وغیرہ پر مشتمل ہے تو اس بات کو ذہن نشین کر لو کہ سرجری کے ذریعے انہیں تبدیل کرنا مشکل نہیں۔''

مسز عباسی نے سگریٹ کی راکھ کو ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں بتایا۔ ''میرے پاس جو نشانی ہے، اس سے انحراف ممکن نہیں۔ مجھے اس کے متعلق اتفاقاً معلوم ہوا۔ فہمی کے فرار کے بعد جب میں نے تنظیم کی سربراہ بننے کے بعد اس کے کمرے میں رکھی دستاویزات کھنگالنے کی کوشش کی۔ تب مجھے ملک کے مایۂ ناز ڈاکٹرز کی تفصیلی رپورٹوں پر مشتمل ایک فائل دستیاب ہوئی جس میں یہ انکشاف کیا گیا تھا کہ فہمی کا دل سیدھے ہاتھ کی طرف دھڑکتا ہے۔ یہ ایک نشانی ہے جس کی بدولت تمام جسم کی سرجری کروانے کے بعد بھی یہ معلوم کرنا مشکل نہیں کہ اس نے کس کے چہرے کی سرجری کروائی ہے۔ ڈاکٹر عاصم فارم ہاؤس میں موجود ہے۔ الٹراساؤنڈ مشین منگوائی جا چکی ہے۔ اب صرف اس بات کا انتظار ہے کہ تم دونوں میں سے کس کی رپورٹ اس بات کا تعین کرتی ہے کہ اس کا دل سیدھے ہاتھ کی جانب ہے۔''

مسرور اور کمال نے بے اختیار اپنے سینوں پر ہاتھ رکھ کر دل کی دھڑکن کو چیک کرنے کی کوشش کی۔ تاہم کچھ خاص اندازہ نہیں لگا سکے۔ وہاں دل کی دھڑکن موجود تھی لیکن مرکز کس جانب تھا۔ وہ اس کے متعلق معلوم نہیں کر سکے۔

مسرور بولے۔ ''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ آنے کے بعد ہم دونوں میں سے کسی کی جگہ تبدیل کرنے کے بجائے روپوش ہو کر تم سے انتقام لینے کی کوشش کرے۔ اس صورت میں تمہارا الٹراساؤنڈ والا آئیڈیا ناکام ثابت ہوگا۔''

مسز عباسی نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ''وہ تم میں سے ایک کی جگہ لینے کی کوشش ضرور کرے گا۔ مجھ پر وار کرنے سے قبل اسے ایک ایسے محفوظ مقام کی اشد ضرورت پڑے گی جس کی آڑ لے کر وہ ہدف کو نقصان پہنچا سکے۔ ہاں یہ ضرور سوچا جا سکتا ہے کہ ابھی تک اس نے اپنے لائحۂ عمل پر عمل کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ اس کی پڑتال تم دونوں کے الٹراساؤنڈ کی رپورٹ کے بعد ہو جائے گی۔''

مسرور نے پوچھا۔ ”یہ سب کچھ کرنا اکیلے ممکن نہیں۔ میرے خیال میں ماسٹر مائنڈ کوئی اور ہے۔ تم صرف کٹھ پتلی ہو۔“

مسز عباسی نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا پھر طویل سانس لیتے ہوئے بولیں۔ ”تمہارا اندازہ درست ہے۔ یہ میرے سسر کی موت سے قبل کی بات ہے۔ میرا دل فیمی کی طرف سے بدظن ہو گیا تھا یا یوں کہہ لو کہ مجھے زلفی میں وہ تمام خصوصیات دکھائی دینے لگی تھیں جن کی تمنا ایک عورت کر سکتی تھی۔ تاہم اس کے پاس حیثیت اور رتبہ نہیں تھا۔ وہ میرے سسر کی انڈر ورلڈ تنظیم کا سربراہ تھا۔ ہم ایک دوسرے کی محبت میں بُری طرح گرفتار تھے۔ تب زلفی نے تنظیم کی حکمرانی کا خواب دیکھنا شروع کیا اور اس کی تعبیر کے لیے مجھے رضامند کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں خود یہی چاہتی تھی۔ فیمی کا ہونا نہ ہونا میرے لیے ایک برابر تھا۔ اہمیت اگر کسی بات کی تھی تو وہ اس کے نام منتقل ہونے والی جائداد کی تھی۔ تاہم میں اس کے باپ کے مرنے کے بعد جائداد بہ آسانی اپنے نام منتقل کروا سکتی تھی۔ ہم دونوں نے ترتیب دیے گئے منصوبے کے مطابق فیمی کو ورغلا کر اپنے باپ کے قتل پر مجبور کیا اور بعد از قتل مووی کے ذریعے اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ تاکہ وہ تمام جائداد میرے نام منتقل کر دے۔ اس دوران زلفی تنظیم کی باگ ڈور بہ احسن و خوبی سنبھال چکا تھا۔ مجھے ضرورت بھی ایسے ہی شخص کی تھی جو انڈر ورلڈ پر حکمرانی کر سکے۔ ایک عورت کے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ تاہم فیمی اس دوران فرار ہو گیا۔“ بادل ایک دفعہ پھر زوردار آواز میں گرجے۔

مسرور اور کمال کا دل بند ہوتے ہوتے رہ گیا۔ مسز عباسی بھی چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئیں پھر دوبارہ بولیں۔ ”اب میرے خیال میں بات چیت بہت ہو چکی۔ کچھ پریکٹیکل ہو جائے۔“ انہوں نے نوکر کو آواز دی۔ وہ دروازے کے قریب منتظر کھڑا تھا۔ اس لیے فوراً چلا آیا۔ انہوں نے اسے ڈاکٹر کو بلانے کے لیے کہا۔ وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

کمال نے پوچھا۔ ”اگر الٹراساؤنڈ کی رپورٹ کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اس نے ہم دونوں میں سے کسی کی جگہ استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی تب تمہارا اگلا لائحہ عمل ہم دونوں سے متعلق کیا ہو گا؟“

مسز عباسی نے جواب دیا۔ ”تم دونوں کو واپس شہر بھجوا دیا جائے گا۔ تم میرے لیے مچھلی پکڑنے والے اس چارے کی حیثیت رکھتے ہو جس کی کشش میں مچھلی ڈور کی طرف کھنچی چلی آتی ہے۔ اگر اس نے اب تک تم دونوں میں سے کسی کی شکل کو استعمال نہیں کیا تب وہ جلد کرے گا اور میرے آدمی اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیں گے۔“

سٹنگ روم کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر عاصم اندر آ گئے۔ انہوں نے بتایا۔ ”الٹراساؤنڈ کی مشین کو جنریٹر کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے اور وہ کام کے لیے تیار ہے۔“

مسز عباسی دونوں سے مخاطب ہو کر بولیں۔ ”اب میرے خیال میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جانا چاہیے۔ تم ڈاکٹر عاصم کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔ رپورٹ کے بعد فیصلہ کیا جائے گا کہ تم دونوں کے ساتھ آگے کیا کیا جائے گا۔“

ڈاکٹر نے دونوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور وہ دونوں سٹنگ روم سے باہر کی طرف چل دیے۔

☆☆☆

فارم ہاؤس کی اکلوتی خواب گاہ کے وسیع و عریض بیڈ پر وہ دونوں سیدھے لیٹے ہوئے تھے۔ مرد کی عمر پینتیس سے چالیس کے درمیان تھی۔ اس کا چہرہ کرخت اور آنکھیں شراب کے نشے سے مخمور، خون کے مانند سرخ تھیں۔ مسز عباسی بھی مدہوش تھیں۔ بارش اب بھی زور و شور اور گرج چمک کے ساتھ ہو رہی تھی۔ کمرے کی اکلوتی کھڑکی کے شیشوں میں سے اس گرج چمک کی روشنی جھماکے کی صورت میں برآمد ہو کر یکدم اندھیرے کی چادر میں ملفوف ہو جاتی۔ کمرے میں اس وقت ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ مسز عباسی نے رپورٹ پر مشتمل وہ فائل پکڑی ہوئی تھی جو ڈاکٹر نے شام کو انہیں دی تھی۔ انہوں نے مطالعہ کرنے کے بعد فائل کو سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے زلفی سے مخاطب ہو کر کہا۔

”الٹراساؤنڈ کی اس رپورٹ کے مطابق فہیم ملک نے کمال کے چہرے کو استعمال کرتے ہوئے پلاسٹک سرجری کروائی۔ مسرور بے چارے کو حالات کی آگاہی کی وجہ سے جان کا نذرانہ دینا پڑا لیکن رپورٹ کی الف بے مجھے سمجھ نہیں آ رہی۔ دل کس طرف ہے اور گردے پھیپھڑے کہاں ہیں۔“

زلفی نے اپنے قریب کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”اب دل اور گردوں کا معاملہ ختم ہو گیا ہے۔ تم کیوں پریشان ہو رہی ہو۔ میں نے تمہاری شکی طبیعت کو مدِنظر رکھتے ہوئے خطرناک موسم کے باوجود تمہیں پہاڑی علاقے کی طرف لانے کا خطرہ صرف اس لیے مول لیا تاکہ تم اپنے

ہاتھوں سے اس کو سیلابی ریلے کے سپرد کر کے مطمئن ہو سکو۔ ورنہ میرے آدمی یہ کام بہ خوبی کر سکتے تھے۔اس کے باوجود بھی نہ جانے کیوں تمہیں خدشہ لاحق ہے۔''

مسز عباسی نے اپنا سر اس کے سینے پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔''سب کچھ حسب منشا اتنی آسانی کے ساتھ ہو گیا کہ مجھے یقین نہیں آرہا۔'' وہ اچانک ہی چونک کر اٹھ بیٹھیں پھر حیرت بھرے لہجے میں بولیں۔''مجھے تمہارے دل کی دھڑکن سیدھے ہاتھ کی جانب سے سنائی دے رہی ہے۔ یہ حیرت کی بات ہے یا پھر شاید میرا وہم ہے۔''

زلفی قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے بولا۔''الٹرا ساؤنڈ کروانے کا تردد ہم نے یونہی کیا۔ تم سینے پر ہاتھ رکھ کر بہ آسانی معلوم کر سکتی ہو کہ دل کس جانب ہے اور پھیپھڑے کس طرف ہیں۔ پھر کیا ضرورت تھی اتنی دور جنریٹر اور الٹرا ساؤنڈ کی مشین لانے کی۔ درحقیقت تمہارے اوسان خطا ہو چکے ہیں اور تمہارے دل و دماغ پر فہیم ملک کا خوف طاری ہو کر رہ گیا ہے۔ رہی سہی کسر شراب کی زیادتی نے پوری کردی ہے۔ تم نے آج بے تحاشا پی ہے۔''

مسز عباسی نے کوئی جواب نہیں دیا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئیں۔ زلفی طنزیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چند منٹوں کے بعد جب اسے اطمینان ہو گیا کہ وہ پُرسکون نیند سو چکی ہیں تب وہ دبے پاؤں بستر سے نیچے اترا اور خواب گاہ کا دروازہ کھول کر سٹنگ روم میں آگیا۔ صوفے پر اندھیرے میں گم ایک ہیولا براجمان تھا۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اس کے قریب گیا۔ ہیولے نے ہاتھوں میں مختصر کیمرا پکڑا ہوا تھا۔ اس نے وہ زلفی کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ زلفی نے اسے آن کیا اور مختصر اسکرین پر فلم کو ریوائنڈ کر کے انہماک کے ساتھ دیکھنے لگا۔ یہ جدید ماڈل کا کیمرا تھا جو رات کے اندھیرے میں بھی بہ خوبی فلم بنا لیتا تھا۔ چند لمحوں کے بعد منظر واضح ہوا۔ ملگجے اندھیرے میں پہاڑ کی چٹان کے پاس تین وجود دکھائی دیے۔ ان میں سے دو زمین پر اوندھے لیٹے ہوئے تھے اور ایک ان کے پاس کھڑا تھا۔ ہوا میں لہراتے ہوئے بال اس بات کی نشاندہی کر رہے تھے کہ وہ عورت تھی۔ کیمرے نے اس کے چہرے کو کلوز کیا۔ منظر واضح ہوا اور چہرے کے دھندلے نقوش صاف دکھائی دینے لگے۔ وہ مسز عباسی تھیں۔ ان کے چہرے پر گھبراہٹ یا خوف کے تاثرات نہیں تھے بلکہ جوش و جذبات کی بدولت چہرہ دمک رہا تھا۔ زمین پر اوندھے پڑے دونوں آدمیوں کے چہرے کیمرے کی طرف تھے۔ وہ مسرور اور کمال احمد تھے۔ ان کے پیچھے دریا کی بپھری ہوئی موجیں دکھائی دے رہی تھیں۔ مسز عباسی نے دھکا دے کر کمال احمد کو دریا میں دھکیل دیا۔ اب ان کے چہرے پر جنونی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ تاہم پانی میں دھکیلتے ہوئے ان کا چہرہ کیمرے کے سامنے سے اوجھل ہو گیا۔ کچھ توقف کے بعد وہ مسرور کے بے جان جسم کی طرف بڑھیں اور انہوں نے مسرور کو بھی پانی میں دھکیل دیا۔ کیمرا آف ہو گیا۔ زلفی نے مطمئن انداز میں کیمرا صوفے پر بیٹھے ہوئے ہیولے کے ہاتھوں میں تھما دیا پھر سرگوشی بھرے لہجے میں بولا۔

''یہ مووی راستے کھل جانے کے بعد پولیس اسٹیشن پہنچا دینا۔ مجھے زلفی کا روپ مستقل استعمال کرنا ہوگا۔ کیونکہ اس سے ملتی جلتی فہیم ملک کی مووی پولیس اسٹیشن میں موجود ہے۔ ویسے بھی پلاسٹک سرجری کے بعد اب دوبارہ فہیمی کی صورت اختیار کرنا مشکل ہے۔''

ہیولے کی سرگوشی سنائی دی۔''آپ کا منصوبہ قابلِ تعریف ہے۔ آپ نے جان بوجھ کر غیر ملکی سرجن کے گھر میں رکھی ہوئی فائل کے اندر مسز عباسی کے دونوں شوہروں کی تصاویر لگا کر انہیں اس بات کی ترغیب دی کہ آپ نے ان میں سے کسی ایک کے چہرے کا انتخاب کیا ہے۔ مسز عباسی ایک کٹھ پتلی کی طرح اس راستے پر آگے بڑھنے لگیں جس کا انتخاب آپ کے دماغ نے کیا تھا۔ ڈاکٹر عاصم نے ایک جھوٹی رپورٹ کے بعد اس بات کی نشاندہی کی کہ سیدھے ہاتھ کی طرف دھڑکنے والے دل کی وجہ سے کمال احمد کا وجود شک کے زمرے میں آتا ہے اور ان دونوں کو ختم کرنے سے قبل میں نے مسز عباسی کی جائے واردات پر مووی بنائی۔ اس مووی کو مدنظر رکھتے ہوئے پولیس کو یہ جاننے میں قطعاً دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا کہ مسز عباسی نے کسی بات پر مشتعل ہو کر اپنے دونوں سابقہ شوہروں کو بے ہوشی کی دوا پلا کر طوفانی لہروں کے سپرد کر دیا۔ ان کی مسخ شدہ لاشوں کے معدوں سے بے ہوش کر دینے والی دوا کی کچھ مقدار حاصل کر لی جائے گی اور بعد از گرفتاری انہیں یقیناً پھانسی کی سزا دی جائے گی۔ زلفی کی کامیاب سرجری کی بدولت تنظیم کی سربراہی کے لیے آپ کو منتخب کیا جائے گا اور آپ کا دستِ راست ہونے کی وجہ سے میں معاملے کی پیش رفت میں نمایاں کردار ادا کروں گا۔''

فہیمی نے اثبات میں سر ہلایا اور دبے قدموں چلتا ہوا دوبارہ خواب گاہ کی طرف چلا گیا۔

❖❖❖

قسط :02

انا گیر

امجد جاوید

زندگی کی کشمکش میں فنا و بقا ایک حقیقت ہے۔ قدرت کا دستور ہے کہ کوئی غیر معمولی طاقت اسی کو ملتی ہے جو اس کا موزوں استعمال جانتا ہے۔ فنا و بقا سے نبرد آزما ہونے والے خود شناس ہوتے ہیں۔ یہ وصف انہی کو حاصل ہوتا ہے جو انا گیر ہوں اور اپنا ادراک رکھتے ہوں... جو ظلم و جبر کے بگولوں کو مات دینا جانتے ہوں... سنہری ریت کے باطن سے اُبھرنے والے ایک نوجوان کی پرت در پرت کھلتی داستانِ دل نواز۔ وہ ریت کی طرح بکھر سکتا تھا مگر ذروں میں بٹ نہیں سکتا تھا۔ دھرتی کی مٹی میں نکھرنے اور سنورنے کا فن بخوبی جانتا تھا... اپنی ذات کو انا کے بھنور سے بچانا جانتا تھا... حالات کی آندھیوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کے گر سے آگاہ تھا۔ جانتا تھا کہ بگولے ریت کو ادھر اُدھر لے جاسکتے ہیں، فنا نہیں کر سکتے۔ ریشمی سراب تھے جو اس کی راہ میں حائل ہو رہے تھے۔

صحرا کے سرابوں سے ایک دلیر اور دل فگار نوجوان کی ہنگامہ خیزیاں
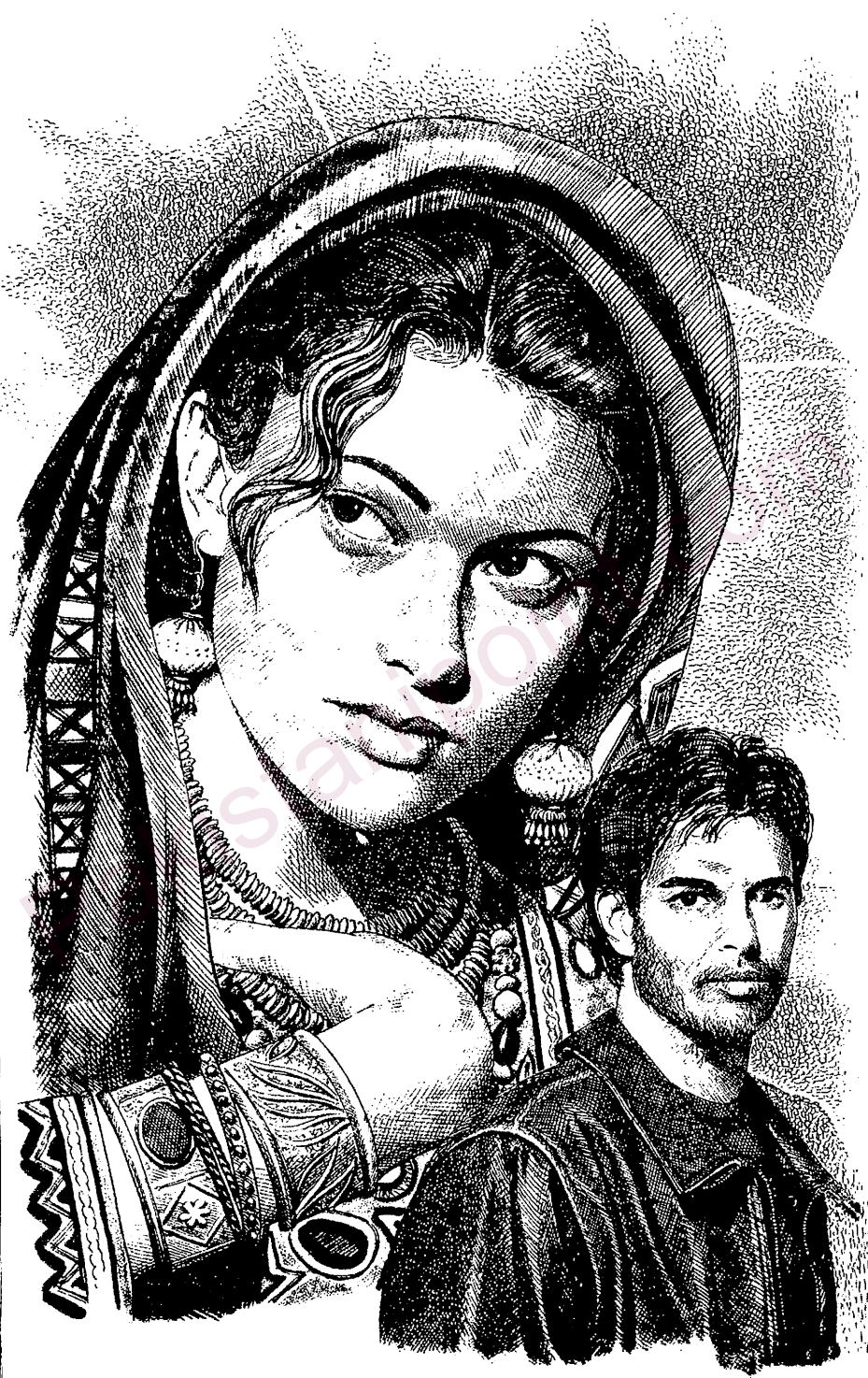
ساوری کی باتیں سن کر میرے ہوش اُڑ گئے تھے۔ وہ میرن شاہ کی بہن پیروزاں کو ایسا کیوں کہہ رہی تھی؟ کیا وہ اتنی ہی خطرناک عورت تھی جو ساوری اس قدر بے حال ہو کر مجھے بتا رہی تھی۔ ساوری تو ان کی ملازمہ تھی اور میں بھی اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ اس طرح مجھے ڈرانے کا مقصد کیا ہوسکتا تھا؟ اگر وہ خطرناک عورت تھی بھی تو کیسے، کیا کرتی ہے وہ؟ کہیں کوئی یہ سازش تو نہیں تھی؟ اگر سازش نہیں تو مجھے آزمایا تو نہیں جا رہا تھا۔ ایسے ہی سوال میرے دماغ میں گردش کرتے چلے گئے۔ ایک دم سے میرا دھیان پرسوں رات کے اُس واقعے کی طرف چلا گیا۔ جو کوئی بھی تھا، ایک بار وہ میرے قریب ضرور آیا تھا اور پھر جوتے کی صورت میں اپنا احساس چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میں اس پر مزید نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ اگر پیروزاں کوئی خطرناک عورت تھی بھی تو مجھے اس سے کیا؟ جب وہ سامنے آئے گی اور میرے لیے خطرہ بنے گی تو دیکھا جائے گا۔ میں یہ سوچ کر یکدم مطمئن ہوگیا۔

شام ڈھلنے کو تھی جب بابا خیر دین واپس آگیا۔ اس نے آتے ہی چار پائیاں بچھا دیں۔ میرا من چاہ رہا تھا کہ اس سے بہت ساری باتیں کروں لیکن میں اس سے ایسی کوئی بات نہیں کرسکتا تھا۔ میں خاموشی سے چار پائی پر پڑا بابا خیر دین کو دیکھتا رہا۔ وہ اپنا کام کر کے رہائش گاہ کی جانب چل دیا۔ کچھ دیر بعد وہ کھانا لے کر آگیا۔ میں کھا پی کر پھر چار پائی پر لیٹ گیا۔ میں کافی بے چین تھا لیکن اس بے چینی کی وجہ مجھے سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

''پتر، کیا بات ہے، کوئی پریشانی ہے؟'' بابا خیر دین نے پوچھا تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ میری جانب بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ میری بے چینی بھانپ گیا تھا۔

''کچھ نہیں بابا، یہاں کام شروع ہوسکا اور نہ ہی کوئی امن سکون ہے، عجیب سی جگہ ہے، جہاں کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا۔'' میں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا۔

''شاید تمہیں شہر کے شور شرابے کی عادت ہے اس لیے یہاں پُرسکون علاقے میں بے چینی ہو رہی ہے؟'' اس نے دھیمے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہوسکتا ہے ایسا ہو لیکن میں تو اس سے بھی ویران علاقوں میں رہا ہوں۔ وہ علاقے خطرناک بھی تھے لیکن اس طرح......'' میں کہتے کہتے خاموش ہوگیا تو بابا چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

''جہاں ظلم ہوتا ہے نا، وہاں بے برکتی ہو جاتی ہے۔ تم ان باتوں کو نہ سوچو، اپنا کام کرو۔''

''ٹھیک ہے بابا۔'' میں نے اس کی بات مانتے ہوئے کہا۔

''تم زمان موہل کو بلا لو، یا پھر اس کے پاس چلے جاؤ۔ باتیں کر کے اپنا دل بہلا لو۔ ہوسکتا ہے وہ کوئی گانے والے بھی ساتھ لے آئے، ہے تو شوقین بندہ۔'' بابا خیر دین نے کہا۔

''نہیں بابا، اب میں سوتا ہوں۔'' میں نے سستی سے کہا تو بابا نے کہا۔

''مجھے تو جانا ہے ابھی پار کی بستی، سائیں کا ایک کام ہے۔ زمان کا گھر رستے میں پڑتا ہے، کہو تو میں اسے بھیج دوں؟''

''نہیں، وہ تنگ ہوگا۔ ویسے بھی وہ سارا دن میرے ساتھ ہی رہا ہے۔ کل پھر وہ میرے ساتھ جائے گا۔'' میں نے کہا تو بابا خیر دین اٹھ گیا۔ میں خود بھی زمان سے زیادہ ملنے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ اب کچھ دن اسی کے ساتھ وقت گزارنا تھا۔ کل کا دن بھی ہم نے طے کیا ہوا تھا بلکہ اسی نے کہا تھا کہ ہم صبح سے دوپہر تک بستی کے جنوبی علاقے میں پھریں گے۔ یہ علاقہ تقریباً چار کلو میٹر بنتا تھا۔ اس کے بعد دوپہر کا وقت گوپے میں گزاریں گے۔ سہ پہر کے بعد ہی وہاں سے واپس ڈیرے پر آنا تھا۔ اس وقت میرا ذہن اُلجھا ہوا تھا۔ سو میں کروٹ لے کر لیٹ گیا۔

میرے ذہن پر ساوری چھائی ہوئی تھی۔ اس کا بچپن کا معصومانہ چہرہ اور اب قیامت خیز حُسن۔ جوانی کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہے۔ میں اسے سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے لگا اس کی اوٹ سے ایک اور چہرہ ابھرنے لگا ہے، بے چین سا، قدرے غصے بھرا، سنہری بال، سفید رنگ مگر خدوخال واضح نہیں تھے، وہ کون تھی، یہ یاد نہیں آرہا تھا۔ شاید میری آنکھ لگ گئی تھی۔ ہلکے سے کھٹکے پر میری آنکھ کھل گئی۔ میرے سامنے چار پائی کے پاس کوئی کھڑا تھا۔ میں ایک دم سے چونک گیا۔ غور کیا تو مجھے لگا وہ کوئی عورت تھی۔ میں ویسے ہی پڑا رہا تو اس نے ہولے سے کہا۔

''اُو علی اٹھ، یہ دودھ پی لے۔'' آواز سن کے اندازہ ہوا کہ وہ ساوری تھی۔

''اس وقت دودھ؟'' میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے کوئی شوق نہیں، اماں نے کہا تو لے آئی۔'' اس نے نخرے بھرے لہجے میں کہا۔

''اچھا چل لا۔'' میں نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے پیتل کا بڑا گلاس میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے گلاس پکڑا تو وہ کافی گرم تھا اس لیے تیزی سے بولا، ''بڑا گرم دودھ ہے، چولھے سے اتار کر سیدھا لے آئی ہو؟''

''جان بوجھ کر اتنا گرم لائی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے پلٹ کر تیزی سے دیکھا اور میرے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔ تبھی میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ایسا کیوں؟''

''مجھے تم سے باتیں کرنی ہیں۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

''کیسی باتیں؟'' میں نے بھی ہولے سے پوچھا۔

''مجھے تم سے پیروزاں کے بارے میں بات کرنا تھی۔'' اس نے آواز دھیمی رکھتے ہوئے تیزی سے کہا تو میں نے گرم دودھ کا گھونٹ لے لیا۔

''کیا بات کرنا چاہتی ہو؟''

''یہی کہ پیروزاں سے بچ کر رہنا۔ وہ بڑی ظالم عورت ہے۔ جب سے اس نے تمہیں دیکھا ہے، اس کے دماغ میں پتا نہیں کیا سما گیا ہے۔ شاید تم اس کے دماغ پر چھا گئے ہو۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

''بڑی بات ہے، کوئی تو ہے جسے میں نے متاثر کیا، ورنہ میری طرف تو کوئی دیکھتا بھی نہیں ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا اور دودھ کا دوسرا گھونٹ بھرا۔

''اس وقت بھی وہ دیوار کے پار کھڑی ہے۔ مجھے یہ دودھ دے کر اسی نے بھیجا ہے۔ تم سے یہ پوچھنے کے لیے کہ جوتے والی بات کس کس کو بتائی ہے؟'' ساوری نے کہا تو مجھے عجیب سا لگا، کیا یہ دونوں عورتیں مجھے پاگل بنانا چاہ رہی ہیں؟ میں نے اس کیفیت کو چھپاتے ہوئے سکون سے پوچھا۔

''تم نے اُسے کچھ بتایا؟''

''نہیں نہیں، میں نے یہاں کچھ بھی نہیں دیکھا، میں کسی جوتے کے بارے میں جانتی ہی نہیں ہوں۔ یہ تو مجھے ابھی پتا چلا ہے پیروزاں سے، اس نے مجھے کہا ہے کہ میں یہاں آکر تم سے پوچھوں۔ بس میں تو اتنا جانتی ہوں......'' اس نے لرزتے ہوئے لہجے میں تیز تیز کہا تو میں نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

''اصل میں تم چاہتی کیا ہو؟''

''دیکھو، دوپہر کے وقت جب میں نے وہ جوتا دیکھا تو میرے دماغ میں آیا میں نے کہہ دیا۔ جو میرے دل میں آیا، وہ کہہ دیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے پیروزاں نے مجھے ساری بات بتا کر یہ پوچھنے کے لیے بھیجا ہے کہ کہیں تم نے کسی کو اس جوتے کے بارے میں تو نہیں بتا دیا؟'' اس نے ہولے ہولے مجھے تفصیل بتائی تو میں نے تحمل سے کہا۔

''اب مجھے اس کا جواب کیا دینا چاہیے یہ بھی بتا دو۔''

''نہیں، کہنا تو یہی ہے کہ تم نے کسی کو نہیں بتایا، مجھے بھی نہیں مگر میں بھی یہ اطمینان کر لینا چاہتی ہوں کہ کہیں تم نے......'' اس نے کہتے ہوئے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تو میں نے سکون سے کہا۔

''نہیں، میں نے کسی کو نہیں بتایا، میرے لیے یہ کوئی اتنی اہم بات نہیں تھی۔ تم نے بھی خود ہی دیکھا ورنہ میں اس بات کو اہمیت ہی نہ دیتا۔''

''لیکن اب اہمیت دو۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

''مجھ سے گھما پھرا کر بات نہ کرو، صرف اتنا بتا دو کہ تم کیا چاہتی ہو؟'' میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا تو وہ سرگوشی میں بولی۔

''دیکھو، میں تمہیں پیروزاں سے بچانا چاہتی ہوں۔ لیکن میں پیروزاں کی بات ماننے کے لیے بھی مجبور ہوں، بس یہی کہنا ہے۔''

''اچھا، اب تمہیں اس پیروزاں سے جا کر یہی کہنا ہے کہ اسے پتا ہی نہیں جوتا کون چھوڑ گیا۔ تم وہ جوتا بھی اٹھا کر لے جاؤ۔'' میں نے کہا اور گلاس منہ سے لگا لیا۔ دودھ ابھی تک گرم تھا۔

''نہیں، وہ خود آئے گی ابھی تھوڑی دیر بعد، وہ خود ہی آکر لے جائے گی۔ مجھے صرف اتنا کہا ہے کہ تم سے گھما پھرا کر یہی پوچھ لوں کہ اس جوتے کے بارے میں کس کس کو پتا ہے۔'' اس نے ہولے ہولے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم اطمینان سے جاؤ اور اسے کہہ دو جو کہنا ہے۔'' میں نے کہا تو وہ اٹھ گئی۔ تبھی اچانک میرے دماغ میں آیا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

''میرن شاہ کی بیوی کو ان سارے معاملے کا پتا ہے؟''

''نہیں، وہ یہاں نہیں رہتی۔'' اس نے دھیمے سے کہا۔

''نہیں رہتی مطلب......؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''وہ شہر میں رہتی ہے اپنے دونوں بچوں کے ساتھ۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ چھڑوایا، گلاس بھی نہیں لیا اور رہائش گاہ کی جانب بڑھ گئی۔ گلاس میرے ہاتھ میں تھا لیکن میری سوچ بڑی عجیب ہونے لگی تھی۔ میرے ذہن میں نجانے یہ خیال کیوں آنے لگا کہ ممکن ہے ساوری

سے کوئی کام لیا جا رہا ہو؟ یہ کام کون لے رہا ہوگا، میں اس بارے بھی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں جیسے جیسے سوچتا گیا، میرا یہ خیال پختہ ہوتا چلا گیا۔

کچھ دیر بعد دودھ ختم ہوگیا لیکن گلاس میرے ہاتھ ہی میں تھا۔ ایسے میں رہائش گاہ کی طرف سے پائل کی جھنکار سنائی دی جو لحہ بہ لحہ میرے نزدیک آتی چلی گئی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ اندھیرے میں ایک ہیولا واضح ہونے لگا۔ جھنکار زیادہ ہوتی چلی گئی۔ مجھے یہ بڑا عجیب سا لگا۔ یوں اندھیرے میں ایک اجنبی سے ملنے آنا ہوتو خاموشی اور راز داری سے آیا جاتا ہے لیکن وہ تو پائل کی چھنکار کے ساتھ آرہی تھی۔ کیا وہ نڈر تھی یا کوئی اسے پوچھنے والا نہیں تھا؟ میرے ذہن میں یہ خیال پہلے ہی سے تھا کہ وہ مجھے نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔ کیونکہ ساوری نے اس کے بارے میں یہی کہا تھا کہ وہ بندے مار قسم کی عورت ہے۔ اب یہ اس نے کس تناظر میں کہا تھا، یہ میں نہیں جانتا تھا۔ وہ بالکل میرے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔ ملگجی روشنی میں اس کے خدو خال تو واضح نہیں ہو رہے تھے لیکن اس کا بدن میرے سامنے تھا۔ وہ اونچے قد کی قدرے فربہ مائل عورت تھی۔ وہ میرے قریب آکر رک گئی۔ اس کا مجھ سے کوئی دو فٹ کا فاصلہ تھا۔ پائل کی جھنکار رک گئی تھی۔ ایک سکوت طاری ہو گیا تھا تبھی اس نے ہولے سے کہا۔

”اوئے علی، اٹھ، اندر چل۔“

”اندر کیوں اور تم کون ہو؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”اندر چل وہاں سب بتاتی ہوں، یہاں پر ہمیں کوئی بھی دیکھ سکتا ہے۔“ اس نے اسی طرح ہولے سے کہا تو میں سکون سے بولا۔

”ایسی کیا خاص بات ہے جو اندر ہی ہوسکتی ہے، یہاں بیٹھ کر بات کرو، جو بھی کہنا ہے یہیں بیٹھ کر کہو۔“

”تجھے کہا ہے نا، اُٹھ...... چل اندر“ اس نے دھیمی سی آواز میں دبے دبے غصے میں کہا اور میرا دایاں بازو یوں پکڑ لیا جیسے مجھے خود اٹھانا چاہ رہی ہو۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ کر اپنا بازو چھڑاتے ہوئے ہوئے رعب دار لہجے میں کہا۔

”نہیں، میں نہیں جاؤں گا، یہیں بیٹھ کے بات کروں گا۔“

”دیکھ تو سمجھ......“ اس نے ہولے سے کہا۔

”تو جاؤ پھر، مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔ اتنا ڈرتی ہو تو پھر یہاں تک آئی ہی کیوں تھیں۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تو وہ سامنے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے سرسراتے ہوئے انداز میں بولی۔

”اُوئے، مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے..... مجھے خوف ہے تیرا، تو کہیں اپنی جان سے نہ چلا جائے۔“

”میری جان کی فکر مت کرو، اپنی کہو جو کہنے آئی ہو۔“ میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

”دیکھو علی، تم مجھے اچھے لگے ہو، اور پھر تم نے مجھ پر ایک احسان بھی کر دیا ہے اس لیے تم سے دوستی چاہتی ہوں۔ کرو گے دوستی مجھ سے؟“

”دیکھو پیروزاں، میں نے تمہیں دیکھا تک نہیں، حالانکہ تم میرے سامنے بیٹھی ہو، اور نہ مجھے یہ پتا ہے کہ میں نے تم پر کیا احسان کیا ہے۔ اس لیے تمہاری یہ دوستی والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ پتا نہیں تم میرے ساتھ کیا کھیل کھیلنا چاہتی ہو؟“ میں نے پھر اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تو اس کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ لحہ بھر بعد بولی۔

”اوئے میرا دوست تو بن، پھر دیکھ کیسا کھیل کھیلتی ہوں میں۔“

”مجھے تمہارے کھیل سے کوئی دلچسپی نہیں۔“ میں نے اس کی آفر کو رد کرتے ہوئے کہا تو وہ میرے سامنے تن کر بیٹھ گئی۔ اندھیرے میں اس کے خدو خال مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

”چل ایسا کر، میری باتیں سن لے، پھر چاہے دوستی کرنا یا نہ کرنا، یہ تیری مرضی ہوگی۔“ اس نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔

”میں کیوں سنوں؟“ میں نے دبے دبے غصے میں یوں کہا جیسے مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ ہو لیکن میرے اندر ہلچل سی ہوگئی تھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ مجھے مزید کہے گی تو میں اس کی بات فوراً مان لوں گا۔ اگلے چند لمحوں بعد اس نے میری توقع کے مطابق کہہ دیا۔

”تو سوچ بھی نہیں سکتا تجھے کتنا فائدہ پہنچے گا۔ اب یہ مت کہنا کہ تجھے کوئی فائدہ نہیں چاہیے۔ بہت ساری دولت تیرے قدموں میں ڈھیر ہوجائے گی۔ یہ جو چند ٹکوں کی تنخواہ کے پیچھے جنگلوں بیابانوں اور ویرانوں میں... پھر رہا ہے، سب ختم ہوجائے گا، عیش کرے گا عیش۔“ اس نے مجھے لالچ دیتے ہوئے کہا تو میں نے اس کی توقع کے مطابق کہہ دیا۔

''ہاں بول، بات کیا ہے؟''

''ہاں، اب ہوئی نا بات، چل اندر، وہیں بتاتی ہوں۔''
اس نے فوراً وہی کہا جو اس نے آتے ہی مجھ سے منوانا چاہا تھا

''چلو ٹھیک ہے تم چلو اندر میں آتا ہوں۔'' میں نے کہا تو وہ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اٹھی اور اندر کمرے میں چلی گئی۔
چند لمحے بعد میں اٹھا اور بہت ہی محتاط انداز میں اندر چلا گیا۔ کمرے میں ٹارچ کی تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میری پہلی نگاہ اس کے چہرے پر پڑی۔ اس کا رنگ تو گورا تھا لیکن نقش نین بہت موٹے تھے۔ اگر اس کا رنگ سیاہ ہوتا تو شاید وہ پہلی نگاہ میں نیگرو ہی دکھائی دیتی۔ میں اسی وقت سمجھ گیا کہ اس کی شادی کیوں نہیں ہو رہی تھی۔ 'مرد مار عورت' کی پہلی نشانی مجھے مل گئی تھی۔ اس کے سیاہ گھنیرے بال آنچل سے جھانک رہے تھے۔ موٹے موٹے سرخ ہونٹ بالکل بھی اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ اس کی گردن سے باقی بدن بڑے سے آنچل میں چھپا ہوا تھا۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا تو میری ...... جانب دیکھتے ہوئے بولی۔
''پہلی بات تو یہ ہے کہ تو نے مجھ پر جو احسان کیا، اس کا ... میں سن۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش رہی پھر کہتی چلی گئی۔ ''اس رات وہ تینوں راجھستانی مجھے مارنے کے لیے آئے تھے۔ ان کی دشمنی میرن شاہ سے نہیں، مجھ سے ہے۔ وہ مجھے مارنا چاہتے ہیں، کیونکہ میں نے ان کے دو بندے مارے ہیں۔''
اس نے یہ بات یوں کہی جیسے بندے قتل کرنے کی نہیں کوئی جانور مارنے کی بات کی ہو۔ میں نے اس کی طرف ... دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''تم نے کیے......؟''
''ہاں میں نے کیے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی مجھے دھوکا دے۔ مجھے دھوکا بھی دے اور زندہ بچ کر چلا جائے، ایسا ہو نہیں سکتا۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا

''مجھ سے کیا چاہتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔
''وہی جو تو نے انجانے میں کر دیا۔ جب تک یہاں پر ... لیے کام کرو باقی سب تجھے آہستہ آہستہ سمجھ میں آ جائے گا۔'' اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا

''اس کے عوض مجھے کیا ملے گا؟'' میں نے پوچھا۔
''... تیری سوچ سے بھی زیادہ۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔
''پھر بھی مجھے کرنا کیا ہوگا؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔
''جو کہوں، وہ کر دینا۔ یہ بات صرف تیرے اور میرے درمیان ہوگی، کسی کو خبر بھی نہ ہو۔ اپنے کام کرتا رہ۔ جیسا کام کرے گا، ویسا پیسہ دیتی رہوں گی۔'' اس نے خالص کاروباری لہجے میں کہا تو مجھے ذاتی طور پر بہت بُرا لگا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں اسے اٹھا کر چلتا کر دیتا لیکن میں اس وقت انہی کے گھر، ان کی زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ نجانے کس وقت وہ کیا کر دے، یہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ تھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کیسی عورت ہے۔ وہ کوئی اپنا ہی کھیل کھیل رہی تھی اور مجھے اب اس کے کھیل ہی میں اپنا کھیل کھیلنا تھا اس لیے میں نے سکون سے پوچھا۔
''ساوری تو جانتی ہے ہمارے بارے میں؟''
''اس کی اوقات کہ وہ اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نکالے۔ اسے چھوڑ، وہ سمجھ گونگی، بہری اور اندھی ہے۔ وہ تیرے اور میرے درمیان رابطہ رکھے گی۔'' اگرچہ اس کی بات سن کر مجھے انتہائی دکھ ہوا تھا کہ وہ یہاں کے لوگوں کو انسان نہیں، جانور سمجھتی ہے۔ یہ لفظ چیخ چیخ کر گواہی دے رہے تھے کہ اس کی ذہنیت کیا ہے؟
''ٹھیک ہے جیسے تم کہو۔ صرف ایک بات کا خیال رکھنا۔'' میں نے کہا۔
''کون سی بات؟'' اس نے ہنکارا بھرنے والے انداز میں پوچھا۔
''اگر تم دھوکا برداشت نہیں کر سکتیں تو میں بھی دھوکا دینے والے کو چھوڑتا نہیں، زمین میں دفن بھی ہو جائے تو اس کی ہڈیاں نکال لوں گا۔'' میں نے سرد لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ شاید میرے لہجے میں اتنی وحشت تھی کہ پیروزاں نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی پھر پھیکی سی مسکان کے ساتھ اپنا ہاتھ بڑھا کر بولی۔
''تو میں سمجھوں کہ تو میرے ساتھ ہے؟''
''ہاں، یہی سمجھو۔'' میں نے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینے کے بجائے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے اپنے نرم ہاتھ سے میرا ہاتھ گرم جوشی سے دباتے ہوئے خمار آلود لہجے میں کہا۔
''ٹھیک ہے۔ چلتی ہوں اب۔''
''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور اٹھ گیا۔
اس نے ٹارچ بند کر دی پھر اٹھ کر میرے برابر کھڑی

ہوگئی۔ اس کی سانسیں میری گردن کو چھونے لگی تھیں۔ اس قدر تنہائی میں اتنی قربت میں خود پر قابو رکھنا بہت مشکل تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایک دم سے مجھے تسخیر کر لینا چاہتی تھی لیکن میں اسے ترسانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے چھوتی، میں باہر کی جانب لپک گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی باہر آگئی۔ وہ پائل چھنکاتی چل دی۔ شاید وہ پائل پہن کر مجھے کچھ سمجھانا چاہتی تھی، وہ جو بھی چاہتی تھی لیکن میں بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔ اس بار اس کی پائل کی چھنکار میں شکست بول رہی تھی۔

☆☆☆

میں ناشتے سے فارغ ہو کر تیار ہوا ہی تھا کہ زمان موہل آگیا۔ اس نے ڈیرے کے باہر ہی سے ہارن دیا تھا۔ میں نے بیگ اٹھایا اور اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر جا بیٹھا۔ اس نے جیپ بڑھا دی۔ تھوڑا سا سفر کیا تو وہ یونہی باتیں کرنے کے لیے سوچتے ہوئے بولا۔

”یار، تم یہاں سروے کرو گے، اس کی رپورٹ بناؤ گے پھر اس پر نجانے کب عمل درآمد ہوگا، یہاں پر تبدیلی میں بہت عرصہ لگے گا۔“

”یار بات یہ ہے، جب تک یہ حاکمانہ ذہن والے لوگ موجود ہیں نا، اور پھر اس سے بھی بڑھ کر محکوم رہنے والے لوگ خود کو بدلنا نہیں چاہیں گے، تب تک کسی بھی تبدیلی کا سوچنا وقت کا زیاں ہے۔“ میں نے عام سے لہجے میں کہا تو وہ مایوسانہ لہجے میں بولا۔

”بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ کسی ایک کو تو بدلنا ہوگا... ورنہ یہ ماحول تو ویسے ہی رہے گا۔ حکومتیں کیا کرلیں گی۔“

”اصل بات ہے...... فائدہ۔ کوئی گینگ ہو، مافیا ہو یا لوگوں کا گروہ، یا کوئی تنظیم وہ کسی نہ کسی فائدے کے گرد جمع ہوتے ہیں۔ بحث یہ نہیں کہ وہ فائدہ کیا ہے۔ جیسے تم لوگ میرن شاہ کے گرد اس لیے جمع ہو کہ تمہیں فائدہ ہے۔ اگر تمہیں فائدہ دکھائی نہ دے تو تم کبھی یہاں کا رخ نہ کرو۔“ میں نے مایوسی سے کہا تو ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا سوچ رہا تھا لیکن میرے ذہن میں پیروزاں کی باتیں گونج رہی تھیں۔ وہ کیا کرنا چاہتی تھی، اس کا فائدہ کس میں تھا؟ میں اس بارے کچھ بھی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔

ہم ایک ایسی جگہ جا پہنچے جہاں تھوڑے فاصلے پر ایک بستی تھی۔ زمان نے گاڑی ایک طرف لگائی اور چادر لے کر میرے ساتھ آگیا۔ میں نے ایک اونچے ٹیلے پر جا کر اپنا بیگ کھولا اور علاقہ دیکھنے لگا۔ وہ چادر بچھا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی مصروفیت شاید سیل فون میں تلاش کرلی تھی۔ وہ سیل فون پر نگاہیں گاڑھ کر بیٹھ گیا۔ میں دور تک دیکھنے لگا، وہی لق ودق صحرا، روہی کے مخصوص پودے اور جھاڑیاں، اس کے علاوہ وہی ویرانی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ کچھ وقت گزار کر بستی میں جاؤں گا، وہاں لوگوں سے گپ شپ کروں گا۔ ان کے مسائل پر بات ہوگی۔ میں نے ابھی اپنا بیگ کھول کر اس میں سے نقشہ نہیں نکالا تھا۔ میں وہاں کھڑا یہی سوچ رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ ایک جیپ پر پڑی۔ وہ اسی راستے سے آرہی تھی جہاں سے ہم آئے تھے۔ زمان نے اس گاڑی کو نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ جیپ اس کی پشت پر سے آرہی تھی۔ وہ جھاڑی کے سائے میں بیٹھا ہوا سیل فون کی طرف متوجہ تھا۔ میں سوچنے لگا کہ وہ گاڑی کہاں سے آئی ہے اور کدھر جانا چاہتی ہے۔ کیا بستی میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ایسی گاڑی رکھتے ہیں؟

میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ وہ ہماری..... گاڑی سے تھوڑا فاصلے پر رک گئی۔ آواز سن کر زمان بھی اسی جانب دیکھنے لگا۔ جیسے ہی اس گاڑی سے لوگ نکلنے لگے، زمان ایک دم سے کھڑا ہوگیا۔ اس کا یہ اٹھنا بالکل لاشعوری تھا۔ ایک دم سے میں نے خطرہ محسوس کیا۔ یہ تو طے تھا کہ نووارد لوگ دوست نہیں ہو سکتے تھے ورنہ زمان یوں بدک کر کھڑا نہ ہوتا۔ وہ تعداد میں تین بندے تھے۔ اپنے حلیے سے وہ مقامی معلوم ہو رہے تھے۔ وہ دوڑنے والے انداز میں ہماری جانب آرہے تھے۔

”زمان بات کیا ہے؟“ میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

”یہ لوگ......“ وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا۔ جیسے اس کے منہ سے مزید کوئی لفظ نہ نکل رہا ہو۔ لمحہ بھر بعد وہ میری طرف دیکھ کر دہشت زدہ لہجے میں بولا ”یہ لوگ...... ہمارے...... دشمن ہیں۔“

”اوہ......!“ میرے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔ وہ لوگ ہم سے تھوڑے فاصلے پر آکر رک کر ہمیں گھور رہے تھے۔ ان میں سے ایک فربہ مائل شخص نے ہماری جانب دیکھتے ہوئے حقارت سے کہا۔

”او زمان...... کب تک ہم سے بچو گے، فکر نہ کرو ہم تمہیں ماریں گے نہیں، بس یونہی تمہاری ٹانگیں توڑیں گے... یا ایک آدھ ہاتھ بھی...... بس اس سے زیادہ نہیں، چپ چاپ ہمارے ساتھ چلو۔“

''بڑے دنوں بعد ہاتھ لگے ہو تم۔'' ساتھ کھڑے ایک گھٹے جسم والے نے غراتے ہوئے کہا تو زمان موہل خوف زدہ لہجے میں بولا۔

''جب میرن شاہ نے طے کر دیا تھا کہ......''

''بھونکو نہیں، کچھ طے نہیں ہوا تھا، ہمیں بدلہ لینا ہے بس......'' فربہ مائل نے دہاڑتے ہوئے کہا تو میں سمجھ گیا کہ دشمنی جیسی بھی ہوگی، اس وقت جو بندے اس کے پیچھے یہاں تک آئے ہیں، وہ اب اسے چھوڑیں گے نہیں۔ تبھی میں بڑے تحمل سے بولا۔

''تم جو کوئی بھی ہو، تمہاری دشمنی کیا ہے، میں اس......''

''اوئے زبان بند رکھ...... بات کرے گا نا تو ہم تیرے بھی ہاتھ پیر توڑ دیں گے...... درمیان میں مت آنا۔'' فربہ مائل شخص نے حقارت سے کہتے ہوئے مجھے ایک طرف ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔

''اوئے سیانے، پہلے بات پوری سنتے ہیں پھر بات کرتے ہیں، یہ تجھے کسی نے سمجھایا نہیں۔'' میں نے اس سے بھی زیادہ حقارت بھرے لہجے میں کہا تو ان سب کے چہروں پر ایک بار حیرت ابھری، وہ خاموش رہے تو میں نے مزید کہا۔ ''میں کہہ رہا تھا، تمہاری جو بھی دشمنی ہو، سو ہو لیکن اس وقت یہ میرے ساتھ ہے۔ تم لوگ اگر مرد ہو، تو اسے ہاتھ لگا کر دیکھو۔''

میری توقع کے مطابق گھٹے بدن والے نے بھنا کر پسٹل نکالا اور دہاڑتے ہوئے کہا۔

''چل پھر پہلے تیرا بندوبست کرتا ہوں۔''

''ایسے کھلونوں سے تو کوئی بچہ بھی کھیل سکتا ہے۔'' میں نے اِک پرانا حربہ آزماتے ہوئے کہا، ''مرد ہو تو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اپنی مردانگی ثابت کرو۔ ورنہ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' میں نے ان کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے رعب دار لہجے میں کہا۔

میں مستقل اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ یہ میں نے ایک رسک لیا تھا۔ اسی لمحے پتا چل جاتا تھا کہ میرے سامنے کھڑا شخص کیسی فطرت رکھتا ہے۔ وہ میرے جھانسے میں نہیں آیا تھا، اس نے گولی چلانے کو ترجیح دی۔ اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، میں اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ گولی کہیں ریت میں جا پڑی تھی۔ یہی لمحہ میرے لیے سب سے قیمتی تھا اور میں اس کا بھرپور استعمال کر چکا تھا۔ میں اس پسٹل پکڑے ہوئے فربہ مائل کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا ہاتھ سیدھا کر کے مجھے نشانہ بناتا، میں نے اس کی کلائی پکڑ لی

اور اپنا سر اس کے سر پر دے مارا۔ وہ لڑکھڑا کر رہ گیا۔ اسی دوران میں اس کے ہاتھ سے پسٹل دور جا گرا۔ میں پسٹل کی جانب نہیں لپکا بلکہ اس کی پشت پر جا پہنچا۔ اس کی گردن میری گرفت میں تھی۔

''چاہوں تو ابھی تیری گردن توڑ دوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اسے ایک جھٹکا دیا تو اس کے منہ سے اُوخ کی آواز اُبھری۔

''چھوڑو اسے......'' گھٹے ہوئے بدن والے نے چلّاتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں یہ نہیں کہوں گا کہ ہمیں جانے دو لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ، ورنہ بہت بُرا حال کروں گا میں۔'' میں نے غراتے ہوئے کہا تو وہ لپک کر آگے بڑھا اور اس نے زمان کا بازو پکڑ لیا۔ زمان نے ذرا سی بھی مزاحمت نہیں کی تھی۔ یہی میرے لیے سب سے بڑی اُلجھن تھی۔ وہ مجھے بھی کمزور کر رہا تھا۔ گھٹے ہوئے بدن والے نے میری طرف طنزیہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب بول کیا کرے گا؟''

یہ کہتے ہوئے اس کا دھیان میری طرف تھا، بالکل اسی لمحے زمان نے اپنا بازو چھڑایا اور اس کے منہ پر گھونسا مار دیا۔ میرے اندر ایک دم توانائی کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے اب زمان کی فکر نہیں رہی تھی۔ میں نے فربہ مائل شخص کی گردن کو ایک جھٹکا دیا اور اسے ریت پر پھینک دیا۔ باقی دونوں میری جانب نہیں بڑھے بلکہ وہ زمان پر پل پڑے تھے۔ میں نے لپک کر ایک کو پکڑا اور اس کی پسلی میں گھونسا مارا، وہ تڑپ کر رہ گیا۔ میں نے دوسرے کو بالوں سے پکڑ کر ہٹایا تو اس نے گھوم کر میرے گھونسا مارا جو میرے سینے پر لگا۔ میں لڑکھڑایا تو اس نے میرا بازو پکڑ کر جھٹکا دیا تاکہ ریت پر گر جاؤں۔ تبھی میں نے اسی کا سہارا لیا اور گھوم کر اپنا پاؤں اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ پیچھے کی جانب گرنے لگا تو میں اس پر چڑھ گیا۔ اس کی کنپٹی پر ایک گھونسا جڑا تو وہ بے دم سا ہو گیا۔ میں نے اسے چھوڑ کر زمان کو دیکھا۔ وہ دونوں اس کو پکڑے ہوئے تھے۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور اسے پکڑنے والوں میں سے ایک کی گردن میں ہاتھ ڈالا اور اسے کھینچ لیا اور لگاتار اس کے ہاتھ جڑتا رہا۔ وہ سخت جان تھے، جذباتی بھی تھے اور طاقتور بھی لیکن وہ لڑنے کے فن میں بالکل کورے لگ رہے تھے۔ میں اگر ایک کو پکڑتا تو دو زمان کو پکڑ لیتے۔ میں نے دیکھا وہ اس کی درگت بنا چکے تھے۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور کئی جگہ سے چہرہ

سوچ چکا تھا۔ وہ چکرایا اور ریت پر گر گیا۔ وہ اب تینوں مجھے پکڑ سکتے تھے۔ ممکن ہے وہ یہی سوچ رہے ہوں کہ مجھے بے بس کر کے پھینک دیں گے اور پھر زمان کو اٹھا کر لے جائیں گے۔ میں زیادہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ زمان کا ریت پر گر کر بے حس وحرکت ہو جانا کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے فیصلہ کر لیا۔

میں نے دیکھا کچھ فاصلے پر پسٹل پڑا ہوا تھا۔ میں انتہائی تیزی سے پسٹل کی جانب لپکا۔ میں نے وہ پسٹل اٹھایا اور ہوائی فائر کر دیا۔ صحرا میں فائر کی آواز گونج کر رہ گئی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے چلّا کر کہا۔

''رُک جاؤ......'' وہ ایک دم سے ٹھٹک کر رُک گئے۔ وہ تینوں ہی غور سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ میں ان تینوں کا نشانہ لیتے ہوئے دہاڑا۔ ''میری تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں، میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا میں نے پہلے بھی کہا تھا...... جسے زندگی چاہیے وہ بھاگ جائے اور جس نے موت کو گلے لگانا ہے، وہ آ جائے میرے سامنے...... تین تک گنوں گا......ایک......''

وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے پھر اچانک جیسے ان میں زندگی کی رمق دوڑ گئی تھی۔

''دو......'' میں نے غراتے ہوئے کہا۔

وہ اٹھے اور ایک جانب بھاگنے لگے۔ میں نے اونچی آواز میں کہا۔

''تین......''

یہ کہتے ہوئے میں نے ان کی جانب فائر کر دیا۔ میں نے ہوائی فائر کیا تھا۔ وہ اپنی گاڑی تک پہنچ گئے تھے۔ میں نے اگلا فائر نہیں کیا۔ وہ بھاگ چکے تھے۔ میں نے پسٹل میں گولیاں دیکھیں، اس میں صرف دو تھیں۔ میں نے اسے بند کیا اور نیفے میں اُڑس لیا۔ پھر زمان کی جانب متوجہ ہوا تو وہ تڑپ رہا تھا۔ میں تیزی سے اس کے پاس گیا۔ میں نے اس کا سر اونچا کرتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔

''کیا ہوا تمہیں......؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ہولے سے سر ہلا دیا۔ مجھے اپنے تئیں یہی سمجھ میں آیا کہ وہ نہیں بچے گا۔ اس لیے میں نے تیزی سے فیصلہ کیا اور پوری قوت سے اسے اٹھایا۔ وہ کافی وزنی تھا لیکن میں اسے لیتا ہوا گاڑی تک جا پہنچا۔ اسے بہ مشکل پسنجر سیٹ پر لٹایا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا کر گاڑی بھگا دی۔

میں کافی حد تک راستہ سمجھ رہا تھا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب جانا کہاں ہے؟ ظاہر ہے مجھے ڈیرے ہی کی جانب جانا تھا لیکن وہاں کوئی ایسی سہولت نہیں تھی۔ اسے فوری ڈاکٹر کی ضرورت تھی، اسپتال کا راستہ مجھے نہیں آتا تھا۔ ڈیرے سے کوئی آدمی لیتا تو اسپتال تک جا سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اچانک مجھے سیل فون کا خیال آیا۔ وہ زمان موہل کے پاس تھا۔ میں نے اس کی جانب دیکھا، وہ تکلیف کی شدت سے گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

''زمان، کیا تم ہوش میں ہو؟'' میں نے ہولے سے پوچھا۔ اس نے میری بات سنی اور ہلکے سے سر ہلا دیا تبھی میں نے سراسیمگی میں کہا، ''مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تمہیں کہاں لے کر جاؤں؟''

میرے یوں کہنے پر اس نے آگے ہی آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

''مجھے اپنا سیل فون دو، میں بات کروں کسی سے، نمبر......'' میں نے رفتار تیز کرتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی جیب سے فون نکالا اور نمبر نکال کر کال ملا دی۔ پھر میری جانب بڑھانے کا اشارہ کیا تو میں نے فون پکڑ لیا۔ دوسری جانب کسی نے فون پک کر لیا تھا۔

''میں زمان موہل کے فون سے بات کر رہا ہوں، وہ شدید زخمی ہے، اسے اسپتال لے کر جانا ہے۔ مجھے بتاؤ میں......'' میں نے تیزی سے کہا اور تفصیل بتاتے ہوئے گاڑی بھگاتا رہا۔

☆☆☆

وہ ایک چھوٹا سا دیہاتی اسپتال تھا۔ سرکاری عمارت بھی بنی ہوئی تھی۔ لوگ باہر لان میں بھی چارپائیاں ڈال کر مریضوں کو لٹائے ہوئے تھے۔ میں نے جیسے ہی گاڑی روکی، وہاں موجود بندے متوجہ ہو گئے۔ ان میں سے کئی افراد .... میرے چہرہ شناس تھے۔ وہ بستی چراغ شاہ ہی کے لوگ تھے جو دوڑ کر آگے آ گئے۔ انہوں نے زمان موہل کو نکالا اور اسپتال کی عمارت میں لے گئے۔ وہاں موجود ڈاکٹر اسے دیکھنے لگا۔ تقریباً دس منٹ دیکھتے رہنے کے بعد اس نے دوائیں تجویز کر دیں۔ تب میں نے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب، خطرے کی کوئی بات......؟''

''کوئی ہڈی تو بظاہر نہیں ٹوٹی لیکن زخم آئے ہیں، سر پر زیادہ چوٹیں ہیں۔ کچھ دیر بعد پھر دیکھتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے بتایا تو مجھے کافی حد تک سکون ہوا۔

وہاں موجود لوگ زمان موہل کو ایک الگ کمرے میں لے گئے۔ بستر پر لٹاتے ہی ڈرپ لگا دی گئی۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ بستی چراغ شاہ سے آئے لوگ بھی ارد گرد بیٹھ گئے۔ ہمیں وہاں بیٹھے دوپہر سے شام ہوگئی لیکن میرن شاہ وہاں نہیں آیا۔ زمان کی حالت بہت حد تک سنبھل گئی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ ماحول کو سمجھ چکا تھا اس لیے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''یار میں تو اِدھر پتا نہیں کب تک پڑا رہوں، تم جاؤ ڈیرے پر۔''

''نہیں، تمہیں ساتھ لے کر ہی جاؤں گا۔ میرے خیال میں اب تم ٹھیک ہو۔ ڈاکٹر نے تمہیں ویسے ہی رکھا ہوا تا کہ پوری تسلی ہوجائے۔'' میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''میں بھی جانتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''وہ سب کون لوگ تھے؟'' میں نے پوچھا تو اس کا چہرہ ایک بار دھواں سا ہوگیا۔

''یہ ایک لمبی کہانی ہے، بعد میں سناؤں گا۔'' اس نے ہولے سے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ اس کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ کوئی انتہائی تکلیف دہ تجربہ رہا ہوگا۔ میں نے مزید نہ پوچھا تو وہ سامنے والے کمرے میں دیکھتے ہوئے اشارہ کرتے ہوئے بولا ''وہ سامنے کمرے میں دیکھا، کون ہے؟''

''نہیں، کون ہے؟'' میں نے تجسس سے پوچھا تو وہ میرے قریب ہوکر دھیمے سے لہجے میں بولا۔

''وہی راجھستانی، جسے تم نے گولی ماری تھی۔ اس رات جو میرن شاہ کے گھر پر حملہ کرنے آئے تھے۔''

ایک دم سے میرے اندر سنسنی پھیل گئی۔ تبھی میں نے حیرت سے پوچھا

''یہ ابھی تک یہیں پڑا ہے؟''

''اور کہاں جائے، اس کے سگے اسے لے کر نہیں جاتے اور میرن شاہ اس پر کوئی سمجھوتا کرنا چاہتا ہے، بس اسی لیے پڑا ہے۔'' اس نے دھیمے سے بتایا تو مجھے نجانے کیوں اس بے چارے سے ہمدردی ہونے لگی۔ کتنے ظالم ہیں لوگ، جب تک وہ کام کا تھا، سو اس سے کام لیا جاتا رہا اب اسے یونہی لاوارث چھوڑ دیا، اور اب اس پر سودے بازی، کیا ہے یار یہ زندگی بھی۔ میں یونہی اوٹ پٹانگ سوچنے لگا تھا۔ میں اسی کمرے کی جانب دیکھ رہا تھا اچانک میں اٹھا اور اس کمرے میں چلا گیا۔

وہاں بستی چراغ شاہ ہی کے دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ میرن شاہ کے بندے تھے۔ وہ اس کی دیکھ بھال کے لیے نہیں بلکہ اس کا پہرا دے رہے تھے۔ ان سب نے میرے طرف دیکھا۔ وہ راجھستانی بھی آنکھیں کھولے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اجنبیت تھی۔ جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ اسے میری پہچان نہیں تھی۔ میں قریب جا کر کھڑا ہوگیا۔ وہ میری جانب دیکھنے لگا۔ میں نے چند لمحے اس کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔

''مجھے پہچانتے ہو؟''

''کوون او تم؟'' اس نے ماتھے پر تیوریاں چڑھا کے پوچھا۔

''وہی جس کی گولی سے تم زخمی ہوکر یہاں پڑے ہو۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''ہو تو مہارے دشمن ...... پر ہو جی دار ...... اک اکیلا بندہ اور تین بندوں کو گرا دیا۔''

میں نے اس کے پاس بیٹھے لوگوں سے کہا۔ ''جاؤ یار، زمان موہل کے پاس بیٹھو، اس کا دھیان کرو۔ میں یہاں بیٹھا ہوں کچھ دیر۔ ڈاکٹر آئے تو مجھے بتانا۔''

وہ اٹھ کر چلے گئے تو میں نے اس راجھستانی سے پوچھا۔

''سنا ہے تیرے لوگ تجھے لینے ہی نہیں آئے؟''

''آویں گے بھی نائیں۔ منّے تو اب اِدھر ای مرنا اے۔'' اس نے کہا تو میں مسکرا دیا۔

''مرنا تو ہے سب کو...... تم نے کون سا انوکھا کام کرنا ہے۔ پر ایسے تو نہیں کرنا چاہیے نا۔ تم ان کے ساتھی تھے۔ ان ......''

''چھوڑ بھائیا...... میں اب کے کام کا نئیں رہا۔ زخم لگ گیا، گھر بیٹھوں گا، کوئی کام تو کر نہ سکوں گا اب۔ انہیں کیا۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔

''میرن شاہ بھی نہیں جانے دیتا کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، اس نے منّے نہیں روکا۔ کہوت ہے جب چاہوں چلا جاؤں، اب ٹھیک تو ہولوں۔'' اس نے کہا اور ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

''یار بات یہ ہے، مجھے بھی تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں تھی، یہ تو اچانک تم لوگوں نے حملہ کیا تو میں......''

''تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی ایسیوں ای کرتا۔ بس ہوگیا اب، میں جانوں، منّے پتا چل گیا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''پر مجھے ہی کیا میرن شاہ کو بھی نہیں پتا کہ تمہاری اور اس کی دشمنی کیا ہے۔ وہ بھی حیران ہے کہ بندے اس نے نہیں

مارے۔'' میں نے کہا تو اس نے میری بات سن کر تحمل سے کہا۔

''تئنے پھر اصل بات کا پتا کوئی نہی۔ او بھائی، میرن شاہ نے نہیں، اس کی بہان نے مارے ہیں بندیے۔''

یہ میرے لیے اب حیرت کی بات نہیں تھی۔ میں بہت حد تک سمجھ گیا تھا کہ پیروزاں کیا ''شے'' ہے۔ اب تو صرف یہ اندازہ کرنا تھا کہ وہ کس حد تک شے ہے لیکن میں خود سے کوئی بھی اظہار نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے صرف دیکھنا تھا کہ حالات کیا رنگ دکھاتے ہیں۔

''واقعی، اس نے کیوں مارے......؟'' میں نے انتہائی حیرت سے یوں ظاہر کیا جیسے یہ میرے لیے بہت حیرت انگیز خبر ہو، میری اس رنگ بازی کا اس راجھستانی پر اثر ہوا، اس نے بھی حیرت سے میری جانب دیکھتے ہوئے ہولے سے کہا۔

''تئنے پتا کوئی نہی......؟''

''یار، تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے میں میرن شاہ کا ساتھی ہوں۔'' میں نے انتہائی سنجیدہ لہجے میں کہا تو وہ اسی حیرت سے بولا۔

''تو پھر کوون اے تُو......؟''

''یار میں گورنمنٹ ملازم ہوں، یہاں سروے کے لیے چند دن پہلے آیا ہوں۔ میری تو گاڑی بھی تم لوگوں نے تباہ کر دی۔ میں تو کہیں کا نہیں رہا۔'' میں نے اپنی کتھا دردناک انداز میں سنائی تو اس نے یوں سر ہلایا جیسے میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہو۔ وہ اپنے تئیں سوچتا رہا پھر بولا۔

''تبھی کہوں، ہمیں پتا کیوں نہیں چلا۔ مہارے حساب سے تو ڈیرے پر کوئی نہی ہونا چاہیے تھا۔ پر تُو تھا۔ یہیں سے مار کھا گئے۔''

''اب جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔ میں نے تو خود کو بچا یا لیکن میری گاڑی تباہ ہو گئی، اس کا بھی محکمے کو حساب دینا ہے۔ خیر بھائی، میری طرف سے اپنا دل صاف کر لے۔ سب کچھ غلط فہمی اور انجانے میں ہوا۔'' میں نے بے چارگی سے کہا تو اس نے میری طرف دیکھا پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''ہاں ہے تو ایسا ہی، خیر......اب کیا ہو سکتا ہے؟''

''مجھے بتا میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں، اسے چاہے جرمانہ سمجھو، ہمدردی سمجھو، یا جو بھی، میں جو انجانے میں......'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں، مجھے کوئی گلہ نہیں۔''

''ٹھیک ہے میں پھر چلتا ہوں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو اس نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ میں نے جو اس راجھستانی کے دماغ میں ڈالنا چاہا تھا، پتا نہیں وہ اس کے دماغ میں گھسا بھی تھا یا اس کا اُلٹ اثر ہوا تھا۔ میں اگر اس غلط بیانی کر سکتا تھا تو وہ بھی ایسا کر سکتا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے میں زمان کے پاس آیا تو ڈاکٹر اس کے پاس کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔

''اب آپ اسے گھر لے جا سکتے ہیں۔ بس یہ دوائیں دیں اور اسے آرام کرنے دیں۔''

گویا اس نے ڈسچارج کر دیا تھا۔ میں نے زمان کو ساتھ لیا اور اس کے گھر تک چھوڑ دیا۔ ہمارے ساتھ بستی کے دو لوگ بھی آئے تھے۔ رات گہری ہو رہی تھی جب میں اکیلا ڈیرے پر واپس آیا۔ میں بہت تھک چکا تھا اس لیے چارپائی پر لیٹا تو مجھے اردگرد کی خبر نہ رہی۔

آنکھ کھلی تو ابھی اندھیرا تھا۔ میں اپنی آنکھ کھلنے کی وجہ جاننے کی کوشش میں تھا۔ تبھی مجھے احساس ہوا کہ میری آنکھ بھوک کی وجہ سے کھلی ہے۔ بھوک کے باعث پیٹ میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ مجھے اب صبح ہو جانے تک صبر کرنا تھا۔ میں ڈیرے کے صحن میں اکیلا ہی پڑا ہوا تھا۔ میں نے سوچا، اٹھ کر پانی پی لوں، شاید اس سے بھوک کا مداوا ہو جائے۔ میں چارپائی سے اٹھا اور کمرے تک گیا۔ باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ پھلوں کی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ میں ٹھٹک گیا۔ میں نے ٹارچ روشن کی تو سامنے چارپائی پر ایک ٹرے میں پھل رکھے ہوئے تھے۔

پھلوں کو دیکھ کر یقین سے کہا جا سکتا تھا کہ کوئی تو ہے جسے میری بھوک کا خیال تھا۔ میں رات دیر سے آیا، بنا کچھ کھائے پیے سو گیا۔ اب میرا مہربان ساوری ہو سکتی تھی یا پھر پیروزاں، ان کے علاوہ کون ہو سکتا تھا۔ ان پھلوں کو دیکھ کر یہ بھی یقین تھا کہ وہ میری آمد کے بارے میں جانتی تھی، وہ یہاں آئی بھی اور ٹرے رکھ کر چلی گئی اور میں غافل پڑا تھا۔ اس دوران اگر کچھ ہو جاتا؟ ایک گولی میری زندگی چاٹ سکتی تھی؟ میں خود پر لعنت ملامت کرنے لگا۔ اگر کچھ ہوتا تو میری غفلت کی وجہ سے ہوتا ورنہ دشمن کا مقابلہ کرنے کی سکت تو مجھ میں تھی۔ یہی سوچ کر جیسے میری بھوک ہی اُڑ گئی ہو۔ میں نے ٹرے کی جانب دیکھا بھی نہیں اور پلٹ کر باہر جانے لگا تو دروازے میں ایک ہیولا نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اندر آ گئی۔ میرے سامنے ساوری کھڑی تھی۔

اس کا سانس پھولا ہوا تھا، جسے قابو میں رکھنے کے لیے اس نے اپنا ہاتھ سینے پر رکھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چند لمحوں بعد اس نے ٹارچ بند کر دینے کا اشارہ کیا۔ میں نے ٹارچ بند کر دی۔ تبھی وہ تھرتھراتے ہوئے لہجے میں.... آہستہ سے بولی۔

''ساری رات...... تری...... رکھوالی...... کرتی...... رہی ہوں۔''

''خیر تھی، کیا ہوا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''میں نہیں چاہتی...... کہ وہ ڈائن...... تیرے پاس آئے۔'' اس نے پھولی ہوئی سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''اچھا سکون کر اور پھر مجھے بتا۔'' میں نے آہستہ سے کہا تو وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ چند منٹ بعد اس نے کہا۔

''جب تم آئے تو وہ تیرے پاس آنا چاہ رہی تھی مگر میں نے بہانے سے روک دیا۔ کہا کھانا دے آؤں پھر چلی جانا۔ مگر تم سو رہے تھے۔ وہ تھوڑی دیر انتظار کرتی رہی پھر سو گئی اور میں جاگتی رہی۔ اب تمہیں دیکھا تو آ گئی۔'' اس نے تیزی سے اپنی بات ختم کی۔

''وہ کیوں ملنا چاہتی تھی اور......''

''ڈائن کیوں ملنا چاہتی ہے......'' اس نے نفرت سے کہا پھر اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر جب باہر نکالا تو اس میں نوٹوں کی ایک گڈی تھی، وہ میری جانب بڑھا کر بولی،

''یہ لو، اسی بہانے آنا تھا اس نے۔''

''اس کا کیا کروں؟'' میں نے پوچھا۔

''اسے اپنے پاس رکھو، جتنی جلدی ہو سکتا ہے یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ تم ایسی دلدل میں پھنسو گے کہ پھر موت ہی تمہارا مقدر ہو گی۔'' اس نے کچھ ایسے کہا کہ مجھے ایک دم سے اس پر پیار آ گیا۔ میں نے اسے دونوں کاندھوں سے پکڑا اور اپنے قریب کر کے کان کے قریب سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا۔

''ساوری، سچ بتا، کیا تم بھی ایسا ہی چاہتی ہو؟''

اس کا بدن ایک دم سے ڈھیلا پڑ گیا۔ یوں جیسے کوئی سخت شے موم ہو گئی ہو۔ میں نے جان بوجھ کر ایک ہلکا سا فاصلہ رکھا تھا، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا وہ یہ فاصلہ خود ختم کرتی ہے یا نہیں۔ مجھے زعم تھا کہ میرے ہاتھوں کا لمس اگر اسے موم کر سکتا ہے تو فاصلہ مٹانے پر بھی مجبور کر دے گا۔ اگلے چند لمحوں میں وہی ہوا۔ وہ میرے سینے سے لگ گئی۔ میں نے اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا۔ وہ میرے ساتھ لپٹی ہوئی ہولے ہولے کانپ رہی تھی پھر ایک دم سے جدا ہو کر کانپتی ہوئی آواز میں دھیرے سے بولی۔

''میں نہیں چاہتی کہ تم جاؤ، پر یہ لوگ تمہیں چھوڑیں گے نہیں؟''

''کیوں، ایسا کیوں ساوری؟'' میں نے اپنا حصار مضبوط کرتے ہوئے پوچھا تو وہ ہولے سے بولی۔

''پیروزاں تمہیں اپنے دشمنوں کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے۔ وہ خود تم سے جی بھرے گی اور پھر دشمنوں کے آگے ڈال دے گی، بس تم بچ کے رہنا۔''

''لیکن میں نہیں جاؤں گا۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''کیوں؟'' وہ تڑپ کر بولی، اس کا بدن ایک بار پھر تن گیا۔

''اس لیے کہ تم ہو یہاں، جب تک تم ہو، مجھے کچھ نہیں ہو سکتا۔'' میں نے کہا تو وہ ڈھیلی پڑتے ہوئے بولی۔

''یہ تو میں بھی چاہتی ہوں، پر......''

''کچھ مت کہو، بس حالات دیکھو۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ میرے سامنے تھا۔ میں نے اپنے لبوں سے خاموشی کی مہر ثبت کر دی۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ اچانک وہ مچھلی کے مانند تڑپی اور میرے حصار سے نکل گئی۔ مجھے پتا اس وقت چلا جب وہ دروازے میں تھی۔

''اے ساوری بات سن......'' میں نے کہا۔

''نہیں، تم وہ نوٹ اٹھا لو، پیروزاں نے دیے ہیں۔ کچھ کھا لینا۔ میں جاتی ہوں۔'' یہ کہتے ہی وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا، وہ اندھیرے میں تحلیل ہو گئی تھی۔ میں واپس چارپائی پر بیٹھ گیا۔

میری بھوک اُڑ گئی تھی۔ ساوری کا لمس ابھی تک میرے ساتھ لپٹا ہوا تھا مگر نجانے کیوں اِک اجنبی احساس بھی میرے اردگرد پھیلا ہوا تھا۔ وہ چہرہ جسے میں بس محسوس کر سکتا تھا، جس کے خدوخال میرے ذہن کی سطح پر ابھرتے لیکن مجھے یاد نہیں آتا کہ... وہ کون تھی؟ میں انہی کیفیات میں الجھا ہوا اکیلا صحن میں بیٹھا رہا۔

☆☆☆

دن اچھا خاصا چڑھ آیا تھا۔ روشن دھوپ میں ہر شے نکھری ہوئی تھی۔ میرے سامنے کی چارپائی پر میرن شاہ بیٹھا ہوا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے آیا تھا اور علیک سلیک کے بعد یونہی خاموش بیٹھ گیا تھا۔ میں بھی اس کے سامنے خاموش بیٹھا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خود ہی

کہے جو کہنا چاہتا تھا۔ کیونکہ بنا مطلب کے وہ یہاں آکر بیٹھنے والا نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔

''تم کل اس راجھستانی سے ملے تھے۔ کوئی مشورہ دو کیا کریں اس کا؟''

''یہ تو سائیں تم جانو اور وہ راجھستانی جانے، میرا کیا لینا دینا اُس سے۔'' میں نے صاف جواب دے دیا۔

''یار کچھ تو کہو، میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ میں کیا کروں اُس کا۔'' وہ اُلجھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''سائیں میں پھر کہوں گا تم جانو اور وہ، مجھے تو اب اجازت دو.... میں اب یہاں نہیں رہنے والا۔'' میں نے اپنے لہجے کو خوف زدہ بناتے ہوئے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر حیرت سے کہا۔

''ارے کہاں جانا ہے تم کو، اِدھر رہو، اپنا کام کرو اور......''

''او نہ سائیں، یہاں تو ایسے ہی قتل و غارت شروع ہے۔ کل اگر وہ لوگ زیادہ ہوتے یا ایسی کوئی چوٹ لگ جاتی تو مجھے کون پوچھتا۔ زمان کی اپنی لڑائی اور مارا میں جاتا۔ اسی طرح تم لوگوں کی اپنی لڑائی ہے اور مارا میں جاؤں۔ میں ایک معمولی سا سرکاری ملازم......''

''یار تم اتنے بزدل ہو، یا پھر یہاں سے بھاگنے کا بہانہ بنا رہے ہو؟'' اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم کچھ بھی سمجھ لو، میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے، اور نہ ہی اس لڑائی کا مجھے کوئی فائدہ ہے۔ میں بس رپورٹ بنا کر دے دوں گا۔ پھر تمہارا ایم پی اے جانے اور محکمہ جانے۔'' میں نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا تو چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر سرد سے لہجے میں بولا۔

''اب تم چاہو بھی تو یہاں سے نہیں جا سکتے۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟'' میں نے دانستہ خوف زدہ.... ہوتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھو، تم اب یہاں کے معاملات جان چکے ہو۔ یہ بات تمہیں اب سمجھ آجانی چاہیے۔ میں جانتا ہوں، تم بہادر ہو، دلیر ہو لڑنا جانتے ہو۔ اس لیے میرے ساتھ رہو۔ کھاؤ، کماؤ، عیش کرو۔ باقی میں جانوں اور تمہارا محکمہ جانے۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔''

''اگر اپنی حفاظت کو آپ لڑنا جھگڑنا کہتے ہو تو......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''چھوڑو یار اس قصے کو، اس راجھستانی کے بارے میں بتاؤ۔ کیا اُسے چھوڑ دیں یا رکھیں یا پھر مار دیں؟''

یہ بات اس نے یوں پوچھی تھی جیسے کسی فضول اور بے کار شے کے بارے میں بات کہی جاتی ہے۔ وہ راجھستانی اس کے لیے جیسے کوئی بے کار اور فضول شے تھی۔ میں نے چند لمحے اس کی طرف دیکھا پھر بولا۔

''اسے جانے دو۔ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ وہ اب لڑنے کے قابل تو نہیں رہا لیکن تمہارے اچھے رویّے کا احسان مند ضرور ہو جائے گا۔''

''نہیں یہ ناممکن ہے، وہ اسے بزدلی سمجھیں گے۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا تو میں ہنس دیا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

''یہ تمہاری بھول ہے سائیں میرن شاہ، ہر فیصلہ تلوار سے نہیں ہوتا۔''

''میں تو اسے چھوڑ دوں لیکن اسے قبول کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ نہ اسے کوئی لینے آتا ہے اور نہ ہی اب اس کا کوئی دعویدار ہے، جس سے بات کی جا سکے۔ اسپتال سے لا کر اسے رکھیں کہاں، یہ بھی مسئلہ ہے، اس پر اعتبار بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔'' میرن شاہ نے یوں کہا جیسے وہ اس راجھستانی کی وجہ سے بہت پریشان ہو۔

''اور تم اسے مار دیتے ہو تو وہ قتل بھی تمہارے کھاتے میں پڑ جائیں گے جو تم نے نہیں کیے، ایسے ہی ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل ایسے ہے۔'' اس نے میری بات کی تائید کی۔

''مجھے شام تک کا وقت دو، میں کرتا ہوں کچھ۔'' میں نے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا جیسے اس کے سر سے بوجھ اتر گیا ہو۔ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

''جو بھی کرو، یہ مسئلہ ختم کرو۔''

''ہو جائے گا۔'' میں نے کہا تو اس نے اپنے کُرتے کو تھوڑا اوپر اٹھایا اور جدید ماڈل کا پسٹل میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اب یہ مت کہنا کہ یہ ہتھیار تمہیں چلانا نہیں آتا۔ اسے اپنے پاس رکھو، حفاظت کے لیے اچھا ہوتا ہے۔''

میں نے پسٹل پکڑ لیا پھر اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ ہوتی ہے شام کو بات۔''

میری بات سن کر وہ چند لمحے بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر چل دیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میرن شاہ کیوں اُلجھن کا شکار تھا۔ اسے دشمنوں کی نہیں، گھر کے اندر سے پریشانی تھی۔ لیکن میں خوش تھا، میں چاہتا تھا کہ وہ مزید پریشان ہو.... میں اپنی

کامیابی پر خوش تھا۔
بابا خیر دین مجھے ناشتا کروا چکا تو میں گاڑی لے کر نکل پڑا۔ میں سیدھا زمان کے گھر جا پہنچا۔ وہ اپنے گھر سے ذرا فاصلے پر ایک گوپے میں موجود تھا۔ وہ ایک رنگین پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے پاس پیڑھوں پر چند لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شاید وہ مقامی تھے، مجھے دیکھتے ہی اٹھ گئے۔
میں نے پیڑھے پر بیٹھتے ہوئے اس کا حال احوال پوچھا، پھر کچھ دیر باتیں کرتے رہنے کے بعد وہی سوال کر دیا، جو تھوڑی دیر پہلے میرن شاہ نے مجھ سے کیا تھا کہ اس راجھستانی کا کیا کرنا ہے؟
''یار وہ لنگڑا گھوڑا ہے، میرن شاہ کو چاہیے تھا کہ اب تک مار کر پرے کرتا، لیکن وہ اسے نہیں مار سکتا۔'' زمان نے خود ہی فیصلہ دیا اور خود ہی انکار کر دیا تو میں نے تحمل سے پوچھا۔
''تم اس کے ساتھی لوگوں کو جانتے ہو، ان تک کوئی رسائی رکھتے ہو؟''
''ہاں، میں جانتا ہوں، اُن سے بات بھی ہوسکتی ہے لیکن یہ دشمنی ہے پیروزاں کی، ایک بار اس سے ضرور پوچھنا ہوگا، ورنہ وہ دشمن بن جائے گی۔'' زمان کے لہجے میں خوف جھلک رہا تھا۔
''کیا ہے دشمنی، کچھ تو پتا چلے؟'' میں نے اکتائے ہوئے انداز میں پوچھا تو وہ میری طرف دیکھتا رہا پھر ہولے سے بولا۔
''دیکھ، یہ جو صحرا ہے نا، یہ بڑا ظالم ہے، اس میں رہنے والے بھی ویسے ہی ظالم ہیں، یہ انسانوں کو انسان ہی نہیں سمجھتے جس طرح یہاں کا سانپ بڑا زہریلا ہے، ایسے ہی ہم بھی بڑے زہریلے ہیں۔ وقت نے ہمیں مزید ظالم ہی نہیں بھیانک کر دیا ہے ــــ نشے سے لے کر انسان تک اسمگل کیے جاتے ہیں۔ یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک حاکمیت نہ ہو۔ میرن شاہ کی اپنی حاکمیت ہے اور پیروزاں کی اپنی۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے وہ میرن شاہ کو نہیں مانتی لیکن جب مفاد ہوگا، کاروبار ہوگا، کسی سے دشمنی ہوگی تو بہن بھائی بن جاتے ہیں۔ اسی لیے اب تک بچے ہوئے ہیں۔''
''میں جانتا ہوں تم مجھے وہ بات بتا ہی نہیں سکو گے جو اصل بات ہے۔ خیر، کوشش نہ کرو، تم مجھے اس راجھستانی کے وارثوں سے ملوا دو، آگے میں جانوں میرا کام۔'' اس کی مجبوری سمجھتے ہوئے وہ بات کی جو میں چاہ رہا تھا۔

''تو پھر پیروزاں ......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے تیزی سے کہا۔
''وہ جانے اور میں۔''
''اوکے۔'' یہ کہہ کر اُس نے اپنے سرہانے پڑے ہوئے سیل فون کو اٹھایا اور نمبر تلاش کرتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہاری بات کروا دیتا ہوں۔ تم جانو اور تمہارا کام۔''
کچھ دیر بعد کال مل گئی تو اس نے کہا۔
''او بھائیا، میرا ایک دوست تم سے بات کرنا چاہتا ہے، غور سے بات سننا، بڑا ذمے دار بندہ ہے۔'' یہ کہا اور فون میری جانب بڑھا دیا۔
''ہاں بھائیا، کیا کہوت ہے؟'' دوسری طرف سے کہا گیا۔
''تمہارا جو بھائی بندہ اسپتال میں پڑا ہے، اسے واپس کیوں نہیں لے جاتے تم لوگ؟'' میں نے کہا تو جیسے وہ پھٹ پڑا۔ اس نے میرن شاہ کے خاندان کو گالیاں دیتے ہوئے کہا۔
''وہ ہی نہیں آن دیتے۔ اب تک یہی کہوت ہیں کہ اپنے لوگاں کا کھون مافھ کر دیوں ان کو...... تو بھیج دیں گے۔ ہمارا بندہ مر جائے پردا نہیں، پہلے دو مر گئے، ہم سمجھیں گے تیجا بھی مر گیا۔ پر اس خاندان کو بخشیں گے نا ئیں اِب کے۔''
''دیکھو تمہیں مجھ پر یقین ہو یا نہ ہو، لیکن میں تمہیں پورے یقین سے کہتا ہوں، تم لوگ اپنا بندہ لے جاؤ۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔
''پاگل سمجھا ہے کیا؟ ایک بندے کی خاطر اور بندے مروالیں۔ پھر کچھ لیے دیے بغیر، کسی بات کے بغیر یوں کیسے چھوڑ دیں گے وہ؟'' دوسری طرف سے کہا گیا تو میں نے کہا۔
''چل بتا، جہاں کہو میں وہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ جہاں کہو، وہاں لے آتا ہوں اُسے۔ کیوں چھوڑ رہا ہوں، یہ وہیں آ کر بتا دوں گا۔'' میں نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا تو دوسری جانب سناٹا چھا گیا پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔
''بتاتا ہوں ابھی۔''
یہ کہتے ہی اس نے لائن کاٹ دی۔ میں نے فون زمان کی جانب بڑھایا تو وہ ہونق بنا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔
''تم پاگل ہو، تم نے اُن کے بندے مارے ہیں۔ وہ تمہیں واپس آنے دیں گے...... کیا تم خودکشی کرنے جاؤ

گے۔ میں نہیں جانے دوں گا تمہیں۔'' اس نے آخری لفظ بہت شدت سے کہے تھے۔

زمان کا خوف بے جا نہیں تھا۔ میں نہ صرف سمجھتا تھا بلکہ اچھی طرح جانتا بھی تھا۔ میں وہاں اگر جاتا ہوں تو موت کا سامنا کرنے جانے والا ہوں۔ میں جو سوچ کر یہاں آیا تھا کہ حالات کو اپنی دسترس میں کرنے کے لیے مجھے کچھ وقت لگے گا۔ میں اس کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا لیکن میری سوچیں اپنی جگہ دھری رہ گئی تھیں۔ حالات اس قدر تبدیل ہونے لگے تھے کہ مجھے ان حالات کے ساتھ چلنا نہیں دوڑنا تھا۔ میں اپنی سوچوں سے نکلا اور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''دیکھو وہ لوگ خوف زدہ ہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جو خوف زدہ ہوتا ہے، وہ زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ لیکن ......! جس طرح ہم ان پر اعتبار نہیں کر رہے ہیں، اسی طرح انہیں بھی ہم پر یقین نہیں ہوگا۔ وہ کوئی راستہ نکالیں گے۔''

''کیسا راستہ؟'' اس نے سرسراتے ہوئے پوچھا۔

''فون آنے دے پھر بات کرتے ہیں۔'' میں نے سکون سے کہا تو وہ میرے چہرے کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیں تھی۔ جسے میں مسلسل نظر انداز کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد سیل فون بج اٹھا۔ اس نے اسپیکر کھول کر فون میرے سامنے کر دیا۔ تبھی دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

''او بھائیا زمان، تو بتا، وہ بندہ کون ہے جس نے ابھی بات کی تھی؟''

''تجھے کیا کہنا ہے، تجھے اپنے مقصد......'' اس نے کہنا چاہا تو دوسری جانب سے بات کاٹتے ہوئے پوچھا گیا۔

''بندہ بتا، پھر بات کرتے ہیں نا۔''

تبھی میں نے فون اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ''میں وہی ہوں جس کے ہاتھوں تمہارے دونوں بندے قتل ہو گئے ہیں اور تیسرا زخمی ہے جس کو لے جانے کی بات کر رہا ہوں۔''

''تم وہ ہو......'' یہ کہہ کر دوسری جانب چند لمحے خاموشی رہی پھر وہ دبے دبے غصے میں بولا، ''تو پاگل ہے، تیری کیا حیثیت ہے کہ تو......''

''دیکھ، میں زخمی اور بے بس پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ میں اسے کیوں واپس بھیجنا چاہتا ہوں، وہیں آرہا ہوں نا، مجھ سے پوچھ لینا۔''

''اتنا جگرا ہے تم میں؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''جگہ بتا آرہا ہوں۔ تم لوگوں میں ہمت نہیں ہے تو میں دکھا دیتا ہوں جگرا۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تو دوسری جانب سے کہا گیا۔

''چل پھر ڈیرے پر آجا۔ ہم تیرا وہیں انتظار کرتے ہیں۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے زمان کو فون واپس کیا تو وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔

''علی، یار وہ تمہیں مار دیں گے۔ کیوں پاگل پن کر رہے ہو۔ تم نے اُن کے دو بندے مارے ہیں یار، یہ بات کیوں نہیں سمجھتے ہو تم؟''

''میں قتل ہو جاؤں گا نا، کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا اور اٹھ گیا تو اس نے پوچھا۔

''رتو بھوہڑ کا ڈیرا کدھر ہے اس بارے میں تمہیں پتا ہے؟''

''نہیں، لیکن میں پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے کہا اور چل دیا۔

میں سیدھا اسپتال گیا جہاں وہ راجستھانی اسی بیڈ پر پڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا تو اس نے بھی پھیکی سی مسکان کے ساتھ میرا ہاتھ تھام لیا۔

''چل آ، تجھے چھوڑ دوں۔''

''تم، وہ میرن شاہ ......وہ پیروزاں ......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا تو میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''اگر جانا ہے تو وقت ضائع نہ کرو، خاموشی سے میرے ساتھ چل دو۔ راستے میں ساری بات بتا دوں گا۔''

''جانا تو ہے۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

''تو چل پھر، اٹھ اور خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ جا۔'' میں نے جان بوجھ کر ہولے سے کہا تو وہ بیڈ سے اتر گیا۔ اس نے جوتے پہنے اور ہولے ہولے چلتا ہوا گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا اور پھر گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''یہ رتو بھوہڑ کا ڈیرا کدھر ہے؟''

یہ سنتے ہی اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے ایک جانب انگلی سے اشارہ کر دیا۔

دوپہر ہو رہی تھی جب میں رتو بھوہڑ کے ڈیرے کے قریب پہنچا۔ ہم راستے بھر باتیں کرتے آئے تھے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں جو چاہتا تھا، اس کی سمجھ میں آگیا تھا یا نہیں۔

''وہ سامنے ہے رتو بھوہڑ کا ڈیرا۔'' اس نے دبے دبے جوش سے کہا۔ سامنے ایک بڑا سا تالاب تھا۔ جس کے ایک

جانب کھجوروں کے درخت کا جھنڈ تھا۔ اس کے عقب میں کچی دیوار دکھائی دے رہی تھی جو کافی اونچی تھی۔ درمیان میں کچے کمروں میں منڈھیریں دکھائی دے رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے۔ بتاؤ، یہیں چھوڑ دوں یا آگے ......''
میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولا۔

''نہیں ڈیرے تک چلو۔''

میں نے کچے راستے پر گاڑی کی رفتار کچھ تیز کر دی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک بڑے سے لکڑی کے سیاہ پھاٹک کے سامنے گاڑی روک دی۔ سامنے برآمدے میں کافی لوگ چارپائیوں، پیڑھوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں شاید تین ایسے آدمی تھے جو اپنے حلیے سے راجھستانی لگ رہے تھے۔ اس کے علاوہ دو چار ایسے تھے جو شاید مقامی تھے۔ میں نے گاڑی صحن میں کھڑی کی اور اسے اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ اتر کر آگے بڑھ گیا۔ میں بھی اترا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔

جیسے ہی ہم برآمدے کے قریب پہنچے تو ایک... جوشیلا راجھستانی آگے بڑھا تو دوسرے نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ میں اس کے جذبات دیکھ رہا تھا۔ میں نے لمحوں میں ساری صورتِ حال کا اندازہ لگا لیا تھا۔ تبھی ایک ادھیڑ عمر شخص اٹھا جس نے سفید دھوتی اور کرتہ پہنا ہوا تھا۔ اس کے لمبے لمبے کھچڑی جیسے بال تھے۔ چہرے پر ہلکی ہلکی گھنی داڑھی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آؤ جوان، میں ہوں رتو بھوہڑ۔''

میں نے اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے خوشی ہوئی تم سے مل کر۔''

''آؤ بیٹھو۔'' اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں ایک چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''داد دیتا ہوں میں تمہارے حوصلے کی، لیکن تم کیا سمجھ کر یہاں آ گئے ہو؟ میں اسے دلیری سمجھوں یا تمہارا پاگل پن؟''

''رتو بھوہڑ، ایسا کچھ نہیں ہے۔ میرن شاہ میرا سگا نہیں ہے اور نہ یہ راجھستانی میرے دشمن ہیں۔ انجانے میں ہی سہی لیکن انہوں نے مجھے مارنا چاہا اور میں نے اپنی جان بچائی۔ میں خود چل کر یہاں آ گیا ہوں۔ آگے تم لوگوں کا فیصلہ، جو چاہو کرو۔'' میں نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات کہہ دی۔ رتو بھوہڑ.... سوچ میں پڑ گیا۔

''ہاں یہ تو میں جانتا ہوں، تم شہر سے یہاں آئے ہو اور سرکاری ملازم ہو۔ تم یہاں تک آ گئے، یہی تمہاری معافی کے لیے کافی ہے۔''

''نہیں رتو بھوہڑ جی، میں معافی مانگنے نہیں آیا اور نہ ہی یہ احسان لینے آیا ہوں کہ تم مجھے معاف کر دو۔ جو حقیقت تھی، وہ میں نے کہہ دی۔ اس میں میری کوئی غلطی نہیں ہے۔ غلطی ہو، قصور ہو، جرم ہو تو معافی ہوتی ہے۔'' میں نے بڑے تحمل سے رتو بھوہڑ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تو پھر ایسا کرو، کھاؤ پیو اور واپس چلے جاؤ۔ ہم ابھی تمہیں نہیں ماریں گے۔ تمہیں میرن شاہ کے ہی علاقے میں ماریں گے۔ یہاں سے چلے بھی جاؤ تو جہاں ہو گے وہیں تلاش کر کے ماریں گے۔ یہ رتو بھوہڑ کا وعدہ ہے۔'' اس نے دبے دبے غصے میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''رتو بھوہڑ جی مجھے تمہاری دشمنی قبول ہے۔'' میں نے کہا اور اٹھ گیا۔

''نہیں، مارو اس کو۔'' وہی جوشیلا نوجوان اٹھ کر چیخا۔

''نہیں بگا، ابھی نہیں میں نے کہہ دیا، یہاں نہیں ماریں گے۔'' رتو بھوہڑ نے تحمل سے کہا۔

''نہیں ماروں گا یہاں، یہاں سے لے جا کر بارڈر پار ماروں گا۔'' اس نے دہاڑتے ہوئے کہا۔

''میں نے زبان دے دی ہے۔ اگر تیرا خون اتنا ہی گرم ہے، تو اس کے علاقے میں جا کر مار۔ میں تیرے ساتھ ہوں گا۔'' رتو بھوہڑ نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں انتظار کروں گا۔'' میں نے کہا اور گاڑی کی جانب چل دیا۔ میں حد درجے چوکنا تھا۔ اپنے پیچھے ہونے والی ذرا سی آہٹ پر بھی میرے کان لگے ہوئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ میرے پیچھے سے وار ہو سکتا ہے لیکن یقین نہیں تھا۔ میں بڑے محتاط انداز میں چلتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور ڈیرے سے نکلتا چلا گیا۔ کچے راستے پر رفتار تیز کرتے ہوئے میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ یعنی حالات کے ساتھ دوڑتا ہوا تھوڑا آگے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

میں گاڑی سمیت ڈیرے میں داخل ہوا تو بابا خیر دین مجھے دیکھ کر یوں کھڑا ہو گیا جیسے میرا یوں آنا کوئی انہونی ہو۔ میں نے گاڑی بند کی اور اتر کر اس کے پاس آ گیا۔ وہ مجھے مسلسل گھور رہا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو بابا؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں، بس یہی ...... کہ شام ہونے کو ہے...... کھانا کھا لو...... ابھی گرم گرم مل جائے گا۔'' وہ اٹکتے ہوئے

جذباتی لہجے میں بولا۔
''ہاں لے آؤ، سورج بھی ڈھلنے والا ہے۔'' میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔
''ہاں لیکن تم ذرا دھیان سے رہا کرو۔ اکیلے ہوتے ہو یہاں۔ مجھے آج کل جانا پڑتا ہے بی بی سئین کے کہنے پر۔ ورنہ میں جاگتا رہتا ہوں۔'' اس نے اپنا خدشہ ظاہر کیا تو میں نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔
''خیر ہے بابا، بس کھانا لے آؤ۔ پھر باتیں کریں گے۔''
اس نے ایک بار میری جانب دیکھا اور پھر رہائش کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ بابا خیر دین خود بھی نہیں جاتا، پیروزاں جان بوجھ کرا سے بھیجتی تھی۔ اب جو بابا نے جانے کا عندیہ دیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ آج بھی وہ ضرور آئے گی، اس کا مجھے یقین تھا لیکن میں چاہتا تھا کہ سا وری میرے پاس آئے۔ میں اس کے ساتھ بہت سارا وقت گزارنا چاہتا تھا۔ میں اس کے ساتھ بہت ساری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ بابا خیر دین کھانا لے آیا۔ میں نے سیر ہو کر کھایا اور چارپائی پر لیٹتے ہوئے بولا۔
''بابا، تمہیں جہاں جانا ہے، میں تمہیں وہاں چھوڑ دوں گا، مجھے زمان موہل کی طرف جانا ہے۔''
''ٹھیک ہے پُتر، میں برتن دے کر آتا ہوں۔'' اس نے کہا اور برتن سمیٹنے لگا۔ میرے دماغ میں کئی ساری سوچوں نے اپنا بسیرا کرلیا تھا۔
کچھ دیر بعد میں زمان کے پاس تھا۔ وہ اسی رنگین پلنگ پر پڑا ہوا تھا۔ گوپے میں بیٹری ٹیوب کی سفید روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ وہ حیرت سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔
''مجھے یقین نہیں آرہا کہ انہوں نے تمہیں واپس آنے دیا۔''
''تم سمجھو گے نہیں، یہ سارا حوصلے کا کھیل ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ میں ان کے پاس چلا جاؤں گا، انہوں نے مجھے دھمکی دی ہے کہ وہ مجھے یہاں آکر ماریں گے۔ خیر ......'' میں سکون سے کہتے ہوئے رُک گیا، پھر لمحے بھر بعد بولا۔ ''مجھے یہ بتاؤ، تمہارے دشمن کون تھے؟''
''کہا نا، پھر بتاؤں گا، تم مجھے یہ بتاؤ، میرن شاہ نے تو کوئی بات نہیں کی، اس کا کیا ردِعمل تھا؟'' اس نے تجسّس سے اپنی بات کو پسِ پشت ڈال دیا۔ میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
''اس سے ابھی ملاقات نہیں ہوئی۔''
''وہ شاید ناراض ہو۔'' اس نے کہا تو میں نے اس کی بات کو اہمیت نہیں دی۔ اسے پتا ہی نہیں تھا کہ یہ میرن شاہ کی مرضی سے ہوا تھا۔ اسی لمحے میں نے سوچا کہ زمان موہل میرے لیے بے فائدہ بندہ ہے۔ میں اٹھ گیا۔
''لے بھئی، نکلتا ہوں۔''
''ارے کہاں چل دیے، ابھی تو آئے ہو، بیٹھو، میں......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''میں بابا خیر دین کے ساتھ آیا تھا، صبح ملتے ہیں۔''
یہ کہتے ہوئے میں مڑا اور گوپے سے نکلتا چلا گیا۔ وہ مجھے آوازیں دیتا رہا لیکن میں نے سنی ان سنی کر دی۔
میں واپس ڈیرے پر آکر لیٹ گیا۔ میرے دماغ میں بہت کچھ چل رہا تھا۔ اچانک بدل جانے والے حالات نے مجھے بالکل نئے سرے سے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مجھے اس کا بالکل بھی خوف نہیں تھا کہ کون، کب، کہاں مجھے مار دے۔ پھر تو کوئی جھنجھٹ ہی نہیں تھا۔ میرے بعد جو ہوتا رہے، مجھے اس سے کیا لیکن جب تک میری زندگی تھی، تب تک میں اپنی مرضی سے جینا چاہتا تھا۔ میں نے بہت کچھ سوچا ہوا تھا، اس میں کیا کچھ میں دیکھ سکتا تھا اور کیا نہیں، میں اس بارے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔
مجھے ڈیرے سے وحشت ہو رہی تھی۔ لاشعوری طور پر میں پیروزاں کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں ذہنی طور پر اسے قبول نہیں کر پایا تھا۔ جیسے جیسے رات گہری ہوتی جارہی تھی، میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ پھر وہی ہوا جس کا مجھے انتظار تھا۔ رہائش گاہ کی جانب آہٹ ہوئی اور بڑے ڈیل ڈول والی پیروزاں کا ہیولا آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں چارپائی پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ وہ میرے قریب آئی تو میں اٹھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے اندر جانے کو کہتی۔ میں بحث نہیں چاہتا تھا لیکن وہ کوئی بات کیے بنا چارپائی پر بیٹھتے ہی لیٹ گئی، پھر میرا ہاتھ پکڑ کر ہولے سے بولی۔
''آؤ میرے ساتھ اِدھر لیٹ جاؤ۔''
''نہیں میں اُدھر لیٹ جاتا ہوں۔'' میں دوسری چارپائی پر لیٹ گیا تو اس نے میری جانب کروٹ لے لی پھر دھیمے سے پوچھا۔
''اس راجھستانی کو چھوڑ آیا، اچھا کیا، میرن شاہ کو سکون ہو جائے گا۔''
''لیکن میری دشمنی ہو گئی ہے اُن سے۔'' یہ کہہ کر میں

نے اختصار سے ساری رُوداد سنا دی۔ وہ سکون سے سنتی رہی پھر سنجیدہ سے لہجے میں بولی۔
''اوئے کچھ نہیں ہوتا۔ میں ہوں نا تیرے ساتھ۔''
''تم ہر وقت تو میرے ساتھ نہیں رہ سکتی ہو نا، خیر، میں نے میرن شاہ سے کہا تھا، اب میں واپس جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے جان بوجھ کر ایسا کہا تو وہ ناراض لہجے میں تیزی سے بولی۔
''پھر وہی فضول بات...... میں کل شہر جارہی ہوں، تجھے بھی ساتھ لے چلوں گی۔ ایک دو دن صحرا سے نکل کر سانس لے لینا، اب خوش۔''
اس نے بچوں سے........ دلاسا دینے والے انداز میں کہا جس پر میں نے اپنا کوئی ردِعمل نہیں دیا۔ چند منٹ یونہی گزر گئے۔ تبھی میں نے پوچھا۔
''مجھے اپنی حفاظت کے لیے کچھ اسلحہ چاہیے، مل جائے گا؟''
''جو چاہیے مجھے بتا دے، یا پھر آ میرے ساتھ، جو بھی پسند ہے لے لینا۔'' اس نے تیزی سے یوں کہا جیسے وہ یہی سننا چاہتی تھی۔ میں نے جان بوجھ کر حیرت سے پوچھا۔
''کہاں جانا ہے؟''
''میرے ساتھ، اُدھر گھر میں، میرے کمرے میں۔'' اس نے سکون سے کہا پھر اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے گالوں پر پھیرتے ہوئے بولی، ''کچھ دیر میرے ساتھ بھی سکون سے ٹھہر جانا۔''
''پیروزاں، میری ایک بات سن لو، تم مجھ پر مہربان ہو، میری احسان مند ہو، اور اس احسان کا بدلہ دینا چاہتی ہو تو اس کا یہ مطلب ہے کہ میں تمہاری مادّی... ضرورت بھی پوری کروں؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ سخت ہو گیا، بات بھی سخت تھی۔ ایک طرح سے یہ اس کی تذلیل بھی تھی لیکن میں اس سے معاملہ صاف کر لینا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے کوئی عام مرد سمجھے، جسے وہ جب چاہے، جیسے چاہے اپنی دسترس میں لے لے۔ اس کا میرے گال پر پھرتا ہوا ہاتھ ایک دم سے رک گیا۔ چند لمحے وہ ہاتھ میرے گال پر رہا پھر اس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ پھر وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔
''میں سمجھی نہیں تو کیا کہنا چاہ رہا ہے؟''
''وہی جو تمہیں سمجھ لینا چاہیے۔'' میں نے سکون سے کہا۔
''میں اب بھی نہیں سمجھی ہوں۔'' اس نے دھیمے سے کہا۔
''تو پھر یوں سمجھ لو، کیا تم نے مجھے اپنے ساتھ دھندے کے لیے رکھنا چاہتی ہو یا پھر اپنی ضرورت پوری کرنے لیے؟ مجھے جس مال و دولت کا تم لالچ دے رہی ہو، وہ کس کام کے عوض مجھے ملے گا؟'' میں نے دھیمی آواز میں لیکن تیزی سے پوچھا۔
''دیکھ علی، دھندا اپنی جگہ، اس کا مال تجھے ملے گا، جتنا چاہے کما لے، میری ضرورت پوری کرے گا تو میری دوستی تجھے نصیب ہو گی، جو تجھے بے خوف کر دے گی۔'' اس نے بڑے سکون سے کہا۔
''اگر میں ان دونوں میں سے صرف ایک چیز کو قبول کروں تو؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا تو وہ فوراً بولی۔
''مطلب تو میری دوستی نہیں چاہتا ہے تو کوئی بات نہیں، میں تجھ سے ویسے ہی دوستی کر لوں گی۔''
''او کے، اب دھندے کی بات کرو، کیا کرنا ہے وہ بتاؤ۔'' میں نے پوچھا۔
''وہ میں شہر سے واپس آ کر بتاؤں گی۔ اور ہاں میرے شہر جانے کے بارے میں صرف تجھے پتا ہے، کوئی دوسرا نہیں جانتا۔''
''ساوری بھی نہیں؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔
''ہاں ابھی وہ بھی نہیں جانتی۔ تیار رہنا صبح۔'' اس نے کہا اور ایک دم سے اٹھ کر چل دی۔ اس وقت میرے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھری تھی کہ میں اسے کہوں کہ کچھ دیر کے لیے ہی سہی ساوری کو بھیج دے مگر میں نے اس خواہش کو اسی شدت سے دبا دیا۔ میں جانتا تھا کہ ان لمحات میں میری اس خواہش کا اثر کس قدر بُرا ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

نیلگوں روشنی کا احساس آسمان پر چھا رہا تھا جب مجھے جگایا گیا۔ میرے سامنے ساوری کھڑی تھی۔ وہ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر جگا رہی تھی۔
''اٹھ علی، پیروزاں بلا رہی ہے۔''
''کیوں، وہ کیوں......'' یہ کہتے ہوئے اچانک مجھے یاد آ گیا۔
''اس کے ساتھ شہر جانا ہے۔ جلدی منہ ہاتھ دھو لے، وہ جانے کے لیے تیار کھڑی ہے۔'' اس نے کہا تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ پیروزاں بڑی گھاگ عورت ہے۔ اس نے یہاں سے نکلنے کے لیے بڑا مناسب وقت چنا تھا۔

اس نے مجھے رات نہیں بتایا، بلکہ بالکل وقت پر بتایا۔ اس کا ایک ہی مطلب لیا جاسکتا تھا کہ ابھی اسے مجھ پر پوری طرح بھروسا نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے، میں تیار ہوتا ہوں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، تیار ہونے کا وقت نہیں، بس اپنے ساتھ کپڑے وغیرہ لے لو اور بس چلو، وہ نکلنے کے لیے تیار کھڑی ہے۔''

''اسے کہو، گاڑی لے کر پھاٹک پر آجائے، میں وہیں آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں اٹھا اور اندر کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے اپنے بیگ سے دو جوڑے کپڑے نکالے، اس کے ساتھ بڑی نوٹوں کی گڈی نکالی جو مجھے پیروزاں نے دی تھی اور پلٹ کر کمرے سے باہر آگیا۔ میں نے منہ بھی نہیں دھویا اور کمرے کی کنڈی چڑھا کر پھاٹک کی جانب چل دیا۔

جیسے ہی میں پھاٹک پر پہنچا، پیروزاں کی فور وہیل آگئی۔ وہ پچھلی نشست پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ساوری تھی۔ میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا تو فور وہیل چل دی۔ ہمارے درمیان چھائی خاموشی کو پیروزاں ہی نے توڑا۔ وہ دھیمے سے بولی۔

''ڈیش بورڈ میں پسٹل پڑا ہے۔ اس کے ساتھ میگزین بھی ہے۔''

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ ڈیش بورڈ کھولا، اور پسٹل اٹھا کر دیکھا۔ یہ بالکل اسی ساخت کا تھا جو میرن شاہ نے مجھے دیا تھا۔ وہ میرے نیفے میں موجود تھا۔ میں نے اسے واپس رکھتے ہوئے میگزین کو دیکھا اور ڈیش بورڈ بند کر کے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی۔

میں سامنے دیکھ رہا تھا۔ ملگجی سفید روشنی میں فور وہیل کی پیلی روشنی مدغم تھی۔ صحرائی راستے میں جھاڑیاں اور پودے پیچھے کی جانب بھاگ رہے تھے۔ مجھے ایک ہی احساس مدہوش کردینے کے لیے کافی تھا کہ میری پشت پر ساوری بیٹھی ہوئی ہے۔ پتا نہیں وہ میرا امتحان تھی یا پھر انعام بننے والی تھی۔

☆☆☆

بہاول پور شہر پہنچنے میں ہمیں تین گھنٹے لگ گئے تھے۔ ماڈل ٹاؤن کی ایک شاندار کوٹھی میں فور وہیل داخل ہوئی تو مجھے پتا چلا کہ یہ پیروزاں کی ملکیت ہے۔ وہاں کا ماحول دیکھ کر یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کوٹھی کی دیکھ بھال بڑے اچھے طریقے سے ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے وہاں کچھ ملازم رکھ چھوڑے ہوں گے۔ لیکن اندر پہنچتے ہی پتا چلا کہ میرن شاہ کی بیوی اور بچے وہیں اس کوٹھی میں رہتے تھے۔ وہاں پر رہتے ہوئے وہ اپنے بچوں کو ایک اعلیٰ اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ دکھ کی ایک لہر میرے اندر سرائیت کر گئی۔ ان لوگوں کے پاس پیسہ ہے تو ان کے بچے تعلیم لے سکتے ہیں اور روہی کے باسی، جن سے تعلیم کوسوں دور تھی۔ میں نے اگلے چند منٹوں میں اپنے دماغ سے یہ خیال نکال دیا۔ میں جذباتی نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مجھے جاتے ہی ایک کمرا دے دیا گیا کہ میں یہاں آرام کروں۔ کچھ ہی دیر بعد ناشتا آگیا۔ اس کے بعد جو میں لمبی تان کر سویا تو دوپہر کے بعد دروازے پر دستک سے میری آنکھ کھلی۔ دروازہ کھولنے پر میرے سامنے ساوری کھڑی تھی۔ اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''پیروزاں سئیں بلا رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم چلو، میں آتا ہوں۔'' میں نے اس کے تنے ہوئے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو مجھے لگا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا تو وہ بولی۔

''ہٹو تو سہی، مجھے برتن لینے ہیں۔'' میں ایک جانب ہٹ گیا۔ وہ کمرے میں آگئی اور پھر میری جانب دیکھے بنا بولی، ''یہاں بڑی احتیاط سے رہنا، سمجھو پیروزاں کی ہر وقت نظر ہے۔ خاص طور پر مجھ سے......'' یہ کہتے ہوئے وہ ساتھ میں برتن بھی اٹھاتی رہی پھر ٹرے اٹھا کر باہر چل دی۔ میں چند لمحے سوچتا رہا پھر فریش ہونے چل دیا۔

لاؤنج میں پیروزاں صوفے پر پھیل کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کا پھول دار سوٹ پہنا ہوا تھا، اس کے ساتھ ایک بڑا سا آنچل تھا۔ اس کے چہرے پر سختی کے ساتھ ہلکا سا تناؤ بھی تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی بولی۔

''یہاں بیٹھ یہاں، ابھی کچھ دیر میں یہاں مہمان آنے والے ہیں۔''

''وہ دوست ہیں یا......'' میں نے ایک خیال کے تحت کہا تو وہ اکتائے ہوئے انداز میں بولی۔

''یہاں کوئی کسی کا دوست نہیں ہے۔ جتنا زیادہ مفاد ہوتا ہے، اتنا ہی وہ قریب ہو جاتا ہے۔''

''بات تو تم نے ٹھیک کہی ہے۔'' میں نے کہا اور اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ بے خیالی کے سے انداز میں میری جانب دیکھتی رہی۔ وہ شاید کسی گہری سوچ

میں تھی۔ میں بھی اس کے پاس خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ زیادہ وقت نہیں گزر رہا تھا کہ پورچ میں کار رکنے کی آواز آئی۔ اس کے کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ عمر شخص اور...... ایک نوجوان سی لڑکی اندر آ گئے۔ ادھیڑ عمر نے سفید شلوار قمیص پر گہرے نیلے رنگ کا ویسٹ کوٹ پہنا ہوا تھا اس کے بال کھچڑی تھے اور بھاری مونچھوں میں تھوڑے سیاہ بال تھے۔ لڑکی نے سیاہ پتلون کے ساتھ گلابی فراک نما شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ ان کے چہروں پر جو مسکراہٹ تھی، وہ بڑی مصنوعی سی لگی۔ وہ دونوں پیروزاں سے ہاتھ ملا کر ایک طرف صوفے پر بیٹھ گئے۔ یونہی رسمی سی باتوں میں ایک دوبار انہوں نے میری موجودگی کا نوٹس لیا تو پیروزاں نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے خوشگوار سے انداز میں کہا۔

''یہ علی ہے، میرا دوست ہے، میرے معاملات اب یہی دیکھے گا۔''

''اوہ اچھا'' ادھیڑ عمر کے منہ سے بے ساختہ نکلا، پیروزاں نے اُسے میری اہمیت کا احساس دلایا تھا۔ اب مجھے تجسس یہی تھا کہ اس نے ایسا کیوں کہا تھا۔ ظاہر ہے یہ جھوٹ بولنے کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ تو تھی۔

''اور علی یہ ہیں ایک بڑے بزنس مین، چوہدری آصف حمید ان کا بزنس کہاں کہاں پھیلا ہوا ہے، اس کی تفصیل تو بہت لمبی چوڑی ہے لیکن ہمارے مطلب کی صرف اتنی سی باتیں ہیں کہ رو ہی میں جو یہ ہمارا بزنس ہے، اس کے یہ سب سے بڑے گاہک ہیں۔ یا ان کے جتنے سیاست داں ہیں یہ ان کے اسپانسر ہیں۔ کسی سیاست داں کے زیادہ اور کسی کے کم۔ اس لیے جس سے، اس کا مطلب ہے یہ ہر کسی سے کام لے سکتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اس لڑکی کی جانب دیکھا پھر خاموش ہو گئی۔

''یہ میری سیکریٹری ہے۔'' آصف حمید نے مختصر سا کہا تو پیروزاں بولی۔

''چوہدری صاحب، مجھے اس لیے اچانک یہاں آنا پڑا کہ اب فیصلہ ہو جانا چاہیے، آپ کس کے ساتھ ہیں؟''

یہ سنتے ہی اس نے غور سے پیروزاں کی جانب دیکھا اور پھر بڑے محتاط انداز میں بولا۔

''دیکھیں پیروزاں بی بی، ہم وہاں پر اکیلے کام نہیں کر رہے ہیں، آپ کو پتا ہے دو پارٹیاں مزید ہیں۔ ان کی اپنی دلچسپیاں ہیں۔ ہم کسی کو روک تو نہیں سکتے اور......''

''یہیں پر گڑبڑ ہے چوہدری صاحب۔ جب ہم کسی کو کھلی چھٹی دیں گے تو ان کا حوصلہ بڑھتا ہے۔ وہ ہمارے کام میں ٹانگ اڑاتے ہیں جس سے کوئی نہ کوئی جھگڑا ہو جاتا ہے۔'' وہ سخت لہجے میں بولی۔

''معاف کرنا بی بی، ہم تو اسی کے ساتھ بزنس کرتے ہیں، جو وہاں زیادہ طاقتور ہے۔ جو اپنے زورِ بازو سے اپنی حاکمیت بنا کر رکھتا ہے۔ اگر آپ کا یہ مطلب ہے کہ میں کسی کو روکوں اور آپ لوگوں کو کھلی چھٹی دوں تو یہ میرا کام ہے ہی نہیں۔ آپ وہاں من مانی کرتے ہو، آج تک کسی نے پوچھا؟ نہیں نا؟'' چوہدری نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پیروزاں کو بتا دیا کہ وہ جو بات کر رہی ہے، وہ اتنی اہم نہیں ہے۔ تبھی وہ بھی مسکراتے ہوئے بولی۔

''ہاں یہ میں مانتی ہوں، میں امید کرتی ہوں کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔''

''بالکل، ایسا ہی ہوگا لیکن ایک بات ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''وہ کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا مشورہ ہے، آپ اپنے بھائی میرن شاہ کے ساتھ چلیں گی تو زیادہ بہتر رہے گا، یہ جو آپ لوگوں کو سر اٹھاتے ہوئے دیکھ رہی ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ آپ دونوں کی طاقت بٹ گئی ہے۔''

''یہی بات میں آپ کو سمجھانے آئی ہوں کہ طاقت بٹی نہیں، میں اپنا کام کر رہی ہوں، وہ اپنا کام کر رہا ہے۔ میرن شاہ میرا مسئلہ نہیں، وہ لوگ میرا مسئلہ ہیں جو اس وقت روہی میں ہیں۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''ٹھیک ہے، ان کے لیے میں آپ کے ساتھ ہوں، آپ کو کوئی نہیں پوچھے گا، یہ میری گارنٹی ہے۔'' اس نے حتمی انداز میں کہا۔

''بس یہی بات ہے۔'' اس نے یوں کہا جیسے یہی بات منوانے وہ یہاں تک آئی ہو۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی۔ ''ایک بات اور......''

''ہاں بولیں۔'' وہ تحمل سے بولا۔

''دھندے میں کچھ باہر سے آئے لوگ دخل اندازی کرتے ہیں۔ کیا وہ بھی آپ کے لوگ ہیں یا......'' اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''باہر سے آئے...... مطلب؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''کیا رتو بھوبڑ آپ کے ساتھ کام کر رہا ہے؟'' پیروزاں نے پوچھا۔

''نہیں، کبھی کرتا تھا لیکن آج کل تو وہ کچھ بھی نہیں کر

رہا۔'' چوہدری نے سنجیدگی سے کہا۔
''لیکن اس وقت وہی راجستانیوں کا باپ بنا ہوا ہے۔ وہی انہیں پناہ دیتا ہے، وہی ان کا دھندا دیکھ رہا ہے، وہ کون ہے؟'' پیروزاں نے پوچھا تو چوہدری نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
''یہ میرے لیے نئی اطلاع ہے۔''
''ویسے حیرت ہے چوہدری جی، آپ کے لیے یہ نئی اطلاع ہے۔ جب آپ کو وہاں کی خبر ہی نہیں تو آپ دھندا کیسے دیکھتے ہیں۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی تو وہ خاموش رہا۔ چند لمحوں بعد پیروزاں نے سرد سے لہجے میں پوچھا،''تو پھر کیا خیال ہے؟''
''اسے ختم کرنا ہوگا، ورنہ وہ سب چوپٹ کر دے گا۔'' چوہدری نے وحشت ناک انداز میں کہا۔
''روہی میں آپ کی جو آنکھیں ہیں نا وہ دھندلی ہو گئی ہیں اور جو کان ہیں اب انہیں سنائی نہیں دیتا۔ اسی لیے ساری گڑبڑ ہو رہی ہے۔ میں کل تک اِدھر ہوں، اچھی طرح پتا کریں، پھر مجھ سے بات کریں۔'' پیروزاں نے کہا تو وہ خاموش رہا پھر کچھ دیر بعد بولا۔
''نہیں، مجھے آپ پر بھروسا ہے۔ ان کے بارے جو بھی فیصلہ ہوگا، وہ آپ ہی کریں۔ مجھے اب دوبارہ سب دیکھنا ہوگا۔''
''ٹھیک ہے، پھر بھی میں یہیں ہوں۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔
''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا تو پیروزاں نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''آئیں چائے پیتے ہیں۔''
ہم سب اٹھ کر اس جانب چل دیے۔ چائے کے دوران میں ان دونوں میں بہت ساری باتیں ہوئیں۔ ان باتوں سے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ روہی کو کس طرح اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے تھے۔
شام ڈھلے وہ لوگ چلے گئے لیکن میرے لیے نجانے کتنی سوچیں چھوڑ گئے۔ کیا پیروزاں نے مجھ پر اتنا اعتبار کر لیا تھا کہ سب کچھ میرے سامنے کہہ دیا؟ کیا ایسا ہو رہا تھا جو میرے سامنے بیان ہوا؟ اگر ایسا سب ہو رہا تھا تو یہ وہاں بسنے والے انسانوں کے لیے ایک شکنجہ تھا، جس میں ان کی طاقت، خون اور مفاد سب کچھ یہ تاجر لوگ استعمال کر رہے تھے۔ دوسرا یہ ملک کے لیے انتہائی خوف ناک تھا۔ ایک طرح سے یہ سیندھ لگائی جا رہی تھی جہاں سے کوئی بھی دشمن

اندر آ سکتا تھا۔ اس کے بعد وہ کیا کرتا ہے یہ اُس کی مرضی تھی۔ اگرچہ یہ میرے لیے اتنی حیرت ناک بات نہیں تھی مجھے اس کا کافی حد تک ادارک تھا لیکن تھوڑا دکھ ضرور ہوا تھا۔ نجانے کتنے برسوں سے یہ لوگ اسی طرح شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ نہ وہ خود نکلنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ کوئی انہیں ان شکنجوں سے نکالتا ہے۔ شاید اسی طرح جکڑے رہنا ان کی عادت بن گئی تھی۔
رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ میں انہی سوچوں میں اُلجھا ہوا جاگ رہا تھا۔ میرے اندر کا انسان مجھے جھنجوڑ رہا تھا کہ میں روہی کے ان باسیوں کی مدد کروں۔ جتنی ان کی ثقافت رنگین تھی اتنی ان میں ضعیف الاعتقادی بھی موجود تھی۔ جتنا ان میں سخت کوشی تھی، اتنی ان میں تعلیم کی بھی کمی تھی۔ جتنے وہ جفاکش تھے، اتنی ہی غربت ان میں موجود تھی۔ ایسا کیوں تھا؟ سوائے ان مفاد پرستوں اور جرائم پیشہ کے علاوہ کون ذمے دار ہو سکتا تھا۔ آہٹ ہونے سے میرا دھیان بٹ گیا۔ دروازے میں پیروزاں کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں بیڈ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ چلتی ہوئی آئی اور بیڈ کی دوسری جانب بیٹھ گئی۔ وہ تکیے کے ساتھ ٹیک لگا چکی تو میری طرف دیکھ کر بولی۔
''کیا سوچ رہا ہے؟''
''یہی کہ تم روہی والے کتنے ظالم ہو، پیسہ بنانے کی خاطر......''
''نہیں علی، صرف پیسہ بنانا مقصد نہیں ہے، تو نے دیکھا ہوگا اور دیکھے گا بھی، صرف پیسہ مقصد نہیں ہے، جنگل کا تو پھر قانون ہوتا ہے ہم انسان تو جنگل کے قانون سے بھی بدتر سطح پر اتر آتے ہیں۔ سب سے پہلے اپنا تحفظ ہوتا ہے اور پھر باقی باتیں بعد میں دیکھی جاتی ہیں۔'' اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔
''تمہیں ایسا کیا عدم تحفظ ہو گیا جو میرن شاہ سے ہٹ کر اپنا الگ سے سب کچھ کر رہی ہو۔ اپنی طاقت......'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
''میں بھی ایک انسان ہوں، میرے اندر بھی جذبات ہیں، مجھے اگر کوئی کچلے گا تو کیوں نا میں اپنا بچاؤ کروں۔'' اس نے زہرخند لہجے میں کہا۔
''میرن شاہ نے تمہیں کچلا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا تو اس کا چہرہ تن گیا، پھر وہ نفرت بھرے لہجے میں کہتی چلی گئی۔
''میں جانتی ہوں اپنے بارے میں، روز آئینہ دیکھتی

ہوں۔ میرے سامنے ساوری ہزار درجہ خوبصورت ہے۔ لیکن مجھے یہ بتاؤ، میرے اندر کی پیاس مرجائے گی۔ میں اگر خوبصورت نہیں تو کیا میرے جذبات بھی مرجائیں گے۔ میں بھی شادی کرنا چاہتی تھی، مجھے بھی ایک مرد کی ضرورت تھی۔ میری شادی اگر نہیں ہو رہی تھی تو میرن شاہ میری شادی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کسی کا 'سالا' بنے یہ اسے گوارا نہیں۔ میرن شاہ کے چاہنے سے کیا جو میرے جذبات ہیں، وہ کیا ختم ہو جاتے...... جو مرد کی ضرورت ہے وہ ختم ہو جاتی؟''

''نہیں...... یہ تو غلط بات ہے، مگر کیا تمہارا رشتہ آیا تھا جسے میرن شاہ نے انکار کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک دو آئے لیکن وہ ذات برادری کے نہیں تھے۔ دوسرا مال بہت مانگ رہے تھے۔ پھر میں نے ایک لڑکے کو خود پسند کیا، اسے اپنی راہ پر لائی لیکن اسے بھی میرن شاہ نے دشمن کا بندہ کہہ کر مروا دیا۔ بس پھر اس دن کے بعد میں نے فیصلہ کرلیا، میں دشمن کے کسی لڑکے کو اپنے قریب کرتی ہوں، جب تک وہ استعمال ہوسکتا ہے کرتی ہوں پھر مار دیتی ہوں۔'' اس نے یوں کہا جیسے کسی ٹشو پیپر کے استعمال کے بارے میں بات کر رہی ہو.... میں اس پر سوال کرسکتا تھا کہ کیا وہ مجھے بھی اپنا دشمن سمجھتی ہے لیکن میں خاموش رہا۔ اس کی طرف دیکھتا رہا تبھی وہ بولی، ''کیا تم جانتے ہو میرن شاہ اسی شہر کی یونیورسٹی میں پڑھا اور مجھے سرے سے اُجڈ اور گنوار رکھا گیا، کیوں کیا ایسا؟''

''تو تم جو کچھ کر رہی ہو اپنے بھائی کے خلاف کر رہی ہو؟'' میں نے پوچھا تو وہ تیزی سے بولی۔

''نہیں، وہ ابھی تک میری راہ میں نہیں آیا۔ جس طرح دوسرے لوگ کام کر رہے ہیں، میں بھی کر رہی ہوں، مجھے بھی حق ہے کہ میں اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزاروں۔ میرن شاہ اگر عیاشیاں کرسکتا ہے تو میں کیوں نہیں کرسکتی۔ میں نے اپنا دھندا خود شروع کیا اور میرے ساتھ بہت سارے لوگ ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے تم میرن شاہ سے بھی زیادہ..... خطرناک عورت ہو۔'' میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو وہ قہقہہ لگا کر بولی۔

''صرف اُن کے لیے جو مجھے دھوکا دیتے ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے تکیہ ایک طرف رکھا اور بیڈ پر لیٹ گئی۔ میں اسی لمحے ایک جانب سمٹ گیا۔ وہ سمجھتی تھی کہ ہمارے درمیان کیا معاہدہ ہو چکا ہے۔ اس لیے کوئی لفظ نہ کہہ سکی۔ وہ کافی دیر تک خاموشی سے دیکھتی رہی۔ تب میں نے کہا۔

''اگر چوہدری تمہیں دھوکا دے دے تو......؟''

''اوئے، یہ لوگ صرف یہاں بیٹھ کر دھندا کرسکتے ہیں، ان میں لڑنے کی سکت نہیں...... ہاں سازش یہ خوب کرتے ہیں۔ اس لیے اپنے مطلب کے لیے ہمیں لڑاتے رہتے ہیں۔'' اس نے حقارت سے کہا۔

''تو پھر تمہاری اس سے ملاقات کا مقصد......'' میں نے پوچھا۔

''میں نے اسے یہ باور کرایا ہے کہ اب وہ میرے بغیر روہی میں نہیں چل سکتا اور علی...... میں نے بھی سوچ لیا ہے، اب میری راہ میں جو بھی آئے گا اُسے ختم کر دوں گی۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو، کل تک اسے اپنی اوقات کا پتا چل جائے گا۔'' اس نے حقارت اور طنز کے ملے جلے لہجے میں کہا۔

''خیر تم جانو اور تمہارا کام۔'' میں نے بات ختم کرنے کے لیے کہا کیونکہ میں بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔ آئندہ آنے والے جو حالات تھے، ان کا بھی اندازہ مجھے ہوگیا تھا اب ان حالات کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا تھا۔

''نہیں تیرا کام بھی ہے اب، ہمارے درمیان اب دھندا ہے۔'' اس نے خود مجھے باور کرا دیا تو دھیمے سے مسکرا دیا، میری جانب سے آمادگی دیکھ کر وہ خوش ہوتے ہوئے بولی، ''میں تو تجھے پسند نہیں آئی، اس لیے تو میرے قریب نہیں ہوتا، ہاں اگر کوئی لڑکی تجھے پسند آجاتی ہے تو بلا جھجک مانگ لینا، دے دوں گی۔''

''چاہے کسی دشمن کی ہو؟'' میں نے جان بوجھ کر کہا۔

''ہاں، چاہے دشمن کی بھی ہو اٹھا لینا۔'' اس نے سرد سے لہجے میں کہا پھر ایک دم سے اٹھ کر چل دی۔ وہ مایوس ہو گئی تھی یا اپنا مطلب نکال چکی تھی، اس کا مجھے اندازہ نہیں ہوا۔ وہ دروازہ پار کر گئی تھی۔

☆☆☆

دن کافی نکل آیا تھا جب میں کمرے سے باہر آیا۔ میں لاؤنج میں صوفے پر آکر بیٹھا تو کوٹھی کا ملازم مجھ سے ناشتے کا پوچھنے آگیا۔ اسی سے پتا چلا کہ کچھ دیر پہلے پیروزاں ڈرائیور کے ساتھ نکل گئی تھی۔ میں وہیں پھیل کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ساوری ٹرے اٹھائے آتے ہوئے دکھائی دی۔ وہ میز پر ٹرے رکھنے کے لیے جھکی تو اس کا آنچل کافی ڈھلک گیا، اس کے ساتھ ہی اِدھر اُدھر دیکھے بغیر منمناتے ہوئے بولی۔

''مجھ سے بات بھی نہ کرنا، سمجھو میں اجنبی ہوں۔''
میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ یوں ہی ٹرے کی طرف دیکھتا رہا جیسے کوئی ندیدہ بھوک کے باعث کھانے کو دیکھتا ہے۔ وہ ٹرے رکھ کر چلی گئی۔ میں اب یہ جان گیا تھا کہ ساوری کہیں زیادہ پیروزاں کو جانتی ہی نہیں سمجھتی بھی تھی۔ یہ سب کیوں ہو رہا تھا، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں نے خوب جی بھر کر ناشتا کیا اور لاؤنج سے باہر نکل آیا۔ کھلی فضا میں سانس لینا اچھا لگا تو لان میں ہری گھاس پر ایک پودے کے سائے میں آبیٹھا۔ میرے پاس سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا لیکن میں کسی موضوع پر بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے اتنا وقت نہیں ہوا تھا کہ گیٹ کھلا اور اس میں سے پیروزاں کی فور وہیل اندر داخل ہوئی۔ میں یونہی بیٹھا رہا۔ وہ میری جانب دیکھتی رہی یہاں تک کہ فور وہیل پورچ میں رُک گئی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ وہ پسنجر سیٹ سے نیچے اتری تو مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ میں اٹھ کر اس کی جانب چل دیا۔ میں اس کے قریب گیا تو اس نے پوچھا۔

''ایسے کیوں بیٹھا ہے؟''
''ایویں ہی بس کھلی فضا میں آ گیا تھا۔'' میں خوشگوار لہجے میں بولا
''چل تیاری کر چلیں واپس۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا اور اندر کی جانب چل دی۔ مجھے کیا تیاری کرنا تھی، میں بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔ مجھے اپنے کمرے سے اپنا بیگ اٹھانا تھا، وہ لے کر نیچے آیا تو لاؤنج میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں باہر پورچ میں آ گیا جہاں ڈرائیور کھڑا تھا۔ میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اپنا بیگ میں نے پچھلی نشست پر رکھا اور ایک جانب کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ پیروزاں کے ساتھ ساوری آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ پچھلی نشست پر بیٹھیں تو میں پسنجر سیٹ پر جا بیٹھا۔ اگلے چند لمحوں میں ہم کوٹھی سے نکل چکے تھے۔ ہم نے جتنا وقت بھی اس کوٹھی میں گزارہ تھا، میرن شاہ کی بیوی اور بچے سامنے نہیں آئے تھے۔ وہ وہاں رہتے ہوئے بھی ان سے الگ تھلگ تھی۔ کیا اس کے پیروزاں کے ساتھ تعلقات اچھے نہیں تھے؟ وہ اس سے ملنا نہیں چاہتی تھی؟ یا پھر وہ تھی ہی ایسی کم الگ تھلگ رہے۔ جو بھی تھا، مجھے اس سے کیا لینا دینا تھا۔ میں نے اسے اپنے دماغ سے نکال باہر کیا۔

بہاول پور سے نکلے ہی تھے کہ پیچھے بیٹھی پیروزاں کی آواز ابھری۔

''یہ لے میں نے تیرے لیے ایک سیل فون لیا ہے۔''
اس کے ساتھ ہی جدید ماڈل کے سیل فون کا ڈبا میرے سامنے کر دیا۔ میں نے اسے پکڑتے ہوئے کہا۔
''میں نے آج تک سیل فون استعمال نہیں کیا، اس لیے مجھے اس کے بارے میں اتنا پتا نہیں ہے۔''
''یہ تو آج کل عام ہو گیا ہے۔ تو نے کیوں نہیں استعمال کیا اب تک۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔
''ضرورت ہی نہیں پڑی۔'' میں نے سکون سے جواب دیا۔

''تم اس طرح بیابانوں میں رہتے ہو، پھر بھی کسی کو فون ...... مطلب کبھی اپنے محکمے سے بھی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی؟'' اس نے کافی حد تک حیرت بھرے انداز میں پوچھا تو میں نے اسی سکون سے کہا۔
''محکمے سے رابطہ کرنے کا مطلب کوئی مزید حکم لینا، جب مرضی واپس جاؤ بس اپنی رپورٹ دو تو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ میرا کوئی ہے نہیں، جس سے میں رابطہ رکھوں۔ اس لیے......''
''مطلب روہی سے باہر اب تک تمہارا کوئی رابطہ نہیں ہے۔'' میری پشت سے پیروزاں کی حیرت بھری آواز ابھری تو میں نے سامنے سڑک پر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔
''تمہارے سامنے ہے، میرے پاس فون ہی نہیں تو رابطہ کیسے ہوگا۔''
''حیرت ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی ... پھر بولی، ''تم کسی سے بھی سیکھ لینا۔''
''نہیں جب مجھے ضرورت ہوگی میں خود خرید لوں گا۔'' میں نے کہا اور وہ ڈبا واپس کر دیا۔ اس نے واپس نہیں پکڑا بلکہ بولی۔
''اسے رکھو اپنے پاس۔''
''بی بی جی اس فون کے لیے نیا سم کارڈ لیا ہے جس سے یہ چلے گا؟'' ڈرائیور نے کہا تو پیروزاں نے تیزی سے کہا۔
''نہیں وہ تو نہیں لیا؟ چل موڑ گاڑی، وہ سم کارڈ لے لیں۔''

اس نے کہا ہی تھا کہ ڈرائیور نے گاڑی موڑی اور شہر کی جانب گامزن ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ایک دکان سے سم کارڈ لیا اور واپس چل دیے۔

سہ پہر ہو رہی تھی جب ہم واپس بستی چراغ شاہ کے قریب پہنچے تھے۔ تبھی پیروزاں نے کہا۔

''ہم اتنی جلدی واپس پتا ہے کیوں آ گئے ہیں؟ حالانکہ ہمیں چار دن رہنا تھا ابھی شہر میں......''
''تم نے بتایا ہی نہیں؟'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔
''مجھے پتا چلا ہے، ان راجھستانیوں نے رتو بھوہڑ کے ساتھ مل کر چالیس گائیوں کو پکڑ کر قبضہ کر لیا ہے۔ انہوں نے میرن شاہ کو یہ پیغام بھیجا ہے کہ اگر ہمت ہے تو لے جاؤ۔'' اس نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کہا۔
''تو میرن شاہ نے کیا جواب بھیجا؟'' میں نے پوچھا۔
''اس کا تو ابھی پتا نہیں، یہ تو وہیں جا کر معلوم ہوگا۔ میرا خیال ہے انہوں نے اب سیدھے سیدھے ہمیں للکارا ہے۔'' وہ دبے دبے غصے میں بولی تو میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔
''پیروزاں مائی، یہاں یہ کونسی نئی بات ہے، ایسا تو ہوتا رہتا ہے۔ جو کوئی بھی خود کو طاقتور ثابت کرنا چاہتا ہے، وہ ایسا ہی کرتا ہے۔''
''میرے خیال میں یہ انہوں نے اس مقصد کے لیے نہیں کیا۔'' وہ سوچتے ہوئے انداز میں بولی تو میں نے پوچھا۔
''پھر اور کس لیے ایسا کیا انہوں نے؟''
''میں میرن شاہ سے بات کر لوں، پھر اصل بات کا پتا چلے گا۔'' اس نے کہا اور پھر ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔
فور وہیل مجھے ڈیرے کے پھاٹک پر اتار کر آگے بڑھ گئی۔ ڈیرے کے ایک جانب چھپر کے نیچے میری جیپ کھڑی تھی۔ میں اندر گیا تو بابا خیر دین اکیلا ہی ایک چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا پھر مصافحہ کرتے ہوئے بڑے اشتیاق سے بولا۔
''ہو آئے شہر سے......؟''
''ہاں بابا، پر کہیں اِدھر اُدھر نہیں جا سکا، بس گئے اور واپس آ گئے۔'' میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''پانی لاؤں تمہارے لیے؟'' اس نے پوچھا۔
''نہیں، ابھی مجھے پیاس نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے بابا خیر دین کے چہرے پر دیکھا اور پھر تجسس سے پوچھا،
''کیا پیروزاں مائی کی گائیں چوری ہو گئی ہیں؟''
''ہاں رات ہی ہوئی ہیں، وہ جو ساتھ والی بستی میں باڑا ہے نا وہاں سے چور رات لے گئے تھے۔''
''کوئی چوکیدار نہیں تھا وہاں پر؟'' میں نے پوچھا۔
''دو بندے تھے، انہیں باندھ کر پھینک گئے اور گائیں لے گئے۔'' بابا خیر دین نے بتایا اور میرے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ کر وہ پورا واقعہ سنانے لگا، میں سنتا رہا، حالانکہ اس تفصیل میں میری کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہم وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ سورج ڈوبنے والا ہو گیا۔ بابا خیر دین میرے لیے کھانا لانے چلا گیا اور میں نے اپنا بیگ اٹھا کر اندر رکھ دیا۔
میں اس چوری کے بارے میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ رتو بھوہڑ اور وہ راجھستانی مجھے نہیں بھول پا رہے تھے۔ وہ شاید پیروزاں والے معاملے کو پسِ پشت ڈال کر پہلے مجھے پکڑ کر قتل کرنا چاہتے تھے۔ ان گائیوں کو پکڑ کر یا تو وہ یہ دباؤ ڈالیں گے کہ مجھے ان کے حوالے کیا جائے۔ ممکن ہے پیروزاں یا میرن شاہ ان گائیوں کے عوض میرا سودا کر دیتے یا پھر ان کے سامنے ڈٹ جاتے۔ ظاہر ہے اس کا نتیجہ ایک لڑائی تھا جس میں نجانے کتنے مارے جاتے۔
بابا خیر دین کا لایا ہوا کھانا کھا کر میں لیٹ گیا۔ میں یہ انتظار کرنے لگا کہ شاید پیروزاں یا پھر میرن شاہ آئے گا اور کوئی بات کرے گا۔ یہی سوچتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ میرن شاہ کے غنڈے خرگوش کے شکار کے بعد یہاں آس پاس دکھائی نہیں دیے تھے۔ وہ لوگ آخر گئے کہاں؟ یہیں کہیں بستی میں ہیں یا انہیں کسی کام پر لگایا ہوا ہے؟ جب سے بختاور ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا، اس کا خاص غنڈہ اسجان بھی دکھائی نہیں دیا تھا، وہ کہاں گیا؟ سب سے بڑھ کر وہ منشی مہر خان، جس سے میری فقط ایک بار ملاقات ہوئی تھی۔ یہ سب کہاں تھے؟ میرے خیالات کی رو انہی کی جانب تھی کہ بابا خیر دین نے آ کر بتایا۔
''میرن شاہ تو نہیں ہیں آج یہاں پر، کوئی پنچایت تھی اُدھر گئے ہیں، رات پتا نہیں آتے ہیں یا نہیں۔ بی بی سئیں نے کہا ہے کہ ذرا خبردار ہو کر رہوں۔''
''ٹھیک بابا، آج تم سے کوئی پرانی باتیں سنیں گے۔'' میں نے پُرشوق انداز میں کہا تو وہ چند لمحے میری جانب دیکھتا رہا پھر سکون سے بولا۔
''پھر کبھی سہی پرانی باتیں۔ مجھے ساتھ والی بستی میں جانا ہے۔'' بابا نے کہا تو میں سمجھ گیا کہ پیروزاں نے اسے جان بوجھ کر بھیجا ہے تاکہ وہ یہاں آ سکے۔ اس گھر کی گھمن گھیریاں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھیں لیکن جو بھی ہو رہا تھا، وہ میرے حق میں تھا اس لیے میں اب سکون سے یہ تماشا دیکھنا چاہتا تھا۔ اس وقت میرا من چاہا کہ میں زمان کے پاس جاؤں اور جا کر اپنے طور پر تصدیق کروں کہ رتو بھوہڑ کیا

چاہتا ہے۔ کیونکہ زمان کا رابطہ اس سے تھا۔ تبھی میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔
''چل پھر تجھے چھوڑ دوں گا رستے میں۔''
میں اور بابا خیر دین جیپ میں بیٹھے اور چل دیے۔ میں نے بابا خیر دین کو اتارا اور خود زمان کے پاس جا پہنچا۔ وہ اس وقت پیڑھے پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔
''اچھا ہو گیا تو آ گیا ہے۔''
''کیوں، کیا ہوا؟'' میں نے اس کے سامنے پڑے پیڑھے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا تو وہ دھیمے سے بولا۔
''تمہیں پتا تو چل گیا ہوگا، ورنہ اتنی جلدی واپسی نہ ہوتی تمہاری۔''
''بات تو بتا، ایویں تجسس نہ پھیلا۔'' میں نے اکتاہٹ سے کہا۔
''وہی پیروزاں کے گائیوں والا معاملہ۔'' اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
''ہاں وہ مجھے اس نے بتا دیا تھا۔''
''ایک تو تمہارے پاس فون نہیں ہے ورنہ میں تمہیں پہلے ہی بتا دیتا۔'' اس نے پُرجوش انداز میں کہا۔
''یار عجیب بات ہے، پیروزاں نے مجھے آج ہی ایک فون دیا ہے، بلکہ سم کارڈ بھی لے دیا ہے مگر مجھے چلانا نہیں آتا۔'' میں نے سکون سے کہا۔
''یہ تو بہت اچھا ہوا، میں تمہیں سکھا دوں گا، مگر میں جو بات تمہیں بتانے لگا ہوں وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔'' اس نے مزید دھیمے لہجے میں کہا۔
''وہ کیا بات ہے؟'' میں نے حیرت اور تجسس سے پوچھا۔
''مجھے نا...... آج فون آیا تھا رتو بھوہڑ کا ...... وہ راجھستانی اسی کے پاس ہے نا ...... باقی راجھستانیوں کے ساتھ...... اِدھر اُدھر کے لوگ بھی اس کے ساتھ مل گئے ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا...... ان گائیوں کے عوض ...... وہ تمہیں مانگیں گے۔'' اس نے ہولے ہولے اپنی بات پوری کی۔
صبح جب میں نے یہ خبر سنی تھی تب مجھے یہی شک ہوا تھا لیکن یہ اتنی بے وقوفی والی بات تھی۔ ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے کہا۔
''یار، تم سوچ سکتے ہو کہ وہ چالیس گائیوں کے لیے مجھے ان کے ہاتھ دے دیں گے؟''
''پاگل ہو تم، ان کے لیے بندہ مارنا کون سا مشکل ہے، اور پھر تمہارا کون ہے ادھر، تمہارے محکمے سے کچھ بھی کہہ دیں گے۔'' اس نے تیزی سے کہا۔
''ایک بات ہے یار......؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''وہ کیا......؟'' اس نے ہنکارا بھرنے والے انداز میں کہا۔
''یہ بات تم مجھے کیوں بتا رہے ہو، حالانکہ تمہیں پتا ہے اگر اس کی بھنک بھی میرن شاہ کو مل گئی تو وہ تمہیں معاف نہیں کرے گا۔'' میں نے کہا۔
''دیکھ ان راجھستانیوں کے ساتھ میں نے کافی کام کیا ہے۔ وہ سب مجھے جانتے ہیں، اس کا پتا میرن شاہ کو بھی ہے۔ یہ ان کے ساتھ دشمنی تو پیروزاں مائی کی ہوئی ہے نا۔ آج نہیں تو کل یہ بات وہ تمہیں بتا دیں گے۔'' زمان نے اطمینان سے کہا تو میں نے چند لمحے سوچا پھر اسی سے پوچھا۔
''تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟''
''اب یہ تم دیکھو، تمہیں کیا کرنا ہے، چپ چاپ راتوں رات یہاں سے نکل جاؤ یا پھر آنے والے خطرے کا مقابلہ کرو۔'' زمان نے کہا تو میں خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا۔
''بات تو تمہاری سوچنے والی ہے، خیر، وہ صبح کیا کرتے ہیں، دیکھ لیں گے۔ اس کے بعد ہی میں فیصلہ کروں گا۔''
''وہ تیری مرضی ہے۔'' زمان نے اطمینان سے کہا پھر اسی موضوع پر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ جب رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا، میں اٹھا اور ڈیرے کی طرف چل دیا۔
ڈیرے پر پہنچ کر میں ایک چارپائی پر لیٹ گیا۔ لاشعوری طور پر میں پیروزاں کا انتظار کر رہا تھا لیکن نجانے کیوں مجھے بے چینی سی تھی۔ میرے اندر کا شخص مجھے کچھ ایسا احساس دلا رہا تھا جس سے مجھے خطرے کی بُو آ رہی تھی۔ اگر زمان موہل مجھے نہ بتاتا تو شاید میں ایسا خطرہ محسوس نہ کرتا۔ میں کچھ دیر تک چارپائی پر لیٹا رہا، پھر کمرے میں چلا گیا۔ میرن شاہ کا دیا ہوا پسٹل اندر پڑا تھا۔ میں نے وہ اٹھایا تو میری نگاہ پیروزاں کے دیے سیل فون پر پڑی۔ ابھی میں نے اس میں سم کارڈ نہیں ڈالا تھا۔ میں نے اسے وہیں رکھا اور پسٹل نیفے میں اُڑس لیا اور ایک چادر لے کر باہر آ گیا۔ میں کچھ دیر تک وہیں کمرے کے باہر کھڑا رہا پھر چلتا ہوا پھاٹک سے باہر چلا گیا۔

وہ چاندنی رات نہیں تھی۔ ملگجے اندھیرے میں چلتا ہوا سامنے ٹیلے پر جا کر بیٹھ گیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سے ڈیرے کے اندر کا کمرا دکھائی تو دے رہا تھا لیکن پوری طرح نہیں۔ اگر کوئی آ کر مجھے روشنی کر کے دیکھتا تو میں ضرور احساس کر لیتا۔ میں نے وہ چادر وہیں ٹیلے پر بچھائی اور لیٹ گیا۔ میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ سو میں اپنی پرانی یادوں کو سوچتا ہوا وہیں بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ رات کا دوسرا پہر بھی ختم ہو گیا۔

رات ختم ہونے کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ آسمان پر تاروں کی چال بتا رہی تھی کہ دو گھڑی بعد صبح ہونے والی ہے لیکن ڈیرے میں کہیں کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوئی تھی۔ نیند کا غلبہ مجھ پر طاری ہونے لگا تھا۔ جسم بھی سست پڑنے لگا تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ شاید مجھے نیند کا ایک جھٹکا لگا تھا لیکن اچانک میرے سارے حواس بحال ہو گئے۔ ڈیرے کے دائیں جانب سے مجھے کسی جیپ کی آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کوئی جیپ ہے، اتنی دیر میں وہ جیپ ڈیرے کے پھاٹک پر آ کر رُک گئی۔ اس کی ہیڈ لائٹس بند تھیں۔ میں پوری طرح چوکنا ہو گیا۔ وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ میرن شاہ کے لوگ ہوتے تو بلاشبہ ان کی ہیڈ لائٹس جل رہی ہوتیں۔ جیسے سجان اور اس کے کارندے تھے۔ ان کو جیپ اندر لے جاتا تھی۔ بنا روشنی کیے ڈیرے کے باہر جیپ کا کیا کام؟ میں نے نیفے سے پسٹل نکال لیا اور پوری توجہ سے اس جانب دیکھنے لگا۔

جیپ سے نجانے کتنے لوگ اُترے، وہ چار پانچ تھے یا کم زیادہ، اس کا مجھے اندازہ نہیں ہوا وہ پھاٹک کھول کر اندر گئے۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آ کر جیپ میں بیٹھے اور چل دیے۔ میں پوری توجہ سے انہیں دیکھتا رہا۔ انہوں نے جیپ موڑی نہیں سیدھے چلتے چلے گئے۔ کافی آگے جا کر انہوں نے ہیڈ لائیٹس روشن کر لیں اور پھر تیزی سے میرن شاہ کے گھر کی جانب سے نکلتے چلے گئے۔ جس وقت وہ میرن شاہ کے گھر کے قریب گئے تھے، تب کتے بھونکنے لگے۔ وہ بھی کچھ اس طرح بھونکے تھے کہ ان کے بھونکنے میں شدت نہیں تھی۔ ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب کوئی مانوس ہو۔ کیا وہ میرن شاہ کے لوگ تھے؟ یہ سوال میرے ذہن میں اٹک گیا۔ اس کا جواب مجھے فوری طور پر نہیں مل سکتا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے ان حالات کو سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

دن کا اُجالا پھیلنے میں ابھی تھوڑا وقت تھا۔ بستی کی مسجد میں سے اذان کی صدا گونج اٹھی تھی۔ گہرے سناٹے میں یہ گونجتی ہوئی آواز اگرچہ ہلکی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے لگا جیسے ہر جانب تقدس پھیل گیا ہو۔ میں نے اٹھ کر چادر سمیٹی، پسٹل نیفے میں رکھا اور ڈیرے کی جانب چل دیا۔

رات جب میں یہاں سے نکلا تھا تو کمرے کی کنڈی لگا کر گیا تھا لیکن اس وقت وہ کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے دروازے کو ہلکا سا دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ ممکن ہے اندر کوئی ہو؟ اس خیال سے میں ٹھٹک کر رک گیا۔ میں دروازے پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ رہائش گاہ کی دیوار میں ہلکے سے میرا نام پکارا گیا۔ میں نے اس جانب دیکھا تو مجھے ساوری دکھائی دی۔ وہ تیزی سے اپنا ہاتھ ہلا کر مجھے اپنی جانب بلا رہی تھی۔ میں اس طرف بڑھ گیا۔ میں جیسے ہی اس کے پاس پہنچا اس نے کہا۔

”آجا، اندر آجا۔“

”اندر، مطلب کیا کہہ رہی ہو؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”کہہ رہی ہوں نا آجا“ اس نے کہا اور پلٹ گئی۔ میں دروازہ پار کر کے اندر چلا گیا۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ایک جانب بنے ہوئے باورچی خانے میں لے گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک اسٹور ٹائپ کمرا تھا۔ وہ اس کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی، ”ادھر، اندر ہو کر بیٹھ جا دروازے کے پاس، وہ پیڑھا لے لو۔“

”گھر میں ......“ میں نے پوچھنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”کوئی بھی نہیں ہے سوائے .... اماں سئین کے۔ پیروزاں بھی رات کی نہیں ہے۔ میرن شاہ تو کل شام کا نہیں ہے۔“

”اگر کوئی اور آ گیا تو میرا کچھ نہیں جائے گا، تجھے ہی پوچھیں گے۔“ میں پُرسکون ہو کر ایک پیڑھے پر بیٹھ گیا۔ ہم دونوں اتنے قریب تھے کہ ہولے ہولے کی جانے والی باتیں سنائی دی جا سکیں۔

”ابھی کوئی نہیں آئے گا، آیا بھی تو اسے پتا نہیں چلے گا“ اس نے کہا اور.... سامنے بیٹھ گئی تب میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”اچھا جلدی بتا کیا کہنا ہے، اگر کوئی آ گیا تو مشکل ہو جائے گی۔“

”رات تم کہاں تھے؟“ اس نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے دھیمے سے پوچھا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

''میں رات کئی بار گئی ہوں تمہیں دیکھنے لیکن تم کہیں نہیں تھے۔ کمرے کی کنڈی لگی ہوئی تھی، پھر مجھے لگا کوئی ہے، میں انہیں پہچاننے کی کوشش کرتی رہی لیکن وہ میری پہچان میں نہیں آئے۔ وہ کوئی تیرے جاننے والے تھے کیا؟'' اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، میں تو رات ڈیرے پر تھا ہی نہیں۔'' میں نے بتایا تو اُس کے چہرے پر حیرت پھیل گئی۔ وہ میری جانب یوں دیکھنے لگی جیسے کوئی ہونق دیکھتا ہے۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''علی، بچنا چاہتے ہو تو بھاگ جاؤ یہاں سے.....''

''ہوا کیا ہے مجھے بتاؤ بھی۔'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''رات جو بندے آئے تھے، وہ تیرے دوست نہیں ہو سکتے۔ تم رتو بھوہڑ کو نہیں جانتے، وہ بہت گندہ بندہ ہے۔'' اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

''میں نے وہ بندے دیکھے ہی نہیں تو میں کیا کہہ سکتا ہوں، تم ہی بتا رہی ہو۔'' میں نے صاف مکرتے ہوئے کہا۔

''دیکھ، چاہے کچھ ہو جائے، پیروزاں اور میرن شاہ ایک دوسرے کو نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ لوگوں کے لیے چاہے جتنے دشمن بن جائیں لیکن اندر سے ایک ہی ہیں۔ یہ مت سمجھنا کہ یہ ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔''

''تمہارا خیال ہے وہ بندے میرے دشمن بن کر آئے تھے؟'' میں نے پوچھا تو وہ تیزی سے بولی۔

''میں یہ تو نہیں کہہ سکتی لیکن یہ جو پیروزاں کے طور طریقے ہیں نا یہ مجھے بڑے غلط لگ رہے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''میں تجھے رات اس لیے بار بار دیکھنے جا رہی تھی کہ تجھے بتا سکوں پیروزاں مجھے اپنے ساتھ بہاول پور کیوں لے کر گئی تھی۔ تاکہ تجھے خبردار کر سکوں کہ اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

''کیا چل رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اُسے بچپن سے جانتی ہوں، وہ کتنی خبیث ہے، یہ بھی مجھے پتا ہے۔ وہ مجھے تمہارے ساتھ صرف اس لیے لے کر گئی تھی کہ اگر تم میں اور مجھ میں کوئی بات ہے تو اسے پتا چل جائے۔ اس کے لیے اس نے کوٹھی کے سارے ملازمین کو ہدایت کر دی تھی۔ یہ تو ایک میری پرانی سہیلی نے بتا دیا۔ ورنہ بات کھل جانے پر وہ......'' وہ کہتے کہتے رُک گئی تو میں نے اُکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''وہ ایسا کیوں کرے گی؟''

''تم نے اسے خوش کیا؟ جو وہ چاہتی ہے تم نے پورا کیا؟ اگر تم نے اسے دھتکار دیا ہے تو کیا یہ اس کی بے عزتی نہیں؟ اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میرے تم سے کوئی تعلق تو نہیں بن گئے۔ میں ساری بات سمجھ گئی۔ تم اس کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتے ہو۔ وہ اب تمہیں کسی بھی وقت مروا سکتی ہے۔'' اس نے دبے دبے جوش سے کہا تو میں نے دھیمے سے پوچھا۔

''تم مجھے یہ اطلاع کیوں دے رہی ہو؟''

میں نے کہا تو اس نے گھوم کر میری طرف دیکھا جیسے میری بات سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو، ایک دم سے اس کا چہرہ غصے سے بگڑ گیا پھر اگلے ہی لمحے اس نے گھما کر تھپڑ دے مارا۔ چٹاخ کی آواز کے ساتھ مجھے کان اور گردن پر جلن محسوس ہونے لگی۔ میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے دکھ، مایوسی اور غصے میں کہا۔

''تجھے مر ہی جانا چاہیے بس...... چلے جاؤ یہاں سے۔''

''ساوری، یہ تم نے کیا کیا، میں نے تو......'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے غصے کی انتہا کر دی۔

''بس تم چلے جاؤ یہاں سے، مرو جیو، یا جو مرضی کرو...... جاؤ۔''

اس نے منہ پھیر لیا۔ میں وہیں بیٹھا رہا۔ اس کا ردِعمل بڑا جاندار تھا۔ اتنی شدت تو ابھی میں نے بھی نہیں سوچی تھی۔ وہ دودھ بلونے لگی۔ میں کچھ دیر بیٹھا رہا پھر ہولے سے کہا۔

''ساوری، چل معاف کر دے، غلطی ہو گئی، میں نے تو یونہی پوچھا تھا۔''

''میں نے کہا نا اس وقت میرے سامنے سے چلا جا، تو بس چلا جا۔'' لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ باہر ہلکا سا کھٹکا ہوا، کوئی صحن میں آ گیا ہو۔ وہ زور زور سے دودھ بلونے لگی۔ میں نے آواز پر کان دھرا تو باہر کسی کے کھنکھارنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی قدموں کی چاپ ابھری، تب ساوری نے مجھے پیچھے دھکیل کر دروازہ بند کرتے ہوئے سرگوشی کی۔

''چپ رہنا۔''

اس کے ساتھ ہی قدم باہر تک آ گئے۔ میں دروازے کی درز میں سے باہر دیکھنے لگا۔ تبھی آواز ابھری۔ ''ساوری پتر۔''

''آ چاچا، میں اِدھر ہوں۔'' اس نے کہا تو اس کے ساتھ ایک بوڑھا چرواہا دودھ کا مٹکا اٹھائے اندر آ گیا۔ اس

نے مٹکا رکھا اور بنا کچھ کہے واپس پلٹ گیا۔ بلاشبہ یہ روزانہ کا معمول تھا۔ اس کے جاتے ہی ساوری نے دروازہ کھول دیا پھر ہولے سے بولی۔

''اب دن چڑھ جائے گا، تم جاؤ۔ میں نے خبردار کر دیا۔ اب تم جانو اور تمہارا کام...... جاؤ۔''

میں اٹھا اور احتیاط سے اِدھر اُدھر دیکھ کر ڈیرے تک جانے والا دروازہ پار کر گیا۔

دن کا اُجالا پھیل چکا تھا جب بابا خیر دین میرے لیے کھانا لے کر آیا۔ میرے چہرے پر شاید ضرورت سے زیادہ سنجیدگی تھی۔ مجھے اس وقت احساس ہوا جب بابا خیر دین نے ٹرے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔

''خیر تو ہے نا پتر، بڑی گہری سوچ میں ہو؟''

''نہیں بابا، بس رات سے یہی سوچ رہا ہوں کہ میں نے اپنا کام ذرا سا بھی نہیں کیا، ایویں ہی خواہ مخواہ ان کے چکروں میں پڑ گیا ہوں۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔

''بس یہی تو سب سے بڑا مسئلہ ہے، یہاں کسی کو کچھ سوجھتا ہی نہیں۔'' اس نے ذرا سا مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں تو سوچ رہا ہوں واپس چلا جاؤں۔'' میں نے کہا تو وہ ایک دم سے مرجھا گیا، جیسے مجھ سے یہ امید نہ ہو، پھر کچھ دیر بعد دھیمے سے بولا۔

''ہاں پُتر، تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔''

میں نے ایک بار اس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے نگاہیں پھیر کر باہر کی جانب لپک گیا تھا میں اس کی بات نہیں سمجھ سکا۔ لیکن اس کا لہجہ بہت کچھ بتا رہا تھا یا پھر میں اپنے تئیں خود ہی اندازہ لگا بیٹھا تھا۔

مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں خطرے میں گھر گیا ہوں۔ میرا دشمن میرے سامنے تھا۔ اب مجھے انتظار صرف اس بات کا تھا کہ مجھ پر یلغار کس طرف سے ہوتی ہے۔ رات میں اپنے اندازے کے باعث ایک حملے سے بچ گیا تھا۔ مگر میں یہ پوری طرح یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ لوگ میری خاطر آئے تھے؟ ممکن ہے ان کا ہدف کوئی دوسرا ہو۔ مجھے زمان کی طرف جانے کا خیال آیا۔ اس وقت وہی ایک شخص اہم تھا۔ وہ چاہے بھولپن میں مجھ سے ساری باتیں کہہ رہا تھا یا کسی کا پیغام مجھ تک پہنچا رہا تھا جو بھی تھا، اس کی باتوں سے کوئی نہ کوئی سرا ملنے کی امید ضرور تھی۔ بابا خیر دین وہاں سے جا چکا تھا۔ میں اٹھا اور سیل فون والا ڈبا اٹھا لیا۔ میں ایسا پاگل نہیں تھا کہ سیل فون کے بارے میں جانتا نہیں تھا۔ جس طرح میں بہت کچھ سوچ کر یہاں پسٹل تک اپنے ساتھ نہیں لایا تھا، اسی طرح میں نے سیل فون بھی ساتھ نہیں لیا تھا۔ میں خالی ہاتھوں اس علاقے میں آیا تھا۔ صرف میرے پاس حوصلہ تھا اور میرے من میں وہ سلگتا ہوا ہدف تھا جسے مجھے حاصل کرنا تھا۔ میں جانتا تھا کہ سیل فون کس بلا کا نام ہے۔ یہ اگر بندے کو چھپا بھی لیتا ہے تو بالکل ظاہر بھی کر دیتا ہے۔ یہ جدید ٹیکنالوجی اسی کی ہے جو اس کے بارے میں انفارمیشن رکھتا ہے۔ میں تیزی سے وہ ڈبا کھول رہا تھا تاکہ سیل فون کو کھول کر دیکھوں۔ اس سے مجھے پتا چل جاتا تھا کہ پیروزاں کی نیت کیا ہے؟ میں نے ڈبا کھولا، اس میں سے سیل فون نکال لیا۔ بظاہر اس پر کوئی ایسا نشان نہیں تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ اس فون کو اندر سے کھولا گیا ہے۔ میں نے اندر تک اسے دیکھا تو میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اس فون کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی گئی تھی۔ اگر میں اس میں سم کارڈ ڈال کر اپنے ساتھ لے کر پھرتا تو میرے بارے میں ہر وقت پتا چلتا رہتا کہ میں کہاں ہوں۔ پیروزاں کے ذہن میں کیا تھا؟ اب یہی فون اس کی نیت کو سامنے لانے والا تھا۔ میں نے وہ ڈبا بند کیا۔ اسے جیب میں رکھا۔ پسٹل نیفے میں اُڑسا اور جیپ لے کر ڈیرے سے نکل گیا۔

میں جس وقت پھاٹک سے نکلا تھا، اسی وقت میری نگاہ سانول پر پڑی جو اپنے ریوڑ کے ساتھ ببول کے درخت تلے کھڑا تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر جیپ روک دی۔ وہ پہلے تو میری جانب نہیں دیکھ رہا تھا لیکن جیپ رک جانے پر اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی نگاہوں میں نفرت پھیلی ہوئی تھی۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر یوں منہ پھیر لیا جیسے مجھ سے کوئی سروکار نہ ہو۔ وہ جیسا بھی تھا، پہلے کبھی اس نے میری طرف یوں نہیں دیکھا تھا۔ میں نے جیپ کو اسٹارٹ ہی رکھا اور اُتر کر اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر رخ میری جانب کر لیا۔ میں نے قریب جا کر سلام کیا تو اس نے بڑی بے دلی سے جواب دیا۔ تب میں نے پوچھا۔

''یار، میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے، تم کیوں مجھے ایسے دیکھ رہے ہو؟''

''اُو جاؤ جاؤ، اپنا کام کرو۔ مجھے تم سے بات نہیں کرنی۔'' اس نے نفرت زدہ لہجے میں کہا تو میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی طرف سے ایسا اظہار میرے لیے ناقابلِ فہم تھا۔ وہ اگر پہلے کے مانند کسی خوف کے باعث مجھ سے بات نہ کرنا چاہتا تو اس کی سمجھ آتی تھی لیکن وہ اس قدر نفرت سے بات کر رہا تھا...... یہ میرے لیے عجیب بات تھی۔

''یار بات سن، میری تم سے ایسی کیا دشمنی ہے کہ تم مجھ سے بات کرنا ہی پسند نہیں کرتے ہو؟'' میں نے عجیب بے چارگی سے کہا تو اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تیری میری ایسی دوستی بھی کیا ہے کہ میں تم سے بات کروں۔ جاؤ اپنا کام کرو۔''

اس کے الفاظ پہلی بار مجھے دکھ دے گئے۔ اس قدر حقارت، نفرت اور طنز بھرا لہجہ مجھ سے برداشت ہی نہیں ہو پایا۔ میں بنا کچھ کہے پلٹ کر جیپ کی جانب بڑھ گیا۔ میرا دماغ سلگنے لگا تھا۔

☆☆☆

''لے یوں چلاتے ہیں اِس کو...... بتا کوئی نمبر اگر کوئی تجھے یاد ہے۔'' زمان نے سیل فون کو روشن کرتے ہوئے کہا۔ وہ سم کارڈ ڈال چکا تھا اور اب مجھے کال کرنے کا طریقہ سمجھا رہا تھا۔ میں پیڑھے پر بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ مجھے ایک نمبر یاد تھا، میں نے وہ بتا دیا۔ اس نے تیزی سے وہ نمبر پش کیے اور میرے کان سے لگاتا ہوا بولا۔ ''دیکھو دوسری جانب بیل جا رہی ہے۔''

''یار اتنا تو میں جانتا ہوں۔'' میں نے سیل فون اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ پھر ٹون جانے کی آواز سنتا رہا۔ کچھ ہی دیر بعد دوسری جانب سے فون ریسیو کر لیا گیا۔ وہ چاچا عبدالمجید تھا۔ جس کے پاس میرا بچپن گزرا تھا۔

''ہیلو چاچا، میں علی بات کر رہا ہوں۔''

''اوئے پُتر کی حال اے تیرا، کتھے گواچ گیا اے۔''

''بس چاچا روزی روٹی کے چکر میں یہاں روہی آیا تھا۔ نوکری جو کرنی ہے۔ اب یہاں ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیسے دن گزر رہے ہیں، موسم کیسا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''موسم پہلے تو اچھا تھا، بڑا پُرسکون...... لیکن اب کافی سخت ہو گیا ہے۔'' میں نے جواب دیا تو چاچا نے پوچھا۔

''کیا خیال ہے، واپس کب آنا ہے؟''

''دیکھتے ہیں، واپس آنا ہے یا آگے کوئی کام نکل آتا ہے۔'' میں نے جواب دیا تو دوسری جانب خاموشی چھا گئی پھر چند لمحوں بعد چاچا بولا۔

''میرے لائق کوئی گل بات؟''

''بس چاچا اپنی خاص دعا میں یاد رکھنا۔ موسم کافی سخت ہے، جلدی جلدی کام ہو جائے۔ اب بھی پتا نہیں میں کہاں پڑا ہوں۔''

''چل ٹھیک ہے پھر، میری دعائیں تیرے ساتھ ہیں۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میری جانب سے بھی فون بند ہوا تو زمان تیزی سے بولا۔

''یوں بات ہو جاتی ہے۔ جب کسی کا فون آ جائے تو یوں سنتے ہیں، دیکھو، میں کال کرتا ہوں تمہیں۔''

وہ کچھ دیر تک مجھے فون کے بارے میں سمجھاتا رہا اور میں بڑے تحمل سے اس کی ہر بات سمجھتا رہا۔ اسے یہ باور ہو گیا کہ میں سیل فون کے بارے میں بالکل بھی نہیں جانتا۔ سیل فون والے 'کھیل' سے فراغت ملی تو میں نے پوچھا۔

''سنا رتو بھوہڑ کی جانب سے کوئی خیر خبر سنا۔''

''میں نے تو بات نہیں کی لیکن اُڑتی اُڑتی خبر ملی ہے کہ پیروزاں مائی کی بات ہوئی ہے رتو بھوہڑ سے۔ اس نے وہی ڈیمانڈ کی ہے، علی کو دے جاؤ اور اپنی گائیں لے جاؤ، یا پھر علی میں ہمت ہے تو آ کر گائیں لے جائے۔''

''یہ رتو بھوہڑ کی ضد ہے یا پھر ان راجھستانیوں کی؟'' میں نے پوچھا۔

''اب میں کیا کہہ سکتا ہوں؟'' اس نے بے چارگی سے کہا تو میں چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر پیڑھے سے اٹھ کر اس کے بیڈ پر لیٹتے ہوئے بولا۔

''یار، میں یہاں پڑا ہوں۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا پھر اٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں وہیں لیٹا رہا پھر نجانے کب سو گیا۔

میری آنکھ مسلسل فون بجنے سے کھلی۔ میں نے اسکرین پر نمبر دیکھا تو وہ چاچا عبدالمجید کا تھا۔ میں نے کال پک کی تو وہ میری آواز سنتے ہی بولا۔

''بیٹا میں نے تیرے لیے دعا کر دی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اب تیرے لیے موسم سخت نہیں رہے گا۔''

''ٹھیک ہے، بس آپ بزرگوں کی دعائیں چاہئیں۔'' میں نے منمناتے ہوئے کہا تو چاچا عبدالمجید بولا۔

''ویسے سنا ہے روہی میں دودھ مکھن بہت ہوتا ہے۔ کھاؤ پیو اور خوب کسرت کرو۔ تھوڑا جسم بنا کر آنا۔''

''میں یہی سوچ رہا ہوں۔ ویسے کھانے پینے کی فکر نہیں، یہاں بہت کچھ ملتا ہے۔ کسرت تو آج ہی سے شروع کر دوں گا۔''

''وہاں کہیں کوئی مزار دیکھ لینا، وہاں سے خوب لنگر کھانا، دنوں میں موٹے ہو جاؤ گے۔'' اس نے ہنستے ہوئے

کہا تو میں بھی ہنستے ہوئے بولا۔
''ضرور، کیوں نہیں، لنگر ہی چلے گا۔''
''چل ٹھیک ہے۔ ہو سکے تو جلدی چکر لگانا۔'' اس نے پیار بھرے انداز میں کہا تو میں نے چند الوداعی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔
شام ڈھلنے والی تھی، جب میں واپس ڈیرے پر جا پہنچا۔ حسب معمول بابا خیر دین چار پائیاں بچھائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں جیپ کافی پیچھے ہی کھڑی کر کے اس کے پاس بیٹھا تھا کہ اس نے کہا۔
''پتر، میرن شاہ جی تمہارے بارے میں دو بار پوچھ چکے ہیں۔''
''ٹھیک ہے اُسے میرے آنے کے بارے بتا دو۔'' میں یہ کہتا ہوا چار پائی پر لیٹ گیا۔ بابا خیر دین اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ میرا کھانا لے کر آ گیا۔ میں کھانا کھا چکا اور بابا خیر دین برتن لے کر جا چکا تو اس کے تھوڑی دیر بعد میرن شاہ آ گیا۔ وہ میرے سامنے والی چار پائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
''یار تمہیں پتا تو چل گیا ہوگا کہ پیروزاں مائی کی گائیں وہ رتو بھوہڑ اور ان راجھستانیوں نے......''
''ہاں میں نے سنا، تمہارے پاس اتنے بندے ہیں، تم چھڑوا کیوں نہیں لیتے ہو، ایسے تو کوئی بھی تمہاری گائیں اونٹ مویشی پکڑ کر لے جائے گا۔''
''رتو بھوہڑ نے یہ سب تیری دشمنی میں کیا ہے۔ وہ تجھے مانگ رہا ہے۔''
''پھر کیا سوچا تم نے؟'' میں نے پوچھا۔
''یہی کہ گائیں ان سے واپس لانی ہیں، چاہے جیسے بھی لائی جائیں۔ میں نے چار لوگوں میں بیٹھ کر رتو بھوہڑ سے بات کی، مگر وہاں اس نے تیری ضد رکھ دی۔ اور میں تجھے دے نہیں سکتا، اس طرح سے میری پورے علاقے میں ساکھ ختم ہو جائے گی۔ یوں گائیں بھی نہیں چھوڑی جا سکتیں، اب سیدھی سیدھی لڑائی بنتی ہے۔ وہ میں لڑوں گا۔'' اس نے دبے دبے غصے میں کہا۔
''میرے لیے کیا حکم ہے؟'' میں نے سکون سے پوچھا۔
''تیری مرضی، یہاں رہے، واپس جا یا پھر ہمارے ساتھ لڑ۔'' اس نے صاف لفظوں میں کہا تو میں خاموش ہو گیا۔ میری جانب سے کوئی جواب نہ پا کر بولا، ''دیکھ اگر تو وہ گائیں واپس لے آ، تو جتنی قیمت بنتی ہے، اس سے دوگنی قیمت میں تجھے دوں گا، جتنے لوگ ساتھ لے جانا چاہے وہ میں دوں گا جو خرچ آئے کر۔ یہ اب ساکھ بچانے کا معاملہ ہے۔'' اس نے جوش سے کہا۔
''ٹھیک ہے، میں کل دیکھتا ہوں اس معاملے کو، مجھے بندوں سے ملوا دو، میں کوشش کرتا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔'' میں نے کہا تو وہ بے ساختہ بولا۔
''یہ ہوئی نا بات، وہ جس کو مانگ رہے ہیں وہی ان سے گائیں لے آئے تو پورے علاقے میں خوف بیٹھ جائے گا۔''
''تو پھر ڈن ہو گیا، کل مجھے بندے دینا، لیکن بہت خاموشی سے دشمن کو پتا نہیں لگنا چاہیے کہ اِدھر کیا ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا
''صبح گوپے پر آ جانا، وہیں سب کو ملوا دوں گا۔'' اس نے کہا اور پھر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اٹھ گیا۔
رات کا سناٹا پھیل گیا تھا۔ میں اپنی پوری تیاری کر کے کچے کمرے سے باہر نکلا اور جیپ لے کر نکل گیا۔ پیروزاں کا دیا ہوا فون میں نے محفوظ کر کے اپنی جیب میں ڈال لیا اور میرن شاہ کا دیا ہوا پسٹل میں نے وہیں کمرے میں چھوڑ دیا تھا۔ میرے پاس چند گھنٹے تھے اور انہی چند گھنٹوں میں وہ کچھ کرنا چاہتا تھا، جس سے میں بہت سارے اہداف حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ میں پورا گیم سمجھ گیا تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مجھے جس طرح گھیرنا چاہ رہے تھے، میں وہی گیم ان پر الٹنا چاہتا تھا۔ میرا رخ بستی چراغ شاہ کے شمال کی جانب تھا۔ وہاں ایک بزرگ کا مزار تھا۔
وہ بزرگ کون تھے؟ ان کا مزار کب سے تھا، میں اس کے بارے میں نہیں جانتا تھا لیکن پتا نہیں کب سے وہاں پر عرس بھی ہوتا تھا اور میلہ بھی لگتا تھا۔ لوگ دور دراز سے وہاں حاضری دینے جاتے تھے۔ مجھے وہاں پہنچنے میں تقریباً پندرہ منٹ لگے۔ میں نے جیپ کچھ فاصلے پر پارک کی اور مزار کے احاطے کی جانب بڑھا۔ رات ہونے کی وجہ سے اِکا دُکا لوگ وہاں تھے۔ میں احاطے میں چلا گیا۔ بڑے سے پکے صحن میں بڑے بڑے درخت تھے۔ جن کے اردگرد دائرے میں سیمنٹ کی اتنی بڑے بینچیں بنائی ہوئی تھیں کہ لوگ وہاں پر بیٹھ بھی جاتے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ سو قدم کے فاصلے پر صاحب مزار کا روضہ تھا، جس کا دروازہ اس وقت بند تھا۔ باہر کی جانب کچھ درویش ملنگ لیٹے ہوئے تھے۔ کسی پر گدڑی تھی اور کسی پر نہیں۔ اس وقت ایسی ہی ایک رات کا وحشت ناک منظر میری نگاہوں کے سامنے پھر گیا۔ مجھے یوں لگا سناٹے میرے چاروں طرف اُگ آئے ہوں۔ چیختی

چلاتی آوازوں نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا ہو۔ آہیں، کراہیں اور چیخیں میرے چاروں جانب پھیل رہی ہوں۔ مجھے لگا جیسے میں پھٹ جاؤں گا۔ اچانک سناٹا چیرتی ہوئی مانوس آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''علی بھائی کیسے ہو؟''

''اوہ، شعیب تم، کب پہنچے؟'' میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ میری جانب دیکھتا ہوا مسکرا رہا تھا۔

''ہم کل صبح آئے تھے۔'' اس نے دھیمے سے کہا۔

''رات کہیں تم ہی تو ڈیرے کی جانب ......'' میں نے پوچھا۔ اس نے پہلے میری جانب دیکھا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''نہیں، ہم نہیں تھے۔''

''تو پھر وہ کون ......'' میں کہتے کہتے رُک گیا، پھر تیزی سے بولا۔ ''او کے اس کا پتا بعد میں کرتے ہیں، باقی لوگ کہاں ہیں؟''

''یہیں ایک بستی ہے، وہاں پر ہیں۔'' اس نے کہا اور مزار کے احاطے سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔

''کون کون ہیں؟'' میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

''جہانگیر، آفتاب اور مدثر۔'' اس نے اختصار سے بتایا۔

''چاچا سے رابطہ ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے ہمیں بتا دیا تھا، ورنہ کل صبح ہم خود تمہارے پاس پہنچ جاتے۔ تمہارے محکمے کے آفیسر بن کر۔'' اس نے کہا اور ہلکا سا قہقہہ لگا دیا۔

''ان کے پاس گاڑی ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، ہے، مگر بات کیا ہے؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''انہیں یہاں بلا لو، تب تک میں تمہیں ساری صورتِ حال بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا تو اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آر یو شیور......؟''

''بالکل، کیل کانٹے سے لیس ہو کر آئیں۔'' میں نے کہا تو اس نے اپنی جیب سے سیل فون نکالا اور کال کرنے لگا۔ ایک آدھ منٹ میں اس نے بات سمجھا دی۔ پھر فون واپس جیب میں رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''معاملہ کیا ہے؟''

''پہلی بات تو یہ ہے اس وقت میری جیب میں ایک فون ہے جو مجھے ٹریس کر رہا ہے۔ میں ٹریس کرنے والوں کو دھوکے میں رکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے سمجھایا تو بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ تب میں اسے بتانے لگا کہ یہاں پر صورتِ حال کیا ہے۔

☆☆☆

ہم طاقتور فور وہیل میں بیٹھے ہوئے مزار سے جنوب کی جانب جا رہے تھے۔ یہ وہ راستہ تھا جو رتو بھوہڑ کے ڈیرے کی جانب جاتا تھا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اور اس کے راجھستانی دوست چوکنا نہ ہوں۔ وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ کم از کم میں انہیں غافل نہیں سمجھ سکتا تھا۔ میں نے اپنی جیپ وہیں چھوڑ دی تھی، جس کے ڈیش بورڈ میں پیروزاں کا دیا ہوا سیل فون پڑا تھا۔ میں نے راستے میں ان چاروں کو اپنے منصوبے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ میری بات سمجھ گئے تھے۔ رتو بھوہڑ کا ڈیرا تھوڑے سے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ میں نے سامنے دیکھا اور شعیب کو بتایا۔

''وہ دیکھو سامنے، وہاں جو پیلے رنگ کا بلب روشن ہے، وہ ہے ڈیرا۔''

''کوئی آئیڈیا......'' اس نے ہولے سے پوچھا۔

''نہیں، کوئی پتا نہیں وہاں پر کتنے لوگ ہو سکتے ہیں۔ بس چار دیواری ہے، اس کے اندر مویشی ہوں گے یا پھر چرواہے چوکیدار۔''

''وہ رتو بھوہڑ......؟'' اس نے پوچھا۔

''وہیں جا کر پتا چلے گا۔'' میں نے کہا تو وہ میری بات سمجھ گیا۔ اس نے فور وہیل روکتے ہوئے کہا۔

''کیا خیال ہے پھر وہیں جا کر دیکھتے ہیں۔''

کسی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ جو چاہتا ہے کرے، وہ پوری طرح تیار تھے۔ ایک پسٹل اور کافی سارے میگزین میں نے لے لیے تھے۔ آفتاب فور وہیل بھگاتا ہوا بالکل پھاٹک کے پاس جا رکا۔ ڈیرے کے اندر سے کتّے زور زور سے بھونکنے لگے تھے۔ اندھیرا اتنا گہرا نہیں تھا۔ میرے خیال میں وہاں کوئی بندہ ہوتا تو اب تک اسے جاگ جانا چاہیے تھا۔ اگر کوئی جاگ گیا تھا تو پھر وہ انتظار میں تھے۔ جہانگیر نیچے اترا اور اس نے جا کر پھاٹک کھولنے کے لیے دھکیلا۔ عموماً ایسے پھاٹک یا تو کھلے رہتے ہیں یا پھر اندر سے ایک لکڑی پھنسائی ہوئی ہوتی ہے جسے مقامی زبان میں 'ہوڑا' کہتے ہیں۔ پھاٹک کھلتا چلا گیا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سامنے بڑے سے صحن میں دو ڈھائی سو مویشی تھے۔ ان میں بکریاں، گائیں، بیل، بھیڑیں اور اونٹ سبھی شامل تھے۔ کوئی کھڑا تھا اور کوئی بیٹھا

ہوا تھا۔ آفتاب نے ہارن دیا جو سناٹے کو چیرتا چلا گیا۔ ہمیں امید تھی کہ کوئی نہ کوئی تو باہر آئے گا، پتا کرے گا۔ کچھ دیر بعد دو نوجوان پھاٹک کے پاس اچانک نمودار ہوئے۔ ایک آگے بڑھا تو دوسرا اس کے پیچھے ٹھہر گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اس کے کور پر ہے۔ بلاشبہ ان کے پاس ہتھیار تھے۔ لاشعوری طور پر وہ نوجوان ڈرائیور کی جانب گیا۔ وہ ذرا فاصلے پر اندر دیکھتا ہوا بولا۔

''کیا بات ہے، کون ہو تم؟''

''او یار رتو بھوہڑ کا ڈیرا یہی ہے؟'' آفتاب نے جواب دینے کے بجائے پوچھا تو اس نوجوان نے تیزی سے کہا۔

''ہاں یہی ہے، لیکن تم کون لوگ ہو؟''

''یار ہم شہر سے آئے ہیں، اس سے تھوڑا کام ہے۔'' آفتاب نے کہا۔

''وہ تو یہاں نہیں ہے۔ وہ اس وقت اپنے گھر پر ہوگا۔'' نوجوان نے کہا۔

''یار پھر اسے کیسے پتا چلے کہ سلمان دولتانہ آیا ہے۔'' آفتاب نے کہا تو اس نوجوان نے پوچھا۔

''تمہیں اس کے گھر کا پتا نہیں ہے؟''

''میں پہلی دفعہ آیا ہوں۔ بڑا خجل خوار ہوئے ہیں، لوگوں سے پوچھ پوچھ کر یہاں پہنچے ہیں۔ یار تم تھوڑی مدد کرو اور اسے بتا دو۔'' اس نے سکون سے کہا تو نوجوان تھوڑا تذبذب میں پڑ گیا پھر بولا۔

''تم اندر آنا چاہو تو آ جاؤ، اس سے رابطہ کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' آفتاب نے کہا اور مزید کوئی سوال کیے بنا فور وہیل اندر لے گیا۔ مویشیوں کے درمیان سے کافی راستہ بنا ہوا تھا۔ سامنے چند کچے کمرے تھے۔ جن کے برآمدے میں کچھ لوگ چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ پہلے سے جاگ رہے تھے یا ہمارے آنے سے جاگے تھے، یہ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ فور وہیل کی ہیڈ لائٹس میں وہ سبھی دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک ایک شخص پر میری نگاہ پڑی تو میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ بگا راجھستانی تھا۔ وہی بگا راجھستانی جو مجھے قتل کرنے کے لیے انتہائی بے تاب تھا۔ میں نے ہولے سے سب کو بتا دیا کہ وہ بھی ہمارے لیے ہدف ہو سکتا ہے۔

فور وہیل سے سبھی اتر گئے تھے۔ میں سب سے آخر میں تھا۔ آفتاب سمجھ گیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ چند لوگ تھے۔ ان کے سامنے دیسی شراب کی بوتل کھلی ہوئی تھی۔ پیتل کے گلاسوں کے ساتھ جگ اور پلیٹیں دھری ہوئی تھی۔ وہ موج میں تھے۔ تبھی ایک مقامی نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے وہی سوال جواب شروع کر دیے جو پہلے اس نوجوان نے کیے تھے۔ اتنے میں وہ نوجوان بھی وہیں آ گئے۔

''یار تیرے پاس فون ہے تو اسے کر لے؟''

''میں اسے کال کر رہا ہوں مگر وہ فون اٹھا ہی نہیں رہا، تم کر کے دیکھ لو، شاید اٹھا لے تمہارا فون ......'' آفتاب نے جواب دیا۔

''چل بگا تو لگا کے دیکھ فون۔'' ایک شخص نے کہا تو وہ اپنی جیب سے فون نکالنے لگا۔

ان کے سوال جواب اور باتوں میں ہم نے چاروں طرف اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ کوئی سامنے نہیں تھا۔ کوئی کمرے میں ہوگا تو اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ یہی وہ وقت تھا، جب میں نے ایکشن لینا تھا۔ میں نے ہلکی سی مخصوص سیٹی بجائی تو سبھی نے ہتھیار نکال کر انہیں کور کر لیا۔

''کوئی بھی نہیں ہلے گا، جو ہلا، وہ مرے گا۔'' آفتاب نے غراتے ہوئے کہا۔

''کہا تھا نا وہ بڑا شاطر ہے۔'' بگا راجھستانی نے یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ نکالا تو وہ خالی تھا۔

''کون شاطر......'' آفتاب نے پوچھا۔

''وہی پیروزاں کا دلال، تمہیں اسی نے بھیجا ہے نا۔'' اس نے کہا ہی تھا کہ جہانگیر آگے بڑھا اور اس کی گردن پر ہاتھ ڈال کر بولا۔

''میں تیرا باپ اِدھر ہی کھڑا ہوں۔ پہچانتا ہے مجھے ......چل اٹھ۔'' اس نے کہا اور بگا کو چارپائی سے گھسیٹ لیا۔ ایسے میں ایک بندے نے دلیری دکھائی اور کسی شیر کی طرح جہانگیر پر جھپٹا لیکن تب تک میں نے کہنی اس کے سینے پر ماری وہ اوغ کی آواز کے ساتھ چارپائیوں کے درمیان گر گیا۔

''زیادہ وقت نہیں ہے۔'' میں نے آواز بدل کر کہا تو ہم چاروں نے ان کے اردگرد فائر کر دیے۔ وہ ایک دم سے سہم کر چارپائیوں کے ساتھ لگ گئے۔ میں نے بگا کو ٹھوکروں پر رکھا تو وہ مزاحمت کرنے کے لیے اٹھا، میں نے پسٹل کا دستہ اس کے سر پر مارا تو وہیں ڈھیر ہو گیا۔

''چلو سب باہر......'' مدثر نے فائر کرتے ہوئے کہا تو وہ سبھی اٹھ گئے۔ میں نے بگا کو باندھا اور اسے گھسیٹ کر فور وہیل تک لے گیا، پھر اسے اندر ڈال کر میں نے ایک

دوسرے نوجوان کو پکڑا، اسے بھی باندھا اور فور وہیل میں لا پٹخا۔ آفتاب فور وہیل باہر لے گیا۔ ہم باقی تینوں کو لے کر ڈیرے سے باہر آ گئے۔ مدثر نے انتہائی تیزی سے ان کی تلاشی لی۔ ایک کے پاس سے ریپیٹر اور دوسرے سے ریوالور نکلا تھا۔

میں نے جس وقت ان کے سامنے پڑی شراب دیکھی تھی، میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ انہوں نے اپنے پاس ہتھیار نہیں رکھے ہوئے، عادی شرابی اپنے پاس ہتھیار یا کوئی تیز دھار شے نہیں رکھتا، انہیں یہ پتا ہوتا ہے کہ وہ نشے میں کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ گمان یہی تھا کہ ان کے پاس ہتھیار نہیں ہوں گے لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ نکل آیا تھا لیکن یہ کوئی حتمی کلیہ نہیں تھا، کئی عادی مجرم اس وقت ہی جرم کرنے کا حوصلہ پاتے ہیں جب وہ نشے میں ہوں۔

وہ ہمارے سامنے کھڑے تھے۔ باقی سب بیٹھ چکے تو میں نے پھاٹک کھولنے والے نوجوان سے کہا۔

''اب سمجھے ہو کہ میں کون ہوں؟''

''ہاں تم وہی ہو جو......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے تیزی سے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''بتا دینا رتو بھوہڑ کو، ہمیں پیروزاں نے بھیجا ہے، میں ان دونوں کو لے جا رہا ہوں۔ اگر اُس میں ہمت ہے تو یہ بندے ہم سے لے جائے۔'' یہ کہہ کر میں ذرا سا رکا، پھر اسے سمجھاتے ہوئے بولا،''اب اس کی اور ہماری دشمنی ہے مطلب پیروزاں کی......''

''تم انہیں...... کہاں...... لے کر...... جا رہے ہو؟'' اس نے اٹکتے ہوئے پوچھا تو میں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

''اگر اسے ہماری دشمنی قبول ہے تو ٹھیک، نہیں تو پیروزاں کی گائیں صبح ہوتے ہی اس کے ڈیرے پر پہنچا دے۔ ہم سمجھ لیں گے، ہماری اور اس کی کوئی دشمنی نہیں رہی، یہ بندے پوری حفاظت سے واپس آ جائیں گے۔ ورنہ، وہ اپنا بندوبست کر لے۔'' میں نے کہا اور فور وہیل کی جانب مڑا ــــ ایک قدم آگے بڑھایا پھر رکا اور پلٹ کر اس سے کہا''اور ہاں یہ بھی کہہ دینا، ہم یہاں موجود لوگوں کو مار کر اس تالاب میں پھینک کر جا سکتے تھے، ان کھجوروں کے ساتھ باندھ کر گولیاں مار دیتے لیکن ہم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ اس لیے کہ یہ صرف وارننگ ہے، اس کے بعد ہم بخشیں گے نہیں۔''

''تت...... تم وہی...... علی ہو جو...... اُس دن......'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہنا چاہا تو میں نے کہا۔

''وہ کون ہے؟''

''نہیں نہیں کچھ نہیں......'' اس نے تیزی سے کہا تو چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر فور وہیل میں جا بیٹھا تو اسی لمحے آفتاب بھی چل پڑا۔

واپسی کے راستے کی اسے کافی سمجھ آ چکی تھی۔ وہ انتہائی تیزی سے مزار سے تھوڑے فاصلے پر جا رکا۔ پھر جیب سے ایک فون سیٹ نکال کر مجھے دیتے ہوئے بولا۔

''اس سے رابطہ رہے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سیل فون پکڑا اور وہیں اُتر گیا۔ مجھے وہاں سے جیپ لے کر بستی چراغ شاہ جانا تھا۔

میں نے جیپ ڈیرے میں کھڑی کی ہی تھی کہ رہائش گاہ والی دیوار کا دروازہ کھلا اور پیروزاں تیزی سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ میں جیپ سے اترا اور کمرے کے باہر پڑی چارپائیوں کی جانب بڑھا۔ وہ مجھ سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھی۔ میں اس سے ابھی چند فٹ کے فاصلے پر ہی تھا کہ وہ ہذیانی انداز میں بڑے غصے میں بولی۔

''کہاں گئے تھے تم؟''

''کیوں کیا ہو گیا؟'' میں نے بے پروائی سے پوچھا۔

''میں کئی بار تمہیں یہاں آ کر دیکھ چکی ہوں، تم یہاں نہیں تھے۔'' اس نے پھر اسی انداز میں پوچھا تو مجھے اچھا نہیں لگا مگر میں چاہتا تھا کہ وہ اپنی بات پوری کر لے، اس لیے تحمل سے بولا۔

''میں مزار پر گیا تھا۔''

''مزار پر وہاں کیا کرنے گئے تھے؟'' اس بار وہ کافی حد تک بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔ اس کے انداز میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

''لوگ کیوں جاتے ہیں وہاں پر؟'' میں نے جان بوجھ کر بات کو بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''میرا یہ مطلب ہے کہ کم از کم بتا کر جاتے، میں خواہ مخواہ پریشان ہو رہی تھی۔ تمہیں فون بھی کرتی رہی لیکن تم نے فون ہی ریسیو نہیں کیا، کہاں ہے تمہارا فون۔'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''اوہو، وہ تو جیپ ہی میں پڑا ہے، میں لاتا ہوں۔'' یہ کہتے ہی میں مڑا اور جیپ کی جانب چلا گیا۔ میں نے جب فون ڈیش بورڈ میں رکھا تھا اسی وقت 'خاموشی' پر لگا دیا تھا۔ میں نے ڈیش بورڈ سے فون اٹھایا اور لا کر اسے دے دیا۔ اس نے تیزی سے فون میرے ہاتھ سے لیا اور پھر اسکرین

روشن کر کے بولی۔
''یہ دیکھو اتنی کالیں کی ہیں تمہیں۔''
''مجھے نہیں پتا۔'' میں نے بے پروائی سے کہا تو کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہوگئی۔ میں چارپائی پر جا بیٹھا۔ تو وہ میرے سامنے آبیٹھی پھر سکون سے بولی۔
''تمہیں پتا ہے کہ اس وقت حالات کیسے ہو رہے ہیں؟''
''حالات تو کبھی بھی ایک جیسے نہیں رہتے جو یہاں ہیں، اس میں منافقت بہت ہے۔ لوگ دھوکا بہت دیتے ہیں۔'' میں نے جان بوجھ کر کہا۔
''یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو، لیکن جب سے رتو بھوہڑ والا معاملہ بنا ہے، حالات بہت خراب ہوگئے ہیں۔ میرن شاہ کچھ نہیں کر رہا ہے۔'' اس نے کہا۔
''نہیں، وہ تو میرے ساتھ معاملہ کر کے گیا ہے۔ اس نے طے کیا ہے کہ مجھے بندے دے گا۔ کل اس کا فائنل ہو جائے گا۔'' میں نے بڑے محتاط انداز میں کہا تو وہ بولی۔
''یہ بات میرن شاہ نے تو مجھے نہیں بتائی، کب ہوئی بات؟''
''ابھی شام کو۔'' میں نے بتایا۔
''تو پھر تم تیار ہو؟'' اس نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔
''ظاہر ہے، اس نے مجھے آفر دی ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے میرن شاہ سے ہونے والے معاملے کی تفصیل اسے بتادی۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ ساری بات سن کر اس نے کہا۔
''میں پھر پوچھ رہی ہوں کہ تم تیار ہو؟''
''ہاں میں تیار ہوں۔'' میں نے حتمی انداز میں کہا۔
''تو ٹھیک ہے، پھر میں تمہیں بتاؤں گی کہ حالات کیا ہو گئے ہیں، صبح بات کرتے ہیں۔'' اس نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ میں بہت کچھ سمجھ رہا تھا، ابھی تک دونوں میرے سامنے کھل نہیں رہے تھے۔ اب صبح ہی ان کا اصل رنگ سامنے آنے والا تھا۔

☆☆☆

صبح کا اُجالا پھیل چکا تھا۔ میں رہائش گاہ کی جانب سے کسی خبر کا منتظر تھا۔ حالات کچھ اس نہج پر آگئے تھے کہ میں کسی پر بھی اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن نجانے کیوں میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ساوری مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتی، وہ جو کہتی ہے، وہی سچ ہو سکتا ہے۔ پچھلی صبح جو اس نے اپنے جذبات کی توہین پر جو شدت دکھائی تھی، میں اسے صرف اسی لیے برداشت کر گیا تھا۔ اس کے ذہن میں جو بھی تھا لیکن میرے لیے تو وہ ساوری تھی، جو بتاشے اپنے بھوچھن میں چھپا کر میرے لیے لاتی تھی۔ میں نے ساوری کے بارے میں سوچا تو نجانے میرا من کیوں بھر آیا۔ شاید اب اس سے ملاقات نہ ہو پائے۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اب میں ڈیرے پر نہیں رہ پاؤں گا۔ رتو بھوہڑ کے ڈیرے پر ہونی والی واردات کی خبر پھیل جانا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔
ایسے میں رہائش گاہ کا دروازہ کھلا اور پیروزاں نے جھانکا، اور تیزی سے میری جانب بڑھی۔ میں چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے میری جانب حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''کچھ سنا تم نے...... وہ رتو بھوہڑ کے ڈیرے پر سے بندے اغوا ہو گئے ہیں۔ کہیں وہ تم نے تو......؟'' وہ کہتے کہتے رُک گئی تھی پھر ناقابلِ یقین انداز میں بولی، ''مگر وہ چار افراد تھے اور تم...... یہ کیا ہے علی......؟''
''میں تم سے سن رہا ہوں۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔
''کہیں یہ کوئی میرن شاہ کی تو چال نہیں؟'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔
''تم جانو اور تمہارا بھائی، لیکن میں تمہاری اس بات سے سمجھ گیا ہوں کہ تم بھی مجھ سے دھوکا کر رہی ہو اور تمہارا بھائی بھی۔'' میرے لہجے میں کچھ اس قدر غصہ تھا کہ اس نے چونک کر میری جانب دیکھا، پھر غضب ناک لہجے میں بولی۔
''کیا بکواس کر رہے ہو؟''
''ایک طرف تمہارا بھائی مجھے یہ کہہ رہا ہے کہ گوپے پر بندے ملوائے گا اور دوسری طرف مجھے مارنے کے لیے بندے بھیج رہا ہے؟'' میں نے غصے میں انتہائی طنزیہ لہجے میں کہا، تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی پھر سرسراتے لہجے میں بولی۔
''کیا کہہ رہے ہو تم؟''
''میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا پھر لمحہ بھر بعد بولا، ''سنو تم دونوں بھائی بہن نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ اب بتاؤ، تم دھوکا دینے والوں کو کیا سزا دیتی ہو؟''
اس کے ساتھ ہی میں نے ایک ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ لی اور دوسرے ہاتھ سے نیفے میں سے پسٹل نکال لیا۔ وہ یوں وحشت ناک نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی جیسے پہلی بار موت کو اپنے سامنے دیکھ رہی ہو۔

حالات کی تند و تیز آندھیوں کی زد میں آجانے والے نوجوان کی سنسنی خیز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ پڑھیے

آخری گناہ

تنویر ریاض

زندگی کی حقیقتیں بڑی سنگین ہوتی ہیں... عرش سے فرش پر پٹخ دیتی ہیں... اس کی زندگی کے شب و روز پر رنگینیوں کا راج تھا... اس کی دہشت سب پر طاری تھی... مگر اچانک ہی وحشت جنوں کی کرامات نے اسے لرزا کے رکھ دیا...

آپ نے آر جے کار اور جینی کار کی کہانیاں پڑھی ہوں گی۔ میں ان کا بیٹا اسٹیو کار ہوں اور انہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے میں نے بھی سراغ رسانی کا پیشہ اختیار کیا ہے اور پرائیویٹ سراغ رساں کا لائسنس حاصل کرنے کے بعد میں اپنے والد کے ساتھ کار انویسٹی گیشن، میں کام کر رہا ہوں۔ زیرِ نظر کہانی میں سراغ رسانی کا عنصر اتنا زیادہ نہیں لیکن اس میں ایک مجرم کے حوالے سے شروع سے آخر تک اسرار و تجسس موجود ہے۔

اگست 1993ء میں میگوئل کیرون نامی ایک سترہ سالہ میکسیکن امریکن لڑکا شکاگو کے شمال مغرب میں واقع اپنے ہسپانوی علاقے کے ایک ہوٹل دا کیئر،The Kier میں کام کررہا تھا۔ وہ امریکا میں پیدا ہوا اور دیکھنے میں ہسپانوی نہیں لگتا تھا۔ وہ ہائی اسکول کا طالب علم تھا اور اسے اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے یہ ملازمت کرنی پڑ رہی تھی۔ وہ اپنی ساری کمائی والدین کے ہاتھ پر رکھ دیتا اور اسے اس کے عوض اسکول جانے کی اجازت مل گئی تھی۔

وہ چھوٹے قد کا دبلا پتلا لڑکا تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ دوسرے لوگ اس کی جانب متوجہ ہوجائیں۔ اسکول میں بھی وہ اپنے آپ کو غیر نمایاں رکھتا تاکہ اس پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ وہ ہر سال اچھے نمبروں سے پاس ہوتا۔ اس کے علاوہ اسکول کی فٹ بال ٹیم اور آٹھ سو میٹر کی دوڑ میں حصہ لینے والا اہم کھلاڑی تھا۔ اس کی کچھ لڑکیوں سے دوستی تھی لیکن ان میں گرل فرینڈ کوئی نہیں تھی۔

وہ ہفتے کی ایک گرم صبح تھی۔ میگوئل نے معمول کے مطابق صبح سات بجے اپنا کام شروع کیا اور ساڑھے نو بجے ناشتا کرنے کے بعد وقفے میں رجسٹریشن ڈیسک کے پیچھے ائرکنڈیشنڈ آفس میں چلا گیا۔ بروکن نامی سفید فام روسی جوڑا اس ہوٹل کو چلاتا تھا لیکن ترش رو اور سخت گیر ہونے کے باوجود انہوں نے ان معمولی باتوں پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔

''میگوئل۔'' مسز بروکن نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''آجاؤ، مجھے تمہاری ضرورت ہے۔''

وہ اس کے پیچھے چلتا ہوا رجسٹریشن ڈیسک تک گیا جہاں ایک لمبے قد کا ہسپانوی باشندہ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی عمر تیس کے قریب تھی اور شیو بڑھا ہوا تھا۔

''کیا تم ہسپانوی بول سکتے ہو؟''

''ہاں۔'' میگوئل نے جواب دیا۔

''مجھے ایک کمرا چاہیے۔'' اس آدمی نے ہسپانوی میں کہا۔ ''اسے بتادو کہ میں پیشگی کرایہ دوں گا۔ میں بیمار ہوں۔''

اس نے جیب سے نوٹوں کا بنڈل نکالا اور اسے دکھا کر دوبارہ جیب میں رکھ لیا پھر اس نے اپنا سفری بیگ اٹھایا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا لابی میں جاکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اسے ایک کمرا چاہیے۔ وہ بیمار ہے۔'' میگوئل نے اپنی مالکن کو بتایا۔

''وہ مجھے بھی نظر آرہا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''یہ صبح میں کیوں آگیا؟''

''کیا میں اس سے پوچھوں؟''

''وہ جھوٹ بولے گا۔ اسے بتادو کہ ایک رات کا کرایہ ساٹھ ڈالر ہوگا۔ اس وقت کوئی سستا کمرا خالی نہیں ہے۔ اس کمرے میں علیٰحدہ باتھ روم، ٹی وی اور ائرکنڈیشنڈ کی سہولت ہے۔''

اس آدمی نے اپنا نام جان گارسیا بتایا اور میگوئل کے ساتھ اوپر جانے سے پہلے ایک سو بیس ڈالر پیشگی ادا کردیے اور وہ اسے کمرا نمبر 502 میں لے گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ آدمی بستر کی جانب بڑھا اور اس پر دھڑام سے گر گیا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میگوئل۔''

''ائرکنڈیشنر چلادو اور میرے لیے پانی لے کر آؤ پھر تم بارہ بجے دوبارہ آنا، میں تمہیں کچھ کام بتاؤں گا، یہ......''

اس نے دوبارہ نوٹوں کا بنڈل نکالا ''بیس تمہارے لیے اور بیس اس عورت کے لیے جو تمہیں یہاں آنے کی اجازت دے گی۔''

بارہ بجے جب میگوئل واپس آیا تو اس آدمی نے خود دروازہ کھولا۔ اس وقت اس نے صرف زیریں لباس پہن رکھا تھا جب وہ بستر کی طرف جانے لگا تو میگوئل کو اس کی کمر پر ایک خون آلود دھبا نظر آیا جو اس کے پہلو تک پھیلا ہوا تھا۔ بستر کی چادر پر بھی ویسا ہی ایک دھبّا تھا جہاں وہ آدمی لیٹا تھا۔

''سر۔'' میگوئل اچانک بولا۔ ''تمہیں اسپتال جانے کی ضرورت ہے۔''

''یہ ممکن نہیں۔'' وہ بمشکل تمام بستر پر لیٹا اور اس نے اشارے سے میگوئل کو اپنے پاس بلایا۔ ''اپنا دماغ استعمال کرو میگوئل، سوچو۔''

''تم نے کوئی غیر قانونی کام کیا ہے۔ لگتا ہے کہ تم پر حملہ ہوا ہے۔''

''ہاں، مجھے پیچھے سے گولی ماری گئی۔ ایک کاروباری سودا تھا جو خراب ہوگیا۔ اس عورت کو مت بتانا۔''

گارسیا کئی سیکنڈ تک آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ ''میں زندہ رہوں گا۔'' اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یا مرجاؤں گا۔ تم سمجھ رہے ہو؟''

اس آدمی کی تکلیف دیکھ کر میگوئل نے کمرے میں رکھی دوسری چیزوں پر نظر ڈالی۔ وہاں نائٹ اسٹینڈ پر ایک ریوالور رکھا ہوا تھا اور اس کے برابر ایک چین میں بندھی

ہوئی صلیب پڑی ہوئی تھی۔
''کیا میں تمہارے لیے اور پانی لاؤں؟'' میگوئل نے پوچھا۔
''ہاں، شکریہ۔ مجھے کچھ بے چینی ہو رہی ہے۔ کسی فارمیسی سے مجھے درد کم کرنے والی دوا اور بینڈ یج لا دو اور اگر وہسکی مل جائے؟''
گارسیا نے اسے پچاس ڈالر کا نوٹ اور کمرے کی چابی دی۔ ''صرف تم اور کوئی نہیں اگر میں سو جاؤں تو جگا دینا۔''
چالیس منٹ بعد وہ دو تھیلوں سمیت واپس آ گیا۔ ایک میں فرسٹ ایڈ کا سامان اور درد کم کرنے والی دوا اور دوسرے تھیلے میں وہسکی کے بجائے ووڈکا کی بوتل تھی کیونکہ اس نے قریبی شراب کی دکان سے اپنے مالکان کے لیے کئی مرتبہ ووڈکا خریدی تھی اس لیے وہ جانتا تھا کہ دکاندار کو اس کی کم عمری پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔
لیکن جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوا اور بستر کے قریب گیا تو اس نے محسوس کیا کہ مزید کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ گارسیا ایک چادر اوڑھے بستر پر چت لیٹا ہوا تھا اور اس کا ایک بازو نیچے فرش کی جانب جھول رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے گلے میں پڑی ہوئی صلیب پکڑ رکھی تھی۔ اس کے سانس لینے کی آواز دور سے ہی سنائی دے رہی تھی اور اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ زرد لگ رہا تھا۔
''تم کون ہو؟'' اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔
''جناب۔'' میگوئل نے دوبارہ کہا۔ ''تمہیں اسپتال جانا چاہیے۔''
''بہت دیر ہو چکی ہے۔'' اس کی نظریں لڑکے پر جم گئیں۔ ''تمہیں کسی پادری کو بلانا چاہیے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟''
میگوئل سمجھ گیا۔ یہ شخص گارسیا کیتھولک تھا اور اس عقیدے کے لوگ مرتے وقت اس قسم کی رسم ادا کرتے تھے تاکہ ان کی بخشش یقینی ہو جائے۔
وہ لفٹ کے ذریعے نیچے آیا اور عقبی گلی سے نکل کر سڑک پر دوڑنے لگا۔ وہ خود پادریوں پر یقین نہیں رکھتا تھا لیکن گارسیا کی نازک حالت اس کی آواز اور آنکھوں نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اس کی درخواست پر فوراً عمل کرے۔ قریبی کیتھولک چرچ صرف ایک بلاک کے فاصلے پر تھا۔
اس نے سینٹ جارج یوکرائن کیتھولک چرچ کا بورڈ پڑھا اور اس آدمی سے رجوع کیا جو اسی وقت عمارت کے مرکزی دروازے سے باہر آیا تھا۔ اس آدمی نے بتایا کہ اس وقت بھی ایک پادری اندر موجود ہے۔ اس پادری نے اس سے کئی سوال پوچھے اور جواب میں اسے اعتراف کرنا پڑا کہ مرتے ہوئے آدمی نے اسپتال جانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ مقامی یا یوکرائن کا رہنے والا تھا اور صرف پادری کے لیے اس کی درخواست سے فرض کر لیا کہ وہ کیتھولک ہے۔
''لیکن وہ یوکرائن کیتھولک نہیں ہے؟'' پادری نے پوچھا۔
''وہ ہسپانوی ہے۔'' لڑکے نے جواب دیا۔
''اچھا، میں سمجھ گیا۔''
پادری نے اسے انتظار کرنے کے لیے کہا اور اسے وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ پانچ منٹ بعد ایک دوسرا پادری آیا جو نسبتاً جوان تھا۔ اس نے کہا۔ ''مجھے اس مرتے ہوئے آدمی کے پاس لے چلو۔''
اس پادری کا نام فادر پال ڈینی تھا۔ وہ تیزی سے ہوٹل پہنچے۔ راستے میں انہوں نے زیادہ بات نہیں کی البتہ جب وہ پانچویں منزل پر لفٹ سے باہر آئے تو میگوئل نے پادری کو بتایا کہ گارسیا صرف ہسپانوی زبان بولتا ہے۔
''کیا وہ ہوش میں ہے؟'' پادری نے رکے بغیر پوچھا۔
''ہاں، اس وقت وہ ہوش میں تھا جب میں اسے چھوڑ کر آیا۔''
''کیا اسے اعتراف کرنے کی ضرورت ہے؟''
''میں نہیں جانتا۔''
''کیا تم ہسپانوی بول لیتے ہو؟''
''ہاں۔''
میگوئل نے تقریباً بدحواسی کے عالم میں کمرے کا دروازہ کھولا اور فادر ڈینی کے پیچھے چلتا ہوا گارسیا کے بستر کے قریب پہنچا۔ پادری نے میگوئل سے کہا۔ ''جان کو بتا دو کہ میں ہسپانوی نہیں بولتا اگر وہ چاہتا ہے کہ میں اس کا اعتراف سنوں تو اسے تم کو اس کا ترجمہ کرنے کی اجازت دینا ہوگی اگر وہ اس پر راضی ہو جاتا ہے تو تمہیں اس اعتراف کو خفیہ رکھنے کا عہد کرنا ہوگا اور ہم دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کبھی کسی کو نہیں بتاؤ گے۔ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو؟''
میگوئل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

ساڑھے تیرہ سال بعد جنوری 2007ء کے ایک

جمعے کی سہ پہر کار انویسٹی گیشن اینڈ سیکیورٹی کے دفتر میں آر۔ جے۔ کار عرف ماسٹر اور اس کا بیٹا اسٹیو ماسٹر میز کی ایک طرف بیٹھے ایک ممکنہ کلائنٹ سے میگوئل کیرون اور مرتے ہوئے آدمی کی کہانی سن رہے تھے۔ وہ ممکنہ کلائنٹ کیرن مائیکل ایک دبلی پتلی، درمیانے قد کی تقریباً تیس سالہ عورت تھی۔ اس کی آنکھیں اور بال سیاہ تھے۔ پہلی نظر میں اسے دیکھ کر یوں لگا جیسے وہ یونانی ہے لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔

کہانی سناتے ہوئے اس نے ایک وقفہ لیا اور اپنے پرس میں کچھ ٹٹولنے لگی پھر اچانک اس نے ہمیں دیکھا اور بولی۔ ''میں...... میگوئل کیرون تھی۔'' یہ کہہ کر وہ پھر خاموش ہوگئی۔

یہ سچ ہے کہ دو سال پہلے ہمارے سامنے جنس کی تبدیلی کا ایک کیس آیا تھا لیکن اس کی بات سن کر ہم چونکے بغیر نہ رہ سکے۔ ''اب میں ایک عورت ہوں۔'' اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''جب میں میگوئل تھی تبھی مجھے فرق محسوس ہونے لگا تھا۔ میں خود بھی لڑکی بننا چاہ رہی تھی لہٰذا میں نے اس عمل کو مکمل ہونے دیا۔''

''ٹھیک ہے۔'' ماسٹر نے کہا۔ ''اس مرتے ہوئے آدمی کے بارے میں کیا کہوگی؟''

''میگوئل نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے اعتراف کو خفیہ رکھے گا لیکن میں میگوئل نہیں بلکہ کیرن ہوں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے تاکہ تم سمجھ سکو کہ گارسیا نے کیا کہا تھا۔ تمہارے لیے یہ ایک معمولی بات ہوگی۔''

''بالکل نہیں۔''

اس نے ڈیڈ کے چہرے پر ٹٹولنے والی نظر ڈالی لیکن وہ بالکل سپاٹ تھا۔ میں نے بات کو آگے بڑھانے کے لیے کہا۔ ''کیا جان گارسیا، میکسیکو کے جان اسمتھ جیسا معلوم نہیں ہوتا؟''

''اوہ ہاں، ایسا ہوسکتا ہے۔ میگوئل کا بھی یہی خیال تھا۔ اس نے بھی یہی سوچا کہ یہ شخص پکا جرائم پیشہ ہے اور اس نے فرضی نام اختیار کیا ہوا ہے اور جب اس کا اعتراف سامنے آیا تو اس خیال کی تصدیق ہوگئی، وہی میں تمہیں بتانے آئی ہوں۔''

وہ اپنے ساتھ پانی کی بوتل لائی تھی۔ اس نے ڈھکنا کھول کر دو گھونٹ لیے اور بولی۔ ''مجھے پورا اعتراف تو یاد نہیں۔ اتنا ضرور بتا سکتی ہوں کہ اس نے تیرہ سال کی عمر میں اپنی بہن کی دلالی کی۔ اس نے اپنی جرائم پیشہ زندگی کا آغاز اس چھوٹے گناہ سے کیا۔ اس کے بعد اس نے ڈکیتی کی واردات کے دوران ایک شخص کو قتل کردیا۔ اس وقت اس کی عمر سولہ سال تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنی بے عزتی کرنے پر ایک طوائف کا گلا گھونٹ دیا پھر وہ مونٹیسری چلا گیا اور بدمعاش گروہوں کے لیے کام کرنے لگا۔ وہ ان لوگوں کے گلے کاٹ دیتا جو ادھار واپس نہیں کرتے تھے۔ اس نے منشیات کا کاروبار اور امریکا اسمگلنگ شروع کردی۔ اسے زندگی میں اپنے کیے پر کبھی ندامت نہیں ہوئی۔ اس کا کہنا تھا کہ تین سال میں اس نے چودہ افراد کو قتل کیا پھر اس نے تفصیل بتانا شروع کردی۔''

کیرن نے لمحہ بھر کے لیے اپنی آنکھیں بند کیں پھر اس نے کہنا شروع کیا۔ ''اس قتل و غارت گری کے علاوہ بھی اس کے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے جن میں دوسری باتوں کے علاوہ عورتوں کی اسمگلنگ بھی شامل تھی۔ مجھے...... یعنی میگوئل کو ایک روبوٹ کی طرح وہاں بیٹھ کر پادری کے لیے انگریزی میں ترجمہ کرنا پڑا۔''

جب اعتراف ختم ہوا تو میگوئل باہر ہال میں چلا گیا۔ وہ گارسیا کی موت سے پہلے واپس نہیں آنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنا کام روک دیا اور دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے گارسیا جیسے خوفناک شخص کے لیے اتنا کچھ کرکے مالکان کے اعتماد کو مجروح کیا ہے۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ انہیں بستر پر پھیلے ہوئے خون کے بارے میں بتا دیتا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ گارسیا کتنا بڑا شیطان ہے۔''

''فادر ڈینی بھی جلد ہی باہر آگیا۔ وہ کافی پریشان نظر آرہا تھا۔ میگوئل کو یقین تھا کہ وہ دونوں ایک ہی طرح محسوس کررہے ہیں گوکہ وہ اس پر بات نہ کرسکے۔ پادری نے میگوئل کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پُرسکون انداز میں کچھ کہا۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ میگوئل اپنے مالکان کو گارسیا کی حالت کے بارے میں بتا دے۔ اس وقت دونوں میاں بیوی ہوٹل میں موجود نہیں تھے جب وہ واپس آئے تو میگوئل کے جانے کا وقت ہو رہا تھا تاہم اس نے انہیں سب کچھ بتا دیا اور اس کے بعد وہ گھر چلا گیا۔''

''دوسرے روز صبح جب وہ کام پر آیا تو اسے پوری امید تھی کہ گارسیا مرچکا ہوگا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ رات میں کسی وقت اٹھا اور خاموشی سے کہیں اور چلا گیا۔ اس نے دو لفافے چھوڑے۔ ایک میگوئل کے لیے جس میں سو ڈالر اور ایک خط تھا جس کی عبارت تھی۔ 'یاد رہے۔ میں یہاں بھی

نہیں آیا' اسی طرح کا ایک خط بوکن کے لفافے میں بھی تھا جس کا ترجمہ میگوئل کو کرنا پڑا۔ انہیں بھی زبان بند رکھنے کے لیے ایک معقول رقم دی گئی تھی۔''

کیرن نے ایک بار پھر اپنے پرس میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکال کر ڈیڈی کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ انہوں نے اسے کھولا اور اسے چند سیکنڈ تک دیکھتے رہے۔ وہ ایک اخبار کے تراشے کی نقل تھی جس میں ایک تصویر شائع ہوئی تھی اور اس کے نیچے یہ عبارت درج تھی۔

''فادر پال ڈینی عمر انتالیس سال، سینٹ جارج یوکرائن کیتھولک چرچ کے سامنے فٹ پاتھ پر پیر کی شام کسی نامعلوم حملہ آور کی فائرنگ سے شدید زخمی ہوگیا۔''

کیرن مائیکل نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میگوئل کو 1994ء میں اسٹینفورڈ یونیورسٹی سے وظیفہ ملا اور اس نے 1998ء میں اکاؤنٹنگ کی ڈگری حاصل کرلی۔ اس کے فوراً بعد اسے بے ایریا میں ملازمت مل گئی۔ اسی دوران جنس کی تبدیلی کا عمل شروع ہوگیا جس کے مکمل ہونے میں دو سال لگے اور میگوئل، کیرن بن گئی۔ میں شکاگو واپس آگئی اور گزشتہ ڈیڑھ سال سے لٹل یوکرائن میں رہ رہی ہوں۔ شاید تمہارے علم میں ہو کہ اب یہ علاقہ بالکل بدل گیا ہے۔ یہاں تک کہ اس ہوٹل کی جگہ بھی اپارٹمنٹ بنائے جارہے ہیں۔''

اس نے اخبار کے تراشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نیٹ پر اخبار پڑھتی ہوں۔ میں نے گزشتہ اگست میں یہ خبر دیکھی اور فادر ڈینی کا نام دیکھ کر چونک گئی کیونکہ تیرہ سال پہلے چودہ اگست کو جان گارسیا نے اسی کے سامنے اعتراف کیا تھا۔''

''میں نے پولیس کو فون کیا تو ایک خاتون سراغ رساں سے میری بات ہوئی۔ انٹرویو کے دوران اس نے مجھ سے ایسا سلوک کیا جیسے میں جھوٹ بول کر اس کا وقت ضائع کررہی ہوں جبکہ میں نے اسے بتا دیا کہ میگوئل کون تھا۔ البتہ میں نے اسے گارسیا کے اعتراف کے بارے میں نہیں بتایا کیونکہ میگوئل نے اسے خفیہ رکھنے کا وعدہ کیا تھا اور صرف اتنا بتایا کہ کس طرح اس نے بستر مرگ پر فادر ڈینی کے سامنے اعتراف کیا اور یہ کہ گارسیا کتنا خطرناک مجرم تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ میں اس وقت اسے اس کا اصلی نام یا اس کے بارے میں کچھ اور نہ بتاسکی۔''

''میں جانتی ہوں کہ انہوں نے ابھی تک اسے گرفتار نہیں کیا کیونکہ میں نے خود اسے بدھ کی رات دیکھا جب میں کام سے واپسی پر بس سے اتر رہی تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا اور اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ شکر ہے کہ اس نے کوئی توجہ نہیں دی لیکن ایک لمحے کے لیے میں اپنی جگہ پر منجمد ہوگئی۔''

''مجھے اپنے گھر تک پہنچنے کے لیے اس کے پیچھے چلنا تھا لیکن میں اندر نہیں گئی اور دو بلاک تک اس کا تعاقب کرتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ ایک بار میں نہیں چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر میرے اعصاب جواب دے گئے اور میں اپنے گھر چلی گئی۔''

''کیا تم نے پولیس کو فون کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے کسی اور کام کی وجہ سے جلدی تھی اور اس سراغ رساں نے مجھے بہت مایوس کیا تھا۔ اس لیے میرے خیال میں پولیس کو فون کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ شاید جان گارسیا مجھے بھی فادر ڈینی کی طرح قتل کرنا چاہتا ہوگا، اگر وہ مجھے بس سے اترتے وقت پہچان لیتا تو میں اس کا اگلا نشانہ ہوتی۔''

میں نے اپنی ایک دوست سے بات کی۔ اس نے بھی وہی کہا جو میں سوچ رہی تھی کہ اگر پولیس اسے تلاش نہیں کرسکی تو وہ میری بھی کوئی مدد نہیں کرسکیں گے لہٰذا ہم نے کسی اور سے رجوع کرنے کا فیصلہ کیا۔'' یہ کہہ کر اس نے پہلے ڈیڈی اور پھر میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''تم......؟''

اس نے بوتل کھول کر پانی کے دو گھونٹ لیے اور بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ یہ ایک خطرناک معاملہ ہے۔ میری جنس بدل گئی ہے اور میں نے ایک مختلف نام اختیار کیا ہے لیکن اپنی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں چھپایا اگر اسے ذرا سا بھی اندازہ ہوگیا تو وہ مجھے تلاش کرلے گا۔ یہ اس کے لیے بہت معمولی بات ہے۔ اس نے فادر ڈینی کو قتل کیا۔ اس سے پہلے وہ کئی لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ کون جانے کہ اس نے ہوٹل سے جانے کے بعد کتنے خوفناک جرائم کیے ہوں گے۔ اگر اسے نہ روکا گیا تو نہ جانے وہ اور کیا کچھ کرے گا۔''

''لہٰذا میں اسی لیے یہاں آئی ہوں۔ تمہاری ایک اچھی ساکھ ہے اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ میں نہیں جانتی کہ وہ کیا ہوسکتی ہے۔''

اس نے سوالیہ نگاہوں سے ڈیڈی کو دیکھا لیکن انہوں نے صرف مجھے دیکھ کر سر ہلا دیا۔ ''مجھے کچھ تفصیل چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ وہ گارسیا تھا اور

یہ کہ اگر تم اسے دوبارہ دیکھو تو پہچان لوگی؟''
''ہاں، بالکل۔''
''دوسری بات، وہ جس بار میں گیا کیا وہ کسی ہسپانوی کا ہے؟''
''میں بار میں نہیں جاتی لیکن میں اکثر اس کے آگے سے گزرتی ہوں۔ میں نے وہاں جانے والے گاہکوں کو دیکھا ہے، وہ زیادہ تر مزدور پیشہ ہیں۔''
''نمبر تین۔ کیا اس کا کوئی امکان ہے کہ گارسیا اسی عمارت میں رہ رہا ہو۔ اوپر کی منزل پر کسی اپارٹمنٹ یا اس کے عقب میں؟''
''نہیں، اس عمارت میں صرف بار اور اوپر کی منزل میں دفاتر ہیں۔ اس بلاک کی ساری عمارتیں کمرشل ہیں۔''
''نمبر چار، تمہیں ذاتی طور پر یقین ہے کہ گارسیا نے پادری کو قتل کیا لیکن اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ہے۔ سوائے گارسیا کے اعتراف اور اگست کے مہینے کے۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ ان کی بنیاد پر کوئی تحقیقات ہوسکتی ہے؟''
''میں سمجھتی ہوں کہ ایسا ممکن ہے۔''
''نمبر پانچ، تم دوبارہ ایک کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ پولیس ہیڈ کوارٹر چلی جاؤ۔''
''نہیں۔''
''ایک منٹ۔'' میں نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں تمہیں یہ کرنا چاہیے کہ اس سراغ رساں کے بارے میں مت پوچھو جس سے پہلے مل چکی ہو اور نہ ہی اپنے بارے میں تفصیل بتاؤ بس اتنا کہہ دینا کہ تمہیں کسی نے روکا تھا یا تم نے کوئی نقب زنی ہوتے دیکھی یا کوئی اور اس قسم کا جھوٹ اور اب تم ان ہسپانوی مردوں کی تصویریں دیکھنا چاہتی ہو جن کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ ہو اور اگر تمہیں گارسیا کی تصویر نہ ملے تو کسی آرٹسٹ کے بارے میں پوچھو جو تصویریں بناتا ہو کیونکہ ہم بھی خلا میں کوئی حکمتِ عملی نہیں بنا سکتے، کم از کم ہمیں مجرم کے نام یا تصویر کی ضرورت ہوگی اور اگر دونوں مل جائیں تو بہتر ہے۔''
میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم چاہتی ہو کہ ہم سنجیدگی سے تمہارے لیے کام کریں تو مجرم کی تصویر اور اصلی نام معلوم کرو گو کہ تصویری خاکہ اتنا اچھا نہیں ہوتا لیکن ہم اس سے بھی کام چلا سکتے ہیں۔''
''اس کے بعد تم کیا کرو گے؟'' اس نے پوچھا۔
''تم کتنی رقم خرچ کرسکتی ہو۔ ہمارا عمومی ریٹ چھ سو پچاس ڈالر یومیہ ہے لیکن نام اور تصویر کے بغیر ہم دس لاکھ ڈالر میں بھی کام نہیں کرسکتے۔ اس کے علاوہ ہم اپنا اور کلائنٹ کا وقت بھی ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ میں زیادہ سے زیادہ چھ دن اس کیس پر کام کروں گا تاوقتیکہ ہمیں کوئی سراغ مل جائے۔ لہٰذا تم ہمیں مجرم کا نام یا تصویر دے دو اور ایک ہزار سے ساڑھے چار ہزار ڈالر خرچ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ہم ساڑھے سات سو ڈالر ایڈوانس لیتے ہیں اور نتیجے کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ ناکامی کی صورت میں ہم فیس واپس نہیں کرتے اور نہ ہی کوئی رعایت دیتے ہیں۔''
اس نے ایک لمحہ انتظار کیا۔ وہ اب بھی غیر مطمئن نظر آرہی تھی۔ ''رقم کا کوئی مسئلہ نہیں لیکن تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ تم کیا کرو گے؟''
میں نے ڈیڈی کی طرف دیکھا تو وہ بولے۔ ''ہم کچھ بھی نہیں کرسکتے جب تک ہمیں وہ آدمی نہ مل جائے اور ہم اسے جانچ نہ لیں۔ وہ کہاں رہتا ہے، کیا کرتا ہے، اس تک کیسے پہنچا جائے۔ اس کے جرائم کے ثبوت کیسے حاصل کیے جائیں جن کی بنیاد پر اسے پولیس کے حوالے کیا جاسکتا ہے۔''
ایک لمحے کے بعد کیرن نے اپنی گھڑی دیکھی اور کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے تمہارا وقت ضائع کیا اور اپنا بھی۔ مجھے یہاں آنے کے لیے کام سے چھٹی کرنا پڑی۔ میری ایک درخواست ہے کہ میں نے جو کچھ کہا اسے اپنے تک رکھنا۔''
''بے فکر رہو، ہم کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔''
''شکریہ، ہوسکتا ہے کہ میں بعد میں تم سے رابطہ کروں۔''
گھر جاتے ہوئے اس کے دماغ میں ایک نیا آئیڈیا آیا۔ اس نے پولیس کی مدد لینے یا ہیڈ کوارٹر جا کر تصویروں کی تلاش میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اس بار کی نگرانی کرنے کا فیصلہ کیا جہاں دو روز پہلے اس نے گارسیا کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ ایک جرأت مندانہ اسکیم تھی جس میں کئی مشکلات تھیں۔ ان میں سے ایک یہ کہ وہ شراب نہیں پیتی تھی پھر وہ بار میں کیا کرنے جاتی۔ اس کے علاوہ یہ کہ ایک جوان عورت کا بار میں تنہا جانا بہت سے لوگوں کی نظروں میں آسکتا تھا اور وہ ان کی توجہ کا مرکز بن جاتی۔
اپنے اسٹاپ پر پہنچنے تک اس کے ذہن میں ایک ایسا منصوبہ آچکا تھا جس پر عمل کر کے وہ اپنی حکمتِ عملی کے

راستے میں آنے والی رکاوٹ کو دور کرسکتی تھی اور وہ یہ کہ وہ بار میں جانے کے لیے اپنی تین دوستوں کو مدعو کرے جو اس کے ماضی سے واقف تھیں اور اس کے لیے اس نے آنے والے بدھ کا انتخاب کیا کیونکہ گزشتہ ہفتے میں اس نے اسی روز گارسیا کو بار میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

اتفاق سے بس اسٹاپ اس بار سے ایک بلاک پہلے تھا جس کا مطلب تھا کہ اسے گھر جانے کے لیے اس کے سامنے سے گزرنا پڑتا۔ وہ اپنی حکمتِ عملی کے بارے میں سوچتی ہوئی جارہی تھی اور خوش تھی کہ اسے اس جگہ کو دیکھنے کا موقع مل جائے گا لیکن جب وہ سڑک پار کرنے کے لیے سگنل کھلنے کا انتظار کررہی تھی تو اس کی نظر گارسیا پر گئی جو بھاری قدموں سے بار کی طرف جارہا تھا۔ وہ بار کے دروازے پر ایک منٹ کے لیے رکا اور اندر چلا گیا۔

اسی دوران میں اور ڈیڈی اپنی کار میں حال ہی میں خریدے ہوئے اس مکان کی طرف جارہے تھے جس میں کچھ عرصہ قبل میں اور میری بیوی لورین شفٹ ہوئے تھے۔ وہ پانچ ماہ کی حاملہ تھی اور میری ماں جینی کار اس کا خیال رکھ رہی تھی۔ گاڑی چلانے کے دوران میں اور ڈیڈی کیرن مائیکل کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ ڈیڈی نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ بالآخر ہم سے رابطہ کرے گی۔''

ہم دونوں میں سے کسی کو توقع نہیں تھی کہ ڈیڈی کا اندازہ اتنی جلدی درست ثابت ہوگا۔ اسی روز رات نو بجے کے قریب جب ڈیڈی اور ممی اپنے گھر چلے گئے اور میں معمول کے مطابق اپنی آنسرنگ مشین چیک کرنے لگا تو اس کا پیغام دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔

''میں کیرن مائیکل ہوں۔ اس وقت چھ بج کر آٹھ منٹ ہوئے ہیں۔ مجھے امید تھی کہ تم سے بات ہوجائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں نے جان گارسیا کو دوبارہ دیکھا ہے، وہ شکاگو ایونیو پر واقع اسی بار او فلائن میں جارہا تھا۔ میں لباس تبدیل کرنے گھر جارہی ہوں۔ اس کے بعد میں خود بھی ایک دوست کے ہمراہ اس بار میں جاؤں گی۔ میں کچھ جاننے یا اگر ہوسکا تو اپنے فون سے اس کی تصویر لینے کی کوشش کروں گی اور تمہیں اس کے بارے میں بتاؤں گی۔''

میں نے چند سیکنڈ سوچنے کے بعد مما کا نمبر ملایا۔ چار گھنٹیوں کے بعد ان کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو اسٹیو؟''

''تم لوگ کہاں پر ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم ابھی ایڈن کے پاس سے گزر رہے ہیں۔''

"ڈیڈی سے کہو گاڑی روکیں۔ مجھے ان سے بات کرنی ہے۔"

میں نے انہیں مختصراً بتایا پھر مجھے ڈیڈی کی آواز سنائی دی۔ "کیا بات ہے؟"

"کیرن مائیکل نے چھ بجے ایک پیغام چھوڑا ہے کہ اس نے گارسیا کو دوبارہ اسی بار میں داخل ہوتے دیکھا اور اب وہ خود اپنے طور پر سراغ رسانی کررہی ہے۔ اس بات کو تین گھنٹے ہوچکے ہیں۔ اس کا سیل نمبر آفس میں ہے ورنہ میں اسے فون کرتا۔"

"ٹھیک ہے، ہم لوگ دفتر کی طرف جارہے ہیں۔ تم تیار رہنا۔"

"اس دوران میں کمپیوٹر پر کچھ تلاش کرتا ہوں۔"

" جیسا کہ کیرن نے بتایا تھا۔ اس نے گھر جانے کے بعد لباس تبدیل کیا اور ہلکا سا میک اپ کرنے کے بعد اپنی ایک دوست سے رابطہ کیا۔ ان کے درمیان طے پایا کہ وہ چھ بج کر پینتالیس منٹ پر بار میں ملیں گی لیکن وہ فوراً ہی گھر سے روانہ ہوکر ساڑھے چھ بجے بار پہنچ گئی۔ اسے یہ فکر تھی کہ اس کے پہنچنے سے پہلے گارسیا وہاں سے نہ چلا جائے۔

بار حسبِ معمول لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آرہی تھیں۔ وہ دروازے کے ساتھ ایک طرف کھڑی ہوگئی تاکہ لوگوں کو گزرنے میں آسانی ہو۔ اس نے اپنی ٹوپی اور کوٹ اتار دیا۔ اور اپنے دائیں جانب نظر دوڑائی۔ دس مردوں اور پانچ عورتوں کے بعد وہ اسے نظر آگیا۔ اس نے اب بھی اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ اور وہ آگے کی طرف جھکا ہوا ایک بارٹینڈر سے باتیں کررہا تھا۔

جب اسے احساس ہوا کہ لوگ اس کی طرف دیکھ رہے ہیں جن میں زیادہ تر مرد تھے تو اسے ڈر لگنے لگا۔ اس نے اپنی گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ اسے آئے ہوئے ابھی صرف تین منٹ ہوئے ہیں اور ابھی اس کی دوست کے آنے میں بارہ منٹ باقی تھے بشرطیکہ وہ وقت کی پابندی کرتی۔

اچانک ہی گارسیا کے برابر میں ایک جگہ خالی ہوئی اور وہ تیزی سے آگے بڑھ کر وہاں بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے لیے جوس کا آرڈر دیا اور گارسیا کی طرف مڑ کر بولی۔ "مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ یہاں بہت گرمی ہے۔ کیا تمہیں اس کوٹ میں گرمی نہیں لگ رہی؟"

اس نے آہستہ سے اس کی جانب دیکھا لیکن اس کی آنکھوں میں شناسائی کی کوئی جھلک نظر نہیں آئی۔ "میرے پاس یہاں آنے کے لیے کوئی لباس نہیں ہے۔" اس نے بھاری آواز میں کہا۔

کیرن کو یہ جان کر اطمینان ہوا کہ اس نے ان سالوں میں تھوڑی بہت انگریزی سیکھ لی ہے۔ اس نے جواب میں کہا۔ "ٹھیک ہے جب میری دوست آجائے گی تو ہم کوئی ٹھنڈی جگہ تلاش کریں گے۔" اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور اچانک بولی۔ "کیا میں تمہیں جانتی ہوں؟" اس نے یوں ظاہر کیا جیسے کچھ یاد کررہی ہو پھر بولی۔ "میں سمجھ گئی۔" میں اس شخص کو تھوڑا بہت جانتی ہوں۔ ایک دفعہ وہ ہمارے ساتھ جارہا تھا اور ہم نے تمہیں ایک کارنر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو اس نے کہا۔ "تم نے اس آدمی کو دیکھا۔ میں اس کا کئی سالوں سے مقروض ہوں لیکن میں نے پہلے کبھی اسے نہیں دیکھا، جب ہم اس موڑ پر پہنچے تو تم جاچکے تھے۔"

وہ شک کرتے ہوئے بولا۔ "تمہارا دوست...... میرا مقروض ہے؟"

"میرا خیال ہے وہ تم ہی تھے، تمہارا نام کیا ہے؟"

"جان...... تمہارے دوست کا نام کیا ہے؟"

"پہلے تم اپنا پورا نام بتاؤ، یہ سوڈالر کا معاملہ ہے۔"

"جان گارسیا۔" وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے آہستہ سے بولا۔ "لیکن یہاں میں جان ہرنینڈیز ہوں۔"

اسے مجبوراً یہ اعتراف کرنا پڑا کہ اس کے فرضی دوست کا نام میگوئل تھا گوکہ ابھی تک اسے یقین نہیں تھا کہ اس شخص کا نام جان گارسیا ہے۔

☆☆☆

دس منٹ بعد ڈیڈی نے مجھے فون کرکے کیرن کا سیل نمبر اور پتا دیا۔ "میں نے اسے فون کرنے کی کوشش نہیں کی تم مجھے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کرتے رہنا۔ تمہاری ماں گھر جارہی ہے۔" اس دوران میں پہلے ہی اوفلائن اور کیرن کے اپارٹمنٹ کا پتا معلوم کرچکا تھا۔ میں نے کیرن کا نمبر ملایا۔ "ہیلو اسٹیو۔" اس نے جواب میں کہا۔

"ہائے مس مائیکل۔ تمہارا پیغام دیکھ کر میں پریشان ہوگیا۔"

"اوہ اسٹیو، ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"کیا تم گارسیا کے ساتھ ہو؟"

"ہاں۔"

"کہاں؟"

"کیا؟ اچھا۔ 990 نارتھ ہائیڈن ایونیو۔ یونٹ نمبر

703۔تم یہی معلوم کرنا چاہ رہے ہو؟''
''تم وہاں کیا کر رہی ہو؟''
''فی الحال ہم تینوں ٹی وی دیکھ رہے ہیں اور ہمیں میگوئل کا انتظار ہے۔اس نے یہاں آنے کا کہا تھا۔تمہیں یاد ہے میں نے بتایا تھا کہ اس نے کسی کو سوڈالر دینے ہیں۔''
''تم گارسیا کو لالچ دے کر اپنے گھر لے گئیں اور اب......''
''یہ بھی صحیح ہے۔''
''اور وہ مسلح ہے؟''
''یقیناً ہوگا۔''

☆☆☆

جب کیرن کی دوست ایلیکس بار پہنچی تو سات بج رہے تھے۔بغل گیر ہونے کے بعد وہ دونوں بار سے تھوڑی دور ایک میز پر بیٹھ گئیں اور سوچنے لگیں کہ اب کیا کرنا ہے۔وہ ایک ایسی کرسی پر بیٹھی جہاں سے وہ گارسیا کو دیکھ سکتی تھی تاہم وہ یہ دیکھ کر چونک گئی کہ گارسیا ان دونوں کو دیکھ رہا ہے۔

''بہتر ہے کہ ہم کچھ کھانا شروع کر دیں۔''اس نے اپنی دوست سے کہا اور وہ راضی ہوگئی۔انہوں نے مینو دیکھ کر آرڈر کیا اور اپنی حکمتِ عملی پر بات کرنے لگیں۔کھانے میں سینڈوچ اور فرنچ فرائز تھے جو دس آدمیوں کے لیے کافی ہوتے۔ویٹر کے جانے کے بعد گارسیا اس کے پاس آیا اور بولا۔''سینوریتا!معاف کرنا لیکن میں......''

اب وہ اس کی طرف نہیں بلکہ میز پر رکھی ہوئی پلیٹوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور کیرن سمجھ گئی کہ وہ بھوکا ہے۔ایلیکس نے بھی ایسا ہی محسوس کیا اور بولی۔''یہ بہت زیادہ ہے،ہم اتنا نہیں کھائیں گے۔تم ہماری مدد کیوں نہیں کرتے؟''
''شکریہ۔''وہ بڑبڑایا۔

جب انہوں نے کھانا ختم کیا تو آٹھ بج رہے تھے۔گارسیا کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ میگوئل سے ملنے کا خواہش مند ہے تاکہ اسے وہ سوڈالر مل جائیں جو وہ بھول چکا تھا۔ایلیکس بغور اس کا مشاہدہ کر رہی تھی۔اس نے سرگوشی میں کیرن سے کہا۔''میرا خیال ہے کہ پلان ون پر عمل کیا جائے۔''

یہ کہہ کر وہ ریسٹ روم میں چلی گئی اور جب کیرن کا سیل فون بجا تو اس نے یہ ظاہر کیا جیسے وہ میگوئل سے بات کر رہی ہے۔وہ اس سے تصوراتی گفتگو کرتی رہی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میگوئل رقم سمیت اس کے گھر آنے کی کوشش

جھگڑا

پڑوس کے گھر سے سخت لڑائی کی مردانہ اور زنانہ آوازیں آرہی تھیں۔خاتون نے اپنے شوہر سے کہا۔''ذرا آپ جاکر دیکھ لیں......ایسا نہ ہو کہ بات بڑھ جائے اور وہ ایک دوسرے کو زخمی۔کرڈالیں۔''
شوہر نے سر جھٹک کر کہا۔''میں نہیں جاؤں گا......پچھلے ہفتے دو مرتبہ گیا تھا اس پر جھگڑا ہو رہا ہوگا۔''

لاہور سے تاج دار کا انکشاف

نوازش خراش

ایک انکم ٹیکس آفیسر نے کنوارے دولت مند سے کہا۔''آپ نے اپنا فارم بھر دیا ہے مگر اس میں ایک بچہ بھی ظاہر کیا ہے،میرا خیال ہے کہ یہ آپ کی سیکریٹری کی غلطی ہے۔''
''نہیں،ہم دونوں کی۔''دولت مند نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بیٹا باپ

بیٹا۔''میں اتنا بڑا کب ہوں گا جب مجھے امی سے اجازت لیے بغیر باہر جانے کی اجازت ہوگی؟''
والد نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا۔''بیٹا!اتنا بڑا تو ابھی میں بھی نہیں ہوا۔''

پلمبر

مریض نے ڈاکٹر سے کہا۔''ڈاکٹر صاحب میری گردن لوہے کی طرح سخت ہوگئی ہے۔سر ایسا ہوگیا ہے جیسا کہ اس میں سیسہ بھرا ہو۔کانوں میں ہر وقت اسٹین لیس اسٹیل جیسے برتنوں کے شور کی آوازیں آتی ہیں اور ناک تو بالکل پیتل کی طرح سخت ہے۔''
ڈاکٹر۔''ایسا کریں کہ آپ کسی پلمبر کے پاس چلیں جائیں۔''

آزاد کشمیر سے بدرالسلام بدر کا تعاون

کرے گا لیکن وہ کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔

یہ سن کر گارسیا ان کی کمپنی میں شامل ہونے کے لیے تیار ہوگیا۔ راستے میں ایک جگہ رک کر ایلیکس نے وہسکی کی بوتل خریدی۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ گارسیا کو شراب پلا کر مدہوش کر دیا جائے۔ لیکن گارسیا چالیس منٹ میں ایک تہائی بوتل چڑھانے کے بعد بھی پوری طرح ہوش میں تھا اور بے چینی سے میگوئل کا انتظار کررہا تھا جس کا درحقیقت کوئی وجود نہیں تھا اور نہ ہی وہ کبھی آتا۔

میری فون کال نو بج کر بیس منٹ پر ختم ہوئی۔ ''میں تمہیں پانچ منٹ بعد دوبارہ فون کروں گا لیکن وہ میں نہیں میگوئل ہوگا۔ تم یہ بات سمجھ لو اور وہ جو کچھ کہے تمہیں وہی کرنا ہے۔ کوئی سوال نہیں پوچھنا۔''

''اوہ، تمہاری بہت مہربانی۔''

ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور جب میں نے ایک سیکنڈ بعد ڈیڈی کو دفتر میں فون کیا تو مما اس وقت بھی وہاں تھیں۔ ان کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے مناسب سمجھا کہ ہم تینوں مل کر کوئی حکمتِ عملی وضع کریں۔ میں نے تجویز پیش کی کہ ہم گارسیا کو جھانسا دے کر کسی دوسرے مقام پر لے جائیں اور اس پر ظاہر کیا جائے کہ میگوئل اس سے علیٰحدگی میں ملنا چاہتا ہے۔ بظاہر یہ ایک احمقانہ خیال تھا جیسا کہ مما نے فوراً کہا۔ ''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اس لالچ میں آکر انہیں چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے گا لیکن کیا وہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔''

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔ ''شاید نہیں۔''

''یہ بہت مشکل کام ہے۔'' ڈیڈی نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں دور رہ کر اس معاملے پر نظر رکھنی چاہیے۔''

''لیکن اس کے لیے ہمیں کوئی بنیادی کام تو کرنا ہوگا'' مما نے اصرار کیا۔ ''میرا خیال ......'' اور جب مما کوئی خیال ظاہر کریں تو اس پر توجہ دینا ضروری ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

دس بج چکے تھے اور اب کیرن مائیکل پچھتا رہی تھی کہ اس نے بار میں گارسیا کا سامنا کیوں کیا۔ ایلیکس کی اسکیم کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ گارسیا وہسکی کی دو تہائی بوتل خالی کر چکا تھا لیکن اس پر اس کا برائے نام اثر ہوا۔ اسے پانی کے ساتھ شراب کی بھی طلب ہو رہی تھی جس کی وجہ سے وہ بار بار باتھ روم جا رہا تھا۔ اسی دوران اس نے سر درد اور تھکن کی بھی شکایت کی۔ کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی اور وہ تینوں میگوئل کا انتظار کر رہے تھے۔ سوا دس بجے انٹرکام کی گھنٹی بجی اور کیرن صوفے سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''اس وقت کون آ گیا؟''

''میگوئل؟ میگوئل؟'' گارسیا نے بوجھل آواز میں پوچھا تو کیرن نے محسوس کیا کہ بالآخر اس کے دماغ کو وہسکی چڑھ گئی ہے۔

''وہ اتنی جلدی کیسے آسکتا ہے۔ اس نے گیارہ بجے کے بعد کہا تھا۔'' اس نے انٹرکام کے پاس جا کر کہا۔ ''کون ہے؟''

''اوہ خدا کا شکر ہے۔'' ایک زنانہ آواز نے کہا جو اس نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ ''مس مائیکل، میں جینی کار ہوں۔ ہم اپارٹمنٹ نمبر 708 میں رہتے ہیں۔ ہم دروازہ مقفل کر کے باہر گئے ہوئے تھے لیکن دونوں ہی اپنی چابیاں بھول گئے۔ کیا میرا شوہر اور میں اندر آکر تمہارا فون استعمال کر سکتے ہیں؟''

''اوہ یقیناً'' کیرن نے کہا۔ ''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولنے کے لیے بٹن دبا دیا۔ ڈیڈی اور مما اندر داخل ہوئے جو اس وقت کیرن کے پڑوسی بنے ہوئے تھے۔

مما نے فوراً وضاحت کی۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ کبھی ہمارا تعارف ہوا ہو۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟ میں جینی کار اور یہ میرے شوہر آرچے کار ہیں۔ شکر ہے تم نے یہ نہیں پوچھا کہ ہم سے یہ حماقت کیسے سرزد ہوئی۔''

کیرن نے انہیں اپنے دوستوں سے ملایا۔ مما، ایلیکس کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئیں اور کیرن ڈیڈی کو لے کر کچن میں چلی گئی تاکہ وہ اس کا فون استعمال کر سکیں۔ انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ وہ چابیوں کے لیے کسی دوست کو فون کر رہے ہیں جبکہ درحقیقت وہ مجھے فون کر رہے تھے۔

بات ختم کر کے ڈیڈی ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور انہوں نے سیل فون کیرن کو دے دیا۔ میں نے آٹھ منٹ انتظار کرنے کے بعد کیرن کو فون کیا۔ یہ اس شام میری تیسری کال تھی لیکن اس وقت میں کیرن کی بلڈنگ کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔

اس نے کہا۔ ''کیرن مائیکل بول رہی ہوں۔''

میں بولا۔ ''ہائے میگوئل کہو، پھر میری بات سنو۔''

''ہائے میگوئل۔''

''سب کچھ کنٹرول میں ہے؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ''گڈ۔'' میں نے کہا۔ ''میگوئل آج رات نہیں آسکتا۔ اسے جان کا پتا اور فون نمبر

چاہیے۔ تم یہ دونوں چیزیں معلوم کرنے کی کوشش کرو۔ وہ شاید کل تم سے رابطہ کرے گا۔ ایک منٹ، اب تمہیں یہ ظاہر کرنا ہے کہ ایک دوسری کال آرہی ہے اور تم اس کا جواب دینا چاہتی ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ تم ہولڈ کرو۔ ایک دوسری کال آرہی ہے۔''

''ہاں لیکن مجھے ہولڈ مت کرواؤ۔ اب میں مسٹر اور مسز کار کا دوست ہوں جو چابیاں لے کر آرہا ہے۔ یہ بات انہیں بتادو اور دوبارہ میگوئل یعنی مجھ سے بات کرو۔''

اس کے بعد میں اس کی جعلی کال سنتا رہا پھر اچانک ہی وہ اونچی آواز میں بولی۔ ''جان کیا تم......؟ اوہ؟''

''کیا ہو رہا ہے؟'' میں زور سے چلایا۔

''اسٹیو! جان اچانک بے ہوش ہو گیا ہے۔''

''میں اوپر آرہا ہوں۔'' میں نے کہا اور لفٹ کی طرف بڑھا جو ابھی تک ساتویں منزل پر کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے بٹن دبایا اور جیسے ہی وہ نیچے آئی۔ میں لپک کر اس میں سوار ہو گیا۔ ساتویں منزل پر پہنچ کر میں نے 703 کے دروازے پر دستک دی اور کیرن کے بجائے مما دروازے پر آئیں۔ وہ بہت سنجیدہ نظر آرہی تھیں جس کا مطلب تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ ڈیڈی کھڑکی کے پاس بیٹھے فون کان سے لگائے ہوئے تھے۔ جان گارسیا فرش پر لیٹا ہوا تھا اور اس کے پاؤں اوپر کی جانب اٹھے ہوئے تھے۔ کیرن اور ایلیکس گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی پانی کے چھینٹے مار کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''یہ صرف بے ہوش نہیں ہوا۔'' مما نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ اسے تشنج کا دورہ پڑا ہے۔ میں نے اس طرح کبھی نہیں دیکھا۔ کیرن اور ایلیکس اسے ہوش میں نہیں لاسکتیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ بہت بیمار ہے۔ تمہارے ڈیڈی ایمبولینس کے لیے فون کر رہے ہیں۔''

اچانک ہی ایلیکس چلائی۔ ''اوہ میرے خدا! یہ ٹیگ بتا رہا ہے کہ اسے ذیابیطس ہے۔''

''آرجے۔'' مما نے پکارا۔ ''آرجے، انہیں بتاؤ کہ یہ کوما میں چلا گیا ہے۔ اسے انسولین یا گلوکوز دینے کی ضرورت ہو گی لیکن مجھے یاد نہیں کہ اس صورت حال میں کون سی چیز مناسب رہے گی۔''

''اسٹیو۔'' ڈیڈی نے کہا۔ ''وہ بتا رہے ہیں کہ ایمبولینس پچیس منٹ بعد آئے گی جبکہ اسپتال یہاں سے

بیوی اور ٹی وی

کسی نے ایک دل جلے شوہر سے جو کہ ٹیلی ویژن کمپنی میں ملازم تھا، پوچھا۔ ''بیوی اور ٹی وی میں کیا بات مشترک ہے؟''

وہ صاحب برملا بولے۔ ''ایک ہی بات مشترک ہے، دونوں کی باتیں بغیر فرمائش کے سننا پڑتی ہیں۔''

کراچی سے اقبال احمد کا ماجرا

تین چار منٹ کی مسافت پر ہے۔ بہتر ہے کہ ہم اسے خود ہی لے جائیں۔''

یہ سنتے ہی سب لوگ متحرک ہو گئے۔ مما نے کہا۔ ''میں منی وین لے کر آئی ہوں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے اپنا کوٹ اٹھایا اور چلی گئیں۔ کیرن اور ایلیکس نے گارسیا کو فرش سے اٹھانے کی کوشش کی لیکن میں نے کہا۔ ''تم دونوں اسے صرف ایک سیکنڈ کے لیے پکڑو اور میں......''

میں نے اسے بازوؤں سے اوپر اٹھایا اور کمر پر لاد کر لفٹ کی طرف بڑھا۔ ڈیڈی میرے ساتھ تھے اور دونوں خواتین اپنے کوٹ پکڑے میرے پیچھے آرہی تھیں۔ مما کی منی وین عمارت کے دروازے کے سامنے تیار کھڑی تھی اور اس کا پچھلا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے گارسیا کو اس کے فرش پر لٹایا اور اس کا اوورکوٹ اس پر ڈال دیا۔ جب گاڑی روانہ ہوئی تو ڈیڈی نے کہا۔ ''مس مائیکل تم اسپتال کے ایمرجنسی روم کو فون کر کے بتادو کہ ذیابیطس کا ایک بے ہوش مریض آرہا ہے تاکہ وہ اس کے لیے تیار رہیں۔''

میں نے راستے میں اس کے اوورکوٹ کی تلاشی لی لیکن دستانوں اور ٹوپی کے علاوہ کچھ نہیں ملا۔ البتہ پتلون کی جیبوں میں ڈیڑھ سو ڈالر اور والٹ تھا جس میں کوئی رقم نہیں تھی صرف چند تہ کیے ہوئے کاغذ اور ایک اس کا شناختی کارڈ جان ہرنینڈیز کے نام سے ملا جس پر گزشتہ برس کی تاریخ پڑی ہوئی تھی اور کسی قریبی جگہ کا پتا درج تھا۔ میں نے وہ

کارڈ ایلیکس کو دیا اور کہا۔ ”تم اس جگہ سے واقف ہو؟“
”کیا؟“ اس نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور بولی۔ ”یہ لٹل ویسٹ کا پتا ہے۔ یہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔“
کیرن نے بھی ایک نظر اس کارڈ پر ڈالی اور بولی۔ ”ناقابلِ یقین، یہ پتا کیسر کا ہے جو کئی سالوں تک ہوٹل رہا ہے۔“
اسپتال والوں نے اسے داخل کرلیا اور انسولین دینا شروع کردی۔ میں، مما اور ایلیکس انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آدھ گھنٹے بعد ڈیڈی نے آکر بتایا کہ مریض کی حالت تسلی بخش نہیں ہے اور کیرن کو وقتی طور پر گارسیا کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اس نے کہلوایا ہے کہ ایلیکس اس کا انتظار کرے۔
ڈیڈی نے مجھ سے کہا۔ ”اب تم بھی گھر جاؤ، لورین کو تمہاری ضرورت ہے۔“
اس کے بعد کے واقعات مجھے کیرن نے چند ہفتوں بعد بتائے۔ وہ ایمرجنسی روم کے کیبن میں بے ہوش گارسیا کے پاس تنہا بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے بارے میں کیرن کا رویہ یکسر تبدیل ہو چکا تھا۔ پانچ گھنٹے پہلے وہ اوفلائن میں اس نیت سے داخل ہوئی تھی کہ گارسیا کا اصلی نام اور پتا معلوم کر کے اسے قتل کے الزام میں گرفتار کروا سکے لیکن اسے بہت جلد احساس ہو گیا کہ یہ 1993ء والا گارسیا نہیں ہے، اس نے گرم ماحول میں جو اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کا مقصد اپنی بوسیدہ قمیص کے ساتھ زوال پذیر جسمانی حالت کو بھی چھپانا تھا۔
اسے اچانک ہی یہ ادراک ہوا کہ اس کی طرح گارسیا کی زندگی بھی مکمل طور پر تبدیل ہو چکی ہے۔ اس کے حالات تو جنس کی تبدیلی کے بعد مزید بہتر ہو گئے تھے لیکن گارسیا تمام محاذوں پر پسپا ہو رہا تھا۔ صحت، ذہنی استعداد، حیثیت، مالی حالات، سب میں بگاڑ پیدا ہو چکا تھا۔ ایمرجنسی روم کے ڈاکٹر نے بتایا کہ اسے ٹائپ ٹو کی ذیابیطس ہے اور یہ بے ہوشی اس کے دماغ کو بھی متاثر کر سکتی ہے۔
اسپتال والوں نے اس کی خطرناک حالت کے پیشِ نظر اسے داخل کرلیا تھا اور بظاہر اس کے پاس علاج یا دیکھ بھال کے لیے پیسے نہیں تھے۔ جیسے ہی اس کی حالت بہتر ہوئی تو اسے فوراً ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ کیرن نے گارسیا کا والٹ اٹھایا اور اس میں رکھے ہوئے تہ شدہ کاغذ دیکھنے لگی۔ پہلا ایک فارم تھا جس میں اس کا نام جان ہرنینڈیز اور پیشہ کنٹریکٹ ورکر لکھا ہوا تھا۔ دوسری ایک پان شاپ کو فروخت کی گئی انگوٹھی کی رسید تھی جو اس نے ڈیڑھ سو ڈالر میں بیچی تھی اور تیسری رسید بھی پان شاپ کی تھی جس کے مطابق اس نے اعشاریہ اڑتیس کا ریوالور صرف پچاس ڈالر میں بیچا تھا۔
اس نے پہلے دو کاغذ واپس والٹ میں رکھ دیے لیکن ریوالور کی رسید اپنے پرس میں رکھ لی۔ اس وقت وہ نہیں جانتی تھی کہ اس نے ایسا کیوں کیا شاید بعد میں ضرورت پڑنے پر وہ اسے پولیس کو دکھائے تاکہ وہ اس ریوالور کو ضبط کر کے اس کا فارنسک ٹیسٹ کروائیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا اسی ہتھیار سے فادر ڈینی کو قتل کیا گیا تھا۔“
اس نے بستر میں کچھ حرکت محسوس کی تو وہ اپنے خیالوں سے باہر آگئی۔ اس نے دیکھا کہ گارسیا نے آنکھیں کھول دی تھیں پھر اس نے کمزور آواز میں کہا۔ ”تم...... کون ہو؟“ لیکن فوراً ہی اسے پہچان لیا۔ ”سینوریتا کیرن۔“
”جان۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تم کوما میں چلے گئے تھے۔ ہم تمہیں اسپتال لے کر آئے ہیں۔“
”اسپتال؟“ وہ انگریزی میں بولا۔ ”نہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے شوگر ہے اور میں اس کی دوا لیتا ہوں۔“
اس نے اپنی گردن پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”سینوریتا، میری صلیب۔“
”اسٹینڈ پر رکھی ہے۔ میں دیتی ہوں۔“
صلیب لینے کے بعد اس نے اسے اپنے سینے پر رکھا اور ہسپانوی میں بولا۔ ”سینوریتا، مجھے اعتراف کرنا ہے۔ تمہیں پادری کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ کیا تم ہسپانوی بول لیتی ہو؟“
وہ جانتی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے یعنی وہ فوراً باہر جا کر نرس کو بتائے کہ مریض کو ہوش آگیا ہے اور پھر اپنی دوست سے مل کر گھر چلی جائے۔
”تھوڑی بہت۔“ اس نے جواب دیا۔
”ٹھیک ہے۔ میری بات سنو۔“ گارسیا نے ہسپانوی میں کہا۔ ”میں کسی پادری کے سامنے اعتراف نہیں کرسکتا جو کچھ میں کہنے والا ہوں۔ تم میرے لیے ایک فرشتہ ہو۔ اس لیے میں تمہارے سامنے اعتراف کر رہا ہوں۔“
”نہیں۔“ وہ رونا چاہ رہی تھی۔
”سینوریتا! مجھے معاف کر دو۔ میں بہت گناہ گار ہوں۔ میں نے ایک پادری کو قتل کیا جو میرا سب سے بڑا

گناہ تھا اور اس کی سزا مجھے ذیابیطس کی صورت میں ملی۔ میں اپنے اس فعل پر شرمندہ ہوں، میں......''

اس نے اپنے اعتراف میں بتایا کہ گزشتہ موسم گرما میں جب وہ سینٹ جارج کے پاس سے گزر رہا تھا تو اچانک ہی فادر ڈینی اس کے سامنے آیا اور اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ وہ وہی پادری ہے جس کے سامنے اس نے بستر علالت پر اعتراف کیا تھا۔ ''جان گارسیا، مجھے تمہارا نام بھی یاد ہے۔''

کوئی جواب دینے کے بجائے وہ مڑا اور گھبراہٹ میں وہاں سے بھاگ گیا کیونکہ وہ اس وقت تک بھول چکا تھا کہ اس نے کبھی کوئی اعتراف کیا تھا۔

اس نے ایک ہفتہ خوف اور دہشت کے عالم میں گزار دیا۔ اس کی نیند، بھوک، پیاس سب غائب ہو چکی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ پادری اس کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے اور وہ کسی بھی وقت پولیس کے سامنے اس کا سارا کچا چٹھا بیان کر سکتا ہے چنانچہ اس نے پادری کی تلاش میں گرجا کے گرد چکر لگانا شروع کر دیا۔ تیسرے روز وہ اسے نظر آ گیا اور گارسیا نے کوئی وارننگ دیے بغیر اسے گولی مار دی۔ یہ اس کا آخری قتل تھا۔ اس کے بعد اسے دن رات سوتے جاگتے میں جہنم کا خوف ستا تا رہتا ہے۔

''سینوریتا؟'' اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''تم میری بات سمجھ گئیں؟ کیا تم میرے لیے دعا کرو گی؟''

''ہاں۔'' کیرن نے انگریزی میں جواب دیا۔ ''میں کبھی کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی' یہ میرا وعدہ ہے اور تمہارے لیے دعا کروں گی۔''

چند لمحے خاموشی رہی۔ اس دوران اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ ''جان۔'' اس نے کہا۔ ''جب تم میرے اپارٹمنٹ میں بے ہوش ہو گئے تھے تو میگوئل آیا تھا۔ اس نے مجھے وہ سو ڈالر دے دیے جو اس پر واجب الادا تھے۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنا پرس کھولا اور اس میں سے سو ڈالر نکال لیے۔ یہ وہی رقم تھی جو کبھی گارسیا نے میگوئل کو خاموش رہنے کے لیے دی تھی۔ اس نے وہ نوٹ گارسیا کے حوالے کیے جس نے انہیں بستر کی چادر کے نیچے رکھ لیا۔

کچھ دیر بعد ایک نرس آئی اور گارسیا کی حالت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ الٹے قدموں واپس گئی اور ایک ڈاکٹر کو بلا کر لے آئی جس نے گارسیا کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ اسے وارڈ میں منتقل کر دیا جائے تاکہ مکمل تشخیص

کے بعد علاج تجویز کیا جاسکے۔ اس عمل میں دو سے تین دن لگ سکتے ہیں۔

گارسیا نے احتجاج کیا۔ وہ اسپتال میں نہیں رہنا چاہتا تھا لیکن اس کی کسی نے نہ سنی اور کیرن بھی اپنے گھر واپس آگئی۔ دوسرے دن صبح نو بجے کسی نے اسپتال سے فون کر کے پوچھا کہ کیا وہ جانتی ہے گارسیا کہاں ہے۔ لگتا ہے کہ وہ صبح ہونے سے پہلے اسپتال سے چلا گیا۔

چند روز تک وہ اسی خوف میں مبتلا رہی کہ گارسیا اسے کوئی نقصان نہ پہنچائے لیکن کچھ عرصہ بعد اس کا خوف ختم ہو گیا کیونکہ اس دوران اسے گارسیا نے کوئی فون نہیں کیا حالانکہ وہ اس کا گھر جانتا تھا پھر یہ کہ اب اس کے پاس اسلحہ بھی نہیں تھا اور نہ ہی اتنے پیسے کہ وہ کباڑیے کی دکان سے ریوالور واپس لے سکتا پھر اس کی رسید بھی کیرن کے پاس تھی تاہم کیرن اپنے وعدے پر قائم رہی اور اس کے لیے ہر روز دعا کرتی رہی۔

تین ہفتے بعد کیرن نے مجھے اور ڈیڈی کو الگ الگ فون کر کے اس خدمت کا معاوضہ جاننا چاہا جو ہم نے گارسیا کو اسپتال پہنچانے کے لیے انجام دی تھی لیکن ڈیڈی نے یہ کہہ کر کچھ لینے سے انکار کر دیا کہ ہم نے اس کی مدد... انویسٹی گیشن کے بجائے انفرادی طور پر کی تھی۔

اس کے بعد اس کی قریبی دوست ایلیکس نے بھی مجھے فون کیا اور کہا کہ کیرن اپنے آپ کو قصوروار سمجھ رہی ہے کہ اس نے موقع ملنے کے باوجود گارسیا کی خاطر خواہ مدد نہیں کی۔ دوسرے لفظوں میں اس نے گارسیا کے بارے میں اپنا نظریہ تبدیل کر لیا تھا اور وہ اسے پولیس کے حوالے کرنے کے بجائے اسے تلاش کر کے اس کی مدد کرنا چاہتی تھی۔

میں کیرن کا اشارہ سمجھ گیا۔ آنے والے جمعہ کی سہ پہر میرے پاس دو گھنٹے کا وقت تھا۔ میں نے ایک اندازہ لگایا اور لٹل یوکرائن کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے گاڑی ایک میٹر دور کھڑی کی اور اس ہوٹل کی جانب چل دیا جہاں کبھی گارسیا نے قیام کیا تھا اور اب وہ تعمیرِ نو کے مرحلے میں تھا۔ اس کے عقبی دروازے پر ایک تالا لگا ہوا تھا لیکن اس کے کنڈے کے اسکرو ڈھیلے ہو چکے تھے۔ اس لیے وہ آسانی سے کھل گیا۔

میرے کوٹ کی ایک جیب میں ٹارچ اور دوسری میں پستول تھا اور میں نے یہ دونوں چیزیں اندر داخل ہونے سے پہلے نکال لی تھیں۔ مجھے گراؤنڈ فلور پر کوئی نظر نہیں آیا اور نہ ہی کوئی آواز سنی۔ ہوٹل کے مرکزی ہال میں کچرا پڑا ہوا تھا اور مجھے وہاں ایک دو چوہے بھی دوڑتے ہوئے نظر آئے۔

میں نے ٹارچ کی مدد سے زینہ تلاش کیا اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا پانچویں منزل پر پہنچ گیا۔ دوسرے کمروں کے برعکس کمرا نمبر 502 میں ابھی دروازہ موجود تھا۔ میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ مقفل تھا۔ ایک سراغ رساں کے لیے تالا کھولنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اندھیرے کے باوجود میں نے چند سیکنڈ میں یہ کام کر لیا۔

کمرے میں داخل ہونے کے بعد میں نے آواز لگائی۔ ''جان، جان...... میں کیرن اور ایلیکس کا دوست ہوں۔'' جب کوئی جواب نہ ملا تو میں نے ٹارچ کی روشنی فرش پر ڈالی لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔ میں نے دوبارہ کہا۔ ''جان! میں صرف اس لیے یہاں آیا ہوں کہ کیرن نے تمہارے لیے ایک لفافہ بھیجا ہے وہ تمہیں دے دوں۔ وہ تمہارے لیے بہت پریشان ہے۔''

اس کے بعد بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ میں کمرے کی دوسری جانب گیا۔ میں نے دیکھا کہ کمرے کے وسط میں ایک گدے پر کئی کمبلوں کے نیچے جان گارسیا کی سرد لاش پڑی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ جن دوسری چیزوں پر میری نظر گئی ان میں دواؤں کی کچھ خالی بوتلیں، کپڑوں کی ایک چھوٹی سی گٹھری، دو بیٹری سے چلنے والی لائٹس اور ایک جگ جس میں پانی جم گیا تھا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ چار بج کر تیس منٹ ہوئے تھے پھر سیل فون نکال کر ڈیڈی کو اس بارے میں بتایا۔ ان کے مشورے پر میں ہوٹل سے باہر آیا اور پبلک فون سے پولیس کو گمنام کال کر کے اس لاش کے بارے میں بتایا اور کیرن کو بھی فون کر کے اطلاع کر دی۔

کیرن اور ایلیکس نے مردہ خانے میں اسے جان ہرنینڈیز کے نام سے شناخت کر لیا کیونکہ اس کے شناختی کارڈ پر یہی نام درج تھا۔ اس کی موت ایک ہفتہ قبل ہو گئی تھی۔ کیا وہ مرتے وقت اپنے گناہوں پر نادم تھا یا اس نے کسی پادری کے سامنے اعتراف گناہ کیا تھا۔ اس احمقانہ سوال کا جواب کوئی پوسٹ مارٹم رپورٹ نہیں دے سکتی تھی لیکن کیرن نے اس کے اعتراف کے بارے میں مجھے بتا کر اس سے کیا ہوا وعدہ توڑ دیا شاید اس لیے کہ وہ کیتھولک چرچ کی رکن نہیں تھی اور ان رسومات پر اسے یقین نہیں تھا۔

البتہ ایک بات یقینی ہے کہ مجھے اس بارے میں بتاتے ہوئے وہ شرمندہ نظر آرہی تھی۔

❖❖❖

کاش

منظر امام

کہانیاں بننا آسان نہیں ہوتا... ذہن و دل کو آمادہ کرنا پڑتا ہے... ایک مصنف کی پریشانی... عرصہ دراز سے اس کے لکھنے کا سلسلہ موقوف ہو چکا تھا... وہ لکھنا چاہتا تھا مگر ذہن پر جمود طاری تھا... اکتاہٹ عروج پر پہنچ چکی تھی... اسی جمود اور اکتاہٹ سے فرار حاصل کرنے کے لیے وہ سفر پر روانہ ہو گیا...
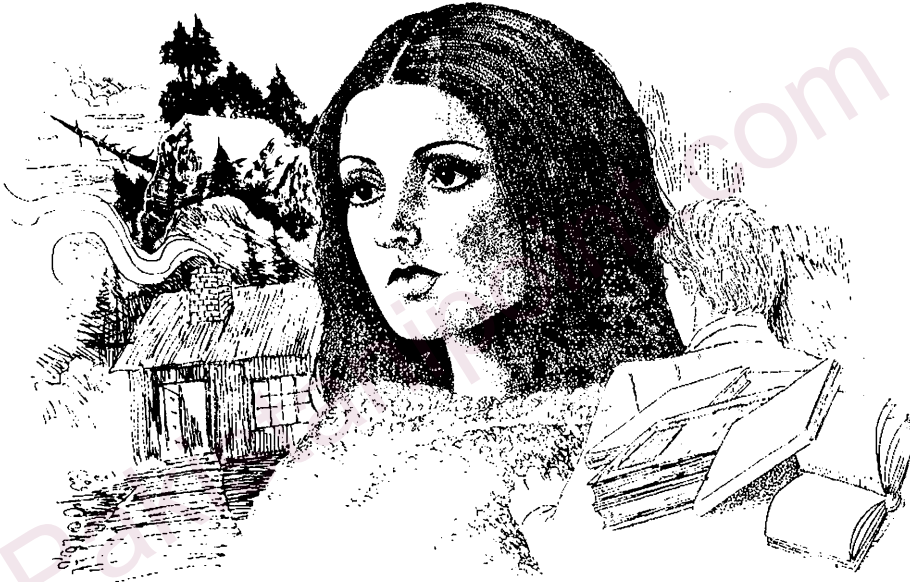
ایک پری کا دلچسپ فسانہ جس نے مصنف کی مشکل آسان کر دی

میں ایک رائٹر ہوں۔ کہانیاں لکھتا ہوں۔ یہی میرا روزگار ہے۔ یہی میرا کام ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ لکھنے والے بے چارے بھوکے رہتے تھے۔ ادب پیسے نہیں دیتا تھا۔ بجلی اور گیس کے بل ادا نہیں کر سکتا تھا۔ مکان کا کرایہ نہیں دے سکتا تھا لیکن جب سے ادب کمرشل ہوا ہے، ڈائجسٹ شروع ہوئے ہیں، تب سے لکھنے والوں کو معاوضے ملنے لگے ہیں۔

ناقدین چاہے کچھ بھی کہتے رہیں، ادیبوں کی خدمت

ہی ادب کی خدمت ہے۔ ادیب زندہ رہے گا تب ہی وہ ادب تخلیق کر سکے گا۔

میں نے بہت سی کہانیاں لکھیں۔ کچھ کہانیاں میری نظر میں بہت عمدہ ہوتی تھیں لیکن ان پر کسی ڈائجسٹ کی چھاپ لگی ہوتی تھی اسی لیے ادبی سقرط ان کو کسی طرح ادب ماننے یا ان کی تعریف کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتے۔

بہرحال یہ ایک الگ موضوع ہے۔ کہانی تو اس وقت سے شروع ہوتی ہے۔ جب میں اچانک بنجر ہو گیا۔ یہاں بنجر ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ مجھ سے لکھا نہیں جا رہا تھا۔

مجھ سے میرے ادارے نے ایک طویل کہانی کی فرمائش کی تھی لیکن میں کسی طرح لکھ ہی نہیں پا رہا تھا۔ کاغذ پر کسی کہانی کا پلاٹ بناتا اور پھر اس کاغذ کو پھاڑ کر پھینک دیتا۔ عجیب بے بسی سی تھی۔

میں نے اپنے ایک دوست سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ یہ بہت عام کیفیت ہے۔ اس کو ذہنی جمود کہتے ہیں۔ بہت سے لکھنے والوں کے ساتھ یہ ہوتا رہا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد خود ہی ٹھیک ہو جاتا ہے۔''

لیکن کچھ دن بھی گزر گئے۔ اس کے بعد دو مہینے ہو گئے، ذہن کی وہی کیفیت رہی۔ اُداس کر دینے والی۔ لکھنا چاہتا لیکن لکھا نہیں جاتا تھا۔ فرمائش کرنے والے بول بول کر تھک چکے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔

اسی دوست نے مشورہ دیا۔ ''تم ایسا کرو۔ کچھ دنوں کے لیے کسی پُرفضا مقام پر چلے جاؤ۔ نئی جگہ ہو گی۔ نیا ماحول ہو گا۔ ہوسکتا ہے کہ وہاں جا کر تمہارے ذہن پر جمی ہوئی برف کچھ پگھلنے لگے۔''

اس کا یہ مشورہ بہت مناسب تھا۔ میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا کہ جا کر دیکھوں تو سہی۔ تازہ ہوا میں سانسیں لوں گا۔ سرسبز پہاڑیوں کو دیکھوں گا تو ممکن ہے کہ کچھ تبدیلی آ جائے۔

اکیلا آدمی تھا اسی لیے جانے میں بھی کوئی دشواری نہیں تھی۔ کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ میں نے اپنا سامان ساتھ لیا اور ایک خوبصورت سفر طے کر کے ایک پُرفضا مقام پر پہنچ گیا۔

یہ ایک دلکش جگہ تھی۔ سرسبز پہاڑیاں۔ دامن میں گھاس کا قالین بچھا ہوا ہو گویا بولتے اور چہچہاتے پرندے۔ سب کچھ بہت خوبصورت تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کسی یورپی ملک کی کسی وادی میں پہنچ گیا ہوں۔

خوشی ہوئی کہ خدا نے اپنے ملک کو بھی کتنا دلکش بنا دیا ہے۔ کیا نہیں ہے یہاں؟

چلتے چلتے مجھے ایک کیبن نظر آ گیا۔ میں بس سے اُتر کر پیدل ہی نہ جانے کس طرف چل پڑا تھا۔ یہ میری عادت رہی ہے۔ میں عام طور پر سفر کے دوران منزل پر نہیں بلکہ راستوں پر توجہ دیتا ہوں۔

میرے نزدیک منزل تو ایک جمود کا نام ہے۔ وہاں زندگی رک جاتی ہے۔ منزل پر پہنچ کر پھر کیا کرنا ہے۔ کچھ نہیں۔ اصل لطف تو راستے میں ہوتا ہے۔ جو آگے چلتے رہنے کا حوصلہ دیتا ہے۔

وہ منظر اتنا دلکش تھا کہ میں ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر ارد گرد کے مناظر دیکھنے لگا۔ پھر اپنی ڈائری نکال کر اپنے تاثرات لکھنے لگا...... اچانک احساس ہوا کہ ارے یہ کیا۔ مہینوں کے بعد میں کچھ لکھ رہا ہوں۔ کچھ بھی سہی، لکھ تو رہا ہوں۔

کچھ لکھ لینے کے بعد میں نے اس کیبن کی طرف چلنا شروع کیا جو اس وادی میں اس طرح لگ رہی تھی جیسے کسی میدان میں پھولوں کا گلدستہ رکھ دیا جائے۔

وہ لکڑی سے بنا ہوا ایک خوبصورت کیبن تھا۔ اس کو سرخ رنگ کر دیا گیا تھا جس نے اس کی دلکشی اور بڑھا دی تھی۔

میں نے کیبن کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ جلد ہی کھل گیا۔

دروازہ کھولنے والا ایک اچھی عمر کا آدمی تھا جس کی صحت بہت اچھی نظر آ رہی تھی۔

اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔ ''کون ہو تم؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا نام ندیم بہزاد ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''میں شہر سے آیا ہوں۔ یہاں اس وادی میں آپ کا کیبن دیکھا تو چلا آیا۔''

''اور جانا کہاں ہے؟''

''نہیں معلوم۔'' میں نے بتایا۔

''کیا مطلب؟'' اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

''میں اس علاقے میں خود کو پُرسکون رکھنے کے لیے آیا ہوں۔ شہروں کی بھاگ دوڑ سے گھبرا گیا ہوں۔ وحشت ہونے لگی ہے۔ اسی لیے اس طرف آ گیا ہوں۔''

''اوہ تو تم یہاں مہمان ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ میں نیا آیا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''آؤ اندر آ جاؤ۔ گھبراؤ نہیں، میں اکیلا رہتا ہوں۔''

میں اس کے کیبن میں چلا گیا۔ صاف ستھرا سا سادہ کیبن تھا۔ ایک طرف ایک چارپائی بچھی تھی۔ بید کی بنی ہوئی

دو پرانی کرسیاں بھی تھیں۔ ایک ہی کمرا تھا۔ ایک طرف چولھا بھی تھا۔

''بابو! میرا نام راجا ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔ ''خدا ہی جانتا ہے کہ میں کہاں کا راجا ہوں۔''

''ایسا کیوں کہتے ہو۔ تم دل کے راجا ہو۔'' میں نے کہا۔

''بابو! میں تمہارے لیے چائے بناتا ہوں۔''

وہ اٹھ کر چولھے کی طرف چلا گیا۔ اس ویران مقام پر اکیلا زندگی گزارنے والا شخص مجھے حیران کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ دو پیالیاں چائے لے آیا تھا۔ چائے بہت مزے دار تھی۔

''راجا'' میں نے ایک دو گھونٹ لینے کے بعد مخاطب کیا۔ '''تمہاری چائے تو بہت اچھی ہے۔''

''ہاں جی یہی ہنر تو آتا ہے۔ صرف چائے اچھی بنا لیتا ہوں۔ باقی چیزیں تو بس کام چلانے کے لیے ہیں۔'' وہ پھر ہنسنے لگا۔ وہ ایک ہنس مکھ آدمی تھا۔

'''اور کھانے کا سامان وغیرہ کہاں سے لاتے ہو؟''

''بابو یہ سامنے جو پہاڑی ہے، اس کی دوسری طرف ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ شکور نام ہے اس کا۔ میں سامان وہیں سے لاتا ہوں اور اپنا کھانا خود ہی بنا لیتا ہوں۔ بس زندگی گزر رہی ہے۔''

میرے ذہن میں دوسرا سوال یہ تھا کہ وہ اکیلا اس ویرانے میں کیوں رہ رہا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ اس کی گزر بسر کیسے ہوتی ہے؟

ہوتا یہی ہے کہ جب ذہن میں ایک سوال آتا ہے تو اس کے بعد مختلف سوالوں کے در کھل جاتے ہیں۔ کیوں کہ انسان کی فطرت میں تجسس ہوتا ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے۔

''راجا تم یہ بتاؤ۔ کیا اس علاقے میں کوئی ہوٹل وغیرہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''جہاں میں رہ سکوں؟''

''نہیں جی یہاں کوئی ہوٹل نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''یہاں ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ تم ویسے بھی میرے مہمان بن کر آئے ہو۔ میرے ساتھ ہی رہو۔''

''نہیں راجا۔ تمہارا یہ کیبن اتنا چھوٹا سا ہے۔ خود تمہارا گزارہ مشکل سے ہوتا ہوگا۔ تم مجھے کیسے رکھو گے؟''

''یہ کیا بات کی؟'' وہ کچھ ناراض سا ہو گیا۔ ''ہم مہمانوں کو بوجھ نہیں سمجھتے اور ویسے بھی تم مجھے دل کا راجا کہہ چکے ہو۔''

''اچھا بھائی راجا صاحب۔ میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔ لیکن میری بھی ایک شرط ہوگی۔''

''چلو وہ سب بعد میں بتانا۔ ابھی تو میں کھانے کی تیاری کر رہا ہوں۔ شام ہونے والی ہے۔ ان علاقوں میں شام ہوتے ہی رات بھی ہو جاتی ہے۔ ہر طرف سناٹا ہو جاتا ہے اسی لیے جو کام کرنا ہو وہ میں جلدی کر لیتا ہوں۔''

''راجا۔ یہاں نہانے کا کیا انتظام کرتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''چند قدم پر ایک ندی بہتی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''بہت صاف پانی ہوتا ہے اس کا۔ میں وہیں اپنے کپڑے بھی دھو لیتا ہوں اور وہیں سے نہا کر آ جاتا ہوں۔ اگر تم کو نہانا ہے تو میرے ساتھ چلو لیکن ایک بات بتا دوں۔ تم شہری ہو۔ پانی بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ برداشت کر لو گے؟''

''کیوں نہیں۔ میں ٹھنڈے پانی سے نہانے کا عادی ہوں۔''

''تو پھر چلو میرے ساتھ۔''

میں اس کے ساتھ نہر یا ندی تک آ گیا۔ وہ برابر ہی میں تھی۔ صاف شفاف پانی۔ کیا خوبصورت منظر تھا۔ ایک طرف پہاڑی۔ جس کے سبزے کی جھلک اس پانی میں اپنا عکس ڈال رہی تھی۔ روح تک میں سرشاری کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

میں نے نہانے والے کپڑے پہنے اور اللہ کا نام لے کر اس پانی میں اتر گیا۔ ایک لمحے تک تو میں سُن ہو کر رہ گیا۔ اتنے ٹھنڈے پانی کا کبھی تجربہ نہیں کیا تھا۔ جھُرجھُری سی آ گئی۔

اس احساس کا دورانیہ بہت کم رہا تھا۔ اس کے بعد اچھا محسوس ہونے لگا۔ عادت سی ہونے لگی۔ پھر میں بہت دیر تک کئی دنوں کی کثافت اسی پانی میں دھوتا رہا۔ راجا اپنے کیبن کی طرف جا چکا تھا۔

میں نہر سے باہر آ کر اپنے آپ کو اسی خطے کا کوئی باسی محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے تولیا سے خود کو خشک کیا۔ کپڑے بدلے اور کیبن کی طرف چل پڑا۔ راستہ یاد تھا مجھے۔ میں کیبن میں پہنچا تو راجا نے میرے لیے گرما گرم چائے تیار کر رکھی تھی۔

چائے کے دو گھونٹ لیتے ہی بدن میں گرمی آ گئی۔

''ہاں جی کیسا لگا؟'' راجا نے پوچھا۔

''بہت اچھا۔ بالکل فریش ہو گیا ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''اگرچہ بہت ٹھنڈ لگ رہی تھی لیکن مزہ آ گیا۔''

راجا کے پاس ایک فالتو بستر بھی تھا۔ اس نے وہ مجھے دے دیا۔ میں اسی میں لیٹ گیا۔ بہت بے خبری کی نیند آئی تھی۔ نہ جانے کب تک بے خبر سوتا رہا پھر راجا ہی نے مجھے اٹھایا۔ ''اٹھو بابو۔ صبح ہو گئی ہے۔ چائے تیار ہے۔''

میں ہاتھ منہ دھونے کے لیے نہر کی طرف چلا گیا۔
واپس آیا تو راجا نے ناشتا تیار کر کے رکھا تھا۔
میں اس شخص کے خلوص کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ کیا رشتہ تھا مجھ سے؟ کچھ بھی نہیں۔ بس ایک دن کی ملاقات تھی۔ اور کیسی خدمت کر رہا تھا۔ ایسی خدمت جس کا شہروں میں تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔
''بابو! میں بستی کی طرف جا رہا ہوں۔'' راجا نے کہا۔
''تم یہاں آرام کرو۔ اگر چاہو تو میرے ساتھ چل بھی سکتے ہو؟''
''نہیں راجا۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ بہت تھکا ہوا ہوں۔''
''تو پھر آرام کرو۔ یہاں کوئی نہیں آتا۔''
راجا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر بستر پر لیٹ گیا۔ تھکان ابھی تک بدن پر طاری تھی لیکن ابھی نیند آنے ہی والی تھی کہ کیبن کے دروازے پر ہونے والی دستک نے چونکا دیا۔ یہ راجا تو نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کو دستک دے کر آنے کی کیا ضرورت تھی۔ راجا کا کوئی جاننے والا ہی ہو سکتا تھا۔
میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور سامنے جو دیکھا اس نے حیران کر دیا۔
میری نظروں کے سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ بہت خوبصورت۔ بہت دل فریب نقوش تھے اس کے۔ اس نے مقامی لڑکیوں جیسا لباس پہن رکھا تھا اس کے باوجود ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا تعلق اس علاقے سے نہیں ہے۔
میں حیران ہو کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔
''جی۔ کون ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔ ''کس سے ملنا ہے؟''
''تم سے...... تم سے......'' اس نے ایک عجیب انداز سے کہا۔
''مجھ سے؟ کیوں؟''
''اس لیے کہ میں تمہیں جانتی ہوں۔'' اس نے سرگوشی کی۔ اس کی سرگوشی میں ایک نشہ سا تھا۔ ایک تو اس کی آواز بہت سریلی تھی۔ کانوں میں گھنٹیاں بجاتی ہوئی آواز۔ پھر اس نے ایک خاص انداز سے سرگوشی کی تھی۔ اسی لیے سرشاری کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔
''میں نہیں سمجھا کہ تم کیا کہہ رہی ہو اور مجھے کیسے جانتی ہو؟''
''میں برسوں سے تمہیں اپنے خوابوں میں دیکھتی آئی ہوں۔'' اس نے کہا۔
اگر وہ لڑکی مجھے شہر میں ملی ہوتی تو میں کوئی دھیان نہیں دیتا۔ شہروں میں اس قسم کی ایکٹیویٹی ہوتی رہتی ہے۔ لڑکیاں اسی طرح بے وقوف بناتی ہیں لیکن اس مقام پر ایسی کسی لڑکی کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔
''دیکھو۔'' اس نے کہا۔ ''لگتا ہے تم یہاں نہیں رہتے۔''
''ہاں میں یہاں نہیں رہتا۔ شہر سے آیا ہوں۔ اس کیبن کا مالک کوئی اور ہے۔''
''جانتی ہوں میں۔'' اس نے پھر اسی انداز میں کہا۔
''میں پھر آؤں گی۔ تم سے ملنے کے لیے۔ یاد رکھنا میں پھر آؤں گی۔''
وہ مڑی اور ایک طرف چل دی۔
میں نے چاہا کہ اسے آواز دے کر روک لوں پھر نہ جانے کیوں ہمت نہیں ہوئی۔ ایک تو یہ انجان علاقہ۔ خدا جانے کون ہے۔ کہاں سے آئی ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو جاتی تو بے چارہ راجا شرمندہ ہو جاتا۔
میں بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ جب جاگا تو اس وقت تک راجا کھانا تیار کر چکا تھا۔ کیسا آدمی تھا جو مجھ پر احسان کیے جا رہا تھا۔
میں فریش ہو کر راجا کے ساتھ کھانے پر بیٹھ گیا۔ کھانے کے دوران جب میں نے اس لڑکی کا ذکر کیا تو راجا بھی حیران رہ گیا۔ ''نہیں بابو۔ اس علاقے میں ایسی کوئی لڑکی نہیں ہے جیسا تم بتا رہے ہو۔ اگر کوئی ہو بھی تو اس کیبن کی طرف کیوں آنے لگی؟''
''مجھے خود اندازہ ہے راجا لیکن جو کچھ ہوا ہے، اس نے مجھے حیران کر دیا ہے۔''
اس وقت تک اچھی خاصی رات ہو چکی تھی اسی لیے ہم سو گئے۔ دوسری صبح پھر وہی معمول تھا۔ راجا نے ناشتا بنا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اس وقت میں نے اپنی جیب سے پانچ ہزار نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے۔
''یہ کیا؟'' راجا نے حیرت سے پوچھا۔
''راجا! میں تمہاری محبتوں کا بدلہ تو نہیں دے سکتا لیکن اتنا ضرور کر سکتا ہوں کہ کسی حد تک تمہارا ساتھ دے سکوں۔''
''بابو جی تم ہمارے مہمان ہو۔'' راجا نے کہا۔ ''ہم مہمانوں سے اپنی محبت کا معاوضہ نہیں لیتے۔''
''راجا تم بھول رہے ہو۔ میں صرف تمہارا مہمان نہیں بلکہ بھائی بھی ہوں۔ کہو بھائی ہوں یا نہیں؟''

راجانے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد گردن ہلادی۔

''یہ تو ہے۔ میں بھی تم کو ایسا ہی سمجھنے لگا ہوں۔ دو ہی دنوں میں تم سے انسیت سی ہوگئی ہے۔''

''تو پھر کیسا تکلف؟ یہ رکھو۔''

راجانے وہ روپے اپنی جیب میں رکھ لیے۔

وہ رات پھر آرام سے گزر گئی۔ اس رات میں چاندنی کا لطف لینے کیبن سے باہر آگیا۔ کیا حسن تھا۔ چاندنی جیسے موج بن کر ہر طرف لہریں لے رہی تھی۔ ایسے ہی عالم میں لوگ شاید تاج محل کو دیکھ کر نیم پاگل ہوجاتے ہیں۔ ایسی ہی کیفیت میری تھی۔

میں ایک بڑے سے پتھر پر جاکر بیٹھ گیا۔ میرے چاروں طرف حسن بکھرا ہوا تھا۔ میں اس مقام کے سحر میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک ایک طرف سے کوئی آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ ایک ہیولا سا تھا جو آہستہ آہستہ قریب آرہا تھا۔ میں اپنی جگہ سنبھل کر کھڑا ہوگیا۔ کئی ماورائی کہانیاں یاد آنے لگی تھیں۔ وہ ہیولا قریب آیا۔ اس بار میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ ایک لڑکی تھی۔ اس چاندنی میں اس کے خدوخال واضح ہوگئے تھے۔

یہ وہی پُراسرار لڑکی تھی جو مجھے دکھائی دی تھی۔ جس نے مجھ سے باتیں کی تھیں۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا یا پہچان کر ہی قریب آئی تھی۔

''کیسے ہو تم؟'' اس نے پوچھا۔ وہی آواز ہلکے سروں میں گھنٹیاں بجاتی ہوئی سیدھی دل اور ذہن میں اترتی ہوئی۔

''تم؟''

''ہاں میں وہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''ہم ایک دوسرے سے مل چکے ہیں۔''

''ہاں تم اس دن بھی اسی پُراسرار انداز میں آئی تھیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔ میں اسی طرح آیا کرتی ہوں۔''

''لیکن تم کون ہو۔ کیا نام ہے تمہارا؟ کہاں رہتی ہو؟''

''میں تمہارے خیالوں میں رہتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''میرا نام عذرا ہے۔ تم نے رائیڈر ہیگرڈ کی عذرا اور عذرا کی واپسی تو پڑھی ہوگی۔ میں وہی عذرا ہوں۔ صدیوں کی مسافت ختم کر کے تمہارے پاس آئی ہوں۔''

اس نے جس ناول کے کردار کا حوالہ دیا تھا، وہ ہیگرڈ کا مشہور کردار تھا۔

لیکن وہ تو ایک ناول کا کردار تھا۔ پھر یہ لڑکی اس کردار سے زندہ ہوکر کیسے نکل آئی تھی۔

''میں اسی طرح چاندنی میں باہر نکل آتی ہوں۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''گھومتی رہتی ہوں۔ شہروں میں میرا دل نہیں لگتا۔ شاید میں نے یہیں کہیں اسی ماحول میں جنم لیا تھا۔''

اچانک فراز کا شعر یاد آگیا۔ ''وہ آگ ہے کہ برق ہیولا کہ آدمی...... اب کے ملے تو ہاتھ لگا کر بھی دیکھیے۔''

میں نے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا تو وہ بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔ ''نہیں یہ مت کرنا ورنہ میں غائب ہوجاؤں گی۔ پھر کبھی تم سے نہیں ملوں گی۔ اور ویسے بھی مجھے واپس جانا ہے۔''

''کہاں جاؤ گی تم؟'' میں نے پوچھا۔

''جہاں سے آئی ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''ایک بات بتاؤ۔ تم جب پہلی بار ملی تھیں تو ایسا لگا جیسے تم مجھے جانتی ہو۔ اور آج بھی تمہارا انداز یہی ہے کہ جیسے تم مجھے برسوں سے جانتی ہو؟''

''ہاں۔ ہمیں سب معلوم ہوجاتا ہے کہ تم کون ہو۔'' اس کا انداز وہی اسرار بھرا تھا۔

''تمہیں کیسے معلوم؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ مت پوچھو۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''تم ایک لکھنے والے ہو۔ جس طرح میری زندگی کے دنوں میں پروہت ہوا کرتے تھے۔ وہ لکھنا جانتے تھے۔ لیکن وہ قسمتوں کے حال لکھا کرتے تھے لیکن تم کچھ اور لکھتے ہو۔''

بولتے بولتے وہ کھڑی ہوگئی۔ میں اس کی باتیں سن کر سناٹے کے عالم میں تھا۔ کون تھی وہ؟ کیا چاہتی تھی؟ کس دنیا کی مخلوق تھی؟ اس نے میرے بارے میں بتا دیا تھا کہ میں ایک لکھنے والا ہوں۔ لیکن یہ سب کیا بھید تھا۔

وہ جس طرح آئی تھی، اسی طرح واپس چلی گئی۔ میں بہت دیر تک وہیں بیٹھا رہا پھر اٹھ کر راجا کے کیبن میں آگیا۔ وہ کیبن میں میرا انتظار ہی کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ لپک کر میرے پاس آگیا۔ ''کہاں چلے گئے تھے؟ میں تو کب سے تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوں۔''

''راجا میں چاندنی کا لطف لینے باہر گیا تھا۔'' میں اس کے سامنے جاکر بیٹھ گیا۔

''تم کچھ پریشان سے لگ رہے ہو۔'' اس نے کہا۔

''راجا میں واقعی پریشان ہوں۔ کیا تم اس وقت میرے لیے چائے بنا سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں، ابھی بنا دیتا ہوں۔'' راجا چائے بنانے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں سوچنے لگا۔ کیا تھا یہ سب؟ وہ کون تھی؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی کہانی کا کردار زندہ ہوکر

سامنے آجائے۔ کیا وہ خواب تھی۔ یا میں خود ہی کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔

راجا چائے لے کر آ گیا۔ میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے اسے ساری کہانی سنا دی۔ اس کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ ''ایسا پہلی بار ہوا ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''باپ دادا سے یہ کہانی سنتے تھے لیکن وہ تو بہت پہلے کی بات ہے۔''

''کس کہانی کی بات کر رہے ہو راجا؟ بتاؤ۔''

''کہانی کچھ یوں ہے کہ بہت پہلے ایک شہزادی ان ہی پہاڑیوں کے درمیان اپنے گھوڑے سے گر کر مر گئی تھی۔ اس کو بہت تلاش کیا گیا۔ بہت دنوں کے بعد ایک کھائی میں اس کی لاش ملی تھی لیکن یہ بات بہت پہلے کی ہے۔ پھر یہ ہوا کہ وہ اکثر ان علاقوں میں دکھائی دینے لگی۔ اسی طرح اپنے گھوڑے پر سوار۔ بہت سے لوگوں سے وہ باتیں بھی کرتی تھی۔ لیکن اس کے بعد پھر اس کا پتا نہیں چلا۔ اور اب تم بتا رہے ہو کہ تم سے ملتی ہے۔''

''ہاں راجا۔ میں غلط نہیں کہہ رہا۔'' میں نے کہا۔

''بابو۔ تم اپنی حفاظت کے لیے رات کو کچھ پڑھ کر سویا کرو۔'' راجا نے مشورہ دیا۔

''ہاں راجا۔ تم نے ٹھیک مشورہ دیا ہے۔ میں اپنی زندگی گزار رہا ہوں چاہے وہ جیسی بھی ہے۔ میں ڈسٹرب ہونا نہیں چاہتا۔''

اس رات پھر کچھ نہیں۔ لیکن وہ مجھے یاد آتی رہی۔ اگر وہ کوئی روح بھی تھی تو بھی وہ میرے اعصاب پر سوار ہو چکی تھی۔ اس کا دلفریب چہرہ۔ اس کی مسکراہٹ اور اس کی گفتگو کا دھیما دھیما انداز۔ یہ سب اسے ایک طلسماتی کشش دے رہا تھا۔ اس کی یادیں بھی ویسی ہی طلسماتی تھیں۔

دوسری صبح راجا نے مجھ سے کہا۔ ''بابو! میں بستی کی طرف جا رہا ہوں۔ اگر تم بھی چلنا چاہو تو میرے ساتھ چلو۔''

''نہیں راجا۔ تم چلے جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''میں آس پاس کی سیر کرتا رہوں گا۔''

راجا نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا۔ پھر خاموشی سے کپڑے کا بڑا سا تھیلا اٹھا کر کیبن سے باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے کچھ دیر بعد میں بھی کیبن سے باہر آ گیا۔ اور ایک طرف چلتا چلا گیا۔ بس یوں ہی بغیر کسی منزل کے انجانے راستوں پر یا شاید مجھے اسی روح کی تلاش ہو۔ جس نے میری روح میں ایک ہلچل مچا دی تھی۔

میں چلتا رہا چلتا رہا اور وہ مجھے دکھائی دے گئی۔

یہ وہی تھی۔ بالکل وہی لیکن وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی اور بھی تھی۔ دونوں ماڈرن لباس میں تھیں۔ ہنستی بولتی ہوئی چلی جا رہی تھیں۔ میں ان کا پیچھا کرنے لگا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس لڑکی یا روح کا ٹھکانا کہاں ہے۔

میں کچھ فاصلے سے ان کا پیچھا کرتا رہا۔ پورے بدن میں ایک سنسنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ نہ جانے کون سا بھید سامنے آنے والا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئیں۔

میں ان سے کچھ فاصلے پر تھا۔ وہ ہنس رہی تھیں۔ زور زور سے بول رہی تھیں۔

دوسری لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''توبہ ہے تو کتنی شریر ہو گئی ہے۔ فلموں میں اداکاری کرتے کرتے زندگی میں بھی اداکاری کرنے لگی ہے۔''

''یار مزہ آتا ہے۔'' اسی لڑکی نے کہا۔ ''وہ بے چارہ مجھے کوئی روح سمجھ رہا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ میں کون ہوں؟''

''لیکن تو نے اسے کیسے بتا دیا کہ وہ ایک لکھنے والا ہے۔''

''یار۔ وہ ایک مشہور رائٹر ہے۔ میں نے اس کی کہانیاں بھی پڑھی ہیں اور اس کی تصویریں بھی دیکھی ہیں اسی لیے میں نے بول دیا۔''

''حد ہو گئی۔ اور وہ بے چارہ تجھے روح سمجھ کر خوابوں اور خیالوں میں گم ہو گیا ہو گا۔''

''ہاں یار! یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن دل چاہتا ہے کہ کاش میں کوئی روح ہی ہوتی اور اسی طرح اس کے پاس آیا جایا کرتی۔ اسی ماحول میں جب ہر طرف چاندنی پھیلی ہو اور پہاڑیاں سرگوشی کر رہی ہوں۔''

''اچھا اچھا چل چل۔ ورنہ سارا یونٹ ہماری تلاش میں چل دے گا۔''

وہ دونوں اٹھ کر چلی گئیں۔ مجھے اب یاد آ رہا تھا کہ میں اس لڑکی کو جانتا تھا۔ وہ ایک فلمی اداکارہ تھی۔

ہو سکتا ہے کہ اس نے بہت سی فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے ہوں لیکن سب سے بڑا مظاہرہ تو اس نے میرے ساتھ کیا تھا۔

وہ ایک دھوکا ہی سہی لیکن اس کے اس دھوکے سے مجھے جو فائدہ ہوا، وہ یہ تھا کہ میرے ذہن کا جمود ختم ہو گیا تھا۔ اور میں ایک نئی ہمت اور نئی سرشاری کے ساتھ کہانیاں لکھنے لگا ہوں۔

❖❖❖
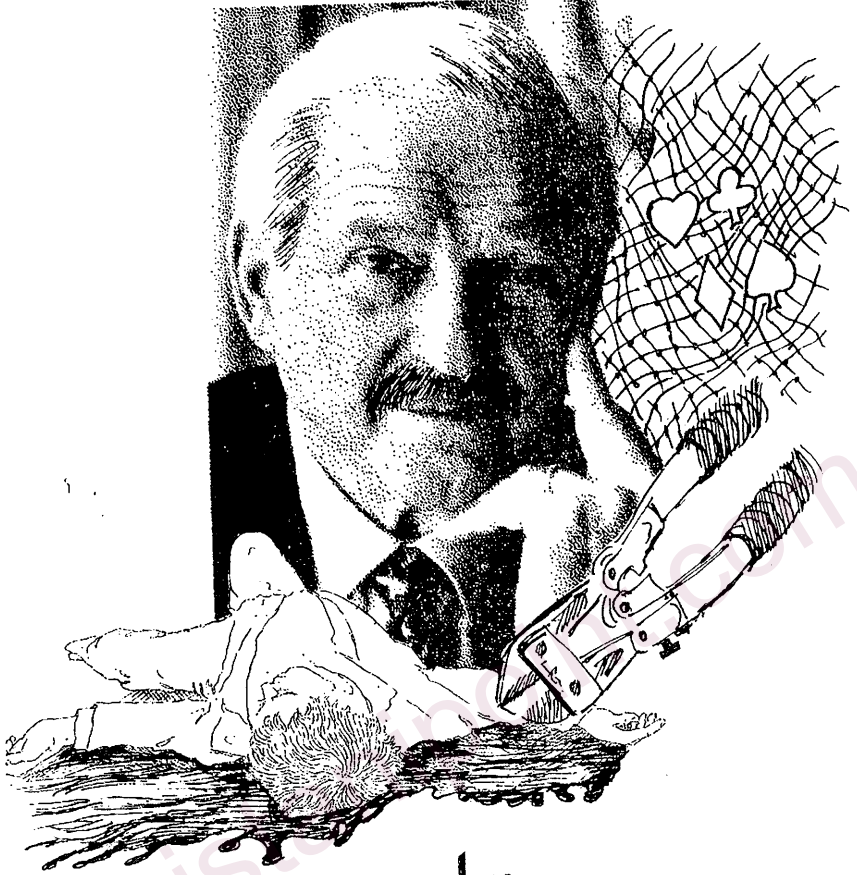
جواری

جمال دستی

کاروبار کرنے کے لیے ذہانت کے ساتھ سرمایہ بھی درکار ہوتا ہے... تبھی یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے... سیر و تفریح کی غرض سے اپنا وقت گزارنے والے جوڑوں کا اجتماع... اچانک ہی قتل کی واردات نے اس تفریحی مقام کے حسن کو داغ دار کردیا... اور تمام ٹولیاں بکھر کے رہ گئیں...

کاروباری اور جواری کے درمیان ہونے والی چپقلش کا قصہ

شیلڈن لاموٹ نے کیمپ گراؤنڈ کے ڈرائیو وے میں اپنا ٹریلر (ریکریشن وہیکل) کھڑا کیا۔ وہ اور اس کی بیوی وانڈا نیچے اُترے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے اور کپڑوں پر سے گرد جھاڑنے لگے۔

وانڈا نے وہاں کھڑی ہوئی دوسری گاڑیوں کو شمار کیا ان میں چھ کی لمبائی ان کے ٹریلر کے برابر تھی یعنی تقریباً ساٹھ فٹ جبکہ چھ دوسری گاڑیاں نسبتاً چھوٹے سائز کی تھیں۔ اس کے علاوہ پانچ کیمپرز اور سات ٹریول ٹریلرز بھی وہاں موجود

تھے۔ ان میں کم از کم دس گاڑیاں دوسری ریاستوں سے آئی تھیں۔ ستمبر کے حوالے سے یہ ایک معقول تعداد تھی کیونکہ بچوں کے اسکول کھل چکے تھے لیکن یہاں آنے والوں میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جن کے بچے جوان بلکہ صاحب اولاد تھے۔ اس لیے وہ بے فکری سے سیر و تفریح کر سکتے تھے۔

استقبالیہ ڈیسک پر بیٹھے ہوئے شخص کا نام ڈچ تھا۔ شیلڈن نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''لاموٹ۔ ہم نے تین راتوں کے لیے ریزرویشن کروائی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ یہاں سے الٹے ہاتھ پر چوبیس نمبر سلاٹ تمہارے لیے مخصوص ہے بجلی اور وائی فائی کی سہولت کے ساتھ۔ تمہارے ہمراہ کوئی اٹھارہ سال سے کم عمر کا بچہ یا چار ٹانگوں والا جانور تو نہیں ہے؟''

''نہیں، بس ہم دو میاں بیوی ہیں۔''

''تم پہلے بھی یہاں قیام کر چکے ہو؟''

''ہاں تین چار سال پہلے۔''

''میں نے کمپیوٹر میں دیکھ لیا ہے۔ تمہیں یہ فارم بھر کر اس پر دستخط کرنا ہوں گے لیکن اس سے پہلے مجھے ڈرائیونگ لائسنس اور کریڈٹ کارڈ دے دو۔''

''شاید تمہیں یاد ہو۔'' ڈچ نے لاموٹ سے کہا۔ ''لیکن میں دوبارہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ تم ایک کشتی کرائے پر لے سکتے ہو لیکن اس میں سوار ہوتے وقت لائف جیکٹ باندھنا ضروری ہے، سورج غروب ہونے کے بعد مچھلیاں پکڑنا یا کشتی چلانا منع ہے۔ اس کے علاوہ تیراکی کی بھی اجازت نہیں ہے۔''

''مجھے سب یاد ہے۔'' لاموٹ نے کہا۔

''لانڈری اور شاور اس عمارت کے دوسری طرف ہیں اور باہر جانے والی سڑک کے اختتام پر ڈمپ اسٹیشن موجود ہے۔ احتیاط کا تقاضا ہے کہ تم رات کو سونے سے پہلے اندر سے کنڈی لگا لینا۔''

شیلڈن لاموٹ نے برتھ نمبر چوبیس پر ٹریلر کھڑا کر کے اس کے پہیوں کو مقفل کیا اور بجلی کا کنکشن لگا دیا۔ وانڈا نے ٹریلر میں موجود سامان کا جائزہ لیا پھر کھانا پکانے کے لیے چیزیں جمع کرنے لگی جس کے لیے اسے جھیل کے ساحل پر موجود آؤٹ ڈور گرل کو استعمال کرنا تھا۔

ڈے بریک آر وی کورٹ اور کیمپ گراؤنڈ جھیل کے کنارے نو ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ ایلومینیم کی کشتیاں کرائے پر دستیاب تھیں۔ پانی کے کنارے پر بورڈ لگے ہوئے تھے جن میں تیراکی اور پانی پر چلنے سے منع کیا گیا تھا۔

کھانا پکانے سے فارغ ہو کر دونوں میاں بیوی واپس آئے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ البتہ درختوں اور کھمبوں پر لگی ہوئی فلڈ لائٹس کی وجہ سے دفتر کی عمارت اور پارکنگ ایریا میں روشنی ہو رہی تھی۔ اسی وقت ایک بہت بڑا ٹریلر ان کے برابر میں آ کر رکا جس پر اوکلاہوما کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی۔

''ہائے۔'' ایک سرخ چہرے اور کھچڑی بالوں والے شخص نے آواز لگائی۔ ''میرا نام ڈارون پرینٹس ہے اور یہ میری بیوی کولیٹ۔ میں دن میں چار سو میل سفر کرتا ہوں۔ اس کے بعد مجھے رکنا پڑتا ہے چاہے وہ غلّے کا کھیت ہی کیوں نہ ہو۔''

شیلڈن لاموٹ نے اپنا اور وانڈا کا تعارف کروایا اور ان کے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو ہونے لگی۔ دونوں جوڑے رات کے کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ ''تم ہماری بس پر کیوں نہیں آ جاتے۔'' پرینٹس نے کہا۔ ''میرے پاس بہت عمدہ اسکاچ ہے جو میں نے گزشتہ ماہ اٹلانٹا سے خریدی تھی۔''

''شکریہ، میں شراب نہیں پیتا۔'' لاموٹ نے کہا۔ ''مجھے پہلے ہی اس کی سزا مل چکی ہے۔''

''اس کا ڈرائیونگ لائسنس چھ ماہ کے لیے معطل ہو گیا تھا۔'' وانڈا نے وضاحت کی۔

لاموٹ نے ٹریلر کو تالا لگا کر الارم سسٹم آن کر دیا اور وانڈا کے ساتھ پرینٹس کے ساٹھ فٹ لمبے ٹریلر میں داخل ہو گیا۔ لیونگ روم کی دیواروں پر ایشین آرٹ اور دستکاری کے نمونوں کے علاوہ مختلف قسم کے نوادرات، ہتھیار اور دیگر سجاوٹی اشیا آویزاں تھیں۔

''مجھے یہ مت بتانا کہ تم نے مختلف جگہوں پر جا کر یہ نادر اشیا جمع کی ہیں۔'' وانڈا نے کولیٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا لیکن اس کے بجائے ڈارون نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم اس بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے لیکن میں اپنا مکمل تعارف کروانا چاہتا ہوں۔ میں آرمی انجینئرنگ کور میں سیکنڈ لیفٹیننٹ بھرتی ہوا اور کرنل ریٹائر ہوا تب تک میرے دونوں کندھوں پر سلور اسٹار اور کانوں میں آلۂ سماعت لگ چکا تھا۔ اس کے بعد میں نے نام، لاؤس اور کمبوڈیا میں کئی ڈیم اور پُل بنائے۔''

''کیا تم دونوں کی ملاقات وہیں ہوئی تھی؟'' لاموٹ نے پوچھا۔

''سات سال پہلے وان ہنگ کے اسکول کی پرانی عمارت میں جواب ایک رہائش گاہ میں تبدیل ہو چکا ہے۔''

جب دونوں مردوں کے درمیان سیاست، کھیلوں اور موسم پر گفتگو ہو رہی تھی تو خواتین کھانوں، ملبوسات اور بچوں کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔

''کیا تمہیں تاش کھیلنے سے دلچسپی ہے؟'' پرینٹس نے پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر دراز کھول کر تاش کی ایک بالکل نئی گڈی نکالی۔ ''تم کیا کھیلنا پسند کرو گے برج یا پوکر؟''

''تم نے بہت خوب صورت ڈائمنڈ رنگ پہن رکھی ہے۔'' لاموٹ نے کولیٹ سے کہا جو پتے پھینٹ رہی تھی۔

''میں پوچھنے والا تھا کہ یہ تمہاری منگنی کی انگوٹھی ہے لیکن تمہاری شادی کو اتنا عرصہ نہیں گزرا کہ یہ پتھر اتنی جلدی میلا ہو جاتا۔ شاید یہ تمہاری نانی یا دادی کی ہے؟''

کولیٹ نے تاش کی گڈی میز پر رکھی اور انگوٹھی کو روشنی کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔

''نہیں یہ میری ہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ برتن دھونے کے صابن اور چکنائی کی وجہ سے اس کی چمک ماند پڑ گئی ہے۔''

''ایسا ہوتا ہے۔ ہمارا کال سٹی کی مرکزی شاہراہ پر جیولری اسٹور تھا جہاں ہم نے تیس سال تک کام کیا لیکن اب پیدل چل کر وہاں جانا مشکل ہو گیا ہے۔ لہٰذا میں نے گھر میں ہی دکان کھول لی ہے جہاں میں گھڑیوں اور انگوٹھیوں کی مرمت کرتا ہوں۔ میں تمہارے ڈائمنڈ کو بھی بیس منٹ میں صاف کر سکتا ہوں اور یہ بالکل نیا ہو جائے گا اس کا میں کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔''

☆☆☆

سیکنڈ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر کے بریک روم میں تقریباً سبھی آفیسرز موجود تھے۔ کافی کا دور چل رہا تھا۔ ایک آفیسر قریبی ڈونٹ شاپ سے ایک درجن پیسٹریاں لے کر آیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپس میں خوش گپیاں بھی چل رہی تھیں۔ اسی وقت کیپٹن مینگ دروازے میں نمودار ہوا۔

''ایک منٹ کے لیے میرے ساتھ آؤ ڈولنگر۔''

وہ اسے اپنے ساتھ دفتر لے گیا اور میز پر سے ایک کاغذ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''شیرف او ورمیل کو ایک حادثے کے سلسلے میں ہماری مدد درکار ہے۔ ڈے بریک آر وی پارک کی جھیل میں ایک شخص ڈوب گیا ہے۔ اس کا نام ڈارون پرینٹس ہے۔ عمر چھیاسٹھ سال۔ اس کی لاش آج صبح جھیل کی سطح پر تیرتی ہوئی پائی گئی۔ اس کے سر کا پچھلا حصہ

پچکا ہوا ہے۔ کورونر آفس کے اسٹیمی کا خیال ہے کہ اسے قتل کیا گیا ہے اور شیرف کو اس کی تحقیقات کے لیے مزید افرادی قوت کی ضرورت ہے کیونکہ وہاں دو تین درجن ٹریلر کھڑے ہوئے ہیں اور ان میں سے کچھ لوگ ابھی واپس جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔

''میں پیٹی فورڈ کو گشت پر سے ہٹا رہا ہوں تاکہ وہ تمہارے ساتھ چلا جائے۔ تم ایک کار لے جاؤ اور شفٹ ختم ہونے سے پہلے مجھے فون پر رپورٹ دینا۔ اگر میں دفتر میں موجود نہ ہوں تو تم لیفٹیننٹ اوبرن سے رابطہ کر سکتے ہو۔ تم شیرف اور اس کے ڈپٹی کے ساتھ مل کر ٹیم بناؤ اور لوگوں سے بات کرو۔ تلاشی اور گرفتاری کے وارنٹ اس کا مسئلہ ہے، تم کوئی سوال کرنا چاہتے ہو؟''

''کیا اس سے پہلے وہاں کوئی واقعہ پیش آچکا ہے جیسے چوری یا نقب زنی؟''

مینگ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹے موٹے واقعات تو ہوتے رہتے ہیں اور شیرف ڈپارٹمنٹ نے ان چوریوں اور جائداد کو نقصان پہنچانے کی تحقیقات بھی کی ہے لیکن کبھی کسی حملے یا قتل کی رپورٹ نہیں ملی۔''

ڈولنگر اور پٹرول مین پیٹی فورڈ دس بج کر چالیس منٹ پر ڈے بریک کیمپ گراؤنڈ پہنچے۔ ڈرائیو وے میں شیرف کی گاڑی اس طرح کھڑی تھی کہ گراؤنڈ تک جانے کا راستہ بند ہو گیا چنانچہ انہوں نے اپنی کار سڑک کے کنارے چھوڑی اور پیدل ہی آگے چل دیے۔

ایک اجنبی کی اچانک موت پر راہ گیروں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں اور وہ اس واقعے پر اپنے اپنے تبصرے کر رہے تھے۔ چھٹیاں منانے آنے والے بہت سے لوگ اب کیمپ گراؤنڈ تک محدود ہو گئے تھے اور وہ وقت گزاری کے لیے مختلف مشغلے اختیار کیے ہوئے تھے۔ کوئی اخبار پڑھ رہا تھا تو کوئی تاش کھیل رہا تھا۔ کوئی آئی پیڈ تو کوئی بیئر سے دل بہلا رہا تھا۔ سنسنی کے متلاشی لوگوں کا ایک چھوٹا سا گروپ کشتیوں کی گودی پر جمع ہو گیا تھا جہاں ڈارون پرینٹس کی لاش ترپال سے ڈھکی ہوئی پڑی تھی۔ جب ڈولنگر اور پیٹی فورڈ وہاں پہنچے تو مجمع انہیں دیکھ کر چھٹ گیا۔ وہاں اسٹیمی ان کا منتظر تھا۔

پرینٹس نے ٹی شرٹ، جینز اور جوتے پہنے ہوئے تھے۔ اس کے دائیں کان کے اوپر اور پیچھے گہرے کٹ کا نشان تھا جو شاید گودی کے کنارے سے ٹکرانے کی وجہ سے

آیا ہو جب اسے پانی میں گرتے ہوئے ٹھوکر لگی تھی لیکن یہ کسی کند ہتھیار کی ضرب لگنے کی وجہ سے بھی ہو سکتا تھا۔ اسٹیمی نے لاش کے دونوں ہاتھوں پر پلاسٹک کی تھیلیاں لپیٹ دی تھیں تا کہ ان پر لگے ہوئے نشانات ضائع نہ ہو جائیں۔

''مجھے اس کے ڈوبنے پر شک ہے۔'' اسٹیمی نے کہا۔ ''تاہم پوسٹ مارٹم ہونے تک کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''اسے مرے ہوئے کتنی دیر ہو گئی؟''

''یہ بتانا بہت مشکل ہے کیونکہ اگر یہ پانی میں نہیں ڈوبا تو اسے مرے ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد ہی کسی نے اس کی لاش کو پانی میں پھینکا۔ میرا خیال ہے کہ اس کی موت صبح دو یا تین بجے کے قریب واقع ہوئی۔''

''کچھ اندازہ ہے کہ وہ اس وقت یہاں کیا کر رہا تھا؟''

''اس کی بیوی کا کہنا ہے کہ اس نے رات میں کسی وقت اسے بستر سے اٹھتے اور ٹریلر سے باہر جاتے ہوئے سنا تھا لیکن وہ نیند میں ہونے کی وجہ سے وقت نہ دیکھ سکی۔''

''کیا اسے لوٹا گیا؟''

''اس کی جیب میں صرف ایک چابی تھی۔ وہ اپنا والٹ اور آلۂ سماعت ٹریلر میں ہی چھوڑ آیا تھا۔''

''کیا اسے کوئی ذہنی بیماری تھی؟''

''اس کی بیوی کا کہنا ہے کہ نہیں۔''

ڈولنگر نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ گودی پرانی تھی۔ اس کا رنگ اڑ چکا تھا اور جگہ جگہ سے زنگ آلود ہو چکی تھی لیکن اس کی مضبوطی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ آٹھ ایلومینیم کی کشتیاں گودی کے مشرقی سرے پر بندھی ہوئی تھیں جن میں سے چار کے ساتھ مچھلی پکڑنے والے جال بھی تھے۔ ایک ریک میں بیٹریاں اور لائف جیکٹ رکھی ہوئی تھیں۔

ایک پختہ گزرگاہ جھیل کے ساحل اور سنگل اسٹوری سرخ اینٹوں کی عمارت کو جدا کرتی تھی۔ اس عمارت کے ایک حصے میں چار نہانے کے بوتھ اور ایک لانڈری بنی ہوئی تھی اس کے علاوہ ایک آئس مشین اور ملحقہ احاطے میں ایک درجن مائع پروپین کے ٹینک نصب تھے۔

شیرف مونٹی اوورمیل بھی وہاں آ گیا۔ اس نے ڈولنگر اور پیٹی فورڈ سے مصافحہ کیا۔

ڈولنگر نے کہا۔ ''ہم تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں؟''

''انتظامیہ نے ہمیں ان افراد کی فہرست دی ہے جنہوں نے گزشتہ رات یہاں قیام کیا۔ قاعدے کے مطابق ہمیں ان سب لوگوں کے بیانات لینے ہیں اور ممکنہ گواہوں کو تلاش کرنا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ یہاں سے چلے جائیں۔''

''سب سے پہلے لاش کس نے دیکھی؟''

''اس پارک کے مالکان میں سے ایک ایزا موریس نے، اسے سب لوگ ڈچ کہہ کر بلاتے ہیں۔ وہ کافی جھنجلایا ہوا ہے۔ اس وقت وہ اور ونٹل دفتر میں گزشتہ رات کی ویڈیو دیکھ رہے ہیں۔''

اسی وقت مردہ خانے کا عملہ بھی لاش لینے کے لیے آ گیا۔ انہوں نے ڈارون پرینٹس کی لاش کو گاڑی میں رکھا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اسٹیمی کی وین بھی اس کے پیچھے تھی۔ لاش کے جانے کے بعد وہاں موجود لوگ بھی منتشر ہونا شروع ہو گئے۔ پیٹی فورڈ مہمانوں کی فہرست میں ان لوگوں کو تلاش کر رہا تھا جو پہلے ہی وہاں سے روانہ ہو چکے تھے یا جانے والے تھے۔

ڈپٹی بیری ونٹل اپنی کار کو راستے سے ہٹا کر آیا تو اس کی ملاقات ڈولنگر سے ہوئی۔ وہ اسے استقبالیہ ڈیسک کے عقب میں واقع بزنس آفس میں لے گیا۔ وہاں اس نے تین افراد سے ڈولنگر کا تعارف کروایا۔ ان میں کیمپ گراؤنڈ کے مالکان ڈچ موریس اور ہوبرٹ ویلس کے علاوہ ڈین ڈوبسن بھی تھا جو ان کے لیے چھوٹے موٹے مرمت کے کام کیا کرتا تھا۔

''ہم باہر لگے ہوئے خفیہ کیمروں میں سے ایک کی ویڈیو دیکھ رہے تھے۔'' مونٹل نے کہا۔ استقبالیہ ڈیسک کے اوپر دیوار پر چار مانیٹر لگے ہوئے تھے جن پر اس کیمرے سے بنی ہوئی ویڈیو چل رہی تھی۔ ونٹل نے بتایا کہ ہر کیمرا اپنے ویڈیو ٹیپ ریکارڈر کو ایک سیکنڈ میں دو تصویریں فیڈ کرتا ہے اور دن کے اوقات میں بند رہتا ہے۔

اس نے میز پر رکھے ہوئے وی سی آر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس ویڈیو کو دوبارہ چلاتا ہوں تا کہ معلوم ہو سکے کہ اس میں کیا ہے۔'' اس کیمرے نے جھیل کے ساحل اور گودی کے اس حصے کا منظر محفوظ کر لیا تھا جہاں سے ڈولنگر ابھی ابھی آیا تھا۔ ہر بلیک اینڈ وائٹ تصویر پر وقت اور تاریخ لکھی ہوئی تھی۔ پہلے اسکرین پر ایک درمیانے سائز کا کتا ٹہلتا ہوا نظر آیا۔ اس نے جھیل کے پانی سے اپنی پیاس بجھائی اور منظر سے اوجھل ہو گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے وقفے کے بعد ایک عورت جس کے بال کمر تک لمبے تھے۔ دائیں سے بائیں جانب جاتی ہوئی دکھائی دی۔

اس کی رفتار سے اندازہ ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ پریشان ہے۔ اس کے جانے کے بعد کیمرا چھ بج کر آٹھ منٹ اور چوالیس سیکنڈ تک غیر متحرک رہا۔

پھر ڈچ مورس پاجامہ پہنے ہوئے اسکرین کے بائیں کونے پر نمودار ہوا۔ اب سورج نکلنے سے منظر واضح ہو گیا تھا۔ تبھی اس کی نظر جھیل کی سطح پر تیرتی ہوئی لاش پر گئی جسے دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت اور صدمے کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ فوراً ہی وہاں سے چلا گیا اور اس کی واپسی دو منٹ اور چند سیکنڈ بعد ہوئی۔ اس کے ساتھ ڈوبسن بھی آیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے لاش کو پانی سے نکالنے میں کامیاب ہوئے اور انہوں نے اسے منہ کے بل گودی پر لٹا دیا اور ہوش میں لانے کی کوشش نہیں کی۔

اس کے بعد کے مناظر میں مزید لوگ گودی پر آئے۔ اس واقعے پر باتیں کرتے اور واپس جاتے نظر آئے۔ اس کے بعد تصویریں غائب ہو گئیں جیسے کسی نے ریکارڈنگ کا بٹن آف کر دیا ہو۔

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔'' وٹنل نے کہا۔ ''کہ پرینٹس کیمرے کی نظروں میں آئے بغیر پانی میں کیسے جا سکتا ہے؟''

''گودی کا دایاں سرا کیمرے کی رینج سے باہر ہے۔'' ڈولنگر نے کہا۔ ''لہٰذا وہاں ہونے والی سرگرمی شاید اس کی نظروں میں نہیں آسکتی۔ وہ اسی جگہ سے پانی میں گر سکتا تھا۔''

''یا اس کی لاش کو وہاں سے پانی میں پھینکا گیا ہو۔''

''جیسا کہ ہم نے شیرف کو بتایا۔'' مورس بولا۔ ''رات گیارہ بجے کے بعد یہ عمارت مقفل ہو جاتی ہے۔ میں اور ہوبرٹ باری باری چوبیس گھنٹے ڈیوٹی دیتے ہیں تاکہ ٹیلی فون کالز کا جواب دے سکیں۔''

''تم دونوں یہیں رہتے ہو؟''

''ہاں، سیزن کے دنوں میں ہم یہیں رہتے ہیں۔ میں صبح چھ بجے اٹھ جاتا ہوں چاہے میری ڈیوٹی نہ ہو۔ میں صبح اخبارات لینے اور گراؤنڈ پر ایک نظر ڈالنے گیا تو مجھے جھیل میں پرینٹس کی لاش تیرتی ہوئی نظر آئی جیسا کہ تم نے ابھی ویڈیو میں دیکھا۔''

''صبح میں تیراکی کرنے کے لیے کافی ٹھنڈا پانی ہے۔'' ڈولنگر نے کہا۔

''کوئی بھی اس کوڑے دان میں تیراکی نہیں کرتا۔'' ہوبرٹ نے کہا۔ ''1880ء میں یہاں ایک فیکٹری تھی جہاں اسٹریٹ کاریں بنتی تھیں جب فیکٹری بند ہوئی تو انہوں نے سارا ملبا جھیل میں ڈال دیا جو اس کے وسطی حصے میں صرف دس فٹ گہرائی میں پڑا ہوا ہے۔''

''اس کی صفائی کے لیے لاکھوں ڈالرز درکار ہیں۔'' ویلسن نے کہا۔ ''اس کے علاوہ اگر ہم تیراکی کی اجازت دے دیں تو ہمیں پانی کے معیار کی نگرانی کرنے کے علاوہ لائف گارڈز کی بھی خدمات حاصل کرنا ہوں گی۔''

''کیا کچھ اندازہ ہے کہ پرینٹس آدھی رات کو وہاں کیا کر رہا تھا؟''

''کچھ نہیں کہہ سکتے۔'' وٹنل بولا۔

''کیا تم نے دوسرے تین کیمروں کی ویڈیوز بھی دیکھیں؟'' ڈولنگر نے پوچھا۔

''کس لیے؟ ان سب کا رخ دوسری سمت میں ہے۔''

''میرا خیال تھا کہ شاید وہ اس عورت یا کتے کی مزید سرگرمیاں دکھا سکیں۔'' ڈولنگر نے کہا۔ ''کتے کی آوارہ گردی تو سمجھ میں آتی ہے لیکن وہ عورت رات کے تین بجے وہاں کیوں پھر رہی تھی؟''

''سڑک پر چلنے کی نسبت یہ راستہ محفوظ ہے۔ میں خود ہر روز صبح کو وہاں سے گزرتا ہوں بشرطیکہ بارش نہ ہو رہی ہو۔''

''گویا تم بھی مقامی ہو؟''

''یہاں سے مغرب کی جانب دس منٹ کے پیدل فاصلے پر میرا ایک پرانا فارم ہاؤس ہے۔''

''تمہاری کوئی فیملی ہے؟''

''بیوی اور دو لڑکے۔ وہ اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔''

''تم آج صبح یہاں کب آئے؟''

''میں یہاں پہنچا ہی تھا جب میں نے ڈچ کو گودی سے مدد کے لیے پکارتے ہوئے سنا۔''

شیرف اوورمیل دفتر میں داخل ہوا۔ ''وٹنل میری کار سڑک پر سے ہٹا دو۔ تقریباً نصف درجن ٹریلرز کا قافلہ بن رہا ہے۔ پٹی فورڈ نے انہیں کلیئر کر دیا ہے اور وہ جانے کے لیے تیار ہیں۔''

شیرف اور اس کے ڈپٹی کے جانے کے بعد ڈولنگر نے پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری رکھا۔ ''کیا کوئی شخص میرے ساتھ گراؤنڈز تک جا سکتا ہے؟''

ڈین ڈوبسن نے اپنی خدمات پیش کیں۔ پہلے اس

نے عمارت کے مختلف حصے دکھائے جن میں ورکشاپ، اسٹورز اور کوارٹرز شامل تھے جن میں مورس اور ویلس سیزن کے دنوں میں رہتے تھے۔
''کیا ویلسن شادی شدہ ہے؟''
''ہاں، اس کی بیوی گروسری اسٹور اور اسنیک بار چلاتی ہے۔''
''اور مورس کے بارے میں کیا کہو گے؟''
''وہ کنوارا ہی اس دنیا سے چلا جائے گا۔''
ڈوبسن نے اپنے فرائض کے بارے میں کہا کہ وہ ٹوٹی ہوئی چیزوں کو جوڑتا ہے۔ اس میں پروپین ٹینک کو دوبارہ بھرنا، فلڈ لائٹ کے بلب تبدیل کرنا، موٹروں کی بیٹری ری چارج کرنا اور ٹریلرز کی دیکھ بھال کرنا شامل ہے۔ آف سیزن میں وہ ہیرس برگ میں واقع ایک کمپنی میں ڈینٹل آفس کے آلات کی تنصیب اور سروس کا کام کرتا ہے۔
جب وہ واپس آئے تو دیکھا کہ پٹرول مین پیٹی فورڈ ان بیانات پر دستخط کر رہا ہے جو واپس جانے والے مہمانوں سے لیے گئے تھے۔ اس نے ڈولنگر سے کہا۔ ''ویلس کا کہنا ہے کہ اگر ہم یہاں اسنیک بار میں لنچ کر لیں تو ہمارا بہت سا وقت بچ جائے گا۔''
وہ دونوں اسنیک بار گئے جہاں انواع و اقسام کے کھانے دستیاب تھے مثلاً ہمبرگر، ہاٹ ڈاگ، چلی، فرائز اور آئس کریم لیکن ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ ہر چیز چکھتے۔ کیرین ویلس بڑی نفاست اور سلیقہ مندی سے کھانا نکال رہی تھی لیکن اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ایک مہمان کی موت سے اسے بہت صدمہ ہوا ہے۔
گراؤنڈ کے باہر حالات معمول پر آ رہے تھے۔ لنچ کے بعد شیرف اپنے ڈپٹی کے ہمراہ قریبی فارم اور گھروں میں پوچھ گچھ کے لیے چلا گیا جبکہ ڈولنگر اور پیٹی فورڈ بقیہ لوگوں سے انٹرویو کرنے کے لیے ٹریلرز کی قطار کی جانب چل دیے۔ ڈولنگر ایک بڑے ٹریلر پر رک گیا اور گھنٹی بجائی۔ ایک شخص نہانے کا گاؤن اور سلیپر پہنے دروازے پر آیا۔
''مسٹر لاموٹ؟''
''اندر آ جاؤ۔'' وہ ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم یہاں کیوں آئے ہو اور میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ ہم نے گزشتہ شب کوئی غیر معمولی بات دیکھی اور نہ سنی۔''
اس کی بیوی بھی کچن سے باہر آ گئی اور اس نے اپنا لباس دکھانے کے لیے ایپرن اتار دیا۔
''کیا تم مسٹر پرینٹس سے واقف تھے؟'' ڈولنگر نے پوچھا۔
''کرنل پرینٹس۔'' لاموٹ نے تصحیح کی۔ ''صرف اس حد تک کہ اس نے گزشتہ شب پوکر کھیلتے ہوئے مجھ سے سترہ سو ڈالر جیت لیے۔''
ڈولنگر نے غیر لائسنس یافتہ جگہ پر جوا کھیلنے کے مسئلے کو نظر انداز کر دیا اور پوچھا کہ ''تم کہاں کھیل رہے تھے؟''
''ان کے ٹریلر میں جو ہمارے پڑوس میں ہے۔'' لاموٹ کی بیوی نے جواب دیا۔
''یہ کس وقت کی بات ہے؟''
''ہم نے تقریباً نصف شب کے قریب کھیل ختم کیا تھا۔'' لاموٹ نے کہا۔ ''کرنل نے وعدہ کیا تھا کہ وہ آج رات ہمیں جیتنے کا موقع فراہم کرے گا۔''
''کیا کرنل اس کا اعزازی خطاب ہے؟''
''وہ ملٹری انجینئرنگ کا ریٹائرڈ افسر تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے انڈوچائنا میں کئی پل بنائے تھے۔ آلۂ سماعت کے بغیر وہ کچھ نہیں سن سکتا تھا۔''
''تمہاری اس سے پرانی واقفیت نہیں تھی؟''
''میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''
''تمہارے علاوہ اس کھیل میں کوئی اور بھی شریک تھا؟''
''نہیں، صرف ہم چار ہی تھے۔ منگل کی شب اس نے مجھے دو سو ڈالر جیتنے کا موقع دیا لیکن گزشتہ شب اس نے وہ رقم مع سود واپس لے لی۔''
''کیا مطلب؟''
''میں مرنے والے کی برائی نہیں کرنا چاہتا لیکن مجھے یقین نہیں کہ قسمت اس پر مہربان تھی۔''
وہ دونوں میاں بیوی فیملی سے ملنے فلوریڈا جا رہے تھے اور ان کا ارادہ دوسرے روز یہاں سے روانہ ہونے کا تھا۔ ڈولنگر نے ان دونوں کے بیانات قلم بند کر کے دستخط لیے اور محفوظ سفر کی دعا کی۔ اس کے بعد وہ پرینٹس کی بیوی سے ملنے چلا گیا۔
''تمہیں زحمت دینے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ تمہارے لیے ایک مشکل وقت ہے لیکن میں تمہارے شوہر کی موت کی تحقیقات میں شیرف کی مدد کر رہا ہوں۔ کیا میں اندر آ کر تم سے چند سوالات کر سکتا ہوں؟''
''کیوں نہیں۔'' اس نے دروازے کی چٹخنی گرائی اور

بولی۔ ''میں پہلے ہی کئی سوالوں کے جواب دے چکی ہوں۔''

ڈولنگر نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارا شوہر ریٹائرڈ آرمی آفیسر تھا۔''

''ہاں، یہ درست ہے۔''

''تم لوگ پرسوں رات یہاں آئے تھے؟''

''ہاں، ہم تلسا سے مین ہٹن جاتے ہوئے یہاں رک گئے تھے۔ میں یہ بات پہلے ہی دو مختلف لوگوں کو بتا چکی ہوں۔''

''میں جانتا ہوں۔'' ڈولنگر نے کہا۔ ''کیا تمہارے شوہر کو حال ہی میں کوئی بیماری لاحق ہوئی تھی مثلاً مرگی، بے ہوشی کے دورے، حافظے کی کمزوری وغیرہ۔''

''نہیں، البتہ اسے ہائی بلڈ پریشر اور دل کا عارضہ لاحق تھا۔ میں نے سب کورونر آفس کے ایک آدمی کو بتا دیا تھا اور وہ اس کی دوائیں ساتھ لے گیا۔''

''کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہارے شوہر کی موت شاید حادثاتی نہیں تھی؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔''

''کیا کچھ اندازہ ہے کہ پرینٹس رات کے وقت گودی میں کیا کر رہا تھا؟''

اس عورت نے جواب میں بے بسی سے کندھے اچکا دیے۔ ڈولنگر نے فرض کر لیا کہ شیرف پہلے ہی اس عورت کا بیان لے چکا ہے لہٰذا اس نے واپس جاتے ہوئے کہا۔

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری اوکلاہوما فلائٹ کی مدت ختم ہو چکی ہے۔''

ڈولنگر اور پیٹی فورڈ تین بجے تک تمام مہمانوں سے انٹرویو کر چکے تھے لیکن شیرف اور اس کے ڈپٹی کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ ڈولنگر دوسرے تین کیمروں کی ویڈیو ٹیپ دیکھنا چاہ رہا تھا۔ وہ عمارت میں گئے جہاں ڈچ موریس استقبالیہ ڈیسک پر فارغ بیٹھا ہوا تھا۔ ''بری خبر بہت تیزی سے پھیلتی ہے۔'' وہ شکایتی انداز میں بولا۔ ''پہلے ہی تین آدمیوں نے اپنی بکنگ کینسل کروالی ہے جنہیں اس ہفتے آنا تھا۔ شاید ہمیں اس سال وقت سے پہلے پارک بند کرنا پڑ جائے۔''

''عام طور پر تم کب پارک بند کرتے ہو؟'' پیٹی فورڈ نے پوچھا۔

''ستمبر کے آخری روز، اگر یہ واقعہ مئی یا جون میں پیش آتا تو ہمارا پورا سیزن تباہ ہو جاتا۔ تم لوگوں نے کھانا کھا لیا؟''

''ہاں۔'' ڈولنگر نے جواب دیا۔ ''اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم ایک بار پھر گزشتہ شب کی ویڈیو ٹیپ دیکھنا چاہیں گے۔ اس کے علاوہ دوسرے تین کیمروں کی ویڈیو بھی۔''

''ہوبرٹ، ان لوگوں کے لیے ٹیپ مشین لگا دو۔''

پہلے انہوں نے وہ ویڈیو ٹیپ دیکھی جس میں پیاسا کتا، لمبے بالوں والی عورت اور موریس کو لاش دریافت کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ پیٹی فورڈ نے یہ تمام واقعات ترتیب سے لکھ لیے اور ساتھ ہی ان کا وقت بھی نوٹ کر لیا۔ وہ عورت چاروں ویڈیوز میں نظر آئی۔ ڈولنگر اور پیٹی فورڈ اس بات پر متفق تھے کہ مہمانوں سے انٹرویو کے دوران ان کا اس عورت سے سامنا نہیں ہوا۔ ڈولنگر نے ٹیپ کو اسی جگہ روک دیا۔ ویلس نے ایک نظر منجمد تصویر پر ڈالی اور بولا۔

''شاید میں نے اسے یہاں کہیں دیکھا ہے۔''

ڈولنگر نے ویلس سے پوچھا کہ اس کی نائٹ ڈیوٹی کے دوران کوئی کال آئی تھی۔

''صرف ایک۔ ایک جوڑے نے شکایت کی تھی کہ ان کے بستر میں ایک مینڈک گھس گیا ہے لیکن میں اسے تلاش نہیں کر سکا۔''

''یہ کس وقت کی بات ہے؟''

''ایک بجنے سے پہلے۔ میں اس وقت بیٹھا اپنا ہوم ورک کر رہا تھا جب انہوں نے گھنٹی بجائی۔''

چار بجے سے پہلے ڈولنگر نے ہیڈ کوارٹر فون کیا تو بتایا گیا کہ کیپٹن مینگ کسی میٹنگ میں شرکت کرنے عدالت گیا ہوا ہے چنانچہ اس نے اپنے باس سراغ رساں لیفٹیننٹ اوبرن سے بات کی۔

''یہاں کوئی خاص بات سامنے نہیں آئی۔ اسٹیمی کے خیال میں اسے قتل کیا گیا ہے لیکن فی الحال کوئی مشتبہ شخص نظر نہیں آیا۔''

''کیا تم دونوں نے وہاں موجود تمام لوگوں سے بات کر لی۔''

''ہمارا یہی خیال ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم شیرف کو رپورٹ نہیں دے سکے کیونکہ وہ اور اس کا ڈپٹی کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں، تم یہ رپورٹ اسے فیکس کر دینا۔''

جمعے کی صبح ڈولنگر کو اپنے معمولات کے درمیان اتنا

وقت مل گیا کہ وہ انٹرنیٹ سے کچھ معلومات حاصل کر سکے۔ اس کے نتیجے میں پرینٹس کی ہسٹری میں کئی تضادات سامنے آئے۔ تلسا ورلڈ، میں شائع ہونے والے ایک آرٹیکل کے مطابق اسے آرمی سگنل کور سے ریٹائر ہوئے بیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا اور وہ اس وقت میجر تھا۔ ڈپارٹمنٹ آف ویٹرن افیئرز نے بھی اس کی تصدیق کر دی اور یہ بھی بتایا کہ اس نے امریکا سے باہر کبھی خدمات انجام نہیں دیں اور اس کی سماعت بھی ٹھیک تھی۔

ڈولنگر نے یہ تمام معلومات اوبرن کو دے دیں اور کہا۔ ''اس کی بیوی کا طرزِ عمل کچھ عجیب تھا۔ اسی طرح پارک کے دونوں مالکان بھی تھوڑے سے محتاط نظر آئے جیسے انہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس رات کیا ہوا۔''

ساڑھے نو بجے اسٹیمی نے ڈولنگر کو فون پر بتایا کہ ڈیڑھ گھنٹے بعد پرینٹس کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہونے والا ہے۔ ''میں نے سوچا کہ شاید تم اس موقع پر موجود رہنا چاہو کیونکہ تم پہلے ہی اس معاملے میں اپنی ٹانگ اڑا چکے ہو۔''

شیرف اوورمیل، ڈولنگر کو مردہ خانے میں دیکھ کر اتنا حیران ہوا کہ اس کی مدد کا شکریہ ادا کرنا بھی بھول گیا۔ ڈپٹی وٹل اور اس نے اوبرن کو مکمل طور پر نظرانداز کر دیا۔ اسٹیمی اور فارنسک پیتھالوجسٹ ڈاکٹر ویلنٹائن پوسٹ مارٹم والے کمرے میں نصف درجن بوتلوں کے لیبل چیک کر رہے تھے۔

''اس شخص کا ہائی بلڈ پریشر اور شریانوں کی تنگی کا علاج ہو رہا تھا'' ویلنٹائن نے انہیں بتایا۔ ''ابتدائی اسکریننگ میں صرف اس کی یہ دوائیں ظاہر ہوئی ہیں اور الکوحل کے آثار نہیں ملے جیسا کہ تم جانتے ہو کہ ہمیں مکمل لیبارٹری رپورٹ ایک ہفتے یا دس دن بعد ملے گی۔''

''کیا دل کے دورے کے کچھ امکانات ہیں؟'' اوبرن نے پوچھا۔

''یہ تم ایک گھنٹے بعد پوچھنا۔ فی الحال میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اس کا امکان بہت کم ہے۔ ایک فیصد بھی نہیں۔''

مردہ خانے کے اٹینڈنٹ جو کیس نے لاش پر سے کپڑا ہٹایا اور اوپر لٹکے ہوئے بلب کو روشن کر دیا۔ ویلنٹائن نے گاؤن اور دستانے پہنے اور اپنا کام شروع کر دیا۔ اس نے ایک پیمانے سے سر کا زخم ناپنے کے بعد کہا۔ ''اس زخم کی لمبائی سات سینٹی میٹر ہے لیکن اس میں کوئی کلاٹ یا بیرونی مادہ نہیں ہے۔'' پھر اس نے زخم کی کچھ تصویریں لیں۔ اسے پرینٹس کی سانس کی نالی یا پھیپھڑوں میں پانی نظر نہیں آیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ اس کا سانس اور دل کی دھڑکن پہلے ہی رک گئی تھی جب وہ پانی میں گیا۔''

ویلنٹائن نے پوسٹ مارٹم ختم کیا اور کہا۔ ''اگر تم مجھے پانچ منٹ دے دو تو میں ان تصویروں کے پرنٹ نکلوا سکتا ہوں۔''

''کیا تمہیں گزشتہ روز پڑوس کے لوگوں سے کچھ معلوم ہوا؟'' ڈولنگر نے باہر آ کر شیرف سے پوچھا۔

''صرف ایک بات، وہ کیمپ گراؤنڈ سے نفرت کرتے ہیں لیکن کسی نے اس سمت سے آنے والی کوئی آواز نہیں سنی۔''

ویلنٹائن نے تصویروں کا ایک پیکٹ شیرف کے حوالے کیا اور ایسا ہی ایک پیکٹ اس نے ڈولنگر کو بھی دیا۔ جب اوبرن اور ڈولنگر سیکنڈ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر واپس آئے تو کیپٹن مینگ نے انہیں اپنے دفتر میں بلا لیا۔

''ابھی میری ڈاکٹر لوڈوک سے بات ہوئی ہے۔'' اس نے کہا۔ ڈاکٹر لوڈوک کاؤنٹی کورونر تھا۔ ''تم دونوں نے کوئی صحیح کام کیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم اس کیس پر کام جاری رکھو۔''

''میرا خیال ہے کہ ہم گزشتہ روز شیرف کو ضروری مدد دے چکے ہیں۔'' ڈولنگر نے کہا۔

''میں بھی یہی سمجھتا ہوں لیکن ڈاکٹر لوڈوک چاہتا ہے کہ تم اس کیس کے ختم ہونے تک اپنی تحقیقات جاری رکھو۔''

''کیا اس میں پیٹی فورڈ کو بھی شامل کرنا ہے؟''

''وہ واپس پیٹرولنگ پر چلا گیا ہے۔ کورونر صرف تم دونوں کو ہی اس کیس پر دیکھنا چاہتا ہے۔''

''ایک سوال اور...... کیا شیرف اس بارے میں جانتا ہے؟''

''ہاں۔'' یہ کہہ کر مینگ نے فون اٹھا لیا۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ انٹرویو ختم ہو گیا۔

''اس کاؤنٹی میں کام کرنے میں ایک مشکل یہ ہے۔'' ڈولنگر نے اپنے کمرے میں آ کر کہا۔ ''کہ شیرف اور اس کے آدمی اپنے علاقے کے بارے میں جانتے ہیں جبکہ ہم وہاں اجنبی ہیں۔ ممکن ہے کہ موریس اور ویلس یا کیمپ گراؤنڈ کا کوئی اور فرد منشیات یا چوری کی چیزیں بیچنے کے کاروبار میں ملوث ہو۔''

''ٹھیک ہے لیکن ہمیں شیرف پر ایک برتری حاصل ہے اور اس کا نام ہے کیسٹرل۔ تم مجھے کھوپڑی کے زخم کی تصویریں دے دو تا کہ ہم اسے ای میل کر سکیں۔''

تصویریں ملنے کے تیس چالیس منٹ بعد فارنسک لیبارٹری کے لیفٹیننٹ کیسٹرل نے اپنی رپورٹ بھیج دی۔ اس کے مطابق یہ مہلک ہتھیار ایک بولٹ کٹر کا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اس اوزار کی نو تصویریں بھی بھیجیں جو انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کی گئی تھیں۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس سے ہمیں کیا حاصل ہوگا۔“ اوبرن نے کہا۔ ”ہمارے پاس تلاشی اور ضبطی کے اختیارات نہیں ہیں اور شاید یہ اوزار اس وقت جھیل کی تہ میں پڑا ہوگا۔“

”ایک بات یقینی ہے۔ بولٹ کٹر ایسی چیز نہیں جس سے کسی کو قتل کیا جائے۔“

”اگر اس کے علاوہ کوئی اور چوائس نہ ہو تو فوری طور پر شاید ایسی ہی کوئی چیز استعمال کی جاسکتی ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں کہ وہاں ڈین ڈوبسن ہی بولٹ کاٹنے کا کام کرتا ہے۔“

”ابھی ایک بج کر پندرہ منٹ ہوئے ہیں۔ یہ وقت نوٹ کرلو۔ ہم مسٹر ڈوبسن سے ملنے جارہے ہیں۔“

گزشتہ روز ڈولنگر نے کیمپ گراؤنڈ میں اٹھائیس ٹریلر دیکھے تھے لیکن اب وہاں صرف چھ باقی رہ گئے تھے جن میں سے ایک پرینٹس کا تھا جس پر گرد جم گئی تھی۔

ہوبرٹ ویلس استقبالیہ کے حصے میں فرش کی صفائی کررہا تھا جیسے واقعی اس کا ارادہ دو ہفتے قبل کیمپ گراؤنڈ کو بند کرنے کا ہو۔

”کیا آج شیرف یہاں موجود ہے؟“ ڈولنگر نے اس سے پوچھا۔

”میں نے اسے نہیں دیکھا۔“

”ایک دو باتیں ایسی ہیں جن میں تم ہماری مدد کرسکتے ہو۔ ہمارے پاس پرینٹس کا مستقل پتا نہیں ہے۔“

”اس کا پتا ہمارے پاس بھی نہیں ہے۔ جیسا کہ میں نے شیرف کو گزشتہ روز بتایا تھا جب وہ یہاں آئے تو ڈچ ان سے یہ معلومات نہیں لے سکا کیونکہ پرینٹس کو اس کا ڈرائیونگ لائسنس نہیں مل رہا تھا۔“

”کیا انہوں نے چند ہفتے پہلے بھی یہاں قیام نہیں کیا تھا؟“

”مجھے معلوم نہیں۔ بہت سے لوگ یہاں آتے اور چلے جاتے ہیں۔“

”کیا تم ہمارے لیے یہ ریکارڈ چیک کرسکتے ہو؟“

”ہاں، یقیناً۔“

ویلس نے جھاڑو کاؤنٹر کے ساتھ رکھی اور کمپیوٹر کے کی بورڈ پر انگلیاں مارنے لگا۔

''ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ وہ چار جولائی کے ہجوم کا حصہ تھے۔''

''تو شاید اس وقت تم نے ان کا پتا لیا ہو؟''

''نہیں، مجھے اس کا یقین ہے۔''

ڈولنگر نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''ڈین ڈوبسن کہاں ملے گا؟''

''وہ صبح یہاں تھا لیکن لنچ سے پہلے اسے گھر سے فون آ گیا۔'' اس نے انہیں ڈوبسن کے فارم کا پتا بتا دیا اور وہ پیدل ہی اس جانب روانہ ہو گئے۔

صاف نظر آ رہا تھا کہ اس جگہ کئی برسوں سے کھیتی باڑی نہیں ہوئی۔ وہ مکان چاروں طرف سے درختوں اور جھاڑیوں میں گھرا ہوا تھا۔ ڈرائیو وے میں ایک سیڈان پک اپ ٹرک کے برابر میں کھڑی ہوئی تھی۔ دو نو عمر لڑکے باسکٹ بال کھیل رہے تھے۔

''کیا تمہارے ڈیڈی گھر پر ہیں؟''

''ہاں۔'' ایک نے جواب دیا۔ ''ہمارے دادا کا انتقال ہو گیا ہے۔''

ڈولنگر نے قدیم طرز کا کنڈا کھٹکھٹایا اور ڈوبسن نے انہیں اندر بلا لیا۔

وہ کافی ٹیبل پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ مسز پرینٹس اور ویڈیو ٹیپ میں نظر آنے والی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔

''لگتا ہے کہ ہم نے غلط وقت کا انتخاب کیا ہے۔'' ڈولنگر نے کہا۔ ''ہم بعد میں آ جائیں گے۔''

''نہیں، اب تم آ گئے ہو تو پوری کہانی سن لو۔ میرا خیال ہے کہ تم میری ساس مسز پرینٹس کو جانتے ہو۔''

''ہاں گزشتہ روز ہماری بات ہوئی تھی۔'' اس نے مسز پرینٹس کی طرف دیکھا اور اوبرن کا تعارف کروایا۔

''اور یہ میری بیوی کامیلا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''خفیہ کیمرے کی ویڈیو میں تم نے اسی کو دیکھا تھا۔''

''گویا کرنل پرینٹس تمہارا سسر تھا؟''

''ہاں، لیکن وہ کرنل نہیں تھا۔''

''ڈارون اپنی خیالی دنیا میں رہتا تھا۔'' مسز پرینٹس نے وضاحت کی۔

''شاید اسی لیے ہماری تحقیقات کے دوران کچھ متضاد معلومات سامنے آئیں۔'' اوبرن نے کہا۔

''کیا تمہاری مستقل رہائش اوکلاہوما میں ہے؟''

''اب نہیں، ہم یہاں سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر رہتے ہیں تاکہ کامیلا اور بچوں سے قریب رہیں۔''

ڈولنگر نے کامیلا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''جب میں نے تمہیں ویڈیو ٹیپ میں دیکھا تو یہی سمجھا کہ تم اپنے والدین کے ٹریلر پر گئی تھیں؟''

''نہیں، میں ان سے ملنے نہیں بلکہ اپنے بیٹے کو دیکھنے گئی تھی جو دمے کا مریض ہے۔''

''کیا تم اپنے والدین کے ساتھ ٹریلر میں رہتی ہو؟''

''ہر وقت نہیں۔ جب وہ یہاں کیمپ گراؤنڈ میں ہوتے ہیں۔''

مسز پرینٹس بولی۔ ''اب تم یقیناً یہ نہیں سوچ رہے ہو گے کہ میرے شوہر کو کس نے قتل کیا ہے۔ دو گھنٹے پہلے کورونر آفس نے فون پر بتایا ہے کہ وہ اس کی لاش ریلیز کر رہے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ پولیس کی تحقیقات ختم ہو گئی۔''

''ابھی نہیں۔'' اوبرن نے کہا۔ ''ہمیں یقین ہے کہ تمہارے شوہر کے سر پر لگنے والا زخم کسی اوزار کی ضرب کی وجہ سے آیا ہے۔''

کامیلا ڈوبسن نے رونا شروع کر دیا۔ ڈوبسن نے اپنا ایک بازو اس کے کندھے پر رکھا اور بولا۔ ''کس قسم کا اوزار؟''

''ایک بولٹ کٹر۔ غالباً اس کا ہینڈل دو فٹ لمبا تھا۔''

''اس طرح کا اوزار کیمپ گراؤنڈ کی ورکشاپ میں ہے لیکن کوئی شخص کیوں اسے استعمال کرے گا؟''

''یہی تو ہم معلوم کرنا چاہ رہے ہیں۔'' ڈولنگر نے کہا۔ ''اور یہ کہ اسے استعمال کرنے والا کون ہے؟ ہم تمہارے بولٹ کٹر کا معائنہ پولیس لیبارٹری میں کروانا چاہتے ہیں تاکہ اس پر انگلیوں کے نشانات اور ایسا کوئی ثبوت مل سکے جس سے ظاہر ہو کہ اسے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔''

''کیا تمہیں ابھی وہ اوزار چاہیے؟''

''ہم پارک واپس جا کر تمہارا انتظار کر سکتے ہیں تاکہ تم اپنی سہولت کے مطابق وہاں آ سکو۔''

جب وہ وہاں سے واپس آئے تو ان کی ملاقات ہوبرٹ ویلس اور اس کی بیوی سے اسنیک بار میں ہوئی۔ ویلس نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں ڈین مل گیا؟''

''ہاں۔'' ڈولنگر نے جواب دیا۔ ''وہ تھوڑی دیر میں یہاں آنے والا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس دوران ایک نظر اس کی ورکشاپ پر ڈال لیں۔''

''کیوں نہیں، ڈچ بھی وہیں کہیں ہوگا۔''

ڈچ تو انہیں کہیں نظر نہیں آیا۔ البتہ انہوں نے ورکشاپ کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ وہاں مختلف قسم کے اوزار اور آلات ترتیب سے رکھے ہوئے تھے لیکن انہیں بولٹ کٹر جیسی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ اسی وقت ڈولنگر کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔

''سارجنٹ، میں اوروا بول رہی ہوں۔ مجھے مسز ڈوبسن نے فون کیا ہے، وہ اس سراغ رساں سے بات کرنا چاہتی ہے جو ڈارون پرینٹس کی موت کی تحقیقات کررہا ہے، میرا خیال ہے کہ وہ تم ہی ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ تم اس سے میری بات کرواؤ۔''

''ہیلو۔'' وہ آواز کہیں دور سے آتی ہوئی لگی۔ ''میں کس سے مخاطب ہوں؟''

''میں سارجنٹ ڈولنگر بول رہا ہوں مسز ڈوبسن۔ ابھی چند منٹ پہلے میں تمہارے گھر پر تھا۔''

''آفیسر! میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ اس سے پہلے کہ ڈین وہاں پہنچ جائے۔ وہ بات تمہیں معلوم ہونی چاہیے اور کوئی تمہیں اس بارے میں نہیں بتائے گا کیونکہ وہ مجھے بچانے کی کوشش کررہے ہیں۔''

''کس سے؟''

''جیل جانے سے۔''

ڈولنگر کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اوبرن کو اشارہ کیا اور فون اپنے کان سے ہٹا دیا تاکہ دونوں سن سکیں۔

''مجھے اپنے دو بیٹوں کی دیکھ بھال کرنا پڑتی ہے۔ ان میں سے ایک کو دمے کا مرض اور دوسرے کی سماعت کمزور ہے۔''

''لیکن تم جیل کیوں جاؤ گی؟''

''کیونکہ میرا باپ ایک پیشہ ور جواری اور چور تھا۔ اس نے اپنے ٹریلر میں نوادرات کے درمیان خفیہ کیمرا لگا رکھا تھا اور اس کے عقب میں ایک مانیٹر روم تھا جہاں اس کا ایک آدمی مخالف کے پتے دیکھ کر اس کے آلۂ سماعت کے ذریعے رپورٹ دیتا جو درحقیقت ریڈیو ریسیور تھے۔ اس نے لوگوں سے بے ایمانی کرکے لاکھوں ڈالر جیتے اور میرا خیال ہے کہ انہی میں سے کسی نے اسے قتل کیا ہے۔''

''ممکن ہے کہ تمہارا خیال درست ہو، میں اس اطلاع کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں لیکن تم کیوں جیل جاؤ گی؟''

''کیونکہ میں گزشتہ تین سال سے اس کا ساتھ دے رہی ہوں۔''

اوبرن نے ڈولنگر سے فون لے لیا اور بولا۔ ''مسز ڈوبسن! میں سراغ رساں اوبرن ہوں، ہم کسی غیر قانونی جوئے کی تحقیقات نہیں کررہے اور میرا تمہیں بھی یہی مشورہ ہے کہ کسی اور سے اس کا ذکر مت کرنا۔''

''شیرف سے بھی نہیں؟''

''ہاں، اس سے تو بالکل نہیں۔''

تھوڑی دیر بعد ڈوبسن بھی آگیا۔ اس نے انہیں ورکشاپ کا تفصیلی دورہ کروایا لیکن وہاں کوئی بولٹ کٹر نہیں ملا۔ ''وہ کس رنگ کا تھا؟'' ڈولنگر نے پوچھا۔

''اس کا دستہ نیلے رنگ اور گرپ سیاہ ربڑ کی تھی۔''

انہوں نے ڈوبسن سے جوئے میں ہونے والی بے ایمانی کے بارے میں کوئی بات نہیں کی لیکن ہیڈ کوارٹر واپس آتے ہوئے ان کا پورا دھیان اسی جانب تھا۔

''پرینٹس، اس کی بیوی اور بیٹی کے علاوہ مزید کچھ اور لوگ بھی اس اسکیم میں شامل ہوں گے۔'' ڈولنگر نے کہا۔

''ظاہر ہے کہ ڈوبسن بھی اس بارے میں جانتا ہوگا۔''

''موریس اور ویلس کو بھی معلوم ہوگا کہ پرینٹس کیا کررہا ہے۔''

''ممکن ہے کہ جب کوئی ناتجربہ کار جوڑا یہاں آتا ہے تو وہ اسے فون کرکے بتا دیتے ہوں۔''

''ہم ڈے بریک کی فون کالز چیک کرسکتے ہیں۔''

''ہاں اگر ہم اس غیر قانونی جوئے کی تحقیقات کررہے ہوتے۔''

''یا ہمیں پورا یقین ہوتا کہ ڈے بریک کے کسی آدمی نے پرینٹس پر بولٹ کٹر سے حملہ کیا تھا۔''

جب وہ ہیڈ کوارٹر پہنچے تو کیپٹن مینگ گھر جا چکا تھا۔ وہاں ان کی ملاقات پٹرول مین پیٹی فورڈ سے ہوئی جو اپنی شفٹ رپورٹ کمپیوٹر میں پوسٹ کررہا تھا۔ ڈولنگر نے اسے اب تک کی تحقیقات کا خلاصہ بتایا۔

''سارجنٹ!'' پیٹی فورڈ نے کہا۔ ''کیا تمہیں یاد ہے کہ میں اور تم منگل کے روز لنچ کے بعد کہاں گئے تھے؟''

''خون کے دھبے دیکھنے گودی پر۔''

''اور پھر ہم نے کیا کیا؟''

''اسنیک بار سے ڈرنکس لیے۔''

''اور میں نے پیالیوں کے ساتھ کیا کیا؟''

پانچ منٹ کے اندر ڈولنگر اور اوبرن، شیرف اوورمیل اور کیسٹرل کے ساتھ ٹیلی فون کانفرنس میں مصروف ہوگئے۔ دوسری صبح تحقیقاتی ٹیم کے ارکان ڈے بریک

کیمپ گراؤنڈ میں جمع ہوئے۔ صاف نظر آرہا تھا کہ انتظامیہ نے آخرکار اس سیزن کے لیے آپریشن بند کردیا ہے۔ اب وہاں صرف پرینٹس کا ٹریلر رہ گیا تھا۔

اوبرن نے پہلے ڈچ مورس سے ملاقات کی جو دفتر میں فارغ بیٹھا ہوا تھا۔ اس دوران ڈولنگر اور کیسٹرل سیدھے گودی پر گئے۔ انہوں نے ایک ایلومینیم کی کشتی کھولی اور اسے پانی میں دھکیل دیا۔ اس کے ساتھ ہی بارہ وولٹ کی ایک بیٹری اور دو چپو بھی اپنے قبضے میں لے لیے۔

ڈین ڈوبسن عمارت سے باہر آیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا گودی پر پہنچ گیا۔

''کیا میں تمہاری مدد کروں؟ تم لوگ جھیل پر کیا کررہے ہو؟''

''نہیں شکریہ۔'' ڈولنگر نے کہا۔ ''یہ ہمارے لیے معمول کی کارروائی ہے۔ سوائے اس کے کہ ہم عام طور پر اپنی کشتی اور مقناطیس کے لیے پاور سپلائی لے کر آتے ہیں۔''

''تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟''

''ہمارے خیال میں اس ہتھیار کے پانی میں ملنے کا خاصا امکان ہے کیونکہ وہ ایک لوہے کا اوزار ہے۔ اس لیے ہم برقی مقناطیس استعمال کررہے ہیں۔''

اس وقت تک مورس، ویلس اور اس کی بیوی کیرن بھی وہاں آگئے تھے۔ ڈولنگر آہستہ آہستہ ساکت پانی میں کشتی چلا رہا تھا اور کیسٹرل نے ایک کیبل کی مدد سے مقناطیس پانی میں ڈالا ہوا تھا۔ وہ گودی سے پانچ چھ گز دور ہی گئے ہوں گے کہ اس نے پانی میں سے ایک بولٹ کٹر نکالا جس کا ہینڈل نیلے رنگ کا تھا۔ ڈولنگر نے اس پر سے پانی صاف کیا اور اسے بڑے پلاسٹک بیگ میں ڈال دیا۔ جب وہ گودی پر پہنچے تو اس نے بیگ کو مضبوطی سے باندھا۔ اس پر مارکر سے دستخط کیے، تاریخ ڈالی اور کیسٹرل کے حوالے کردیا۔ جس نے خود بھی اسے دستخط کرکے وین میں رکھ دیا۔

اوبرن نے ڈے بریک اسٹاف کے چاروں ممبران سے اسنیک بار میں جمع ہونے کے لیے کہا۔ ''منگل کے روز جب سارجنٹ ڈولنگر اور پیٹی فورڈ نے خفیہ کیمرے کے ویڈیو ٹیپ دوبارہ دیکھے تو انہوں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ ہر بار جب بھی تیز ہوا چلتی تو تین کیمرے درختوں کی شاخوں اور پتوں کی حرکت کو ریکارڈ کرتے لیکن جس کیمرے کا رخ جھیل کی طرف تھا وہ اسے ریکارڈ نہیں کررہا تھا جس [illegible] یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ ٹیپ کو روک دیا گیا یا اسے مٹادیا گیا تاکہ پرینٹس کے قتل اور اس کی لاش کو جھیل میں پھینکنے کا منظر ریکارڈ نہ ہوسکے۔''

''اسے کون مٹا سکتا ہے؟'' ویلس نے کہا۔ ''یہ عمارت اس وقت سے مقفل تھی جب میں مینڈک دیکھ کر واپس آیا۔''

''جہاں تک ہمیں معلوم ہے کہ صرف تم چاروں ہی کی ٹیپ مشین تک رسائی تھی لہٰذا مجھے یقین ہے کہ تم سمجھ گئے ہوگے کہ لیفٹیننٹ کیسٹرل کیوں تمہاری انگلیوں کے نشانات لینے آرہا ہے تاکہ اگر ہتھیار پر کوئی نشان ہو تو ان کا موازنہ اس سے کیا جاسکے۔''

تھوڑی دیر بعد ہی کیسٹرل ایک فنگر پرنٹ مشین کے ساتھ وہاں آگیا۔ ''یہ محض معمول کی کارروائی ہے۔'' اوبرن نے انہیں یقین دلایا۔ ''جیسے ہی یہ کیس ختم ہوگا تو یہ نشانات بھی ضائع کردیے جائیں گے۔''

''کیا اوزار پر لگے نشانات پانی میں ضائع نہیں ہوگئے ہوں گے؟'' ڈوبسن نے پوچھا۔

''شاید نہیں۔ اگر کوئی دھاتی اوزار زیادہ عرصے استعمال میں نہ ہو تو اس پر گریس لگادی جاتی ہے اور اس پر لگے ہوئے نشانات ضائع نہیں ہوتے۔''

☆☆☆

ڈولنگر اور اوبرن تقریباً چار گھنٹے تک جیل کے پار جنگل میں گھنی جھاڑیوں کے پیچھے چھپے رہے۔ ڈولنگر اپنی دوربین کے ذریعے گودی پر نظریں جمائے ہوئے تھا اور اوبرن، شیرف کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھا جو عمارت سے چوتھائی میل کے فاصلے پر سڑک کی نگرانی کررہا تھا۔

''ہوشیار ہوجاؤ لیفٹیننٹ۔'' ڈولنگر اچانک بول اٹھا۔ ''کوئی حرکت کررہا ہے۔''

اوبرن نے فوراً ہی شیرف کو مطلع کیا۔ ڈولنگر نے دیکھا کہ ایک تنہا شخص عمارت سے باہر آیا اور جب وہ گودی کے قریب کوڑے کے ڈرم کے پاس پہنچا تو اس کی رفتار تیز ہوگئی۔ اس نے ڈرم کا ڈھکنا اٹھایا۔ اس نے دستانے پہن رکھے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ ڈرم میں ڈالے اور ایک بولٹ کٹر باہر نکال لیا جس کا دستہ نیلے رنگ کا تھا۔ اس نے اسے ایک پرانے کپڑے میں لپیٹا اور اسی راستے سے واپس عمارت میں چلا گیا۔

جب ڈولنگر اپنے موبائل پر یہ منظر ریکارڈ کررہا تھا تو اسی دوران اوبرن بھی ٹیلی فون پر شیرف کو آنکھوں دیکھا حال سنا رہا تھا۔ تین چار منٹ بعد شیرف کی کار دفتر کی عمارت کے باہر رکی اور وہ تین معاونین کے ساتھ عمارت

میں داخل ہوگیا۔

''کھیل ختم ہوگیا ہے۔'' اوبرن نے کہا۔ ''اپنا کیمرا بند کرو۔ ہم بھی اس کا اختتام دیکھنے چلتے ہیں۔''

جب وہ عمارت میں پہنچے تو کھیل واقعی ختم ہو چکا تھا۔ اسنیک بار میں شیرف آفس کے چار باوردی افسران اوران کے سامنے ڈے بریک کے عملے کے چاروں ممبر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں تھیں۔ وہ بولٹ کٹر جو ڈارون پرینٹس کے سر میں ضرب لگانے کے لیے استعمال ہوا فرش پر پڑا ہوا تھا۔

''خوش آمدید دوستو۔'' شیرف نے کہا۔ ''کیا تم ان لوگوں کو بتانا پسند کرو گے کہ آج صبح جھیل پر کیا ہوا تھا؟''

''میرا خیال ہے کہ انہیں پہلے ہی اس کا بخوبی اندازہ ہے۔'' اوبرن نے کہا۔ ''منگل کے روز جب آفیسر پیٹی فورڈ کوڑے کے ڈرم میں پلاسٹک کے کپ پھینکنے گیا تو اس نے دیکھا کہ کسی اوزار کا دستہ ڈرم سے چپکا ہوا ہے۔ اس وقت اس نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی کیونکہ اس وقت تک آلۂ قتل کی شناخت نہیں ہوئی تھی لیکن گزشتہ شب جب اسے معلوم ہوا کہ ہم ایک بولٹ کٹر تلاش کر رہے ہیں۔''

''اگر شیرف اس اوزار کو ضبط کر لیتا تب بھی اسے ثبوت کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گو کہ بالوں اور خون سے اس کے آلۂ قتل ہونے کی تصدیق ہو جاتی لیکن ربر کی گرپ ہونے کی وجہ سے انگلیوں کے نشانات نظر نہیں آتے۔ لہٰذا ہم سر جوڑ کر بیٹھے اور ایک منصوبہ تیار کیا تاکہ قاتل خود ہی اپنے آپ کو ظاہر کر دے۔ گزشتہ شب شیرف نے ایک لڑکے کو ڈرم میں دیکھنے کے لیے بھیجا اور تصدیق ہو گئی کہ وہ اوزار ابھی تک وہیں تھا پھر اس نے کچرا اٹھانے والوں سے رابطہ کر کے کہا کہ وہ ڈرم کو خالی نہ کریں جب تک ان سے کہا نہ جائے۔''

''لیفٹیننٹ کیسٹرل نے جو اوزار آج صبح جھیل سے نکالا وہ ہو بہو اس اوزار کی نقل تھا جس سے پرینٹس کو قتل کیا گیا۔ تم سب کو یقین آ گیا ہو گا کہ ہم اصلی آلۂ قتل تلاش کر رہے تھے لیکن تم میں سے کم از کم ایک شخص حیران تھا کہ وہ اوزار ڈرم سے نکل کر جھیل میں کیسے چلا گیا۔ لہٰذا وہ خود دیکھنے چلا گیا کہ وہ اوزار اب بھی ڈرم میں ہے یا نہیں۔ ہمارے پاس ویڈیو ہے جس میں اسے ڈرم کا ڈھکنا اٹھاتے اور اس اوزار کو باہر نکالتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔''

شیرف کھڑے ہو کر بولا۔ ''میں نے پہلے ہی تمہارے حقوق پڑھ کر سنا دیے ہیں مسٹر مورس۔ تم نے سن لیا کہ مسٹر اوبرن نے کیا کہا ہے۔ کیا تم کوئی بیان دینا چاہتے ہو؟''

''پرینٹس میں زہر بھرا ہوا تھا۔ اسے جھوٹ بولے بغیر کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔ میں کبھی اس کے ساتھ نہیں چل سکا۔ ہم نے اس کے ساتھ ایک کاروبار کیا تھا لیکن ہمیں پورا یقین تھا کہ وہ دھوکا دے رہا ہے۔''

''بدھ کی صبح چار بجے میں اس کی آواز سن کر جاگ گیا۔ وہ میرے بیڈروم کی کھڑکی کے باہر اپنی بیٹی پر ناراض ہو رہا تھا۔ ڈین نے اسے فون کر کے گھر بلایا تھا کیونکہ اس کے بیٹے کو دمے کا دورہ پڑا تھا۔ پرینٹس اس کے پیچھے آیا اور ٹریلر چھوڑنے پر اسے بُرا بھلا کہنے لگا۔''

''کیوں؟'' شیرف نے پوچھا۔

مورس نے اس سوال کو نظرانداز کر دیا اور بولا۔ ''میں غصے سے پاگل ہو گیا کیونکہ اس نے مجھے سوتے سے جگا دیا تھا اور اس سے بھی زیادہ غصہ مجھے اس پر تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو ایسے القاب سے پکار رہا تھا جو ہم کسی جانور کے لیے بھی استعمال نہیں کرتے۔''

وہ ایک لمحے کے لیے رکا اور کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نہیں جانتا کہ اس وقت مجھے کیا ہو گیا تھا لیکن اچانک ایسا محسوس ہوا کہ اس سے پیچھا چھڑانا چاہیے۔ میں بستر سے اٹھا اور میرے ہاتھ میں جو سب سے بڑی اور بھاری چیز آئی وہ لے کر اس کے پیچھے چل دیا تب تک کامیلا اپنے گھر جا چکی تھی۔ میں نے پیچھے سے پرینٹس کے سر پر زوردار ضرب لگائی۔ مجھے دوسری بار حملہ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ جیسے ہی نیچے گرا۔ مجھے ہوش آ گیا اور محسوس ہوا کہ میں نے ایک شخص کو قتل کر دیا ہے لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔''

شیرف کے آدمیوں نے اسے کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ شیرف نے رسمی طور پر اوبرن اور ڈولنگر کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اس کیس میں اس کی مدد کی۔

مورس کا وکیل یہ واضح نہیں کر سکا کہ پرینٹس اور ڈے بریک کی انتظامیہ کے درمیان کس نوعیت کا کاروباری تعلق تھا۔ سوائے اس کے اس کے ٹریلر میں کھلے عام جوا ہوتا تھا اور وہ اس پر اپنا کمیشن وصول کرتے تھے لیکن پرینٹس نے اس میں بھی بے ایمانی شروع کر دی اور مورس کی ناراضی کی بڑی وجہ یہی تھی۔ اسی لیے وہ اس سے پیچھا چھڑانا چاہ رہا تھا۔

❖❖❖

آٹھویں قسط

الاؤ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

الائو... مرحوم کاشف زبیر کی آخری سلسلے وار تحریر ہے... جو انہوں نے..... قارئین کے لیے تحریر کرنا شروع کی تھی... لیکن دستِ قضا نے ان کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ چند سنسنی خیز اقساط لکھنے کے بعد اسے اختتام تک پہنچاتے... کسی بھی مصنف کی تحریر کو اسی کے رنگ و آہنگ میں لکھنا کڑا امتحان ہوتا ہے... الائو کو آگے بڑھانے کا فریضہ اب ڈاکٹر عبدالرب بھٹی انجام دیں گے... الائو ایکشن، تھرل اور سسپنس سے بھرپور داستان ہے... ایک مسیحا کو لوگوں کی مسیحائی سے دور کر کے درندگی کے گھنائونے کھیل میں ایسا الجھایا کہ وہ زندگی کی ہر رنگینی کو بُھلا بیٹھا... اب اس کا مقصد صرف اور صرف ان دشمنوں کی کھوج تھی جو سامنے ہوتے ہوئے بھی نگاہوں سے اوجھل تھے...

انسان نما درندوں کی داستان جو جیتے
جاگتے ہم نفسوں کو بھی بازار کی جنس بنادیتے ہیں
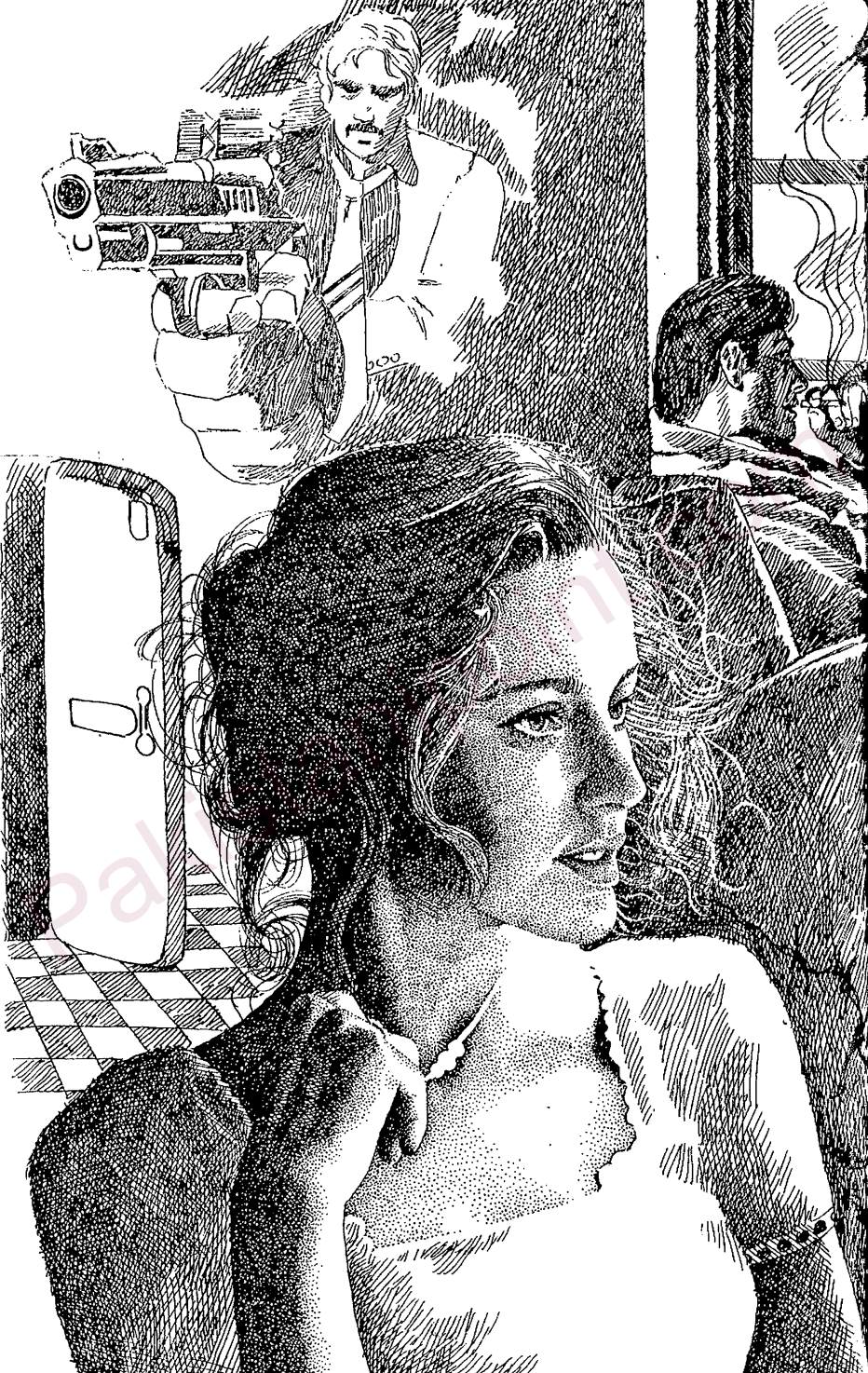
”سس...... سیف! ہم.....کل کی فلائٹ سے یو کے جا رہے ہیں۔“

سسکیوں کے دوران اس نے مجھے اطلاع دی۔ خود میرا دل اس اطلاع پر بھاری سا ہونے لگا۔ میں نے خود کو سنبھالا دیا، ہمت مجتمع کی اور بولا۔

”رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں حمیرا!“ میں نے اپنے دل کے بوجھل پن پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہم سب کے لیے اچھا ہی ہے۔“

”ہمارے لیے بھی.....؟“ اس نے شکوہ کناں انداز میں پوچھا۔

”یقیناً! کیا تمہیں نہیں لگتا؟“ میں نے اپنے کرب کو دباتے ہوئے کہا۔

”ہم ایک دوسرے سے میلوں دور ہو جائیں گے۔“ وہ دل گرفتگی سے بولی۔

”مگر قریب رہیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تم دور ہو کے مجھے یاد بھی نہیں کرو گی؟“

جواب میں اس کی ایک گہری اور آزردہ سی سانس کھینچنے کی آواز سنائی دی تھی۔ ”تمہاری یاد تو ایک لمحے کے لیے بھی میرے دل و دماغ سے محو نہیں ہو سکتی مگر سیف.....! اتنا حوصلہ میں کہاں سے لاؤں؟ تمہاری تو خیر بات اور ہے، تم ایک اہم مقصد کے حصول کے لیے سرگرداں ہو، کبھی یاد کر لو گے مجھے اور کبھی بھلا دو گے مگر میں.....“

”تم بھی رفتہ رفتہ ایسے حوصلوں کی عادی ہو جاؤ گی اور پھر.....سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں نے گرہ لگائی۔

”جانے سے پہلے ایک بار مل سکتے ہو؟“ اس نے جیسے التجا آمیز انداز میں کہا۔

”شاید نہیں..... میں کہیں مصروف ہوں اور لاہور سے باہر بھی.....“ میں نے دل پر پتھر رکھ کے کہا۔ ”اور شاید میں تمہیں سی آف کرنے کا حوصلہ نہ پاسکوں اور تم بھی.....بہتر یہ ہے کہ مجھے دعاؤں میں یاد رکھو اور میرے مشن کو بھی..... مجھ سے زیادہ.....“ میں نے اس بار اپنے لہجے اور آواز کو مضبوط کر لیا تھا۔

تھوڑی دیر مزید باتیں ہوئیں اور اس کے بعد خدا حافظ اور الوداع کہہ دیا گیا۔

”حمیرا کا فون تھا؟“ طارق نے خفیف سی مسکراہٹ سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں!“ میں نے کہا۔

”تم اسے بالکل ٹھیک سمت پر لے جا رہے ہو۔“ اس نے کہا تو رومی ایک نگاہ مجھ پر ڈالنے کے بعد طارق کو تکنے لگی مگر بولی کچھ نہیں، یوں لگتا تھا جیسے اسے طارق کی بات سے اختلاف رہا ہو لیکن اس پر وہ اپنا کوئی تبصرہ کرنے سے قاصر ہو۔

میں نے اس موضوع سے ہٹتے ہوئے انہیں ہوٹل کے مالک منیر گانجے کی کسی ”پھل سائیں“ سے ہونے والی ٹیلی فونک گفتگو کے بارے میں آگاہ کر دیا۔

”اوہ.....تم تو اب ایک ڈاکٹر سے جاسوس بھی بن گئے، ڈیئر سیف!“ طارق مسکرایا۔

”یہ بڑے پتے کی بات معلوم ہوئی ہے ہمیں۔“ رومی نے بھی جوش سے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ منیر گانجے کی پشت پر کسی ایسے آدمی کا ہاتھ ہے، جو جبار سے ٹکر لینے کی طاقت رکھتا ہے۔“

”یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟“ طارق نے ایک دم جیسے اس کی بات کی نفی کر ڈالی۔ اس کی بات غلط بھی نہیں تھی۔

”ایک مفروضہ ہے میرا۔“ رومی نے دفاع کیا۔ ”ظاہر ہے، منیر خود تو ان کے آگے ہاتھ جوڑ رہا تھا، یقیناً اس نے اپنے سالے پھل سائیں کو اس لائق گردانا ہی ہوگا کہ وہ.....“

”یہ بات اپنی جگہ.....“ میں نے مداخلت کی۔ ”دشمن کا دشمن ہمارا دوست بن جائے تو کام آسان ہونے کی پوری توقع کی جانی چاہیے۔“ میں نے ایک طرح سے رومی کی حمایت میں کہا تھا۔

”ہاں ٹھیک ہے، ہمیں ہر پتا کھیلنا چاہیے۔“ بالآخر طارق نے کہا۔ ”تمہارے ذہن میں اب آگے کا کیا لائحہ عمل ہے؟“ طارق نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔

”یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں یہاں آتے ہی ایک راہ ملی ہے۔“ میں نے کچھ سوچنے کے سے انداز میں کہا۔ ”منیر گانجا کی دُکھتی رگ کو چھیڑ کر ہم اس سے جبار کے بارے میں مزید کچھ جان کاری حاصل کر سکتے ہیں، رہی سہی کسر اس کا سلطان راہی ٹائپ سالا پھل سائیں پوری کر دے گا، یقیناً منیر کے تھرو ہم اس سے بھی ایک عدد سودمند بیٹھک لگا سکتے ہیں۔“

”یہ بالکل ٹھیک رہے گا۔“ رومی ایک بار پھر میری حمایت میں بولی۔ ”ہمارے ساتھ اس علاقے میں کسی بااثر مقامی کا ساتھ بھی ضروری ہوگا۔“

”ہمم.....“ طارق نے پُرسوچ سی ہمکاری بھری۔

پھر ایک نظر رومی کے چہرے پر ڈال کر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم منیر کے ساتھ کس برتے پر روابط بڑھاؤ گے؟''

''یہ میرا کام ہے، میرے ساتھ رومی اگر ہو تو بہتر رہے گا۔'' میں نے کہا۔ رومی نے جھٹ ہامی بھر لی۔

''میرے بارے میں کیا خیال ہے؟'' طارق مسکرایا۔

''نیک خیال ہے، لیکن بہتر ہوگا، پہلے میں اور رومی اسے اعتماد میں لیں اس کے بعد تم بھی سامنے آ ہی جاؤ گے۔ بہتر ہوگا کہ ایک پاؤں بچا کے کسی نئی راہ کا رسک لیا جائے۔''

''گڈ......! میں سمجھ رہا ہوں۔ سو یو ریڈی؟''

''آف کورس۔'' میں اُٹھ کھڑا ہوا اور رومی کی طرف دیکھا، وہ بھی میری نظروں کا مطلب بھانپتے ہی اپنی جگہ چھوڑ چکی تھی۔

ہم دونوں کمرے سے نکل کر ہوٹل کی لابی میں آ گئے۔ میری نظریں ریسیپشن کے عقبی ستون میں بنے منیر گانجے کے شاہانہ طرز کے آفس روم کی طرف اُٹھ گئیں۔ میں استقبالیہ کی طرف بڑھ گیا۔ رومی میرے ساتھ تھی۔

''ایکسکیوزمی۔'' میں نے وہاں موجود آدمی سے کہا۔

''جی فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' اس نے پیشہ ورانہ اخلاقیات کا مظاہرہ کیا۔

''ہمیں دراصل ہوٹل کے مالک منیر گانجا صاحب سے ملنا تھا۔'' میں نے کہا اور اس پر جیسے ایک بم گرا، وہ بے چارہ یہی سمجھا کہ شاید ان سے کچھ غلطی ہوگئی اور اب ہم ان کی شکایت کرنے والے تھے۔

''کک...... کیوں جناب؟ خیریت؟ ہم سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو......''

''ہرگز ایسی بات نہیں، ہم آپ کی سروس سے بالکل مطمئن اور خوش ہیں۔'' میں نے فوراً اس کی بات کاٹتے ہوئے دوستانہ مسکراہٹ سے کہا۔

''ہمیں کوئی اور ذاتی نوعیت کا کام ہے ان سے، آپ پلیز، ہماری ملاقات کرا دیں۔'' پھر لحہ بھر کے توقف کے بعد مستفسر ہوا۔ ''وہ اپنے آفس روم میں ہی ہیں نا ابھی تک......؟''

''ج...... جی ہاں! مگر آپ کیا ابھی ان سے ملے تھے؟'' آدمی نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں اُلجھن آمیز حیرت تھی۔

مجھے بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا، کیونکہ میں ملا تو نہیں تھا، وہ تو میں نے اس کی جاسوسی کی تھی، تاہم فوراً ہی بات بناتے ہوئے بولا۔ ''میں نے دراصل ابھی تھوڑی دیر پہلے انہیں اپنے کمرے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔''

اسی اثنا میں ایک وردی پوش آدمی وہاں آیا تو اس آدمی نے وردی پوش سے کچھ کہا اور پھر ہمیں اس کے ساتھ روانہ کر دیا۔

ہم ایک ریلنگ کا چکر کاٹ کر عقب میں آ گئے اور وہ ہمیں لے کر اندر چلا گیا۔

سامنے منیر گانجا ایک بھاری سی کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔

''سر! یہ آپ سے ملنا چاہتے تھے۔'' ہمیں ساتھ لے کر آنے والے نے نہایت مؤدبانہ انداز میں منیر سے کہا۔ وہ چونک کر میرے اور رومی کے چہرے کی طرف تکنے لگا۔

''کون ہیں آپ لوگ؟ میں آپ کو نہیں جانتا؟'' وہ بولا۔

''بے شک آپ ہمیں نہیں جانتے مگر جان پہچان کرانے میں کیا دیر لگتی ہے۔ بشرطیکہ آپ ہمیں بات کرنے کا موقع دیں۔'' میں نے کہا۔

''بیٹھو۔'' اس نے کہتے ہوئے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ بھی کر دیا، میں نے دانستہ اس آدمی کی جانب گردن موڑ کر دیکھا۔

منیر سمجھ گیا اور اس نے اسے جانے کا کہا۔

''منیر صاحب! اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہاں ہم رازدارانہ انداز میں گفتگو کر سکتے ہیں تو میں شروع کرتا ہوں ورنہ ہم نے یہاں کمرا لے رکھا ہے۔ وہیں چل کر......''

''آپ یہاں گفتگو کر سکتے ہیں۔'' اس نے میری بات کاٹ دی اور ایک بار پھر مجھے اور رومی کو اشتباہ انگیز نظروں سے گھورنے لگا۔

''او کے......'' میں نے کہا۔ پھر نیچی آواز میں بولا۔ ''ہم دراصل آپ کے بیٹے کے بارے میں بات کرنے آئے تھے، جو جبار یا اس کے آدمیوں کی گرفت میں ہے۔''

میرے یہ کہنے کی دیر تھی کہ اس پر عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی۔ پہلے ایک انجانہ سا خوف اس کے چہرے اور آنکھوں میں چمکا تھا پھر ایک امید سی چمکی جیسے کسی بے یار و مددگار کو تنکے کا سہارا مل رہا ہو۔

''تت...... تم کیا جانتے ہو میرے بیٹے کے بارے میں......؟'' بالآخر اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

’’یہی کہ جو میں ابھی آپ کو بتا چکا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’جبار ایک خطرناک آدمی ہے۔ ہم دراصل اسی کی بیخ کنی کے لیے یہاں آئے تھے، یہ اتفاق ہی تھا کہ ہم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ کی اور ان کے آدمیوں کے درمیان ہونے والی گفتگو......‘‘ یہ کہتے ہوئے میں نے اسے مختصراً اس بارے میں بتا دیا جو میں اس کی ریکی کے دوران دیکھ اور سُن چکا تھا۔

’’تم خفیہ پولیس کے آدمی ہو تو میرے لیے یہ بات سود مند نہیں ثابت ہو سکتی۔‘‘ اس کے لہجے میں صاف گوئی اور دبا دبا خوف تھا۔

وہ ایک باپ تھا، ایک جوان بیٹے کا باپ...... وہ ایسا کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا جس کے بارے میں اسے یقینی طور پر یہ دھمکی ملی ہو کہ پولیس سے رابطہ کرنے کی صورت میں اغوا کنندگان اس کے مغوی بیٹے کا کیا حشر کر سکتے تھے، وغیرہ۔ لہٰذا میں اس کی تسلی کی غرض سے بولا۔

’’ہم خفیہ پولیس کے آدمی ہوتے تو تمہاری اس وقت تک جاسوسی کرتے جب تک تم زمیندار جبار سے کوئی خفیہ معاملہ داری نہ طے کرتے، یہاں تمہارے سامنے نہیں بیٹھے ہوتے۔‘‘

’’تو پھر تم ضرور اس کے ساتھ دشمنی کے چکر میں یہاں آئے ہو۔‘‘ وہ ایک دم بولا۔ ’’مگر میں اس کے ساتھ کسی بھی قسم کی دشمنی نہیں پالنا چاہتا۔‘‘

میری اُمیدوں پر اوس پڑ گئی۔ وہ میری توقع کے خلاف بزدل ثابت ہوا تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ اسے مدد ملتے ہی خوشی ہوگی مگر اس کا الٹا اثر ہوا۔ تاہم میں مایوس نہ ہوا اور اسے قائل کرتے ہوئے بولا۔

’’بزدلی دکھاؤ گے تو ناقابلِ تلافی نقصان اُٹھاؤ گے مسٹر منیر گانجا!‘‘ میں نے لہجہ بدل دیا۔ ’’تم جبار کو نہیں جانتے کہ اس نے تمہارے بیٹے کو کیوں اغوا کروایا ہے۔‘‘

’’اس نے کوئی مطالبہ کیا ہے تم سے؟ میرا مطلب ہے زرِ تاوان کا مطالبہ؟‘‘ اس بار رومی نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

’’ہاں!‘‘

’’کتنا؟‘‘

’’اس کا رقم کا نہیں، کسی اور شے کا مطالبہ ہے۔‘‘

’’کسی اور چیز کا مطالبہ ہے؟ میں سمجھا نہیں؟‘‘

’’میری تین کنال زمین ہے، جو اس کے علاقے سے متصل ہے، وہ اونے پونے اس کے سودے پر مجھے مجبور کرنا چاہتا ہے۔‘‘

’’اوہ......! تمہارا مطلب ہے، کراکوٹ سے متصل؟‘‘ میرے استفسار پر وہ چونکا۔

’’تمہیں اس کا علم ہے؟‘‘

میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے اگلا سوال کر ڈالا۔ ’’اور تم دینے پر راضی ہو؟‘‘

’’ظاہر ہے اب کوڑیوں کے بھاؤ دینا ہی پڑے گا، مگر...... تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’کیا تم چاہو گے کہ تمہاری زمین بچ جائے اور بیٹا بھی تمہارے پاس صحیح سلامت پہنچ جائے؟‘‘ میری بات پر وہ مخمصے کا شکار ہو گیا۔ اسی وقت کوئی اندر داخل ہوا، جسے دیکھ کر منیر گانجا ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

اس شخص کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ ایک دم کھل گیا، یوں لگا جیسے اس کے سر کا بوجھ اتر گیا ہو، وہ اسے خوشی اور اُمید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’آؤ...... آؤ...... پھل سائیں! میں بہت پریشان تھا۔‘‘

ہم نے گردن موڑ کر اس نووارد کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر مگر اچھی صحت اور جثے کا لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ رنگ سانولا تھا، قد چھ فٹ سے بھی متجاوز اور سینہ چوڑا تھا۔ چہرے پر مہندی رنگ کی گھنی مونچھیں اور بالوں کا بھی یہی حال تھا۔ اس نے بے داغ کھلی ڈلی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔

اس کے ہمراہ دو اور بھی آدمی تھے۔ وہ اس کے باڈی گارڈ ہی معلوم ہوتے تھے۔ ان کی بغلوں سے ہولسٹر جھول رہے تھے۔

اس نے ایک گہری نظر رومی اور مجھ پر ڈالی پھر بولا تو اس کی آواز بجتے ہوئے ڈھول جیسی لگی۔

’’ان دونوں کو فارغ کر دو پھر بات کرتے ہیں۔‘‘

’’نن...... نہیں...... نہیں پھل سائیں! یہ دونوں بھی کچھ اسی قسم کی گفتگو کے لیے یہاں آئے ہیں مگر......‘‘ منیر ہمارے بارے میں اسے بتاتے ہوئے بولا۔ اس کے بعد اس نے جلدی جلدی مختصر لفظوں میں ہمارے بارے میں اسے بتا دیا۔

اب پھل سائیں ہماری جانب گھور گھور کر تکنے لگا۔ اس کے دونوں آدمی صوفوں پر بیٹھے رہے مگر وہ خود اٹھ کر منیر کے بائیں جانب والی کرسی پر بیٹھ گیا تا کہ صحیح طرح ہم سے مخاطب ہو سکے۔

’’تمہاری اس سے کس قسم کی دشمنی ہے؟‘‘

''پھل سائیں! دشمنی کی وجہ بے حد سنگین ہے اور اس کی تفصیل کچھ طویل ہے۔'' میں نے اسے پورے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بے حد خطرناک آدمی ہے۔ اس کے پیچھے ایک پورا گروہ ہے۔ جس میں ملکی اور غیر ملکی ناخداؤں کا عمل دخل رہتا ہے۔''

میں نے واضح طور پر پھل سائیں کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے سناٹے کے آثار ابھرتے محسوس کیے۔ پھر وہ جیسے محتاط ہوکر بولا۔

''مگر ہم جبار سے کسی قسم کی طویل دشمنی چاہتے ہیں اور نہ ہی..... اسے سنگین بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔'' بڑے ہی روکھے اور خشک لہجے میں مجھ سے یہ الفاظ کہتے ہوئے وہ اپنے بہنوئی منیر گانجا سے مخاطب ہو کے ہمارے حوالے سے مستفسر ہو کر بولا۔ ''انہوں نے تمہیں کیا پٹی پڑھائی ہے؟''

اس کی بات پر منیر نے اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے ہماری طرف ایک نگاہ اٹھا کے اس سے وہی کچھ کہہ ڈالا جو ابھی ہم تھوڑی دیر پہلے اسے تجویز کے طور پر کہہ چکے تھے۔

''ہرگز نہیں۔'' پھل سائیں بھاری آواز میں اپنے بہنوئی سے بولا۔ ''ان کی باتوں میں مت آؤ اور زرتاوان پر کمی بیشی کی بات کرو، اگر پھر بھی وہ سؤر زمین کا سودا کروانا چاہتا ہے تو بیچ دو اسے، اولاد سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوتی، اگر پیسوں پر رضامند ہو جائے تو اچھی بات ہے، تب پھر مجھے بتانا.....'' اپنے آدمیوں میں سے ایک کو تحکمانہ انداز سے مخاطب کر کے بولا۔

''اوئے، شوکے! میری چیک بُک نکال۔'' شوکے نامی آدمی نے جھٹ اپنے کرتے کی سائڈ جیب میں ہاتھ ڈال کر چیک بک نکال کر دی۔ وہ ایک چیک پر دستخط کر کے منیر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ سادہ (بلینک) چیک ہے۔ جتنی رقم طے ہو جائے لکھ دینا، بعد میں حساب کرتے رہیں گے اور اس زنانی اور اس کے مرد سے آئندہ کسی قسم کی کوئی معاملہ داری مت کرنا۔''

اپنے بہنوئی کو یہ ''حکم'' دینے کے بعد وہ کرسی سے اٹھا اور میری طرف دیکھ کر گویا تنبیہ کے سے انداز میں بولا۔

''اور..... تم دونوں اپنا درد سر خود ہی نمٹاؤ لیکن اگر تمہاری وجہ سے معاملہ گڑبڑ ہوا تو اس کی ذمے داری تم پر ہوگی، میرے لیے تم دونوں کو تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہ ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے دونوں آدمیوں سمیت نکلتا چلا گیا۔

''کیسا آدمی تھا یہ.....؟'' اس کے کمرے سے نکلتے ہی بے اختیار میرے منہ سے برآمد ہوا۔

''جیسا بھی تھا مگر بات ٹھیک کر کے گیا ہے۔ آ جا سکتے ہیں لیکن خیال رہے معاملہ بگڑے نہیں.....''

''ارے.....! یہ تو الٹی آنتیں گلے کو آ گئیں۔'' رومی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ کچھ جوش میں آ گئی تھی، اس لیے کہ وہ خود ایک قانونی ادارے سے متعلق تھی۔ مگر میں نے اسے مزید کوئی ریمارکس دینے سے منع کر دیا اور منیر گانجا کے کمرے سے نکل گیا۔

کمرے میں پہنچے تو طارق اپنا لیپ ٹاپ کھولے کرسی پر بیٹھا انہماک سے کام میں مصروف تھا، ہمیں دیکھتے ہی وہ کرسی چھوڑ کر بیڈ کے قریب والی کرسی پر آن بیٹھا اور ہمارے چہروں کو بھانپتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے گویا چٹخارے لینے کے انداز میں بولا۔

''لوٹ کے بدھو گھر کو آئے.....''

''کیا مطلب؟'' رومی نے اسے گھورا۔

''مطلب تمہارے اترے ہوئے چہروں سے ظاہر ہے۔'' وہ اسی اطمینان سے بولا جبکہ میں تھکے تھکے انداز میں کرسی پر ڈھیر سا ہو گیا۔

''کیا رہا سیف؟ تم ہی بتا دو؟''

''اندازہ تو تمہیں ہو ہی چکا ہے۔'' میرے لہجے میں مایوسی تھی۔

''پتا تو تم نے اچھا پھینکا تھا مگر پھل سائیں جیسے جنجال کو تم نے پیچھے لگا لیا ہے۔'' وہ اس بار سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''کیا مطلب؟ تم اس پھل سائیں سے واقف ہو؟'' میں کچھ بھانپتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''ایک حد تک.....'' اس نے جواب میں کہا۔

''لیکن تم نے ہمیں بتایا نہیں؟'' میں نے بھی اسے گھورا۔

''بتا دیتا لیکن پہلے میں تمہارا تجربہ گیس کرنا چاہتا تھا۔''

''اب اس تجربے والی باتوں کو چھوڑو اور ہمیں یہ بتاؤ کہ یہ پھل سائیں ہے کیا بلا؟ جس نے ہمارا منصوبہ خراب کر دیا، ورنہ تو وہ تھڑدلا سا ہوٹل کا مالک منیرا فیم.....''

''منیر گانجا.....'' میں نے رومی کی تصحیح کی۔

''ہاں، وہی..... وہ تو ہم سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو ہی گیا تھا۔''

''پھل سائیں...... درحقیقت پانچ سال پہلے گل بادشاہ کے نام سے جانا جاتا تھا۔'' طارق بتانے لگا۔ ''وہ اصل میں ہارون آباد کا رہنے والا ہے، آج کل ادھر ہی کہیں مقیم ہے۔ اینٹوں کے بھٹوں کا ٹھیکے دار ہے۔ ایک بڑی سیاسی پارٹی کا.... موسٹ ایکٹو ورکر رہ چکا ہے۔ میڈم ڈالی کا سب سے قریبی اور جاں نثار، وفادار مقربِ خاص کارپرداز رہ چکا ہے۔ اس کے بعد یہ دونوں اچانک غائب ہوگئے تھے۔ آج تک ان دونوں کا سراغ نہیں ملا۔ ان دنوں سنسنی خیز اور خفیہ انکشافات کو طشت از بام کرنے والے کرائم رپورٹرز کا ایک گروہ ان کے پیچھے لگا ہوا تھا، میں اس کا گروپ انچارج تھا۔ اچھا ہوا آج ایک یہ پرانی گتھی بھی سلجھنے کی راہ ہموار ہوئی۔'' اس کے لہجے میں جوش تھا۔

''لیکن...... تم نے کیسے اسے پہچان لیا؟'' رومی نے پوچھا۔

''تم دونوں کے کمرے سے نکلنے کے تھوڑی دیر بعد میں بھی کمرے سے نکل کر یونہی لابی میں آ گیا تھا، وہاں میں نے اسے دو آدمیوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ اگرچہ اس نے ناک نقشہ تھوڑا بدل لیا ہے مگر میری نظریں اس کا ''اصل'' بھانپ چکی تھیں، پھر جب میں نے اسے منیر کے کمرے سے نکل کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے باہر جاتے دیکھا تو مزید غور سے دیکھ کر تصدیق کر لی اور پھر فوراً اپنے کمرے میں آکر لیپ ٹاپ پر پرانی یادداشتیں کھنگالتے ہوئے اس کی پرانی تصاویر دیکھیں۔ آؤ...... تمہیں بھی دکھاؤں۔'' کہتے ہوئے وہ اٹھ کر میز کی جانب بڑھ گیا جہاں لیپ ٹاپ کھلا پڑا تھا۔

میں اور رومی حیران حیران سے وہاں گئے اور میز کے قریب جاکر کھڑے کھڑے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر جھک کر دیکھنے لگے، جبکہ طارق کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

وہ اب ہمیں مختلف تصاویر دکھانے لگا۔ ہم بھی پھل سائیں عرف گل بادشاہ کی تصاویر غور سے دیکھنے لگے، اس میں واقعی اس کا ناک نقشہ اور حلیہ بدلا، بدلا سا تھا مگر قد کاٹھ اور ایک ویڈیو کلپ میں اس کی چال ڈھال حتیٰ کہ چند قریبی ورکروں سے باتیں کرتے دیکھ کر پہچان گئے کہ ماضی کے گل بادشاہ اور حال کے پھل سائیں میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔

اس کے ہمراہ ایک بھرے بھرے بدن اور اچھے قد و جسامت کی گوری چٹی جوان خاتون کو بھی دیکھا، جس کی شخصیت خاصی دبنگ نظر آتی تھی۔

ایک کلپ میں وہ پارٹی کے چند ارکان کو چینل کر رہی تھی۔ بے حد حسین عورت تھی وہ۔ اس کی آنکھیں اور ہونٹ بڑے دیدہ زیب تھے۔ ریشم جیسے گھنے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

''اُف وہ...... ہم یہ کن خرافات میں پڑ گئے...... اس طرح اصل مقصد سے ہٹ جائیں گے......''

ذرا ہی دیر میں رومی بیزار ہو کر بولی اور پلٹ کر اپنی کرسی پر جا بیٹھی۔ میں نے بھی کم و بیش انہی کلمات کا اظہار کیا اور اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا۔ طارق وہیں بیٹھا رہا اور ہماری طرف گھوم کر مسکراتا رہا۔

کمرے میں ایک اعصابی کھنچاؤ کی سی کیفیات طاری تھی۔ خود میرا اپنا دل و دماغ موجودہ حالات کی مایوس کن ابتدا اور حمیرا کے دھیان سے بوجھل ہو رہا تھا۔ ایک چڑچڑاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس پر مستزاد طارق نے ایک نیا پینڈورا باکس کھول لیا تھا۔

بہرکیف...... رومی کے مختصر تبصرے پر میں نے کہا۔

''میرا خیال ہے ہمیں منیر وغیرہ کا باب بند کر کے وہی لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے جسے لے کر ہم لاہور سے یہاں پہنچے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' طارق نے اپنے کندھے اچکا دیے۔

''اگر تم لوگ اپنی مہم کو آسان نہیں کرنا چاہتے تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''آسانی سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' رومی نے اس کے چہرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''یہی کہ اگر ہم موجودہ حالات کے مطابق اپنا تھوڑا ٹریک بدل لیں تو اس میں کیا حرج ہے؟ نہ جبار کہیں بھاگا جا رہا ہے اور نہ ہی...... گوہر شاہ۔'' طارق نے رومی کے سوال کا جواب میری طرف تکتے ہوئے دیا تھا۔

''لیکن میرے سامنے کھیلنے کے لیے ایک لمبی پچ پڑی ہے۔ اس میں کئی جگادری کھلاڑی میرے مدمقابل ہیں۔ انہیں میں جینے کا زیادہ موقع نہیں دینا چاہتا، مذکورہ اماراتی ریاست کے قصائی ڈاکٹر سرجن امرناگ اور رمیش اگروال سے لے کر گوہر شاہ، تاج اور جبار کا گلا دبوچنا ہے۔ باقی یہ لوگ بھاڑ جھونکیں، مجھے باقیوں یا ان کے اس عالمی بلدی سنڈیکیٹ سے کیا لینا دینا ہے، میں کوئی خدائی فوجدار تھوڑی... ہوں تم لوگوں کی طرح...... ہاں! اپنے معصوم اور بے گناہ بھائی عادل کی قبر کی مٹی کو چھوتے ہوئے میں نے جو قسم کھائی ہے، وہ تو میں ضرور پوری کروں گا ہی......''

یہ سب کہتے کہتے حسب سابق میرے اندر بیک وقت ایک جوش کا سا ارتعاش اور تلخ سی کیفیات کا احساس بڑھنے

لگا۔ رومی اور طارق میری جانب تکے جا رہے تھے۔

''تم ٹھیک کہتے ہو سیف! لیکن میرا خیال ہے کہ طارق بھی غلط نہیں، یہ مہم میں آسانی پیدا کرنے کی غرض سے ایسا کہہ رہے تھے۔'' رومی بولی۔

''میں بھی سمجھ رہا ہوں۔'' میرے لہجے میں ہلکا سا اعتراف تھا۔ ''مگر یہ ایک چین سسٹم ہو جائے گا۔ میں نے جو پلان مرتب کیا ہے وہ سیدھا ان کی شہ رگ کو کاٹتا ہے، جس طرح انہوں نے میرے ساتھ کیا ہے۔''

''یعنی گوہر شاہ کی لاڈلی بیٹی کا اغوا۔'' رومی کے لہجے میں طنز تھا، میں نے اس کی پروا کیے بغیر کندھے اچکا دیے۔

''یہی کچھ میرے ساتھ بلکہ اس سے زیادہ ہوا ہے۔''

''چلو چھوڑو اب اس بحث کو۔'' طارق نے اچانک مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں پھر میری اور رومی کی آپس میں بحث نہ چھڑ جائے۔ کیونکہ وہ اس کے حق میں نہیں تھی مگر شاید طارق کی اسے کوئی دی ہوئی ''تسلی'' کے سبب وہ خاموش تھی۔

ہم تینوں نے وہ ہوٹل چھوڑ دیا اور اپنے مختصر سامان کے ساتھ دوسرے ہوٹل کا رخ کیا۔ وہاں کمرا لیا اور سامان رکھا، کچھ ساتھ لیا۔ اپنی کار میں سوار ہوئے اور روانہ ہو گئے۔

مطلوبہ منزل تک پہنچنے سے پہلے ہم تینوں نے کار میں ہی ریڈی میڈ میک اپ کر لیا۔ میں اور رومی تو نوجوانوں کے ہی بھیس میں تھے، جبکہ طارق نے ایک بوڑھے آدمی کا بہروپ بھر لیا تھا۔ رومی کو میری بیوی بنا دیا گیا جبکہ طارق اس کا باپ......

ہم کراکوٹ کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس وقت سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ جنوبی پنجاب کی گرمیاں عروج پر تھیں۔ اس وقت بھی حبس اور گرمی تھی۔ کار میں اے سی تھا، مگر اس کی کارکردگی خاطر خواہ نہیں تھی۔ گزارے لائق ہی سہی، کم از کم گرمی اور دھوپ سے تو بچے ہوئے تھے، چار بجے بھی دن کا ہی سماں محسوس ہوتا تھا۔ مین شاہراہ پر معمول کا ٹریفک رواں تھا۔

کار کا اسٹیئرنگ طارق نے سنبھالا ہوا تھا۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ رومی پچھلی نشست پر بیٹھی تھی۔ کراکوٹ تک جانے کے لیے اس نے ایک چور راستہ تلاش کر لیا تھا جو ہمارے منصوبے کے مطابق عام شاہراہ سے ہٹ کر قدرے نشیبی اور کچے کے علاقے سے ہو کر گزرتا تھا۔

راہِ مذکور پر ایک پرانا سا سرائے نما ہوٹل بھی بنا ہوا تھا۔ بلکہ پہلے یہ ایک سرائے ہی تھی، یہاں آس پاس ٹھیکے پر کھیتوں میں کام کرنے والے کھیتی مزدور رہا کرتے تھے، یا پھر محکمۂ انہار کا عملہ اور ان کے ورکرز رہا کرتے تھے۔ بلکہ کہا یہ جاتا تھا کہ یہ پہلے سرائے یا ہوٹل نہیں بلکہ ایک پرانا سرکاری ریسٹ ہاؤس یا ڈاک بنگلا ٹائپ عمارت ہوتی تھی، پھر عرصہ دراز تک یہاں ویرانی کا راج ہونے کی وجہ سے اس کی بیشتر دیواریں منہدم ہو گئیں۔

مقامی لوگوں نے اس کی کھڑکیاں اور چوکھٹیں چرانا شروع کر دیں، اس کے فرنیچر پر تو پہلے ہی ہاتھ صاف کیا جا چکا تھا، بعد میں اینٹیں بھی نہیں چھوڑی گئیں اور اس کے بعد کسی مقامی زمیندار نے اس پر اپنا قبضہ جما لیا اور اس کے گرد مضبوط چہار دیواری کھڑی کر کے اسے سرائے میں بدل ڈالا۔ مزید تیکھا کام یہ کیا کہ سرکاری عملے کے لیے اس نے پچاس فیصد رعایت رکھ ڈالی اور اندرونِ خانہ متعلقہ محکمے سے مک مکا بھی کر لیا۔

وہ زمیندار مر گیا تو اس کے چھوٹے بھائی نے اسے قدرے نئی طرز پر کرنے کے لیے سرائے سے ہوٹل پر منتقل کرنے کی مقدور بھر کوشش کی، اب وہ عمارت ایک طرف تو بھوت بنگلے کا منظر پیش کرتی تھی اور دوسری جانب ایک رخ سے سرائے اور دوسرے سے ہوٹل بھی نظر آتی تھی۔

یہ ساری معلومات رومی ہمیں راستے میں دیتی آئی تھی اور ہمارے لیے یہ سرائے نما ہوٹل ایک موزوں اور غیر معروف ٹھکانا بن سکتا تھا۔ وہاں تک پہنچنے میں ہمیں آدھا گھنٹا لگا تھا، کچا اور قدرے ریتیلا علاقہ ہونے کے سبب گاڑی کی رفتار ہلکی رکھی گئی تھی اور کہیں کہیں وہ پھنس بھی رہی تھی، اس علاقے میں بڑی گاڑیاں یا جیپ وغیرہ موزوں ہوتی تھیں۔ مہران نے بہرحال گزارہ کر لیا تھا۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا کہ کراکوٹ کا یہ دریائی وادی کا علاقہ تھا جو خاصا سرسبز اور نیم جنگلاتی بھی تھا۔ یہ بھارت کی سرحد کے قریب تھا، جس کے نزدیک ایک دریا بھی بہتا تھا۔

اس وقت شام ہونے لگی تھی۔ موسم درمیانہ تھا، خاصی مرطوب ہوا چل رہی تھی۔ آسمان البتہ صاف نظر آتا تھا۔ چہار سو ایک ٹھہرا ٹھہرا سا ماحول محسوس ہوتا تھا۔ ایک اسرار بھری سی خاموشی طاری تھی۔ کبھی کہیں قرب و جوار سے کسی پرندے کی آواز سنائی دے جاتی۔

سرائے نما ہوٹل کا راستہ درختوں اور گھنی جھاڑیوں

کے جھنڈ کے درمیان سے قدرے بل کھاتا ہوا جب اس کی عمارت کے سامنے اختتام پذیر ہوا تھا تو اس کی اسراریت اور دل فریبی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ سرکاری ریسٹ ہاؤس یا ڈاک بنگلے ایسی ہی جگہ پر ہونے چاہئیں۔ عمارت اب بھی پرانی ہی نظر آتی تھی، پرانی سالخوردہ اور منہدم شدہ اینٹوں کو نکال کر اس کی جگہ نئی سرخ اینٹیں لگا دی گئی تھیں، رنگ و روغن میں بھی کنجوسی سے ہی کام لیا گیا تھا، بس، سفیدی وغیرہ سے ہی کام لیا گیا تھا۔

عمارت قدرے مستطیل تھی اور زیادہ بلند نہیں تھی۔ عمارت کے سامنے وسیع احاطہ تھا، جہاں شاید باغیچے سے زیادہ قدرتی جھاڑ جھنکاڑ کا گمان ہوتا تھا۔ وہیں چند سیمنٹ کی بینچیں درختوں اور کیاریوں کے پاس زمین میں نصب تھیں۔ مرکزی دروازے کی دیواروں پر دو پیلے بلب جل رہے تھے، ان پر مچھروں کے جھرمٹ محو گرداں نظر آ رہے تھے۔ وہاں کوئی ادھیڑ عمر شخص کرسی رکھے بیٹھا تھا۔ چند ایک افراد وہاں بھی دکھائی دیے۔

باغیچے میں بھی کچھ لوگ تھے۔ اسی دیوار کی پیشانی پر سفید چاک اور کوئلے کے رنگ بے رنگ استعمال سے بے ڈھنگے لفظوں میں ''سرائے ہوٹل'' لکھا تھا۔ لفظوں کا اچھا امتزاج کیا گیا تھا، بس ایک یہی بات مناسب دکھائی دی تھی ہمیں۔ ایک پرانے ماڈل کی جیپ ہمیں کھڑی نظر آئی۔

کار روک کر ہم اپنے مختصر سامان کی کٹس اٹھائے دروازے کی طرف بڑھے تو وہ تھوڑے لوگ ہماری طرف دیکھنے لگے۔ وہ بھی شاید کوئی ہماری طرح مسافر تھے، عام ہی قسم کے لوگ تھے۔

ہم برآمدے میں آئے تو کرسی پر بیٹھا ادھیڑ عمر ہماری طرف متوجہ ہوا۔ قریب پہنچنے پر عقدہ کھلا کہ موصوف یہاں بیٹھے کسی ڈائجسٹ کے مطالعے میں مستغرق تھے۔ جسے انہوں نے اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔

''ہمیں کمرا مل جائے گا یہاں......؟'' طارق نے اس سے پوچھا۔ میری طرح شاید اس نے بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ سرائے ہوٹل کا مالک یا منتظم ہوگا۔

''بالکل مل جائے گا۔'' اس نے کھرکھراتی سی آواز میں سر اٹھا کر کہا اور شاید ہمارے ساتھ ایک خاتون کو دیکھ کر وہ احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کی عمر کا اندازہ پچاس پچپن ہی ہوسکتا تھا، صحت اچھی تھی۔ قد چھوٹا تھا، جسم فربہی مائل۔ آنکھوں پر اس نے موٹے سیاہ فریم والی عینک لگا رکھی تھی۔ رنگت سانولی تھی۔ لب و لہجے سے مقامی ہی لگتا تھا۔

''دو کمرے چاہیے ہوں گے ہمیں......'' میں نے کہا۔

''دیکھیں جی......'' وہ شاید عادتاً اپنی عینک پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''نام تو آپ نے پڑھ ہی لیا ہوگا کہ یہ ایک سرائے ہوٹل ہے، ہم کسی کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتے۔ جو ہے ویسا ہی لکھ دیا۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ یہ نہ پوری طرح سے ہوٹل ہے اور نہ ہی سرائے......''

''دونوں کے درمیان کی چیز ہے۔'' میں نے درمیان میں لقمہ دیا۔

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے......'' وہ باچھیں پھیلا کر بولا۔ ''مگر آپ بالکل فکر نہ کریں...... یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ کھانا پینا، آرام اور ہواخوری، منظر چشمی...... ان سب چیزوں سے آپ انشاء اللہ بھرپور انجوائے کریں گے۔''

وہ بے تکان بولتا چلا گیا۔ ڈائجسٹ کے مطالعے نے شاید اسے بولنے کا خاصا سلیقہ سکھا دیا تھا اور باقی دنیا نے...... ''منظر چشمی'' کا لفظ خدا جانے صحیح بولا تھا یا یونہی رواروی میں، تاہم وہ خاصا باتونی مگر دلچسپ شخص محسوس ہوا۔

''دو کمرے......'' میں نے اسے مزید بولنے سے روکنے کے لیے مسکرا کر یاد دلایا۔

''میں یہی کہنے والا تھا کہ آپ...... کو ایک ہی کمرا ملے گا اور وہی کافی ہوگا آپ کے لیے، اس میں زیادہ خرچ بھی نہیں آئے گا، کیونکہ یہاں ہال سسٹم ہے۔ ایک چھوٹا ہال آپ تینوں کے لیے کافی ہوگا، بشرطیکہ......''

''بشرطیکہ...... ہم تینوں میں سے کوئی میاں بیوی نہ ہو......'' میں نے پھر درمیان میں کہا۔ میرا انداز سنجیدہ تھا، میرا اغصیلا پن ایسا ہی مزاح کے انداز میں ہوتا تھا۔

وہ گڑبڑا سا گیا اور روبی کی طرف جھینپی جھینپی نظروں سے دیکھتا ہوا اسی مسکراہٹ تلے بولا۔

''آں...... ہاں، میرا مطلب یہی تھا......'' (خواہ کچھ اور ہی ہوتا) میں نے دل میں کہا۔

''آپ چھوٹا ہال ہی عنایت فرما دیں اور ذرا مناسب کرائے کے ساتھ......'' اس بار طارق نے کہا۔

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے......'' وہ پھر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ یہ شاید اس کا تکیہ کلام تھا ''کرایہ بالکل

مناسب ہے، یعنی ایک دن کا صرف پانچ سو روپے......''
اس سرائے ہوٹل کی خستہ حالی مگر ہمارے لیے بالکل موزوں ہونے کے مقابلے میں یہ واقعی کم کرایہ تھا۔ لہٰذا ہم نے فوراً ہامی بھرلی۔
وہ ہمیں اندر لے آیا۔ اندر بھی ایسی ہی کسی کسی جگہ کمزور پاور بلب کی یرقان زدہ روشنی پھیلی ہوئی تھی، اسی میں وہ ہمیں ایک چھوٹی راہداری اور پھر ایک بڑے ہال سے گزارتا ہوا نسبتاً چھوٹے ہال میں لے آیا۔
اس ہال کے نیچی چوکھٹ والے دروازے سے سر جھکا کر اندر داخل ہونے پر پہلا ڈر مجھے یہی ہوا کہ اب تب میں چمگادڑوں کا ایک غول اندر سے گھمیریاں بھرتا ہوا برآمد ہوگا، مگر ایسا نہیں ہوا، البتہ اس کی جگہ ایک بن مانس ضرور نمودار ہوا تھا، جسے دیکھتے ہی ہم تینوں ہی تقریباً بدک سے گئے تھے، وہ بھاری جسامت اور جھکے جھکے کندھوں والا کوئی گوریلا ٹائپ شخص ہی محسوس ہوا تھا ہمیں۔ اس نے اپنے بھاری بھرکم جسم پر فقط ایک میلی چیکٹ سی بغیر بازوؤں والی بنیان اور نیچے کھلے گھیر والی شلوار پہنی ہوئی تھی جس سبب اس کا بالوں سے ڈھکا ہوا جسم خاصا عریاں تھا۔
''اوئے جھاویاں......! کبھی پورے کپڑے بھی پہن لیا کر، پتا نہیں تجھے یہاں زنانیاں بھی آتی ہیں...... دفع ہو، قمیص پہن کر آ۔'' ادھیڑ عمر نے اسے ڈپٹا۔ وہ کھی کھی کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔
''معافی چاہتا ہوں جی......! یہ میرا چھوٹا بھائی ہے، قادر نام ہے اس کا، کھدو کہتا ہوں میں اسے...... یہی یہاں کے مسافروں کی دیکھ بھال اور خدمت چاکری کرتا ہے۔''
وہ ادھیڑ عمر پھر شروع ہونے لگا تو میں نے کہا۔
''مگر آپ نے...... ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا، عرفیت سمیت......''
''بالکل ٹھیک کہا جی آپ نے...... مجھے اپنا تعارف بھی کروانا چاہیے تھا۔'' وہ بولا۔ ''میرا نام محمود عرف مودا ہے...... میں اس سرائے ہوٹل کا مالک ہوں۔''
پھر لگے ہاتھوں ہم نے بھی اپنا اپنا ''جعلی'' تعارف کروادیا۔ شناختی کارڈ وغیرہ دیکھنے کی نوبت اس جیسے سرائے ہوٹل میں نہیں آسکتی تھی اور آتی بھی تو آسانی سے کوئی بہانہ کارگر ثابت ہوجاتا۔ میں نے اور رومی نے خود کو میاں بیوی اور طارق کو جو بوڑھے کے بھیس میں تھا، اپنے ابا میاں کے جعلی شرف نامے سے نواز دیا۔
''اندر تشریف لائیں......'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
اندر تو ہم آ ہی گئے تھے۔ اس نے شاید ازراہِ مروت دو بلب اور جلا دیے۔
اس کی روشنی میں ہال کی چھت خاصی نیچی دکھائی دی اور دیواریں مٹوری زدہ......، فرش، ننگی اینٹوں سے اٹا ہوا نظر آتا تھا اور کہیں سے اوپر نیچے تھا۔ کونے میں تین چار پائیاں پڑی تھیں جن پر گندے سے بستر اور تکیے پڑے ہوئے تھے۔
ایک کونے میں تین ٹانگوں کی میز تھی جس کی چوتھی ٹانگ دیوار کا سہارا دے کر بنائی گئی تھی۔ دو چار ٹوٹی پھوٹی اسٹول ٹائپ کرسیاں بھی ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔
''بستر ے آپ کے اپنے ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں، ورنہ میں کھدو سے کہہ کر نئے صاف بستر ے لگوا دیتا ہوں۔'' مودا بولا۔
ہم نے سر ہلا دیے۔ وہ دائیں جانب سامنے ایک چھوٹے سے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
''اس دروازے کے پار مشترکہ غسل خانے ہیں۔ اس کے بعد کینٹین ہے پھر بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو کھدو یا مجھے آواز دے دینا۔''
''اس وقت ہمیں اکیلے ہونے کی سخت ضرورت ہے۔'' میں اس ہولناک جگہ کا جائزہ لیتے ہوئے اندر ہی اندر جل کر بولا۔
''بالکل ٹھیک کہا آپ نے، بہت اچھا جی...... آپ آرام کریں...... اور اپنی سیٹنگ بھی کرلیں۔'' وہ یہ کہہ کر چلا گیا۔
''بڑی عجیب سی جگہ ہے۔ جیسے ہونٹڈ ہاؤس......'' رومی نے ہولے سے تبصرہ کیا۔ مودا اس وقت ہال کے دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ میں نے رومی سے سرگوشی میں کہا۔
''آہستہ، وہ ادھر ہی ہے، اس نے سن لیا تو وہ اس کی تعریفوں میں پھر شروع ہو جائے گا اور اسے چپ کرانا دوبھر ہوجائے گا۔''
''ایسے اہم مشن اور خطرناک دشمنوں کے ٹھکانے میں ایسی ہی جگہیں کیمپ کرنے کے لیے سودمند ثابت ہوتی ہیں، کسی کو اس پر شبہ نہیں ہوتا، بالکل ٹھیک جگہ ہے یہ......'' طارق نے مثبت تبصرہ کیا۔
''چلو اپنے کیمپنگ والے بستر نکال کر لگاؤ ذرا سکون سے بیٹھیں تو سہی۔'' میں نے کہا اس کے بعد ہم اپنے اپنے سفری بیگ کھولنے لگے۔

ہال کی صفائی ہم نے کھدو کو بلوا کر کروائی، چارپائیاں بھی اس نے سلیقے سے اور ہمارے کہنے کے مطابق لگا دیں۔ طارق محمود عرف مودا کو تین دنوں کی پیمنٹ جمع کروا آیا۔

یہاں کے غسل خانوں کی حالت بھی ڈراؤنی سی تھی، کسی مذبح خانے کی طرح..... کینٹین میں ناگوار سی بو کو دروازے کے باہر ہی سونگھ کر ہم واپس لوٹ آئے تھے۔

ہال میں آ کر ہم نے اپنے آڑے وقتوں کے لیے خریدے ہوئے خشک خوراک کے ڈبوں سے کام چلایا، البتہ چائے کی طلب ہونے لگی، وہ ہمیں ذرا ڈھنگ سے کھدو نے لا دی، وہ اب قمیص پہن آیا تھا۔ چائے کے لیے مگ ہم نے اسے اپنے دیے تھے۔

ہال میں چار کھڑکیاں تھیں دو باہر کی سامنے کی سمت، ایک اندر کسی اندھیری راہداری میں اور چوتھی عمارت کے پچھواڑے کھلتی تھی۔

''میں نے غسل خانے اور کینٹین کی طرف کھلنے والے دروازے کے باہر بائیں جانب ایک سالخوردہ سا تنگ زینہ دیکھا ہے۔'' طارق چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ ہم نے چارپائیاں اس طرح قریب قریب کر کے بچھالی تھیں کہ ہم بہ آسانی ایک دوسرے سے دھیمے لہجے میں باتیں کر سکیں۔

''تم دونوں ادھر ہی ٹھہرو، میں اوپر جا کر ذرا جائزہ لے آؤں۔''

''میرا خیال ہے تم یہاں سے اس روح فرسا قلعہ نما عمارت کراکوٹ کا جائزہ لینا چاہتے ہو۔'' رومی بولی۔

''یقیناً.....'' طارق نے کہا۔ ''اگر مودا یا کھدو آ جائے تو یہی بتانا انہیں کہ میں غسل خانے میں ہوں۔'' کہتے ہوئے اس نے چائے کا آخری گھونٹ بھرا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ دوربین اس نے رکھ لی تھی۔ یہ انفرا ریڈ تھی، اس سے تاریکی میں دیکھا جا سکتا تھا۔

''طارق کا کہنا کچھ اتنا غلط بھی نہیں.....'' اس کے جاتے ہی رومی بولی۔ ''ایسی جگہ پر دشمنوں کا شبہ کم ہی جاتا ہے۔''

''لیکن محتاط رہنا پھر بھی ضروری ہے۔ ہم صرف اسی بات پر تکیہ کر کے احتیاط کا دامن نہیں چھوڑ سکتے۔'' میں نے کہا۔

''ہم.....'' رومی نے ہنکاری بھری۔

ذرا دیر بعد طارق آ گیا۔ یرقان زدہ بلبوں کی روشنی میں اس کا چہرہ جوش سے سرخ نظر آ رہا تھا۔ چارپائی پر بیٹھتے ہی بولا۔

''عمارت تو یہاں سے بالکل صاف نظر آ رہی ہے اور وہاں ہونے والی نقل و حرکت بھی..... ہم نے بالکل ٹھیک جگہ پر اپنا ٹھکانا بنایا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، پانچ سو کے بجائے اگر وہ باتونی مودا ہزار بھی لیتا تو قبول ہوتا ہمیں.....؟'' میں نے کہا۔

''ہاں!''

''مہم کا آغاز کب اور کیسے کرنا ہے؟'' رومی نے سوال ڈالا۔

''جلد بازی کی ضرورت نہیں، ہم ٹھیک سمت پر ہیں اور بھٹکے نہیں ہیں۔'' طارق بولا۔ پھر کچھ صراحت سے آگے بتانے لگا۔ ''قلعے کی عمارت کے پس منظر میں مجھے آبادی کے بھی آثار نظر آئے ہیں اور وہاں ایک الگ تھلگ سے قدرے اونچے مقام پر ایک حویلی کا خاکہ بھی نظر آیا ہے، وہ یقیناً جبار کی ہو سکتی ہے، کیونکہ باقی گھر عام سے تھے۔

کراکوٹ کی عمارت بھی بہ ظاہر کوئی فارم ہاؤس ہی محسوس ہوتی ہے مگر یہاں خاصی ہلچل رہتی ہوگی، کیونکہ میں نے وہاں کچھ گاڑیاں اور ٹرکس کھڑے دیکھے ہیں..... پہرے دار بھی گشت کرتے دیکھے ہیں وہ سب مسلح بھی تھے۔ سرچ لائٹیں بھی نصب تھیں مگر اس وقت وہ بجھی ہوئی تھیں، جبکہ دیگر روشنی بس ایک حد تک ہی رکھی گئی تھی۔''

وہ اس کے محلِ وقوع سے آگاہ کرتے ہوئے ذرا دیر کو سانس لینے کے لیے تھما تو میں نے پوچھا۔

''اس کے قرب و جوار میں کیا نظر آتا ہے؟''

''خودرو جھاڑیاں، درخت اور ان کے درمیان ایک پٹی، جو ان کی راہ گزر کے طور پر کام آتی ہوگی۔''

''ہم.....'' میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

''اس کا مطلب ہے ہمارا کام آگے بڑھنے کی امید ہے۔'' طارق کچھ سوچتے ہوئے بڑبڑایا۔

''کیا مطلب؟'' رومی اس کی بات نہ سمجھ سکی۔ ''مشن تو ہمارا آگے بڑھ ہی رہا ہے۔''

''میں مشن کے پہلے مرحلے کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔'' طارق بولا۔ ''پہلے جانچ پڑتال اور..... نظرداری ضروری ہے۔ یہ طے ہو جانے کے بعد کہ اس خوفناک سی عمارت میں وہ سفاکانہ کھیل کس حصے میں کھیلا جاتا ہے، پھر ہمارے مشن کے دوسرے مرحلے کا آغاز ہوگا، اس

کے بعد تیسرے اور آخری مرحلے کو آزما کر تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی جائے گی۔‘‘

’’تم...... میرا مطلب ہے، یہ جان کاری لینے کے لیے ہمیں چوری چھپے اس عمارت کے اندر جانا ہوگا؟‘‘ میں نے سوالیہ نظروں سے طارق کے جوشیلے چہرے کو دیکھا۔

’’ہاں!‘‘ اس نے سر کو جنبش دی۔ ’’لیکن صرف میں یہ مہم جوئی اختیار کروں گا، تنہا...... تم لوگ میرا انتظار کرنا، میں رات کو نکلنے والا ہوں۔‘‘

اس کی بات پر میں اور رومی ایک دوسرے کے چہرے کی طرف تکنے لگے۔

’’ہرگز نہیں......‘‘ رومی نے صاف انکار کر دیا۔ ’’ہم تمہیں یوں اکیلے اس خطرناک عمارت میں داخل ہونے نہیں دیں گے، ہم بھی تمہارے ساتھ جائیں گے، خواہ آج ہی رات جانا پڑے۔ کیوں سیف؟‘‘

’’بالکل ٹھیک کہا تم نے......‘‘ بے اختیار میرے منہ سے مودا والا تکیہ کلام برآمد ہو گیا مگر کسی نے محسوس نہیں کیا۔ آگے بولا۔ ’’نہیں طارق! یہ خطرناک اور رسکی کھیل ہم تمہیں تن تنہا نہیں کھیلنے دیں گے۔ ہم تینوں ایک دوسرے کی مدد......‘‘

’’یار تم لوگ بالکل عجیب ہو۔‘‘ طارق جھلا کر میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

’’مشن میں بعض مرحلے ایسے آتے ہیں کہ ساتھیوں کی راہ ہموار کرنے کے لیے پہلے کسی ایک کو قدم آگے بڑھانا پڑتا ہے۔‘‘

’’اور اگر خدانخواستہ تم کسی مصیبت میں پھنس گئے......؟‘‘ رومی بولی۔

’’اب تو تم بچوں والی باتیں کرنے لگیں۔‘‘ طارق نے منہ بنایا۔ ’’ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ انسان اگر یہ سوچے کہ وہ نہ ہو جائے یہ نہ ہو جائے تو ساری زندگی ہاتھ پر ہاتھ ہی دھرے بیٹھا رہے۔‘‘ طارق نے منطقی انداز اختیار کیا۔ ’’ہم رابطے میں رہیں گے۔ میں اپنا سیل فون سائلنٹ پر کر دوں گا، تم بھی ایسا ہی کرو۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’لیکن یہاں سے وہاں تک ہم بھی تمہارے ساتھ......‘‘

’’اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔‘‘ طارق نے یکدم میری بات کاٹ کر کہا۔ ’’میں کوئی دور نہیں جا رہا، بہ مشکل ڈیڑھ دو کلومیٹر کی ہی دوری ہے۔ پیدل چلا جاؤں گا، میں ایسے حالات اور مہم جوئی کا عادی ہوں۔‘‘

’’وہ تو میں بھی ہوں۔‘‘ رومی جھٹ سے بولی۔ ’’سیف کی بات میں نہیں کر سکتی، ایسا کیوں نہ کریں کم از کم میں ہی تمہارے ساتھ......‘‘

’’یار! ایسا کرتے ہیں کچھ بھی نہیں کرتے۔ اسی بحث میں صبح ہو جائے گی۔‘‘ طارق جھلایا۔ ناچار رومی اور میں نے چپ سادھ لی۔

طارق اپنی مختصر تیاری کے بعد ہوٹل کے پچھلے...... راستے سے نہایت رازداری کے ساتھ نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ہماری ہدایت کے مطابق ہم سے رابطہ کر کے بتا دیا کہ وہ عمارت کے قریب بہ خیریت پہنچ چکا ہے اور اب اندر گھسنے والا ہے۔ اسی لیے محتاط رہا جائے اور کوشش یہی ہو کہ ہم اسے کوئی کال نہ کریں۔ اگرچہ حفظِ ماتقدم کے تحت اس نے اپنا سیل وائبریٹ پر کر دیا تھا۔ ہم نے اسی لیے ایسا کیا تھا کہ رات میں اس کی آواز سے کوئی چونک نہ جائے۔

رات اپنے جوبن پر تھی۔ میں اور رومی یونہی ہال سے باہر برآمدے میں آ گئے۔ سائبان تلے کرسی رکھی ہوئی تھی اور مودا صاحب ابھی تک وہاں بیٹھے کسی ڈائجسٹ کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھے۔ وہ انٹرنیٹ اور آئی فون کے اس دور میں بھی ڈائجسٹ اور کہانیوں کا کوئی شیدائی معلوم ہوتا تھا۔ اس بار اس کے ہاتھ میں ڈائجسٹ کے بجائے مشہور رائٹر ایم اے راحت کا کوئی پُراسرار اور ایڈونچر ناول تھا۔ جس ماحول میں وہ ایسے موضوع کا ناول پڑھ رہا تھا وہ بالکل پرفیکٹ تھا۔ یوں بھی اکثر میں نے لوگوں کو ایم اے راحت کے اور دیگر لوگوں کے ایسے ناول پڑھتے پایا تھا۔ رومانس کی بے عمل اور خوابوں کی جنت بنانے والے خیالی ناولوں کے موضوعات سے لوگ اب چڑنے لگے تھے، اسی لیے شاید الیکٹرانک میڈیا کے اس دور میں بھی لوگوں کو میں نے زیادہ تر معاشرتی، جاسوسی، پُراسرار اور ایڈونچر بس ناول پڑھتے پایا تھا۔ ایک زمانے میں خود میں بھی ابن صفی کی ایچ اقبال، ایس قریشی کی سیکریٹ سروس (پرمود سیریز) اور ابن صفی کی عمران سیریز اور جاسوسی دنیا شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ اگرچہ اس دور میں بھی رومانوی ناولوں کی بھرمار تھی۔ اب کتابوں کہانیوں کا دور لوگ ختم سمجھتے تھے یا زوال پذیر مگر حقیقت یہی تھی کہ کتاب سے قاری کا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹنے والا، کمی بیشی اور بات ہے، کرائسز ہر شعبے میں آتے ہی ہیں، انہیں نئی پلاننگ کے تحت سنبھالا جاتا ہے، مغرب میں تو آج بھی کتابوں کی دکان پر لائن لگی ہوتی ہے کہ کتاب کے لمس میں ہی کہانی اور ناول پڑھنے کا مزہ ہے۔ میں تو ڈاکٹری میں

پڑ کر ان چیزوں سے دور ہو چلا تھا لیکن کھدو میاں کو اس میں محو پا کر میرے اندر بھی شوقِ مطالعہ بھڑکا تھا۔

بہرکیف ہمیں دیکھتے ہی کھدو نے اپنے موٹے فریم کی عینک کے پیچھے سے ذرا سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا تھا۔

''اگر آپ باہر کہیں چہل قدمی کا پروگرام بنائے ہوئے ہیں تو میں یہی کہوں گا یہ وقت انتہائی نامناسب ہے، جنگلی جانور اور آوارہ کتے آپ کو نرغے میں لے سکتے ہیں۔'' اس نے دوستانہ مشورہ دیا۔

''آپ نے بالکل ٹھیک کہا'' میں نے دانستہ بلکہ ''شرارتاً'' اس کے تکیہ کلام کی نقل کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''ہم بس، احاطے کے اردگرد ہی ہواخوری کریں گے۔''

اس کے بعد میں اور رومی آگے بڑھ گئے۔ تھوڑی سی چہل قدمی کرنے کے بعد ہم اندر آ گئے۔ یوں ہم نے اندر کا بھی اچھی طرح جائزہ لے لیا۔ ہمارے محتاط اندازے کے مطابق سرائے ہوٹل میں چند ہی مسافر ٹھہرے ہوئے تھے۔ فیملی کوئی نہیں تھی۔ صرف رومی کی موجودگی پر مرد حضرات اسے گھور گھور کر دیکھتے۔

مجھے حیرت ہوتی، ہم کیسے لوگ ہیں؟ عورت کو یوں گھورتے ہیں جیسے پہلے کبھی دیکھی ہی نہیں، حالانکہ رومی بے چاری پوری طرح ڈھکی چھپی ہوئی تھی، مطلب یہ کہ وہ پورے اور ڈھنگ کے لباس میں تھی، مڈل ایسٹ میں اکثر عورتوں کو میں نے مغربی اور ''شارٹ'' ڈریس میں دیکھا، مگر مجال ہے جو کوئی انہیں یوں گھور گھور کے دیکھتا ہو، ماسوائے ایک سرسری نگاہ کے۔

رومی کو اس سے کوفت ہوئی ہو یا نہیں، البتہ مجھے ضرور یہ بُرا لگا تھا، شاید اس لیے کہ میں تقابلی جائزہ لینا جانتا تھا۔

طارق نے ہی ہمیں یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ ہم اس کے جانے کے بعد ذرا سرائے ہوٹل کا اندرونی بیرونی گھوم پھر کر جائزہ لے لیں۔ یہ کام انجام دینے کے بعد ہم اندر آ گئے۔

رات دبے پاؤں بیت رہی تھی۔ میں اور رومی الگ الگ آمنے سامنے کی بچھی ہوئی چارپائیوں پر پاؤں جھلائے بیٹھ گئے، دروازہ ہم نے بند کر رکھا تھا اور ہر سو خاموشی کا راج تھا۔ دیگر لوگ بھی سو رہے تھے مگر موداا بھی تک برآمدے میں کرسی پر بیٹھا کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا۔ طارق نے ہمیں ''سب خیریت'' کا میسج کر دیا تھا۔

میں اور رومی دھیمے لہجے میں طارق کی اس خفیہ مہم جوئی کے متعلق باتیں کر رہے تھے، ساتھ ہی بے چینی سے اس کی کامیاب واپسی کے منتظر بھی تھے۔

جانے کیا بات تھی کہ میرا دل نامعلوم سی بے چینی کا شکار تھا، یوں لگتا تھا جیسے کوئی بڑا حادثہ رونما ہونے والا ہو۔

ہال کی ساری لائٹیں ہم نے آف کر رکھی تھیں۔ فقط زیرو پاور کا بلب روشن تھا۔ کسی کو طارق کی یہاں سے ''خفیہ'' روانگی کا اندازہ نہ ہو سکا تھا۔

اچانک میں، رومی سے باتیں کرتے کرتے چونک گیا، جبکہ رومی مجھے چونکتا پا کر ٹھٹکی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''شش......'' میں نے جواب میں اپنے ہونٹ پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ دیا۔ میرا چہرہ ایک جگہ ٹک سا گیا تھا اور آنکھوں کے ڈیلے اِدھر اُدھر سن گن لینے کے انداز میں حرکت کرنے لگے۔

''او گاڈ......! اتنی پُراسراریت پھیلا رہے ہو خوامخواہ...... آخر ہوا کیا ہے؟'' رومی بدکی۔

میں یک ٹک سا ہو کے اپنی سماعتوں پر زور دینے لگا اور پھر سرسراتی آواز میں بولا۔ ''ابھی...... اب سے چند سیکنڈ پہلے تم نے کچھ سنا؟''

''نن...... نہیں تو۔'' رومی اِدھر اُدھر تکتے ہوئے بولی۔ میرے کان ہنوز کھڑے تھے۔

''تم نے کسے اور کیا سنا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''کسی کی آواز، یوں جیسے کوئی سسک کر چپ ہو گیا ہو۔ یا پھر دبے دبے انداز میں رونے کی کوشش کو چھپا رہا ہو۔'' میں نے سنسنی خیز سے لہجے میں کہا۔

''تت...... تمہارا مطلب ہے کہ کمرے میں ہم دونوں کے علاوہ بھی کوئی اور ہے؟'' رومی کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ اور استعجاب تھا۔

''ہاں!'' میں نے غیر مرئی نقطے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا اور اسی وقت پھر مجھے ہولے سے کسی کے ٹھسکنے کی آواز سنائی دی۔ اس بار میں نے پورا خیال رکھا تھا کہ آواز کی سمت دوڑوں گا سو یہی کیا میں نے۔

آواز مجھے بائیں جانب ذرا فاصلے پر دیوار کے کونے میں پڑی اس خالی چارپائی کی جانب سے آئی تھی جو اضافی تھی، میں فوراً اس طرف لپکا، وہ خالی تھی مگر میں اس کے نزدیک پہنچ کر رکا اور اکڑوں بیٹھ کر جب اس کے نیچے جھانکا تو بُری طرح ٹھٹک گیا۔ وہاں ایک جوان لڑکی چادر میں لپٹی گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔

''اے..... کون ہو تم؟ باہر نکلو.....'' میں نے اسے ہولے سے پکارا..... اس دوران میں رومی بھی حیران پریشان قریب آ گئی تھی اور اب وہ بھی جھک گئی تھی۔
لڑکی جوان تھی، چادر ڈھانپی ہونے کی وجہ سے وہ پہچاننے میں تو نہیں آ رہی تھی مگر اس کے دراز ریشمی گیسو چادر کی بکل سے باہر اس کی جوان اور صحت مند پشت تک نیچے پھیلے ہوئے دکھتے تھے۔
تب ہی اس نے چادر کی بکل سے اپنا چہرہ نکالا تو ایک لحہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے چارپائی کے اس اندھیرے اور محدود گوشے میں چاند چمک گیا ہو۔
وہ واقعی ایک جوان اور حسین چہرہ لڑکی تھی۔ اس کی آنکھیں کشادہ اور پُرکشش تھیں، ان میں خوف اور سراسیمگی نے عجیب تاثر پیدا کر دیا تھا۔ دہن اس کا اب بھی چادر کے نقاب میں ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ بڑھا کر سہارنا چاہا تو وہ اسی طرح گٹھڑی بنی کسی معصوم بچے کی طرح ڈر کر اور پیچھے سرک گئی۔ مجھے اس کی خوب صورت آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ بھی چمکتی محسوس ہوئی تھی۔
''میں نے کہا نا باہر نکلو..... ورنہ میں چارپائی اوپر اٹھا کر تمہیں زبردستی کھینچ لوں گا۔'' میں نے اس بار لہجے میں سختی اور تہدید پیدا کی تو وہ کپکپاتے لہجے میں بولی۔
''نن..... نہیں..... مجھے..... چھپ..... چھپا رہنے دو، وہ..... وہ مجھے مار ڈالیں گے۔'' وہ کافی دہشت زدہ تھی۔ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔
''نہیں، یہاں ہمارے سوا اور کوئی نہیں ہے، تم یہاں محفوظ ہو، باہر آ ؤ۔''
وہ چارپائی کے نیچے سے نکلنے سے اب بھی کترا رہی تھی تب رومی نے جھک کر نرم اور دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''ڈرو نہیں، ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں، یہ جگہ محفوظ ہے، ہم تمہارے بارے میں کسی کو نہیں بتائیں گے بلکہ مدد کریں ہم تمہاری.....''
رومی کی بات کا مثبت نتیجہ نکلا اور وہ سکڑ سمٹ کر قدرے گھسٹتے ہوئے چارپائی کے نیچے سے نکل آئی۔
میں اور رومی بھی سیدھے کھڑے ہو گئے، وہ اب ہمارے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے چادر اتار کر چارپائی پر پھینک دی تھی۔ جس کے نیچے وہ چھپی تھی۔ اب میں نے بہ غور اس کے سراپا کا جائزہ لیا، وہ چہرے مہرے سے حسین ہی نہیں بلکہ سرو قد بھی تھی، صحت اچھی تھی، رنگ گورا تھا۔ بال سیاہ تھے، اس کی کشادہ آنکھیں بھی کالی تھیں۔ ناک ستواں اور گردن صراحی دار، وہ بلاشبہ حسن و جمال کا پیکر تھی۔ اس کا حسین چہرہ اشکبار تھا۔ وہ مصیبت زدہ اور دکھی معلوم ہو رہی تھی۔
''تم کون ہو اور تمہارا نام کیا ہے؟ یہاں کیسے آ گئیں؟'' میں نے حیران سے لہجے میں اس سے پوچھا تو رومی نے مجھے ٹوکا۔
''اسے پہلے آرام سے بیٹھنے تو دو۔'' کہتے ہوئے وہ اس کی طرف بڑھی اور پھر اسے بازو سے تھام کر بستر بچھی دوسری چارپائی پر بٹھا دیا۔ ہم اس کے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گئے۔
''پپ..... پانی مل جائے گا؟'' اس کی آواز بھی مترنم تھی۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر اسے پانی کا گلاس تھما دیا، جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گئی۔ اس کے بعد وہ بار بار خوف زدہ سی نگاہوں سے ہال کے دروازے اور پچھواڑے کھلنے والی کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی۔ عقدہ کھلا کہ وہ کھڑکی سے ہی اندر کودی ہوگی۔
''ڈرو نہیں، ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں، ہمارے سوال کا جواب دو۔'' رومی نے کہا۔
وہ اپنے خشک عنابی ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ ''مم..... میں..... میں.....''
ابھی اس نے بہ مشکل اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ہال کمرے کے بند دروازے پر زور زور سے دھڑ دھڑ ہونے لگی۔ لڑکی کے حلق سے بے اختیار گھٹی گھٹی چیخ خارج ہو گئی اور وہ ایک دم اسی چارپائی کے نیچے رینگ گئی۔
دوسری طرف دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ اس بار دوسری جانب سے کسی نے بھاری مردانہ آواز میں کہا۔ ''دروازہ کھولو..... جلدی.....''
میں اور رومی اس اچانک افتاد پر بوکھلا سے گئے تھے، اندازہ تو ہونے لگا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے، میں نے اپنے حواس بحال کیے اور رومی سے خالی چارپائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''تم وہاں چارپائی پر بیٹھ جاؤ اور اس لڑکی کی پڑی ہوئی چادر نیچے کھسکا دو جلدی اور کسی کو کچھ مت بتانا، میں دروازہ کھولتا ہوں۔''
رومی نے فی الفور میری ہدایت پر عمل کیا اور میں دانستہ نیند سے اُلسائے ہوئے انداز میں یہ کہتا ہوا دروازہ کھولنے کے لیے بڑھا۔
''آتا ہوں..... کون سی مصیبت آ گئی ہے، سونے بھی نہیں دیتے۔'' اس کے بعد قریب پہنچ کر میں نے دھڑکتے

دل سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک قدآور اور جیم شحیم شخص کھڑا تھا، اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں اور وہ خاصی رعب دار شخصیت کا حامل تھا۔ وہ بیش قیمت ڈبل گھوڑا بوسکی کی شلوار قمیص میں ملبوس تھا اور اس کے بغل سے ہولسٹر جھول رہا تھا۔

اس کے دائیں جانب سے جس شخص کو میں نے دیکھا تو یکلخت جیسے میرا دل رُک رُک کر دھڑکنے لگا، بڑی مشکل سے میں نے خود کو اس خبیث کے سامنے سنبھالا تھا، وہ گوہر شاہ کا مقرب خاص کارپرداز...... تاج تھا۔

اب میں پورے وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مجھے اس ریڈی میڈ میک اپ میں بھی پہچان سکتا تھا یا نہیں، لیکن...... بہرحال ہماری یہ ''حفظِ ماتقدم'' والی پالیسی کامیاب ضرور رہی تھی کہ ہم تینوں نے بہروپ بدل رکھے تھے اور بالخصوص میں نے بھی اب اپنے لب و لہجے کو بدلنا تھا۔

ان کے ہمراہ مضطراب الحال سا مودا کھڑا تھا اور باقی تین اپنی وضع قطع سے اس رعب داب والے شخص کے گارڈز وغیرہ لگتے تھے، انہوں نے بندوقیں پکڑ رکھی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے وحشت مترشح تھی۔ سب سے آخر میں کھدو بھی کھڑا تھا۔

تاج کی گھورتی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ تاہم مجھے یہ کوئی نئی کھچڑی پکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''کیا بات ہے؟ کون ہیں آپ......؟'' میں نے ان کی طرف دیکھتے ہی پوچھا۔

''آپ ایک طرف ہو جائیں ضمیر صاحب! اور اپنی زنانی کو بھی ذرا ایک طرف ہٹا دیں، یہ کمرے کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔'' مودے نے مجھ سے مخاطب ہو کے کہا۔

''تلاشی؟ مگر کیوں؟'' میں نے دانستہ حیرت کا اظہار کیا۔ لڑکی والا معاملہ ابھی اندھیرے میں سہی مگر اتنا سمجھ میں ضرور آ گیا کہ یقیناً تعلق اسی ''تلاشی'' سے ہی تھا۔ وہ اسی لڑکی کی تلاش میں آئے تھے، لیکن ان اجنبیوں کے ساتھ مجھے تاج کی موجودگی نہیں سمجھ... آ رہی تھی۔ رومی بھی یقیناً میری طرح تاج کو یہاں پا کر چونکی۔

میرے جواب کے انتظار میں وہ رعب دار شخص مجھے اب خشمگیں نظروں سے گھورنے لگا تھا، اس کے تینوں مسلح حواریوں کی بھی تیکھی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، صاف لگتا تھا کہ وہ مجھے دھکا دے کر بھی اندر داخل ہونے میں مطلق دیر نہیں لگائیں گے۔

''بس، ہے ایک معاملہ، بعد میں بتا دیں گے۔'' مودے نے مجھ سے کہا اور اس سے بولا۔ ''تشریف لائیں...... چوہدری صاحب!''

میں دانستہ حیران و پریشان ہونے کی اداکاری کرتا ہوا ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ اندر گھستے چلے آئے۔ رومی ایک طرف ہو گئی۔ یہی وہ وقت تھا جب میرا دل جانے انجانے خدشات تلے زور زور سے دھڑکنے لگا۔

اگر لڑکی ادھر سے برآمد ہو جاتی تو یہ ایک نیا سیاپا پڑ سکتا تھا۔ ایک خوامخواہ کی مصیبت گلے کو آ جاتی۔ بہرحال میں نے اسی طرح حیران اور انجان بننے کی ایکٹنگ جاری رکھی اور رومی بھی شاید موجودہ صورتِ حال... کو بھانپ کر اپنی باڈی لینگویج کے زور پر وہی کچھ ظاہر کیے ہوئے تھی جو میں کر رہا تھا۔

ہم دونوں کے ایک طرف ہٹتے ہی وہ لوگ تیزی سے اندر گھستے چلے آئے۔ انہوں نے پہلے تو ہال کے وسط میں آ کر چاروں طرف متلاشی نظریں دوڑائیں، اس کے بعد یہ لوگ الماریاں اور میزیں کرسیاں ہٹا ہٹا کر دیکھنے لگے، آخر میں ان کا دھیان چارپائیوں کی طرف چلا گیا۔

''ان چارپائیوں کو الٹ دو۔'' دفعتاً رعب دار شخص نے اپنے حواریوں سے تحکمانہ کہا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا، اس کے حواری آگے بڑھے۔ پہلے میری اور رومی کی چارپائیاں الٹ دیں، پھر تیسری بھی الٹ دی، اس کے بعد وہ چوتھی چارپائی کی جانب بڑھے جو کھڑکی کے قریب تھی اور اسی کے نیچے وہ لڑکی چھپی بیٹھی تھی۔ میرا دل سینے میں زور زور سے دھڑکنے لگا جبکہ رومی کا چہرہ بھی ستا ہوا نظر آتا تھا۔

انہوں نے وہ چارپائی اٹھائی۔ میری اور رومی کی دھڑکتی نظریں وہیں مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں مگر دوسرے ہی لمحے ہمیں حیرت کا جھٹکا لگا، جسے جلد ہی ہم نے طمانیت کے آثار تلے چھپا لیا۔

چوتھی چارپائی بھی الٹ دی گئی مگر وہاں سے بھی لڑکی برآمد نہ ہوئی۔

''یہاں کوئی نہیں چوہدری صاحب!'' بالآخر اس کے ایک حواری نے کہا۔

''ہم......'' اس نے ایک غراہٹ سے مشابہ ہنکارا بھرا۔ پھر ہم دونوں کی طرف گھور گھور کر دیکھنے لگا اور ہماری جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پاس کھڑے مودے سے سوال کیا۔

"یہ لوگ کون ہیں؟"

"جی چوہدری صاحب! یہ مسافر ہیں۔" مودے نے جلدی سے جواب دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ مودا کہیں ہمارے تیسرے ساتھی طارق کے بارے میں کوئی سوال نہ کرڈالے ہم سے...... لیکن شاید وہ خود بھی اس مصیبت سے چھٹکارا چاہتا تھا اس لیے مزید کچھ نہ بولا۔

"تم کہاں سے آئے ہو اور یہ کون عورت ہے تمہارے ساتھ؟" تاج نے پہلی بار مجھ سے مخاطب ہوکر کھردرے سے لہجے میں کہا۔

"یہ میری بیوی ہے، ہم شہر سے آئے ہیں، یہاں کی سیر کرنے ایک اخبار سے ہمارا فری لانس تعلق ہے۔" میں نے جواب دیا، یوں میری حتی الامکان کوشش یہی تھی کہ یہ رذیل مجھے لب و لہجے سے نہ پہچان لے، میں نے اسی لیے آواز اور لہجہ بدلنے اور ٹوٹے ٹوٹے لفظ بولنے کی کوشش کی تھی، دانستہ میں کھانستا بھی رہا تھا۔ شکر تھا کہ وہ مزید کچھ نہیں بولا۔ انہیں شاید جلدی پڑی ہوئی تھی۔

"تم میرے ساتھ آؤ، کچھ ہدایات دینی ہیں تمہیں۔" چوہدری ٹائپ آدمی نے مودے کو تحکمانہ انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا اور اس نے یکدم فدویانہ انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دے دی۔ پھر وہ لوگ چلے گئے۔

"ارے...... یہ لڑکی کہاں غائب ہوگئی......؟" ان سب کے ہال کمرے سے نکلتے ہی رومی نے متحیرانہ لہجے میں کہا۔

"شش......! آہستہ، وہ لوگ ابھی ادھر ہی ہیں، کہیں سن نہ لیں۔" میں نے اسے ٹوکا، جبکہ میں خود بھی حیران تھا لیکن دوسرے ہی لمحے میری نظر کھلی کھڑکی کی طرف اٹھ گئی، جو اسی چارپائی کے قریب تھی اور وہاں سے میں نے تاریکی میں ایک سایہ ابھرتے دیکھا، جس کا انداز چوروں کا سا تھا۔

میں اور رومی ٹھٹکے۔ وہ وہی لڑکی تھی، وہ جلدی سے کھڑکی کود کر اندر آئی اور ہمارے قریب آکر سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ "وہ چلے گئے؟"

میں اور رومی جو ابھی تک اس کی ہوشیاری اور چابک دستی پر حیرانی میں مبتلا تھے، یہ سوچے بنا نہ رہ سکے کہ اسے تو فرار کا موقع مل گیا تھا مگر یہ پھر اندر آگئی تھی، شاید کھڑکی کے باہر نیچے دبک گئی ہوگی اور یہ سوچا ہوگا کہ بھاگنے کی صورت میں کہیں ان کے ہتھے نہ چڑھ جائے، گویا اس نے اسی جگہ کو پناہ کے لیے سوچ رکھا تھا۔

"وہ ابھی ادھر ہی موجود ہیں لیکن میرا نہیں خیال کہ وہ دوبارہ کمرے میں آئیں گے۔" میں نے اس سے از راہِ تشفی کہا مگر رومی نے اس سے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ضروری نہیں، وہ دوبارہ یہاں کا رخ نہ کریں، یہاں کوئی بھی آسکتا ہے دوبارہ، تم ابھی فی الحال کسی چارپائی کے نیچے جا چھپو۔" رومی کی ہدایت پر لڑکی نے فوراً عمل کیا اور دوبارہ ایک چارپائی کے نیچے جا دبکی۔

ہمارا خیال تھا کہ مودا انہیں رخصت کر کے دوبارہ ہمارے پاس آئے گا مگر کافی دیر گزر گئی وہ نہیں آیا تو ہمیں اچنبھا ہوا۔

"مودا آیا نہیں؟" رومی بولی۔

"میرا بھی یہی خیال تھا کہ مودا آئے گا اور ہمیں کچھ بتائے گا۔" میں بھی گومگو کے انداز میں بولا۔ "ہوسکتا ہے اب صبح ہی بتائے کچھ۔"

"لیکن طارق کی تو کوئی خیر خبر لے لیتے؟" رومی نے کہا۔ میں نے اسے آنکھ کے اشارے سے طارق کے بارے میں ابھی کسی قسم کی گفتگو کرنے سے منع کر دیا، میرا اشارہ اس چارپائی کی جانب تھا جہاں وہ پُراسرار لڑکی چھپی بیٹھی تھی۔

میں دروازے کی جانب بڑھا، باہر کی سن گن لی، پھر سوائے ایک زیرو بلب کے تمام لائٹیں بجھا دیں اس کے بعد میں نے رومی کو اشارہ کیا کہ لڑکی کو لے آئے۔

ذرا دیر بعد لڑکی ہمارے روبرو دوسری چارپائی پر بیٹھی تھی۔ اس نے پانی مانگا تو رومی نے اسے گلاس بھر کے دیا جسے وہ ایک ہی سانس میں چڑھا گئی۔

"تم کون ہو؟ اور کیا یہ لوگ تمہاری ہی تلاش میں یہاں آئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"مم...... میں......" ایک بار پھر وہ اتنا کہہ کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوگئی اور اپنے اندر کے کسی انتہائی غم زدہ جذبے تلے سسک کر رو پڑی۔ مجھے اب اس سے بیزاری سے ہونے لگی، سمجھ میں میری یہی آیا تھا کہ یہ کسی روایتی ظلم کا شکار تھی اور ہمارے پاس بالکل بھی وقت نہیں تھا کہ یہاں خدائی فوجداری کا رول نبھاتے...... اسی سب اس لڑکی کے سلسلے میں اب میرے اندر کا تجسس بھی رفع ہونے لگا تھا۔

"لڑکی! تمہاری وجہ سے ہم بھی خوامخواہ کی مصیبت میں پھنسنے والے تھے، ہم دوبارہ اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔" اس بار رومی نے اسے متنبہ کیا۔ وہ بھی شاید میری

طرح اس سے بیزار ہونے لگی تھی۔ سنجیدگی سے لڑکی سے مخاطب ہوکے مزید بولی۔

"تم اب یہاں سے چلی جاؤ...... ہم نے تمہاری جتنی مدد کرنا تھی، وہ کرلی۔"

اچانک کسی خیال کے تحت میرے ذہن میں ایک سوال ابھرا۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔ "ویسے یہ معاملہ کیا ہے؟ کون تھے یہ لوگ؟ تم بتاتی کیوں نہیں ہو؟"

لڑکی ہمارے روکھے پن پر رونا سسکنا چھوڑ کر بالآخر بولی۔ "میرا نام بانو ہے جی! اور میں چوہدری گوہر شاہ کی بیٹی بانو ہوں......"

"کیا......؟" اس کے انکشاف پر میں رومی دونوں ہی بُری طرح چونکے تھے مگر دوسرے ہی لمحے ہم محتاط ہوگئے کہ کہیں مارے حیرت ہماری آواز نہ بلند ہو جائے۔ اس کا لہجہ سرائیکی تھا۔

گویا میں جسے تختۂ مشق بنانے کی "پری پلاننگ" کیے ہوئے تھا وہ خود ہی چل کر میرے سامنے آگئی تھی۔ بڑے عجیب حالات پیدا ہونے لگے تھے۔

"لیکن...... یہ کون تھا بڑی بڑی مونچھوں والا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ میرے باپ کا دوست اور بھائی وال اور ساجھے دار (پارٹنر) ہے۔" وہ بولی۔ "چوہدری جبار ماہی نام ہے اس کا......"

یہ اس کے منہ سے برآمد ہونے والا دوسرا دھماکے دار انکشاف تھا۔ میں اور رومی سنتے رہے۔ تاہم اب تاج کی اس مونچھوں والے کے ساتھ موجودگی سمجھ میں آرہی تھی۔

"انہوں نے میرے فیکے کو بڑی بیدردی سے مار ڈالا۔ میں اس بے چارے کی کوئی مدد بھی نہ کرسکی۔ ہائے...... بے چارہ فیکا، مجھ سے محبت کے جرم میں مارا گیا۔" وہ پھر سسکنے لگی۔

میں اور رومی حیرت میں مبتلا تھے۔ کہاں تو میں گوہر شاہ کی ایک جذباتی کمزوری سے کھیلنے آیا تھا اور میرا ارادہ اس کی لاڈلی اور اکلوتی بیٹی کو اغوا کرنے کا تھا اور یہاں صورتِ حالات یہ تھی کہ وہ خود ہی میرے پاس ایک مجبور اور دکھیاری عورت کے روپ میں موجود تھی۔

گویا ہماری مہم کی ابتدا عجیب الٹ پھیر سے ہو رہی تھی۔ تاہم یہ انکشاف ہوتے ہی کہ وہ رذیل گوہر شاہ کی بیٹی تھی، میرے لیے اب وہ ایک دم اہم ہوگئی تھی۔

ایک طرح سے وہ اب بھی ہماری مہم کے لیے کارآمد ہوسکتی تھی۔ یوں اب میرا رویہ بھی اس کے ساتھ ایک دم بدل گیا۔ اس کی دلجمعی کرتے ہوئے بولا۔

"دیکھو، اب دکھ کرنے اور رونے سے کیا فائدہ؟ جو ظلم ہونا تھا وہ ہوچکا۔ تم اب کہاں جاؤ گی؟"

"قبر میں جاؤں گی اب میں...... اپنے فیکے کے پاس......" وہ نہایت آزردہ اور مایوسی سے بولی۔ کہاں تو وہ موت کے خوف سے اس قدر ڈر رہی تھی اور اب ایک دم مرنے کی باتیں کرنے لگی تھی۔ شاید دکھ کی انتہا تھی یہ کہ وہ اس طرح کی باتیں کرنے لگی تھی۔

اس بار رومی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "دیکھو......! مایوسی کی باتیں نہیں کرتے، تمہارے باپ نے اگر ایک بے گناہ نوجوان کے ساتھ یہ ظلم کیا ہے تو کیا تم نہیں

چاہوگی کہ انہیں سزا ملے......؟''

میں رومی کی دانشمندی پر اش اش کر اٹھا۔ وہ اسے شیشے میں اتارنے کے لیے کوشاں تھی۔ میں نے دیکھا اس کی بات پر لڑکی نے ایک دم اپنا اشکبار چہرہ اٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے غم زدہ تاثرات اب ایکا ایکی ایک جوشِ غیظ میں بدلنے لگے تھے اور وہ اسی لہجے میں بولی۔

''ہاں! تم ٹھیک کہتی ہو بہنا! میرے بے گناہ فیکے کو انہوں نے جس بیدردی سے ہلاک کیا ہے، میں بھی اس کے قاتلوں کو نہیں بخشوں گی لیکن......'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو رہی۔ شاید اسے اپنی کم مائیگی کا ایک دم ہی احساس ہو چلا تھا۔

''ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔ ظلم کے خلاف تو ہم بھی اپنے سروں سے کفن باندھ کر نکلے ہیں۔'' اسے انتقام کی آگ میں سلگتا پاکر بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا، جس پر رومی نے آنکھ کے اشارے سے مجھے نہ صرف ٹوک دیا بلکہ انگریزی میں مجھے محتاط رہنے کی ہدایت بھی کردی کہ ابھی اتنی جلدی ''کھلنے'' کی ضرورت نہیں ہے۔

''آ...... آپ نے ابھی انگریزی میں کیا کہا؟'' اچانک وہ لڑکی چونک کر رومی سے بولی۔

''کچھ نہیں، تم یہ بتاؤ کہ...... یہ تمہاری اور فیکے کی کیا کہانی ہے؟'' رومی نے اس سے سوال کر ڈالا۔

وہ کافی سنبھل گئی تھی، پھر وہ بتانے لگی۔ ''رفیق، مجھ سے محبت کرتا تھا، میں بھی اس کی دیوانگی سے متاثر ہوکر اس کے قریب ہوتی گئی، لیکن میں ساتھ ہی فیکے سے کہتی رہتی تھی کہ ہمارا ملن مشکل ہے، مگر وہ ضدی تھا، کہتا تھا کہ وہ مجھے حاصل کرکے ہی رہے گا، وہ مجھے دیوانہ وار چاہتا تھا، سچی بات یہی تھی کہ میں بھی اس سے محبت کرنے لگی تھی مگر میں جانتی تھی کہ میرا باپ کبھی بھی یہ رشتہ منظور نہیں کرے گا، وہ ایک جابر، انا پرست اور مغرور آدمی ہے، خاندان سے باہر تو کیا اپنی حیثیت سے نیچے کے لوگوں کو خاطر میں ہی نہیں لاتا۔ دولت اس کا غرور تھی۔ مگر فیکا بضد تھا کہ وہ میرا رشتہ بھیج کر رہے گا، کم حیثیت کا تو وہ بھی نہیں تھا، کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق تھا اس کا...... لیکن میرے باپ سے زیادہ دولت مند نہیں تھا اس کا باپ اس پگلے نے اپنے ماں پیو (ماں باپ) کو میرا ہاتھ مانگنے کے لیے ایک دن بھیج ہی دیا تو میری ماں خوف زدہ ہوگئی، ماں نے ان کے ساتھ کوئی بُرا سلوک تو نہیں کیا مگر صاف لفظوں میں بتا دیا کہ ایسی بات ان (گوہر شاہ) سے کرنا بھی مت...... ورنہ وہ اسے گالی سمجھ کر ان پر چڑھ دوڑے گا، کیونکہ میری ماں اپنے شوہر کے جابرانہ اور ظالمانہ مزاج سے واقف تھی۔

فیکے کی شاید موت ہی آئی تھی، وہ پیچھے نہیں ہٹا اور اس نے صاف صاف مجھ سے کہہ دیا کہ ہم بھاگ کر شادی کر لیں گے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی، کچھ اس لیے بھی کہ فیکا میرے باپ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا، وہ اسے نہیں جانتا تھا، لیکن میں جانتی تھی اپنے باپ کو، وہ اور اس کے آدمی ہم دونوں کو پاتال میں سے بھی ڈھونڈ نکالتے مگر فیکا تو پاگل بس، میری محبت میں دیوانہ ہوا جا رہا تھا، میرے اپنے دل کا بھی یہی حال تھا کہ میں بھی اس کی محبت میں دیوانی ہو رہی تھی۔ یہ اس کا دیوانہ پن ہی تھا کہ اس نے بالآخر اپنے ماں پیو کے ذریعے میرے باپ تک یہ بات پہنچا دی، پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا، سب سے پہلے فیکے کے باپ کی مار لگوائی، اس کے بعد فیکے کی۔ میرے باپ نے دونوں کی اپنے آدمیوں سے اتنی ٹھکائی کروائی کہ انہیں اسپتال داخل ہونا پڑا۔

میرا باپ گوہر شاہ بڑے اثر و رسوخ والا آدمی ہے، پولیس میں رپورٹ لکھوانے کے باوجود اس کا بال تک بیکا نہیں ہوا۔

قصہ مختصر یہ کہ بالآخر ہم نے بھاگ کر شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا، وہ مجھے کراچی لے جانا چاہتا تھا۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ ہم پر اسی دن سے کڑی نگاہ رکھی جانے لگی تھی جس دن سے فیکے کے باپ نے میرے باپ سے اپنے بیٹے کے لیے میرے رشتے کی بات کی تھی، نجانے کس طرح میرے باپ کو بھی احساس ہو چلا تھا کہ میں بھی فیکے کی محبت میں مبتلا ہوں۔

ہم نے بھاگنے کی کوشش چاہی تھی کہ عین وقت پر ہمارا بھانڈا پھوٹ گیا۔ ہم بھاگتے رہے...... مگر کہاں تک ہے؟ میرا باپ اپنے بھیڑیا صفت حواریوں کے پورے جتھے سمیت ہمارے پیچھے لگا ہوا تھا۔

ہم دونوں بھاگ کر پہلے بھاولنگر آ گئے، یہاں فیکے کا کزن رہتا تھا، جب اسے اصل کہانی کا علم ہوا تو وہ خوف زدہ ہوگیا اور ہمیں زیادہ دن نہیں رکھ سکا، پتا چلا کہ وہاں بھی میرے باپ کے حواری پہنچ چکے تھے، فیکے کو اب میرے باپ کے لمبے بازوؤں کا اندازہ ہونے لگا، مگر وہ مجھے تسلیاں دیتا رہا، اس کے بعد ہم بورے والا آ گئے مگر یہاں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا گیا، ہم پریشان ہو گئے، ہمیں نہیں جائے

امان نہیں مل رہی تھی، بالآخر فیکے نے طے کیا کہ کسی بڑے شہر کے بجائے چھوٹے شہر کا رخ کیا جائے وہاں سے ہم بورے والا پہنچے تو وہاں بھی بدقسمتی اور موت ہمارا پیچھا کرتی رہی، ایک بار تو ہم حواریوں کے ہتھے چڑھتے چڑھتے بچے تھے، ہم وہاں سے بھی فرار ہوئے اور...... ان سے بچتے بچاتے جبار ماہی کے علاقے میں آگئے، یہاں بہ قول فیکے کے اس کا کوئی جاننے والا رہتا تھا، اس کا ارادہ اس کے ہاں کچھ دن چھپے رہنے اور پھر کراچی کوچ کرنے کا تھا، مگر بدقسمتی سے اسے معلوم نہ تھا کہ یہاں بھی اس کا ایک خاص آدمی اور ساجھے دار جبار رہتا ہے، حالانکہ میں نے اسے بتایا بھی تھا، بس اس کی مت ماری گئی تھی جی! وہ کہتے ہیں نہ کہ پریشانی در پریشانی میں آدمی کی مت ماری جاتی ہے، وہی ہوا۔

میرے باپ کے گرگوں کو اس کی بھی بھنک پڑ گئی کہ ہم یہاں ہیں اس نے اپنے بھائی وال جبار کی طرف اپنے تین حواری، جن میں تاج بھی تھا، روانہ کر دیے، تا کہ وہ بھی مدد کر سکے۔ اس کی یہ چالاکی کامیاب گئی اور بالآخر ہم ان کے ہتھے چڑھ گئے۔

میرے ظالم باپ نے انہیں حکم دے رکھا تھا کہ ہمیں تلاش کرنے کے بعد فیکے کو ہلاک کر دیا جائے اور مجھے پکڑ کر اس کے حوالے کر دیں۔

میں نے تو بھاگ کر جان بچائی تھی مگر چھپ کر اپنے دیوانے عاشق کا حال دیکھا اور یہ دیکھ کر کہ جب تاج اور چوہدری جبار نے اسے دبوچ کر بڑے غرور سے یہ کہا کہ ”کہ کیا تو اب بانو کا نام لے گا بھی؟“

”ہاں...... ہاں...... میں مرتے دم اس کا ہی نام لوں گا، کیونکہ میں اس سے سچی محبت کرتا ہوں۔“ اس جی دار نے ان ظالم بیریوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو اس غریب کو میرے باپ کی ہدایت کے مطابق بیدردی سے گولی ماردی گئی اور حواریوں کو حکم دیا کہ اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے آوارہ جانوروں کے آگے ڈال دیں، تا کہ پھر کوئی کم کمین ہماری عزت رولنے کی جرات نہ کر سکے، یہ حکم دینے کے بعد وہ لوگ میری تلاش میں نکلے تو میں بھاگ کر یہاں آگئی اور کھڑکی کے راستے اندر کود کر چارپائی کے نیچے چھپ گئی۔“

وہ اتنا بتا کر خاموش ہوگئی مگر اس کی آنکھوں کے آنسو نہیں رکتے تھے، وہ بلاشبہ ایسے حسن و شباب کی مالک تھی جس پر مرا جائے، جس پر بے جگری سے قربان ہونے کو جی چاہے، وہ ایک ٹھیٹھ پنجابن الھڑ مٹیارن بھی مگر فیکا بدنصیب تھا یا خوش نصیب، اس سے قطع نظر وہ بہرحال بانو کے عشق میں بڑی بیدردی سے مارا گیا تھا۔

اسی دوران میں ماضی کا ایک بہت قریبی باب میرے غور و فکر کرتے دماغ میں کسی فلم کی طرح گھومنے لگا، جب پپو شاہ کی بہن صائمہ سے گوہر شاہ کے کچے چھٹے سے متعلق میری بات چیت ہوئی تھی۔

اس کے مطابق گوہر شاہ کا اپنا خاندان اس کے آبائی گاؤں کی حویلی میں تھا جو پاکپتن کے کسی نیچے کے کچے علاقے میں تھا۔ اس نے دو شادیاں کی ہیں اور وہ دونوں بیویاں حویلی میں ہی رہتی ہیں۔

”ممکن ہے ادھر لاہور میں بھی شادی کر رکھی ہو؟“ میں نے پوچھا تھا۔

صائمہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس نے یہاں کوئی شادی نہیں کی اور اسے ضرورت بھی نہیں ہے۔“

”یعنی عقل مند آدمی ہے ورنہ گاؤں دیہات کے جاگیرداروں ایک بیوی شہر میں رکھتے ہیں اور ان کے مرنے کے بعد شہر اور گاؤں والوں میں وراثت کے جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔“

”یہاں میں ہوں اور دوسری تیسری بہت آجاتی ہیں۔ اسی کوٹھی میں آتی ہیں۔ ایک تو بہت مشہور فلمی اداکارہ ہے۔ اب بیکار ہے تو اسی طرح گزارا کر رہی ہے۔ کچھ اسٹیج والیاں بھی آتی ہیں مگر رات بھر کے لیے۔“

”گوہر شاہ پچاس کے قریب ہوگا اگر رواج کے مطابق اس کی شادی کم عمری میں ہوگئی ہوگی تو اب اس کے بچے بھی بچوں والے ہوں گے۔“

”سنا ہے چار یا پانچ بیٹے ہیں اور ایک بیٹی ہے۔ وہ اس سے بہت پیار کرتا ہے، اکثر میرے سامنے اس کا ذکر کرتا ہے، مگر وہ یا بیٹے اس کوٹھی میں کبھی نہیں آئے۔“

”حیرت ہے جبکہ گوہر شاہ یقیناً بیشتر وقت یہیں ہوتا ہوگا، تب اپنے گھر والوں کو کب وقت دیتا ہے؟“

”مہینے میں دو بار دو دن کے لیے حویلی جاتا ہے۔“ صائمہ نے کہا۔ ”اس کے علاوہ سارا وقت یہیں گزرتا ہے۔ گاؤں کی زمین پر اس کے بھائی قابض ہیں اس نے زمین ان کے حوالے کر دی ہے۔“

”اسے زمین کی کمائی کی ضرورت ہی نہیں ہے، اس دھندے سے اتنا کما لیا ہوگا کہ پورے گاؤں کی زمین خرید سکتا ہوگا۔“

صائمہ نے سر ہلایا۔ ”کتنی بار اس نے میرے سامنے

اپنی بڑی سی تجوری کھولی، وہ اوپر تک نوٹوں سے اور سونے کی اینٹوں سے بھری ہوئی ہے۔ نوٹوں میں باہر کے نوٹ بھی ہیں۔ ڈولر، پاؤنڈ اور وہ یور یا کیا کہتے ہیں اسے......''

''یورو۔'' میں نے لقمہ دیا۔

''وہی اور بہت سارے ہیں۔''

یہ سب بلیک اور ڈرٹی منی تھی جو انسانوں کے اعضا فروخت کر کے کمائی گئی تھی۔ ہمارے ہاں بلیک منی عام طور سے تجوریوں اور بیرونِ ملک خفیہ بینک اکاؤنٹس میں رکھنے کا رواج ہے۔ مجھے یقین ہے گوہر شاہ کی جتنی دولت یہاں تھی اس سے کہیں زیادہ بیرونِ ملک ہوگی۔ اس کا بیرونِ ملک تک پھیلا ہوا ریکٹ اس کا واضح ثبوت تھا۔ صائمہ سے مزید گفتگو میں انکشاف ہوا کہ گوہر شاہ ایک بار صوبائی اسمبلی کا ممبر رہ چکا تھا۔ اس نے ایک پارٹی کا ٹکٹ خریدا تھا مگر پھر اس نے بادشاہ گر کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ اس کے علاقے میں ووٹوں کے لیے زر اور اثر دونوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ گوہر شاہ کے پاس دونوں چیزیں تھیں۔ اس کا حلقہ دو قومی اسمبلی اور چار سے پانچ صوبائی اسمبلی کی نشستوں پر پھیلا ہوا تھا۔ انتخابات سے پہلے وہ متوقع جیتنے والے امیدواروں سے ساز باز کر لیتا تھا اور پھر ان کی کامیابی کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا تھا۔

صائمہ نے انکشاف کیا تھا کہ وہ خرچ کرنے میں بہت کھلے ہاتھ کا آدمی تھا۔ اپنے علاقے میں انتظامیہ اور پولیس والوں کو بے دریغ نوازتا تھا۔ اپنے کارندوں اور کام کرنے والوں کو بھی کھل کر دیتا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ سب اس کے مرید تھے اس کے گُن گاتے تھے۔ یہ آزمودہ نسخہ ہے جتنا گڑ ڈالو اتنا میٹھا ہوگا۔ اس لیے گوہر شاہ جو کماتا تھا اس کا ایک حصہ یوں خرچ بھی کرتا تھا۔ عام طور سے اس قسم کے مافیا مین حاصل ہونے والی دولت کا بڑا حصہ اپنے تصرف میں چاہتے ہیں، اس سے کام کرنے والوں اور ان کے جرائم سے چشم پوشی کرنے والوں میں بددلی پھیلتی ہے۔ امریکا میں بہت سے مافیا خاندان اسی وجہ سے ختم ہو گئے کہ اوپر والے آنے والی دولت پر قابض ہو جاتے تھے اور خاندان کے دوسرے لوگوں کو نہیں دیتے تھے، ان کی آپس میں لڑائیاں ہوتی تھیں اور یہ چیز ان کی تباہی کا باعث بن جاتی تھی۔ ہمارے ہاں بھی ایسا ہوتا ہے اگرچہ اس کا پیمانہ اور طریقہ مختلف ہے۔

''گوہر شاہ کے کئی بیٹے ہیں اور یقیناً جوان بھی ہوں گے تو کیا اس نے انہیں اپنے دھندے میں شامل نہیں کیا ہے؟''

''اگر وہ شامل ہیں تب بھی مجھے علم نہیں ہے۔'' صائمہ بولی۔ ''کیونکہ میں نے انہیں کبھی یہاں نہیں دیکھا۔''

میں سوچ رہا تھا کہ گوہر شاہ کا دھندا لاہور تک محدود نہیں تھا بلکہ اصل کام تو لاہور سے باہر سے ہوتا تھا۔ عظیم نے مجھے بتایا تھا کہ اکثر انسان جن کے اعضا نکالے جاتے تھے وہ جنوبی پنجاب، سندھ اور بلوچستان سے لائے جاتے تھے۔ ان میں بڑی تعداد میں یقیناً افغانی بھی ہوں گے جو آسان شکار تھے کیونکہ ان کی موجودگی غیر قانونی ہوتی ہے اور گم ہونے کے بعد انہیں کوئی مشکل سے ہی تلاش کرتا ہے۔ اس وسیع نیٹ ورک کو چلانے، مال تلاش کرنے اور اس کی بہ حفاظت ترسیل کے لیے یقیناً گوہر شاہ نے اعتماد کے آدمی رکھے ہوں گے۔ اس کے خاص آدمی لازمی اس کے قریبی لوگ ہوں گے اور کسی انسان کے سب سے نزدیکی افراد جن پر وہ اعتماد کر سکے اس کے رشتے دار ہوتے ہیں۔ گوہر شاہ بیشتر وقت لاہور میں ہوتا تھا اور یہاں سے باہر ہونے والے کاموں کو دوسرے لوگ دیکھتے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ گوہر شاہ کے بیٹے اور دوسرے رشتے دار یہاں آتے ہوں لیکن صائمہ کو پتا نہیں چلتا ہو۔ یہ بات میں نے اس سے کہی تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''یہاں سب ملازم میرے ہاتھ میں تھے۔ میرا مطلب کام کرنے والوں سے ہے۔ وہ مجھے ایک ایک بات کی رپورٹ دیتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو مجھے ضرور پتا چل جاتا۔''

''ممکن ہے وہ دوسری عمارت میں آتے ہوں؟''

صائمہ نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ''ڈاکٹر تو زیادہ ہی سوچ رہا ہے اگر ایسا ہے تو گوہر شاہ کو کس کا ڈر ہے کہ وہ چھپائے گا؟''

میں خفیف ہو گیا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ گوہر شاہ نے اپنی اولاد کو اس دھندے سے بالکل الگ رکھا ہوا ہے اور اسی وجہ سے وہ انہیں یہاں نہیں بلاتا ہے۔''

''میری سمجھ بھی یہی آتا ہے۔'' صائمہ نے کہا تھا۔

خدائے قدرت تھی یا پھر مکافاتِ عمل کا سلسلہ گوہر شاہ کے ساتھ شروع ہو چکا تھا کہ وہ اپنی جس گندگی کو اولاد سے چھپانا چاہتا تھا وہ اسی کے سامنے اب اس کی بیٹی بانو کی صورت میں آ رہی تھی۔

☆☆☆

بہرکیف بانو ہمارے لیے گوہر شاہ کے خلاف ہی نہیں بلکہ جبار ماہی کے خلاف بھی ترپ کا پتّا بن سکتی تھی اسے کس طرح کھیلنا تھا، اس کا فیصلہ طارق کی آمد کے بعد باہم صلح مشورے سے ہی کیا جاسکتا تھا مگر اب مسئلہ بانو کا تھا کہ اسے سنبھالا کیسے جائے؟

بانو کے لیے ہم نے وہ رات اپنی خوار تو کرنا ہی تھی، کیونکہ طارق کی بھی ابھی تک کوئی خیر خبر نہیں آئی تھی اور رومی نے مجھے سختی سے منع کررکھا تھا کہ بانو کے سامنے ابھی کوئی بات نہ کی جائے ماسوائے انگریزی کے تاکہ وہ کچھ سمجھ نہ پائے۔

پتا چلا تھا کہ وہ کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی اور اس نے روایتی جاگیردارانہ گھرانے میں پرورش پائی تھی جہاں عورتوں کو زیادہ پڑھنے لکھنے نہیں دیا جاتا تھا۔

''میرا خیال ہے ہمیں طارق کو کال کرلینی چاہیے۔'' رومی نے انگریزی میں کہا۔

بانو کو ہم دوسری چارپائی پر لیٹنے کا کہہ چکے تھے، اس بے چاری کو کیا نیند آنا تھی، وہ وہیں سکڑ سمٹ کر خاموش بیٹھ گئی تھی اور اپنی تقدیر پر ماتم کناں رہی، جبکہ میں اور رومی دوسرے کونے والی چارپائی اور کرسی پر آن بیٹھے تھے اور طارق کے متعلق بات چیت میں مصروف ہوگئے تھے۔

''میں کرتا ہوں کال۔'' اس کی بات پر میں نے کہا اور اپنا سیل فون نکال کر اس کا نمبر ملایا...... میں جانتا تھا کہ طارق نے اپنا سیل وائبریٹ پر لگا رکھا ہوگا تاہم وہ کال اٹینڈ کرسکتا تھا۔

دوسری طرف ٹون جارہی تھی اور میری بے چینی سوا ہوتی رہی مگر دوسری جانب سے کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔

''کیا ہوا؟''

دوسری جانب سے کال ریسیو نہ ہونے کا میسج سنائی دیا تو میں نے سیل کان سے ہٹالیا۔ ''وہ کال اٹینڈ نہیں کر رہا۔''

''کہیں کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس گیا؟''

''خدا خیر کرے گا، ہوسکتا ہے وہ کوئی اہم قدم اٹھانے میں مصروف ہو۔'' میں نے دعائیہ کلمہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن اگر ایسا ہے تو اسے تھوڑی دیر بعد تو ہمیں کال کرکے اپنی خیریت کے متعلق بتانا ہی چاہیے۔''

''یقیناً وہ ایسا ہی کرے گا، جب میرا نمبر اپنے سیل پر دیکھے گا یا دیکھ لیا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں تھوڑا انتظار کر لینا چاہیے۔''

رومی خاموش ہوکے اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ وہ شاید طارق کی جانب سے نامعلوم تشویش کا شکار تھی، لیکن میں سمجھتا تھا کہ طارق کسی سے کوئی جنگ کرنے نہیں بلکہ سُن گُن لینے گیا ہے، بے شک یہ کام بھی ایک جنگ سے کم خطرناک نہیں تھا، تاہم میں جانتا تھا کہ وہ یہ کام بھی محتاط روی سے کرتا تھا۔

ہم دونوں باتوں کے درمیان میں سامنے والی چارپائی پر چادر لیے ہوئے لیٹی بانو کی طرف بھی دیکھ لیتے تھے۔

اب طارق کی آمد کے بعد ہی اس کے بارے میں ہم کوئی تبادلۂ خیال کرسکتے تھے تاکہ کوئی مشترکہ لائحہ عمل ترتیب دے سکیں۔ ایک تفکر اس بات کا بھی تھا کہ اگر طارق خدانخواستہ کسی مصیبت میں پھنس چکا ہے تو بانو والا معاملہ ہمارے لیے اضافی بوجھ یا مصیبت کی صورت میں سامنے آسکتا تھا، کیونکہ جبار ہمارا دشمن ہی نہیں شکار بھی تھا اور اس ''بلڈی سنڈیکیٹ'' میں گوہر شاہ کا مبینہ پارٹنر بھی جس کی جوان بیٹی گھر سے بھاگی ہوئی تھی، لیکن بدقسمتی سے اس کا عاشق نامراد رفیق عرف فیکا قتل کردیا گیا تھا اور اب نجانے وہ اپنی بیٹی کا کیا حشر کرنے والا تھا، جو ابھی ہمارے پاس تھی۔ اگر ایسی صورت میں اس کے کانوں میں بھنک بھی پڑجاتی تو ہمیں الٹا لینے کے دینے پڑسکتے تھے۔

رات اب آخری پہر میں داخل ہوچکی تھی۔ بانو اتنی پریشانیوں اور دکھوں کے باوجود ''نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے'' کہ مصداق بالآخر سوچکی تھی۔

میرے بعد تھوڑی دیر کے وقفے سے رومی نے بھی طارق سے اپنے موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش چاہی تھی مگر بے سود...... تیسری بار میں نے کال کی تو اس کا سیل فون آف ملا۔

اب ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ صاف لگتا تھا کہ طارق کسی مشکل میں پھنس چکا تھا۔

''مجھے جانا پڑے گا۔'' رومی نے کہا۔ وہ طارق کی طرف سے سخت تشویش زدہ دکھائی دینے لگی تھی۔ خود میں بھی پریشان تھا۔ اس کی بات سن کر بولا۔

''تم...... جاؤ گی؟ اکیلی......؟''

''تو اور کیا کریں؟ طارق کو ہم ایسی مشکل میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' میں نے اسے گھورا۔

''ظاہر ہے میں طارق کی تلاش میں اکیلا تو تمہیں نہیں جانے دوں گا مگر بانو ہمارے ساتھ ہے۔''
''میں سمجھ رہی ہوں۔'' رومی بولی۔ ''اسی لیے تو میں نے کہا کہ تم ادھر ہی رکو گے اور صرف میں جاؤں گی، لیکن تم نے مجھے بچی کب سے سمجھ لیا؟ نہیں جانتے کہ میں کون ہوں اور میرا پروفیشن کیا ہے جبکہ تم......''
''رہنے دو۔'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ ''اگر خدا نخواستہ تم بھی...... غائب ہوگئیں تو میں کیا کروں گا؟ اس لیے میرا خیال ہے کہ اب ہم دونوں کو ہی اس موجودہ دہری صورتِ حال کا جائزہ لے کر بانو سے متعلق کوئی فیصلہ کرلینا چاہیے۔''
''اسے سردست کسی دارالامان جیسی جگہ پر پہنچادیتے ہیں۔'' رومی نے مشورہ دیا تو میں نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔
''اور تم نے جو اسے اس کے مقتول عاشق کے قاتلوں کی پٹی پڑھائی ہے، اس کا کیا ہوگا؟''
''تم بھی تو اس کے ذریعے اس مہم کو کارآمد بنانا چاہتے تھے۔'' رومی کے اس جوابی حملے پر میں نے کہا۔
''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ بانو اب ہمارے ساتھ ہی ہوگی۔ ہمیں اسے ساتھ ملانے کے لیے سب کچھ بتا دینا ہوگا۔ تاکہ ہمارے معاملے کو بھی مدِنظر رکھ سکے اور ہماری طرف سے کسی پریشانی کا شکار نہ ہو۔''
''پریشانیاں تو خیر اب اس بے چاری کے مقدر میں لکھ دی گئی ہیں۔'' رومی شاید میری بات کا مطلب سمجھے بغیر بولی، یا پھر اسے بانو کے دکھوں کا درد محسوس ہوتا تھا، کیونکہ وہ بھی ایک عورت تھی۔
تھوڑے توقف سے میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''یوں وہ ہماری کچھ مدد کرتے ہوئے اپنے باپ یا اس کے پارٹنر کے خلاف کئی ایسی باتیں بتادے جو ہمارے مشن کے لیے مفید ثابت ہوں۔''
''کیا وہ اپنے باپ کے خلاف ایسا کرسکتی ہے؟''
''ہاں!'' میں نے پورے تیقن سے کہا۔ ''کیونکہ اس کے محبوب کو اس کے باپ نے بڑی سفاکی سے اس کی آنکھوں کے سامنے ہلاک کروایا تھا۔ بعد میں اس کے حواریوں نے اسی کے حکم سے اس بدنصیب فیکے کی لاش کے ٹکڑے کروا کے آوارہ جانوروں کو کھلا دیے تھے۔ وہ اپنے باپ سے سخت نفرت کرتی ہے۔''
''یہ مناسب ہوگا کہ ایک بیٹی کو اس کے باپ کے خلاف قدم اٹھانے پر مجبور کیا جائے؟'' رومی نے میری جانب کچھ شکایتی نگاہوں سے دیکھا۔ اس کے اس خالص ''عورتانہ'' برتاؤ پر میں نے بے تاثر سی مسکراہٹ سے کہا۔
''یہ راموسیٰ را فرعون والی بات ہے، اس کے باپ کے کرتوت ہی سیاہ ہیں تو اس میں بیٹی کیا کرے؟ اسے حق اور سچ، مظلوم اور انصاف کے تقاضوں پر ہی چلنا ہوگا۔ تم عورت ہونا، اسی لیے ایسا کہہ رہی ہو۔''
''مجھے عورت ہونے کا طعنہ مت دو۔'' رومی نے منہ بنایا۔ پھر کچھ غور کرنے والے انداز میں بولی۔ ''ویسے تمہاری بات بھی غلط نہیں ہے۔''
میں مسکرا کر رہ گیا۔
رات آخری پہر میں داخل ہوچکی تھی اور مارے نیند کے ہمارا بھی بُرا حال ہورہا تھا، طارق کا کچھ اتا پتا نہ چل سکا تھا اور نہ ہی میں اور رومی سردست کسی نتیجے پر پہنچ سکے تھے۔ یوں ہم اسی طرح باتیں کرتے کرتے نیند کے بوجھ تلے ادھر ادھر لڑھک کر چارپائی پر ڈھیر ہوگئے۔
سب سے پہلے میری شور پر آنکھ کھلی تھی اور ساتھ ہی مجھے جیسے کوئی جھنجوڑ کر جگا رہا تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھا تو بانو مجھے دونوں ہاتھوں سے ہلا ہلا کر جگانے کی کوشش میں مصروف تھی۔
میں اٹھ بیٹھا۔ رومی بھی شوروشغب پر اٹھ بیٹھی۔ بانو ہراساں سی نظر آرہی تھی۔ میری نظریں دروازے کی جانب اٹھ گئیں۔ پھر میں نے بانو کو چارپائی کے نیچے چھپ جانے کا کہا اور خود اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔
یوں اچانک نیند سے بیداری پر میرا سر چکرانے لگا تھا۔ طبی نقطہ نظر سے اس طرح نیند سے یک دم اٹھ کھڑے ہونا اعصابی نظام کے لیے نہایت خطرناک عمل ہوتا ہے۔ کیونکہ عام لفظوں میں سوئے ہوئے انسان کے حواس بھی خوابیدہ سے رہتے ہیں۔ انسان کے جاگ جانے کے باوجود بھی وہ دیر سے ہی جاگتے ہیں۔ خون کی گردش کی رفتار معمول سے کم ہوتی ہے۔ نسوں اور شریانوں میں بالخصوص دماغ تک خون دیر سے پہنچتا اور اپنے معمول کی گردش میں آتا ہے۔ ایسی صورت میں انسان کی موت بھی واقع ہوجاتی ہے۔ اسی لیے جب بھی نیند سے بیدار ہوا جائے تو ایک دم بستر سے اٹھ کھڑے ہونے کے بجائے تھوڑا بیٹھے رہنا چاہیے، لہٰذا ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میں یہ بات سمجھتا تھا، لیکن یہاں میرے ساتھ معاملہ اور تھا اسی لیے جیسے ہی میں چارپائی سے دروازہ کھولنے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہوا تو مجھے

ایک دم چکرا آ گیا۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالتے ہوئے میں دروازے کے قریب پہنچا اور دروازہ کھول دیا۔

سامنے کھدو باچھیں پھیلائے کھڑا میری طرف گھور رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟ یوں صبح صبح دروازہ اتنی زور سے بجانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تمہیں؟'' میں نے ذرا غصہ سے کہا۔

''صبح......؟'' وہ حیران ہوا۔ ''وقت تو دیکھو صاحب جی! بارہ بج رہے ہیں۔''

مجھے ایک جھٹکا لگا، واقعی ہم ساری رات کے جگے ہوئے بارہ بجے تک سوئے رہے تھے۔

''اچھا...... اچھا ٹھیک ہے، بارہ بج گئے ہیں تو تمہیں کوئی اعتراض ہے؟ بات کیا ہے؟'' میں نے جھلائے ہوئے لہجے میں اس کے آنے کا مقصد پوچھا۔

''نہیں جی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، وہ...... محمود صاحب آپ لوگوں سے بات کرنا چاہتے تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''پہلے وہی آئے تھے، دروازے پر دستک دے کر لوٹ گئے، پھر اب مجھے بھیجا ہے۔''

''کیا بات کرنی ہے ہم سے؟ کرایہ جمع کروانا ہے؟ دے دیں گے۔''

''اچھا آپ تیار ہو کر خود ہی ان سے مل لیں، ویسے کرائے کی تو کوئی بات نہیں ہے، وہ کوئی اور ہی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

میں نے اسے مثبت جواب دے کر ناشتا وغیرہ لانے کا بھی کہہ دیا۔

کھدو چلا گیا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور پلٹا۔ بانو بھی چارپائی سے نکل آئی۔ اس کے لیے واقعی یہ مصیبت ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوتے ہی اس بے چاری کو بار بار چارپائی کے نیچے چھپنا پڑتا تھا۔ جان پر بنی تھی اس لیے اسے بہرحال یہ ''جمناسٹک'' کرنی تھی۔

''کیا کہہ رہا تھا؟'' رومی نے پوچھا۔ میں نے اسے بتا دیا۔

''اس سے جا کر مل لو، لگتا ہے کوئی ایسی بات کرنے والا ہے جس کا تعلق رات والے واقعے سے ہو۔'' اس نے کچھ سوچنے کے سے انداز میں کہا۔

''ہم......'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا اور غسل خانے کی جانب بڑھ گیا۔

جب تک فریش ہو کے آیا۔ کھدو ناشتا رکھ کر جا چکا تھا۔ یہ عام سا بوسیدہ ٹائپ ہوٹل سرائے سہی، مگر یہاں کھانے پینے کا نظام بہتر تھا۔ ناشتے میں ڈبل روٹی، مکھن کی ٹکیا، ابلے ہوئے انڈے اور آملیٹ کے علاوہ پراٹھے بھی تھے۔

ہم نے بانو کو بھی بلا لیا۔ وہ بے چاری پتا نہیں کب سے بھوکی تھی۔ رومی اور میں نے اس کی بھوک محسوس کرتے ہوئے کم ہی کھایا تاکہ وہ اچھی طرح اپنا پیٹ بھر سکے، وہ ایک امیر کبیر باپ کی بیٹی تھی، محبت اسے کس مقام پر لے آئی تھی کہ اس طرح اور ایسے حالات میں یوں اسے پیٹ بھرنا پڑ رہا تھا۔

اس کے بعد میں ہال کمرے سے نکلا اور...... مودے کے پاس جا پہنچا مگر حسب سابق میں نے اسے باہر برآمدے میں کرسی پر بیٹھے کسی ناول یا ڈائجسٹ کے مطالعے کے بجائے پریشان حال سا اپنے تنگ دیواری والے کمرے میں محبوس دیکھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ یوں چونکا جیسے میرا... بڑی بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہا ہو۔

''آیئے ضمیر صاحب! میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ معاف کرنا میں بیٹھنے کا نہیں کہہ سکتا، جگہ ہی اتنی تنگ ہے اور دوسرا یہ کہ......'' اس نے جیسے چھوٹتے ہی کہنا شروع کر دیا جبکہ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے کی زحمت اور کام کی بات پہلے کر لینے پر اکساتے ہوئے کہا۔

''نہیں کوئی بات نہیں، یہ بات تو نظر ہی آ رہی ہے۔ آپ بات کریں، کیا کہنا ہے مجھ سے؟''

وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بولا۔ ''صرف آپ سے نہیں بلکہ آپ کے دونوں ساتھیوں سے مجھے ایک گزارش کرنا تھی، وہ یہ کہ آپ برائے مہربانی جتنی جلدی ہو سکے، یہ ہوٹل سرائے ہی نہیں بلکہ یہ علاقہ بھی چھوڑ دیں تو بہتر ہوگا۔ پیغام کسی اور کا یا میرا نہیں بلکہ خود وڈے چوہدری جبار ماہی کا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے بھویں اچکا کر اسے سوالیہ نظروں سے گھورا۔ وہ جیسے میرا اعتراضانہ انداز صرفِ نظر کرتے ہوئے کچھ یاد کر کے بولا۔

''آپ کا ایک ساتھی اور بھی تو تھا، بوڑھا سا، پتا نہیں کیا نام تھا اس کا......'' وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''طارق......'' میں نے یاد دلایا۔ کیونکہ طارق اور رومی کے اصلی نام ہی دیے گئے تھے اس لیے کہ یہ نام عام

سے تھے۔ میرے نام کی اور بات تھی، اسی طرح شناختی کارڈز وغیرہ بھی انہوں نے ہی دکھائے تھے، جبکہ میں نے کوئی بہانہ بنا دیا تھا۔

''ہاں! وہی...... وہ کل شام سے نظر نہیں آ رہا، آج بھی نہیں دیکھا گیا؟ کہیں چلا تو نہیں گیا وہ......؟''

''شاید وہ چلا گیا ہے۔'' میں نے غیر تاثر لہجے میں کہا۔ ''اس کی میرے ساتھ کسی بات پر ناراضی ہوگئی تھی۔

''اوہ...... خیر، مجھے آپ کے نجی معاملات سے کیا لینا دینا۔'' وہ بولا۔ ''میں بس یہ کہنا چاہتا تھا کہ مجھے خود بھی افسوس ہے کہ مجھے ایسا کہنا پڑ رہا ہے، مگر کیا کریں جی، جاگیردارانہ ماحول ہے یہاں کا...... بلکہ یہ آپ لوگوں کے لیے بھی بہتر ہے۔''

''ہمارے لیے کیا بہتر ہے کیا نہیں...... آپ......'' میں ذرا تلخی سے کہنے لگا تو اچانک میری بات ادھوری رہ گئی۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں محمود صاحب!'' یہ رومی تھی جو اچانک نجانے کس وقت وہاں آن موجود ہوئی تھی اور مجھے اس پر حیرت سے زیادہ غصہ آنے لگا تھا کہ ہال کمرے میں وہ بانو جیسے ایٹم بم کو یوں چھوڑ کر یہاں آگئی تھی۔ ظاہر ہے وہ ہمارے لیے کسی خطرناک بم سے کم تو نہ تھی۔ اس کی یہاں بڑی زبردست ڈھنڈیا پڑی ہوئی تھی۔ اگر وہ یہاں سے برآمد ہو جاتی تو لینے کے دینے پڑ جاتے ہمیں...... جبکہ گزشتہ شب ہمارے کمرے کی تلاشی بھی لی گئی تھی۔ ہمارا منصوبہ بھی ادھورا رہ جاتا۔ خیر، رومی کمرے کو لاک کر کے آئی ہوگی مگر پھر بھی کیا بھروسا کہ کھدو یا کسی اور یہاں کے ملازم کے پاس اس ہال کمرے کی ڈپلی کیٹ چابی موجود ہوتی، یوں اکیلے میں بانو گھبرا کر کوئی ایسی ویسی حرکت بھی کر سکتی تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا ہم چلے جائیں یہاں سے؟ پر جائیں کہاں؟ ابھی تو ہم نے یہاں کی سیر بھی نہیں کی، فیچر لکھنا ہے، تصاویر اُتارنی ہیں۔'' میں نے پلٹ کر رومی کو گھورا، مگر وہ میری بات نظرانداز کرتے ہوئے بدستور مودے سے مخاطب رہی اور مزید بولی۔

''لیکن آپ ایک مہربانی کر دیں کہ ہمیں پھر کوئی دوسری جگہ بتا دیں جہاں ہم رہ سکیں۔''

''اوہ نہیں جی......! آپ سمجھیں نہیں، ماشاءاللہ پڑھے لکھے نظر آتے ہیں آپ لوگ تو۔'' مودا ایک دم پریشانی سے بولا۔ ''وڈے چوہدری صاحب ماہی نے تم لوگوں کی ساری ذمے داری مجھ پر ڈال دی ہے۔ اگر آپ یہاں کہیں بھی وڈے چوہدری جی کو نظر آ گئے تو آپ کی تو بعد میں مگر میری شامت پہلے آ جائے گی، میں آپ کے ہاتھ جوڑتا ہوں جیسا وہ کہہ رہے ہیں ویسا ہی کریں، کیوں میری روزی کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ وہ سرائے ہوٹل پر بلڈوزر چلا دیں گے اور میرے گھر پر بھی۔'' اس نے ہمارے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''اچھی بدمعاشی ہے یہ...... نہ ہمارا ان سے کوئی لینا دینا اور بلاوجہ ہی ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے۔'' میں غصے سے بولا، مگر مودے کے تو جیسے سر سے ہی بات گزر گئی، بولا۔

''یوں بھی یہاں میرے سرائے ہوٹل کے علاوہ دور نزدیک تک کوئی بھی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں آپ رہ سکیں، اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ خوامخواہ ہی اپنے گلے میں یہ مصیبت کا ہار نہ ہی پہنیں۔''

''یہ ہمارا مسئلہ ہے، ٹھیک ہم یہاں سے چلے جاتے ہیں مگر اس علاقے کو نہیں چھوڑیں گے، کسی کے باپ کی جاگیر نہیں ہے یہ......'' مجھے طیش آ گیا۔

حالانکہ یہ میرا مزاج نہیں تھا مگر چونکہ ہمارا منصوبہ داؤ پر لگ رہا تھا، دوسرے یہ کہ طارق بھی نجانے کہاں غائب تھا۔ رومی بھی خاصی پریشان نظر آ رہی تھی۔ تب ہی مودے نے ایک دم بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے جناب! پھر مجھے مجبوراً وڈے چوہدری ماہی صاحب کو آپ لوگوں کی ہٹ دھرمی کے بارے میں بتانا پڑے گا، تاکہ کم از کم میری شامت تو نہ آئے، میں تو انہیں آگاہ کر کے اپنا فرض نبھا لوں۔''

''اپنا فرض...... اونہہ......'' میں نے حقارت سے کہا۔ مودا بھی مخاصمت پر اتر آیا۔ اس نے فوراً آواز دی۔

''اوئے کھدو! ادھر آ......'' کھدو شاید کہیں قریب ہی کھڑا ہماری تلخ کلامی گوش گزار کرنے میں مصروف تھا، فوراً بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوگیا۔

''جی جی......'' کرتا ہوا مودے سے بولا۔

''اوئے جا کر اکمل کو بتا دے کہ یہ لوگ اپنے وڈے چوہدری جی کا حکم نہیں مان رہے ہیں اور خود ہی یہاں آ کر ان کا بندوبست کر ڈالے۔'' مودا یہ کہہ کر غصے سے ہمیں گھورتا فرش پر پاؤں پٹختا ہوا اپنے کھولی نما کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ اکمل شاید جبار ماہی کا کوئی خاص حواری تھا۔

''یہ تم نے کیا کر دیا؟ مودے کو ناراض کر دیا؟ وہ

ہمارے لیے مشکل کھڑی کر سکتا ہے۔'' رومی پریشانی سے بولی۔ مودے کے صیغے پر کھدو اپنا سر کھجانے لگا تھا۔ میں خود غصے سے دانت پیس رہا تھا۔ پھر رومی کھدو سے مخاطب ہو کے بولی۔

''تم جا کر مودے...... میرا مطلب ہے محمود صاحب سے کہہ دو کہ وہ ہمارے لیے کوئی مشکل کھڑی نہ کرے ہم اسی وقت یہ ہوٹل اور علاقہ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔'' پھر وہ میرا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔ ''چلیں کمرے میں......''

ہم کمرے میں آ گئے۔ بانو چارپائی کے نیچے چھپی ہوئی تھی۔ ہمیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر باہر نکل آئی اور پریشانی سے بولی۔

''کیا ہوا؟ خیریت تو ہے نا......؟ پھر تو کوئی یہاں تلاشی لینے کے لیے نہیں آ رہا؟'' اس بے چاری کو اپنی پڑی ہوئی تھی، اسے کیا معلوم تھا کہ اس کی وجہ سے ہم کیسی پریشانی کا شکار ہو رہے تھے۔

میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ نیز رومی نے اس سے یہ بھی کہا کہ ہم یہاں سے کوچ کرنے والے ہیں تو اچانک وہ ڈری سہمی لڑکی ایک دم تن سی گئی۔ اس کے چہرے پر جوش کی سرخی سی ابھر آئی اور وہ اسی لہجے میں بولی۔

''کیا تم لوگ بھی میرے ظالم باپ سے ڈر گئے ہو؟ تم نے تو میرے فیکے کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا مجھ سے عہد کیا تھا؟''

''ہم اس عہد پر قائم ہیں۔'' میں نے کہا۔ ہم بہت دھیمے انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔ ''لیکن کیا کریں، تمہارے باپ نے ہمارے پاؤں کاٹ دیے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہم معذور ہو گئے، کوئی نہ کوئی حل سوچنا پڑے گا۔''

''میرے پاس اس کا حل موجود ہے۔'' وہ بولی۔

''وہ کیا؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ رومی بھی اسے گھورنے لگی۔

''چوہدری جبار ماہی کی حویلی میں ایک روہی (چولستانی) ملازمہ آئی تھی۔ سکھاں نام تھا اس کا، وہ میری رازداں سہیلی بن گئی تھی۔ وہ چولستان کی بنجارن ہے۔ ہم اس کے ہاں چھپ سکتے ہیں۔''

''کیا؟ تمہاری ملازمہ کے ہاں؟ ہرگز نہیں، وہ مخبری کر سکتی ہے۔'' رومی نے صاف انکار میں سر ہلاتے ہوئے اختلاف کیا۔

''ٹھہرو، مجھے بات کرنے دو۔'' میں نے رومی کو ٹوک دیا۔ پھر بانو سے مخاطب ہو کر مستفسر ہوا۔

''کیا تمہیں اس پر پورا اعتماد ہے؟''

''بالکل جی، سو فیصد...... وہی تو فیکے اور میرے درمیان پیغام رسانی کرتی تھی۔'' وہ تیقن سے بولی۔ ''مجھے اس پر پورا بھروسا ہے، وہ اب بھی میری وجہ سے اُداس اور پریشان ہو رہی ہوگی۔''

''لیکن تمہاری اس سے اس قدر گہری دوستی کیسے ہو گئی؟ وہ تمہاری تو ملازمہ نہیں تھی؟'' رومی نے اچانک درمیان میں سوال اُٹھا دیا۔

''میں نے بتایا نا ابھی کہ چوہدری جبار اور میرے باپ گہرے دوست ہیں، دونوں خاندانوں کے گھر آنا جانا ایسا ہی ہے جیسے پکی رشتے داری ہو، ہم بھی اکثر یہاں آتے تو کئی کئی روز چوہدری جبار کی حویلی میں رہا کرتے تھے، بس، وہیں سے ہی میری اور سکھاں کی دوستی ہو گئی تھی، فیکا بھی یہاں اپنے کسی ماموں کے ہاں آتا رہتا تھا، ہم چھپ کے یہاں بھی ملتے تھے۔ سکھاں بھی میری ہی عمر کی ہے۔''

میں اس کی بات سن کر سوچتا بن گیا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا کہ گوہر شاہ کی آبائی حویلی بھی اسی علاقے کے دور دراز مقام پر واقع تھی، لہٰذا بانو کو ابھی یہ نہیں معلوم تھا کہ ہم دراصل یہاں اس کے باپ ہی کی کھٹیا کھڑی کرنے کے لیے آئے تھے۔

یہ تو اس کا معاملہ بیچ میں آن پڑا، اگرچہ یہ بھی ہمارے منصوبے کا ایک جزو بن سکتی تھی مگر اسے کس طرح استعمال کرنا تھا، اس کے لیے میں نے ایک وقت متعین کر رکھا تھا، جو ابھی نہیں آیا تھا۔ کیونکہ سب سے پہلے بانو کو اعتماد میں لینا تھا، دیکھنا یہ تھا کہ وہ اپنے باپ سے متعلق ہمارے ساتھ کیا سلوک روا رکھتی ہے، اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اس کے اندر کی غیرت جاگی ہوئی تھی۔

یہ بات ہی ایسی تھی کہ اس کا محبوب اس کی آنکھوں کے سامنے بڑی بیدردی کے ساتھ مار دیا گیا تھا۔ محبوب بھی ایسا کہ جس نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھی ایک ہی نام لیا تھا اور وہ تھا ''بانو''...... اب بانو کے دل و دماغ میں یہ بات ایسی گھر کر گئی تھی کہ وہ اپنے باپ کی بھی جانی دشمن بن چکی تھی۔

''دیکھو بانو!'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''چلو ہم تمہاری سہیلی یا ملازمہ سکھاں پر بھروسا کر لیتے ہیں لیکن وہ ظاہر ہے اکیلی تو اپنے گھر میں نہیں رہتی ہوگی، اس کے گھر والے بھی تو ہوں گے، وہ چوہدری جبار کو ہماری مخبری کر سکتے

ہیں۔“

”میں نے بتایا نا کہ سکھاں میری ہی عمر کی لڑکی ہے۔“ بانو جواب میں بولی۔ ”لیکن بہت ہوشیار اور دردمند لڑکی ہے۔ بے شک وہ اپنے قبیلے والوں کے ساتھ رہتی ہے، مگر جہاں ان روہی بنجاروں کی وستی (بستی) ہے، وہاں ان کے گنتی کے چند ہی خاندان آباد ہیں۔ مزید تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی، لیکن اتنا مجھے یقین ہے کہ اگر ہم اس کے پاس پہنچ جائیں تو وہ ہمارا یہ مسئلہ حل کرسکتی ہے۔“

”میں یہ رسک لینے کو تیار نہیں ہوں۔“ مجھے غور کرنے والے انداز میں بانو کی طرف تکتے ہوئے رومی نے فوراً اپنا فیصلہ سنا دیا۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو رومی! حالات اچانک ہی اس قدر غیر یقینی ہو گئے ہیں کہ ہمیں کوئی نہ کوئی رسک تو لینا ہی پڑے گا اور یہ بھی مت بھولو کہ ہم اس وقت بھی خطرناک اور رسکی حالات سے دوچار ہیں۔ یہ پتا ہمیں کھیلنا چاہیے، ہمیں اس وقت یہاں ٹھکانے کی سخت ضرورت ہے، یہاں سے باہر بھی اگر ہم اپنا کوئی خفیہ ٹھکانا بناتے ہیں تو اس میں کئی سقم ہوں گے، طارق کی پُراسرار گمشدگی بھی ایک معما بنی ہوئی ہے۔ دشمن کی بغل میں رہیں تو وہ ہمیں اتنی جلدی نہیں تلاش سکتا، دور ہوں گے تو اس کی نظروں میں آسکتے ہیں۔“

میں نے اسے نفسیاتی رو سے سمجھانے کی کوشش چاہی تو وہ بھی کچھ سوچنے پر مجبور ہوگئی۔

یہ بات تو میں نے رومی سے کہی تھی مگر بانو نے الجھی ہوئی نگاہوں سے ہم دونوں ہی کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے سوال کر ڈالا۔ ”تم لوگ یہاں کس مقصد کے لیے ٹھہرے ہوئے تھے؟ اور یہ طارق کون ہے اور وہ کہاں غائب ہوگیا ہے؟ تم دونوں کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ تم کسی خاص مقصد کے لیے یہاں آئے ہو اور اس کا تعلق بھی میرے باپ سے ہی بنتا ہے۔“

میں نے اس کی بات سن کر ایک گہری ہمکاری بھری۔ رومی نے مجھے ابھی اسے اصل حقیقت بتانے سے منع کر رکھا تھا اسی لیے میں نے پہلے کی طرح بات بناتے ہوئے اس سے کہہ دیا کہ ہم یہاں کچھ مقامات کی تصویریں کھینچنے آئے تھے اور جس پر ہم فیچر وغیرہ لکھتے ہیں، طارق بھی اسی مقصد کے لیے کہیں گیا ہوا تھا مگر اب تک لوٹا نہیں، وغیرہ۔ وہ کچھ مطمئن ہوئی، کچھ نہیں، سرِدست اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

میں جان سکتا تھا کہ رومی نے بانو کو اصل حقیقت بتانے سے مجھے کیوں روک رکھا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ اس اہم مشن خفیہ کو کسی پر ظاہر کر کے اسے متاثر ہونے نہیں دینا چاہتی تھی، دوسرے اسے یہ ڈر بھی تھا کہ اگر ہم بانو کو یہ بتادیتے تو لامحالہ اس کے دل دماغ میں یہ خیال آسکتا تھا کہ ہم اپنے ذاتی مقصد کے لیے اسے اس کے باپ کے خلاف استعمال تو نہیں کر رہے، اگرچہ کسی حد تک یہ بات غلط بھی نہ تھی، مگر ہم چاہتے تھے کہ پہلے اس کا اصل اور گھناؤنا چہرہ اس کی بیٹی کے سامنے آجاتا تو تب ہی وہ سمجھ سکتی تھی کہ یہ سب ہم انسانیت کی بھلائی کی خاطر کر رہے تھے کہ اس کا باپ درحقیقت خونی سوداگروں کے ایک ایسے گروہ کا اہم اور فعال رکن تھا جو زندہ انسانوں کو ہلاک کر کے غیر قانونی طور پر ان کے اعضا نکال کر فروخت کرتا تھا نیز اسی نوعیت کے اور بھی کالے دھندوں میں ملوث تھا۔ یوں رومی کی بات درست بھی تھی اسی لیے میں نے بھی اس پر صاد کر رکھا تھا۔

ہم نے کوچ کرنے کی تیاری کرلی۔ مودا ہمیں دھمکی دے چکا تھا۔ میں نے اس کا حساب کتاب چکتا کیا اس کے بعد بانو کو تو نہایت احتیاط اور رازداری سے کھڑکی کے ہی راستے باہر نکالا اور خود اپنا سامان سمیٹ کر سرائے ہوٹل سے نکل آئے۔ باہر آتے پر پتا چلا کہ ہماری گاڑی غائب ہوچکی ہے۔

ایک مقررہ مقام پر بانو بھی ہم سے آن ملی، اس نے اپنے گرد اچھی طرح چادر اوڑھ لی تھی اور چہرہ بھی اس کا نقاب سا بنا کر چھپا لیا تھا، تاہم یہ خطرہ موجود تھا کہ اگر جبار کا کوئی گماشتہ یا جاسوس مل جاتا تو مشکل پڑ سکتی تھی۔

ساتھ ہی رومی کے مشورے پر اس بات کا بھی خیال رکھا گیا تھا کہ کہیں سرائے ہوٹل سے مودے کا کوئی آدمی یا ملازم ہمارے تعاقب میں تو نہیں آرہا تھا، اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد ہی، ہم بانو سے ملے اور اس کے ساتھ ہولیے۔

دوپہر ہو چلی تھی اور گرمی اور دھوپ کی شدت میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ ہمارے اردگرد اونچے نیچے ٹیلے ٹبے بکھرے ہوئے تھے اور کہیں کہیں خودرو جھاڑیاں اور درخت نظر آرہے تھے، ایک جانب کیکر کا جنگل سا نظر آرہا تھا۔

بہ قول بانو کے ان کے پار جنگلی جھاڑیوں سے اٹا پڑا ایک پیالہ نما میدان سا تھا جہاں روہیوں (چولستانیوں) کے چند خاندان آباد تھے۔

ہم جب وہاں پہنچے تو ہمارا دم خاصا پھول چکا تھا۔ پیاس کی شدت سے حلق میں جیسے تھور اُگ آئے تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہمیں کہیں ٹھکانا نصیب ہوجاتا تو طارق کی تلاش میں کچھ کیا جاتا۔

وہاں پہنچے تو ہمیں دور ہی سے ایک وسیع میدان میں

چند سرکنڈوں کے بنے ہوئے جھونپڑے دکھائی دے گئے۔

"تم دونوں یہاں رکو، پہلے میں جا کر سکھاں سے ملتی ہوں۔" قریب پہنچنے سے پہلے ہی بانو نے ایک جگہ رک کر ہم سے کہا۔

میں نے ہانپتی ہوئی ہمکاری بھر کے اپنے گرد و پیش میں نظر دوڑائی۔ ہر سو ویرانی کا راج تھا۔ یہ مقام ایک ٹیلے کے قریب تھا جہاں ایک درخت کے نیچے ہم کھڑے تھے۔

اس کی بات پر رومی اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا، رومی شاید اس سے مطمئن نظر نہیں آتی تھی، اس نے سوال کیا۔

"اگر تمہیں وہاں کسی نے پہچان لیا تو......؟"

"آپ فکر نہ کریں باجی جی!" بانو بولی۔ "میں سیدھی سکھاں کے پاس ہی جاؤں گی، مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت مجھے اپنے گھر میں ہی ملے گی، میں نے چہرہ چھپا رکھا ہے اور وہ اگر نہ بھی ملی تو میں ادھر ہی دوبارہ لوٹ آؤں گی، میں بھلا اب تم لوگوں کے سوا اور کہاں جا سکتی ہوں۔"

وہ اتنا کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ تھکن کے سبب ہم درخت تلے بیٹھ گئے، بھربھری مٹی والی زمین قدرے گرم ہو رہی تھی، درخت بھی کچھ اتنا زیادہ سایہ دار نہ تھا، گزارا کر رہے تھے۔ وقت ہی ایسا تھا۔

بانو کو گئے خاصی دیر ہوگئی تو رومی بولی۔ "میرا خیال ہے، وہ کہیں پھنس گئی ہے۔ ہمیں اب اپنے برتے پر ہی کچھ کرنا ہوگا۔"

"ضروری نہیں۔" میں نے کہا۔ پھر اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ "اسے گئے ہوئے لگ بھگ نصف گھنٹا ہی ہوا ہے۔"

"تو کیا تم مزید آدھا گھنٹا اور اس کا انتظار کرنے کے موڈ میں ہو؟" وہ بولی۔

"تھوڑی دیر اور دیکھ لیتے ہیں، اس کے بعد ہم خود وہاں جا کر اس کا پتا چلانے کی کوشش کریں گے......"

"وہ آرہی ہے۔" اچانک رومی بولی۔ میں نے اس طرف دیکھا، وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ہمراہ کوئی اور بھی تھا، اپنی وضع قطع سے وہ بھی کوئی عورت ہی معلوم ہوتی تھی۔

ہم دھڑکتے دل سے انہیں دیکھتے اور ان کے قریب آنے کا انتظار کرتے رہے۔ دونوں ہانپ رہی تھیں۔

"یہ سکھاں ہے۔" بانو نے قریب آتے ہی اس لڑکی کے بارے میں بتایا۔ میں اور رومی غور سے اس کا جائزہ لینے لگے، وہ بھی حیران سی ہماری طرف تکے جا رہی تھی۔ وہ چولستان

کے روایتی لباس یعنی عنابی رنگ کے گھاگرے اور پیلی سی چولی میں ملبوس تھی۔ رنگت سانولی تھی۔ چہرے کے نقوش تیکھے تھے۔ صحت مند تھی۔ بالوں کی چوٹی بنا رکھی تھی، ہاتھی دانت کے چند روایتی سے زیور ہاتھوں اور گلے میں نظر آرہے تھے۔

اس کے چہرے سے بیک وقت حیرانی، پریشانی سمیت اُداسی اور دکھ کے تاثرات ہویدا ہو رہے تھے۔

''میڈے نال ٹری آؤ......'' (میرے ساتھ آجاؤ) سکھاں نے ہم سے کہا۔ اس کا لہجہ سرائیکی تھا۔ اس کے بعد میں اور رومی ایک دوسرے کی طرف تکتے ہوئے اپنا مختصر سا سامان اٹھائے اس کے ساتھ ہو لیے۔

وہ ہمیں میدان کے شمالی سمت کی جانب لے گئی، جہاں ایک جھکے جھکے ٹبے کے پاس ہی کٹیا سی بنی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے پھوس کا سائبان تھا اور ایک بدنما سے ایستادہ لکڑے سے پرانی لالٹین جھول رہی تھی۔ ہم اندر آگئے۔

کٹیا خالی تھی۔ اندر زمین پر میلی سی رلی بچھی ہوئی تھی، دو دستی پنکھے پھوس کی دیوار میں اٹکے ہوئے تھے، وہ اس نے اتار کر ہمیں تھما دیے، ایک گھڑا پڑا ہوا تھا جس پر جست کا ایک ٹیڑھا میڑھا گلاس رکھا تھا۔ پتا نہیں اندر پانی تھا بھی نہیں۔

''تُساں ہتھے ٹکو، پر جیادہ دیر ہتھے نہیں رک سکتے، آگے تساڈی مرضی، باقی مانی ٹکر کی کُرتی مت کرنا اوہ مے آپے ہی گھن لاساں۔ (آپ لوگ ادھر ہی رہو، پر زیادہ دیر تم لوگوں کا یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہوگا، آگے تمہاری مرضی۔ باقی روٹی پانی کی فکر نہ کرو وہ میں لاتی رہوں گی)

ہمیں تو اس جگہ سے ہی ہول اٹھ رہا تھا، مگر مجبوری کا نام شکر یہ کے مصداق رومی اور میں نے فقط اپنے سروں کو اثباتی جنبش دے کر رضامندی دکھا دی۔

پھر اس نے بانو سے کچھ سرگوشی میں کہا تو وہ ہم سے بولی۔ ''یہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہے اور اگر مہمان کے طور پر تمہاری ساتھی بھی آنا چاہے تو اسے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔''

''لیکن وہاں پہچان لیے جانے کا خطرہ نہ ہوگا؟'' میں نے کہا۔

''نہیں، یہ ہمیں مہمان کے طور پر چھپائے رکھے گی۔'' بانو بولی۔

''یہ کیا بات ہوئی بھلا؟'' رومی بولی۔ ''وہ تو ہم یہاں بھی چھپے ہوئے ہیں۔ ہم یہیں ٹھیک ہیں بلکہ تم بھی ادھر ہی ہمارے ساتھ رہو۔ ہم تمہاری وجہ سے تو یہاں رکے ہیں۔''

بانو نے سکھاں کے سامنے یہی بات اس کے لب و لہجے میں دہرادی۔ سکھاں ذرا دیر سوچتی رہی پھر چلی گئی۔

''یہ قابلِ اعتبار تو ہے نا......؟'' اس کے جاتے ہی رومی نے بانو سے کہا۔

''آپ اس کی طرف سے بالکل بےفکر ہو جائیں باجی جی۔'' بانو خفیف سی مسکراہٹ سے بولی۔

''یہ قابلِ اعتبار ہو نہ ہو، مگر موجودہ حالات غیر یقینی ضرور ہیں۔'' میں نے لقمہ دیا۔ ''تم نے.... سکھاں کی زبانی سنا تھا کہ وہ خود بھی اس صورتِ حالات سے مطمئن نہیں ہے اور ہمیں کہہ گئی ہے کہ ہمارا زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہ ہوگا۔''

''یہ بات تو ہے۔'' رومی بولی۔

''لیکن بات اصل یہی ہے کہ ہمیں آج رات اپنی مہم کا آغاز کر دینا چاہیے اور بانو سے یہ سب گوشِ گزار بھی کرنا ہو گا۔'' میں نے رومی کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔ وہ گومگو کی کیفیت میں تھی۔

''بات کیا ہے؟ آپ لوگ کچھ چھپا رہے رہو؟'' بانو نے پوچھا۔ اس نے باری باری ہمارے چہروں کی طرف دیکھا تھا۔

اس کے بعد میں دھیرے دھیرے بانو کو وہ سب بتانے لگا، جو ہمارے منصوبے کا اہم حصہ تھا۔

وہ ایک ٹک خاموشی کے ساتھ سب سنتی رہی۔ اس کے خوب صورت چہرے کا رنگ بدلتا رہا، کبھی اس کی کشادہ آنکھوں سے غیر یقینی کے آثار جھلکنے لگتے تو کبھی اس کا چہرہ خوف اور تفکیر کے مارے ستنے لگتا، بعض دفعہ تو اس کی سانسیں بھی چڑھنے لگتیں، ایک بار تو وہ جیسے رو دینے کے قریب ہو گئی۔

وہ شاید یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھی کہ اس کا باپ ایک ایسے خونی سوداگروں کے گروہ کا ساتھی ہے، یا پھر مقامی سرغنہ ہے، جو معصوم اور بے گناہ انسانوں کے ساتھ اس قدر بربریت انگیز سلوک روا رکھے ہوئے ہے، اگرچہ اس کی ایک جھلک وہ اپنے محبوب فیکے کے سلسلے میں اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ ہی چکی تھی مگر اعضا فروشی کے دھندے میں ملوث ہونے کا یقین کرنے میں اسے تامل ہو رہا تھا۔ میں نے اسے یہ بھی بتانا ضروری سمجھا تھا کہ اس کے باپ کا ساجھے دار چوہدری جبار بھی یہی کچھ کرتا ہے اور یہی اصل میں ان کی آپس کی ساجھے داری کی بنیاد بھی ہے، وغیرہ۔

جب میں نے اس کے باپ کے کالے کرتوتوں کے بارے میں بتانا ختم کیا تو...... جو آخری تاثرات اس کے چہرے پر ثبت ہو چکے تھے وہ شرمندگی اور ندامت کے ہی

محسوس ہوئے تھے مجھے۔ شاید اب اسے گوہر شاہ کی بیٹی ہونا ایک گندی اور غلیظ ترین گالی ہی محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ اپنے گھٹے گھٹے جذبات پر قابو نہ پاسکی اور بے اختیار اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھے رو پڑی۔

رومی اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہم نے اسے خوب رونے اور سسکنے دیا۔

ذرا دیر بعد اس نے خود ہی رونا دھونا موقوف کیا اور بولی۔ ''میرے باپ کے بارے میں جو کچھ تم لوگوں نے بتایا وہ اس قدر گھناؤنا اور سفاک ہے کہ مجھے اپنے آپ سے بھی ندامت اور نفرت محسوس ہونے لگی ہے۔ خود کو گوہر شاہ کی بیٹی کہنا بھی مجھے گالی لگنے لگا ہے، اگر میں ان کی سفاکی کی ایک جھلک اپنے فیکے کے ساتھ ہوتے نہ دیکھ لیتی تو مجھے اس کہانی پر بالکل یقین نہ آتا۔'' وہ سانس لینے رکی پھر ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا یہ سب واقعی سچ ہے؟ کیا میرا باپ ایسے خونی سوداگروں کا ساتھی یا سرغنہ ہے جو اس قدر انسانیت سوز اور گھناؤنا ہے کہ ایک عام انسان کی روح تک کانپ اٹھتی ہے۔''

''یہ سب بالکل سچ ہے بانو!'' اس بار رومی نے اس سے کہا۔ ''لیکن اس سلسلے میں، ہم مزید کھوج لگانے آئے ہیں، تاکہ عینی شواہد کے ساتھ ٹھوس ثبوت ہمارے ہاتھ لگ سکیں، لیکن بانو اس سے پہلے میں تم سے ایک ضروری اور اہم بات کہنا چاہوں گی۔'' اتنا کہہ کر رومی تھمی، بانو کا اشکبار سا چہرہ جھکا ہوا تھا۔

میری پُرغور نظریں اس کے سُتے ہوئے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ رومی کی آخری بات پر اس نے اپنا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ رومی بولی۔ ''دیکھو بانو! تمہیں اب تک اس مشن کے بارے میں آگاہ نہ کرنے کی یہی وجہ تھی کہ کہیں تم کسی جذباتی کمزوری کا شکار ہو کے اپنے باپ کے گھناؤنے جرائم پر پردہ ڈالنے کی نہ کوشش کرو یا ہم سے منحرف ہو جاؤ، مگر اب چونکہ تمہارا معاملہ بھی درمیان میں آن کھڑا ہوا تھا اسی لیے ہمیں مجبوراً ہی سہی تمہیں یہ سب بتانا پڑا۔''

''میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں باجی جی!'' بانو نے ہولے سے کہا۔ ''مجھے تو اب تک صرف فیکے کا دکھ تھا، جس طرح فیکے کو بے رحمی سے ہلاک کیا گیا، اپنے باپ اور اس کے خونی حواریوں کی اسی سفاکیت نے مجھے اس سے نفرت پر مجبور کر دیا تھا، مگر اب پتا چلا کہ یہ تو اس کی ایک معمولی سی جھلک تھی، اصل میں میرا باپ تو اس سے بھی زیادہ گھناؤنے کردار کا مالک ہے۔ کاش! یہ غلط ہو مگر ظاہر ہے آپ لوگوں کا دعویٰ غلط تو نہیں ہوسکتا مگر پھر بھی میں کم از کم فیکے کے معاملے میں اپنے باپ اور جبار کو ساری زندگی نہیں معاف کرسکتی۔ آپ میری طرف سے کسی بے چینی کا شکار نہ ہوں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

بانو کے زبانی اقرار پر نہ صرف میں نے بلکہ رومی نے پہلی دفعہ اطمینان کی سانس لی تھی مگر رومی کی سوئی ایک بار پھر تشکیک کے سائے تلے آن اٹکی تھی اور وہ تھی سکھاں...... وہ بانو سے بولی۔

''لیکن بانو، سکھاں کو تم ہم سے زیادہ جانتی ہو، جبکہ مجھے اب بھی ڈر لاحق ہے، کہیں وہ ہمارا یہ سارا کھیل نہ بگاڑ دے۔''

''اس کی میں خود ضمانت دیتی ہوں، وہ ایسا نہیں کرے گی جس سے ہمیں نقصان پہنچے۔'' بانو نے اس کے بارے میں ایک بار پھر پورے یقین سے کہا تو میں نے مداخلت کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''یہ ٹھیک ہے، مگر پھر بھی سکھاں سے نادانستگی میں کوئی غلطی ہوسکتی ہے، جس کا ادراک اسے بھی تھا اسی لیے اس نے ہمیں زیادہ دیر یہاں ٹھہرنے سے خطرے کا اظہار بھی کیا ہے۔ اسی لیے ہم آج رات کو اپنے مشن کا آغاز کرنے والے ہیں، کیا تم ہمیں کراکوٹ کے اندرونی و بیرونی محلِ وقوع کے بارے میں آگاہی دے سکتی ہو؟''

بات مقصد کی طرف آچکی تھی، بانو ذرا دیر کی پُرسوچ خاموشی کے بعد ہمیں بتانے لگی۔

''کراکوٹ بیک وقت فارم ہاؤس اور زرعی گوداموں جیسی ہی عمارت ہے۔ اس میں رہائش کا بھی پورا بندوبست ہوتا ہے، خاص دوست اور مہمان وغیرہ کی رہائش کا بندوبست اسی عمارت میں ہی کیا جاتا تھا، ہم بھی جب کبھی یہاں آتے تو اسی عمارت کے ایک کشادہ پورشن میں رہا کرتے تھے۔''

''تمہاری اپنی حویلی کہاں واقع ہے؟'' رومی اور میں نے اس سے چند اور متعلقہ سوالات پوچھے پھر اس سے آخر میں یہ دریافت کرتے ہوئے میں بانو کے چہرے پر اپنی سوالیہ نظریں جمائے رہا۔

''یہاں نہر والی پُلیا پار تقریباً پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر نظر پور میں واقع ہے۔ یہ حاصل پور کا وسطی علاقہ بھی کہلاتا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''ہمم......'' میرے منہ سے ہمکاری خارج ہوئی۔

تھوڑی دیر بعد رومی اور میں کراکوٹ کی طرف ''گوریلا'' روانگی کا منصوبہ بندی کرنے لگے۔

میرا خیال تھا کہ رومی کو یہاں بانو کے پاس رُکنا چاہیے

تھا مگر وہ اس پر بالکل تیار نہ تھی کہ میں طارق کی کھوجنا اور کراکوٹ کی اصلیت جاننے کے لیے اکیلا اس مہم پر روانہ ہو جاؤں، اگر رومی میرے ساتھ چلتی تو بانو کو یہاں تنہا چھوڑ کر جانا میں نہیں چاہتا تھا۔

بہرکیف۔ جب بانو کو ہماری بحث وتمحیص کا پتا چلا تو اس نے خود ہی اس کا حل بتاتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں کا ساتھ جانا ہی بہتر ہوگا۔ رہی میری بات تو اس کی فکر نہ کریں آپ لوگ۔ میں سکھاں کے ساتھ اس کے ہاں چلی جاتی ہوں یا اسے ادھر بُلا لیتی ہوں۔''

میں نے اس کی بات پر غور کرنے والے انداز میں اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''میرا خیال ہے تم سکھاں کو یہاں بلانے کے بجائے اس کے ساتھ ہی چلی جاؤ اس کے گھر......بس، ذرا تم دونوں کو یہ احتیاط کرنا ہوگی کہ تمہارے بارے میں کوئی جان نہ سکے۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔'' بانو مستحکم لہجے میں بولی۔ ''سکھاں کو حالات کا اندازہ ہو چکا ہے اچھی طرح سے۔ جیسا کہ اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے وہاں اپنی کسی سہیلی یا مہمان کہہ کر اپنے گھر میں ہی رکھ سکتی ہے، اس کے جھونپڑے سے گھر میں اس کی بوڑھی ماں کے سوا اور کوئی نہیں رہتا۔''

''ٹھیک ہے، یہ ہمیں منظور ہے۔'' میں نے کہا اور رومی کی طرف سوالیہ نظروں سے تکتے ہوئے اس کی راہ لینی چاہی تو وہ بولی۔

''اب کچھ نہ کچھ تو رسک لینا ہی پڑے گا۔ میں اس سے متفق ہوں۔''

رومی کی تسلی کے بعد میں بھی مطمئن ہو چلا۔

☆☆☆

قبل از شب... ہی سکھاں ہمارے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان لے آئی تھی جسے ہم نے جیسے تیسے زہر مار کیا، اس کے بعد سکھاں کو بھی اپنی طرف سے کچھ ضروری ہدایات دے کر بانو کو اس کے ساتھ روانہ کر دیا۔

رات کی تاریکی چہار اطراف پھیلتے ہی میں اور رومی کٹیا سے نکلے اور اونچے نیچے ٹیلے ٹبوں اور خودرو جھاڑیوں والے جنگل کی طرف چل دیے۔

ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ آسمان پر تاروں کی روشنی بکھری ہوئی تھی اور چاند جیسے دور کہیں آسمان کے کناروں پر محوِ سفر تھا۔ ہم ٹیلوں اور قدِ آدم جھاڑیوں کے اس مختصر میدان کو پار کر کے ہی کراکوٹ کے نسبتاً محفوظ راستے کا انتخاب کر سکتے تھے۔

ہم ابھی جھاڑیوں اور ٹیلوں سے اٹے پڑے میدان کے وسط میں ہی تھے کہ اچانک فائرنگ کی آواز ہماری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں سے ٹکرائی اور ہم دونوں بُری طرح چونک کر وہیں رک گئے۔

''یہ...... فائرنگ کیسی ہے؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''کہیں کوئی شکار وغیرہ کا معاملہ تو نہیں؟'' رومی نے خیال ظاہر کیا۔ میں فضا پر غور کرنے لگا، اچانک دوبارہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری، ہم دبک کر ایک ٹیلے کی ڈھلوانی آڑ کی طرف کھسک گئے۔

''یہ دو طرفہ فائرنگ ہے۔ کچھ اور ہی معاملہ لگتا ہے۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''معاملہ وہی بانو والا ہی لگتا ہے۔'' رومی نیچی آواز میں جیسے خود کلامیہ بڑبڑائی۔ ''شاید بانو کے مقتول عاشق فیکے کے وارث ہوں مقابلے میں......''

دفعتاً دو فائر تلے اوپر اور اس قدر ہمارے قریب سے ہوئے کہ ایک لحہ کو ہمیں دھڑکا لگا کہیں ہم پر گولیاں نہ داغی گئی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی انسانی چیخ کی آواز بلند ہوئی۔

یہی وہ وقت تھا جب ہم نے مدھم مدھم روشنی میں کسی کو ٹیلے کے اوپر سے نیچے لڑھکتے دیکھا، میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ ہمارے سروں پر موت بکھری ہوئی تھی۔ وہ بدنصیب گولی کھا کر نیچے لڑھکتا ہوا سیدھا ہمارے قریب آن گرا۔ میں اور رومی ہک دک سے رہ گئے۔

میں غیر ارادی طور پر گولی کھا کر گرنے والے کی جانب لپکا اور...... اس کا چہرہ پہچانتے ہی بُری طرح چونک گیا، اس قدر کہ بے اختیار میرے منہ سے مارے حیرت کے ''ارے......'' نکل گیا۔

ٹھیک اسی وقت مجھے ٹیلے کی بلندی پر چند مسلح افراد کے ہیولے متحرک دکھائی دیے۔ میں واپس رومی کی جانب ڈھلوانی آڑ میں کھسک آیا اور اسی وقت اوپر سے ایک شناسا آواز سنائی دی۔

''اسے گولی لگ گئی اور وہ نیچے لڑھک گیا ہے، جلدی نیچے آؤ میرے ساتھ......''

اس منحوس آواز کو میں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا جو تاج کی تھی۔

ہم عجیب حالات میں بڑے بُرے پھنسے تھے۔

ان دیکھے دشمنی کے جال میں جکڑے نوجوان کی مزید مشکلات آئندہ ماہ پڑھیں

راستہ

صبا مغل

مجرم اپنے جرم کو چھپانے کے لیے ہزار راستے ڈھونڈ لیتا ہے... مگر جرم کو عیاں کرنے کے لیے ایک ہی غلطی کافی ہوتی ہے... ایک ایسے ہی پوشیدہ جرم کی روداد... جسے نمودار ہونے کے لیے قدرت نے اسے ایک راستہ دکھادیا تھا...

الف ... نفرت اور اکتاہٹ سے جڑی شگون کے مختلف زاویے

رات کے قریباً دس بج چکے تھے۔ میاں بیوی بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ شہلا نے آج شوخ لباس پہنا ہوا تھا۔ کلائیوں میں ست رنگی چوڑیاں تھیں۔ آصف بھی ہولے ہولے گنگنا رہا تھا۔ وہ دونوں جانتے نہیں تھے کہ کچھ ہی دیر بعد کتنا بڑا ''حادثہ'' رونما ہونے والا ہے۔

آصف کپڑے بدلنے کے لیے واش روم چلا گیا۔ شہلا نے بستر سے شکنیں درست کیں۔ دونوں تکیے اچھی طرح جمائے۔ اچانک شہلا کی نگاہ آصف کے موبائل فون

پر پڑی۔ وہ موبائل فون کی طرف سے غفلت نہیں برتتا تھا لیکن یہ شاید تھوڑی دیر پہلے اس کی پینٹ کی جیب سے پھسل کر تکیے کے پاس گر گیا تھا۔ شہلا نے یونہی اسکرین کی طرف دیکھا۔ وہاں ابھی ابھی ٹیکسٹ میسیج کی نوٹیفکیشن آئی تھی۔ فون نمبر پڑھ کر شہلا کا دماغ جیسے ابل کر رہ گیا۔ پورے بدن میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ یہ اسی حرافہ قندیل کا نمبر تھا جو پچھلے کئی ماہ سے آصف کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ بے شرم شادی شدہ تھی پھر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتی تھی۔ چار پانچ ماہ پہلے اسی سلسلے میں آصف اور شہلا کے درمیان زوردار جھگڑا بھی ہوا تھا جس کے بعد کافی عرصہ سکون سے گزر گیا تھا مگر آج پھر شہلا کو اس کا میسیج اسکرین پر نظر آ گیا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے میسیج کھولا۔ لکھا ہوا تھا۔ ''کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ شکر ہے تم نے یاد تو کیا جانِ من۔'' شہلا کا سارا خون جیسے دماغ کو چڑھ گیا۔ آصف گنگناتا ہوا شلوار قمیص پہن کر باہر نکلا تو شہلا کے موڈ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ''کیا ہوا بھئی۔'' اس نے پوچھا۔ وہ کسی بھوکی بلی کی طرح اس پر جا پڑی۔ تین مرلے کے اس چھوٹے سے گھر کے درمیانے سائز کے کمرے میں کہرام سا مچ گیا۔ وہ اسے گریبان سے پکڑ کے جھنجوڑتے ہوئے چلائی۔

''کیوں کر رہے ہو، میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو؟ ایک سال میں ہی اگر دل بھر گیا ہے مجھ سے..... تو دفع کر دو مجھے..... طلاق دے دو..... اور اس کمینی کے سارے ارمان پورے کر دو۔''

اس نے آصف کا منہ نوچنا چاہا تو اس نے اس کی کلائیاں تھام لیں اور گھما کر دیوار سے دے مارا۔

''تمہارے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں جو منہ میں آ رہا ہے بک رہی ہو۔''

شہلا نے موبائل فون کھینچ کر اس کے سینے پر دے مارا۔ ''دیکھو اس میں اپنے کرتوت۔'' وہ گرجی۔

آصف خجالت سے سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

''پہلے تو میں نے سب کچھ خاموشی سے سہہ لیا تھا۔ پر اب دیکھنا میں کیا کرتی ہوں۔ تمہارے ماں باپ کے گھر جا کر انہیں سب کچھ بتاؤں گی جن کی زبانیں تمہاری تعریفیں کرتے نہیں تھکتیں۔''

''ٹانگیں توڑ دوں گا تمہاری۔'' آصف بھی غیظ و غضب میں آ گیا اور طیش کے عالم میں اس کی طرف لپکا۔ شہلا فوراً بیڈ کے اوپر چڑھ گئی۔ وہ پھنکار کر بولی۔

''تم نے جو میری زندگی کے ساتھ تماشا کیا ہے ناں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا تمہیں، ایک دن خود کو بالکل بے بس اور نہتا پاؤ گے دیکھنا۔''

آصف بھی اب اس کے روبرو بیڈ پر کھڑا ہو کر چلانے لگا تھا اور اسی دوران میں شہلا کی کسی بات پر آپے سے باہر ہو کر اس نے اسے دو زناٹے کے تھپڑ مارے اور دھکا دے دیا۔ شہلا اپنے پورے وزن سے سر کے بل نیچے گری اور یک دم ساکت ہو گئی۔ آصف اس کی طرف لپکا اور بازو کا سہارا دے کر اسے اٹھانے کی کوشش کی تو اس کی گردن عجیب بے ڈھنگے سے انداز میں ایک طرف لٹک گئی۔ (وہ اپنے وزن پر سر کے بل ایسے زاویے سے گری تھی جس نے گردن کے پیچھے اس کی اسپائنل کورڈ کو توڑ دیا تھا)

''شہلا...... اٹھو...... ہوش کرو۔'' وہ یکدم حواس باختہ ہو گیا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد ہی اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کے ہاتھوں میں ایک بے جان وجود ہے۔ شہلا کی ست رنگی چوڑیوں کی کرچیاں زمین پر بکھری ہوئی تھیں۔ پلٹی ہوئی آنکھیں اور ہیبت ناک انداز میں ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی گردن اس کی کہانی کے آناً فاناً تمام ہو جانے کا پیغام دے رہی تھیں۔

آصف نے ایک نظر دوبارہ فرش پر پڑے اپنی بیوی کے بے جان وجود پر ڈالی اور وہیں بیٹھ کر اپنے حواس بحال کرنے لگا۔ اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ سب سے پہلی سوچ جس نے اس کے دماغ کا دروازہ کھٹکھٹایا، وہ یہ تھی کہ شہلا کا چھوٹا بھائی رضوان جو ان دنوں ان کے ہاں انٹری ٹیسٹ کی تیاری کے لیے قیام پذیر تھا، وہ اکیڈمی سے یقیناً تھوڑی ہی دیر میں گھر پہنچنے والا تھا۔ چنانچہ اس کے آنے سے پہلے اسے ہر صورت اس موقع سے اپنی عدم موجودگی ثابت کرنی تھی اور ساری صورتِ حال کو کوئی اور رنگ دینا تھا۔ اس نے گردوپیش میں نظر دوڑائی اور چند لمحوں میں ایک پورا منصوبہ اپنی جزئیات سمیت اس کے ذہن میں اتر آیا۔ سب سے پہلے وہ کرسی کھینچ کر لایا اور پنکھے کے نیچے رکھی۔ شہلا کا تلے کی کناری لگا نارنجی دوپٹا وہیں فرش پر پڑا تھا اسی دوپٹے کو اس نے شہلا کی ٹوٹی ہوئی گردن کے گرد بل دیے اور پھر ہمت جمع کر کے کسی نہ کسی طرح اس کے بے جان وجود کو پنکھے کے ساتھ لٹکا دیا۔ سرد موسم کے باوجود اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اب دوسرا مرحلہ کمرے کو اندر سے بولٹ کر کے کسی نہ کسی

طرح باہر نکلنے کا تھا۔ جو اب اس کے لیے پریشان کن ثابت ہو رہا تھا۔ کمرے سے نکلنے کا واحد ذریعہ ایک روشن دان تھا۔ اس میں فکس شیشہ لگا ہوا تھا اور یہ روشن دان کافی چھوٹا بھی تھا۔ آصف جیسا تنومند اس میں سے کسی صورت نہیں گزر سکتا تھا۔ اچانک ایک خیال اس کے ذہن میں کوندا۔ بیڈ روم کے دروازے کے نیچے والا سلائڈنگ بولٹ جو فرش کے سوراخ میں جاتا تھا کچھ عرصے سے ''لوز'' تھا۔ پیر کے انگوٹھے سے ہلکی سی جنبش دینے پر ہی ڈھلک کر سوراخ میں چلا جاتا تھا۔ اگر باہر نکل کر دروازے کو اس طرح سے ہلایا جائے کہ اندر والا بولٹ گر جائے تو سارا معاملہ حل ہو جاتا۔ کچھ سوچ بچار اور تیاری کے بعد آصف نے عمل درآمد کیا اور وہ کامیاب بھی ہو گیا۔ وہ وہاں سے ہانپتا کانپتا نکلا اور سیدھا ایک نزدیکی چائے خانے پہنچ گیا۔ سب چیزیں اس کی توقعات کے مطابق ہو رہی تھیں۔ ابھی اس نے چائے کے پہلے دو گھونٹ ہی لیے تھے کہ اس کے سالے رضوان کی کال آ گئی۔ خوف اور اضطراب سے اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ وہ بمشکل اتنا ہی کہہ پایا کہ آپی نے دروازہ اندر سے بند کر رکھا ہے اور کھول نہیں رہی ہیں۔

آصف جس پریشانی اور انتشار میں وہاں سے بھاگا تھا، کچھ محلے دار واقف لوگ بھی اس کے ساتھ ہو لیے۔ وہ گھر پہنچا تو پڑوس کی کچھ عورتیں بھی ہکا بکا کھڑی تھیں۔ بند دروازے کو پیٹا جا رہا تھا۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آصف نے بھی خود کو وحشت زدہ ظاہر کیا اور دروازے پر دو ہتڑ برسانے لگا۔ اسی دوران ایک محلے دار نے بانس کی سیڑھی لگائی۔ روشن دان کا شیشہ صفائی سے توڑا اور ایک چھوٹے لڑکے کو روشن دان کے ذریعے کمرے میں داخل کر دیا۔ دہشت زدہ لڑکے نے چند سیکنڈ میں ہی اندر سے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ اندر کمرے میں شہلا کی لاش پنکھے سے جھول رہی تھی۔

''نہیں شہلا...... تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ یہ کیا کیا تم نے...... کیوں؟ شہلا کیوں؟ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتیں......'' آصف کی دہاڑیں اس چھوٹے سے گھر کے در و دیوار کو لرزانے لگیں۔ محلے کے بڑے بوڑھے آگے بڑھ کر اسے سنبھالنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہاں پولیس بھی آ گئی۔ جائے وقوعہ کا جائزہ لیا گیا۔ آصف اور رضوان کے بیان بھی درج ہوئے۔ رضوان نے اپنے بیان میں کہا۔

''سر! مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ چھوٹے موٹے جھگڑے تو ہر گھر میں چلتے ہیں۔ مجموعی طور پر تو آصف بھائی ایک اچھے شوہر ثابت ہوئے تھے۔ آپی بھی باشعور اور پانچ وقت کی نمازی تھیں پھر...... پتا نہیں کیوں انہوں نے یہ انتہائی قدم اٹھا لیا۔'' رضوان اتنا ہی کہہ پایا اور اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔

دوسری طرف آصف بھی اپنی بناوٹی خستہ حالت کے پیشِ نظر کم ہی بولا۔ اس نے کہا۔ ''آفیسر صاحب! رضوان آپ کو سب کچھ بتا چکا ہے میرا سینہ تو درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ سانسیں لینا مشکل ہو رہا ہے۔ اپنی زندگی کا، اپنے دکھ سکھ کا ساتھی کھو دیا میں نے۔ پھر بھی...... جو آپ پوچھیں گے بتاؤں گا۔ پتا نہیں، کس بات پر دلبرداشتہ ہو کر وہ مجھے تنہا چھوڑ گئی۔ اس نے ایک مرتبہ بھی میرے بارے میں نہ سوچا۔'' آصف پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ شہلا کی موت کا راز جیسے اس کے ساتھ ہی دفن ہونے جا رہا تھا۔ اہلِ محلہ کے سامنے کمرے کے روشن دان کا شیشہ توڑا گیا تھا۔ کمرے کے اندر سے جو زمینی شہادتیں ملی تھیں، وہ بھی یہی ثابت کرتی تھیں کہ شہلا نے خود دوپٹا گلے میں ڈالا۔ پنکھے سے باندھا اور پھر لکڑی کی کرسی کو ٹھوکر مار کر دور پھینک دیا۔ قانونی کارروائی چند ہفتے جاری رہی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے بھی کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ کیس کے سلسلے میں آصف کو دو چار مرتبہ کچہری جانا پڑا، اور...... اس کے بعد زندگی کی شاہراہ اسے پہلے سے کہیں زیادہ سہل دکھنے لگی تھی۔ سب کچھ بے خبری کی گہری تاریکیوں میں چھپ گیا۔ شہلا کے لواحقین بھی رو دھو کر چپ ہو رہے، وہ خوبرو اور نیک خولڑکی کہانی بن کر رہ گئی تھی جس نے ایک روز شوہر کے موبائل فون میں جھانکنے کی کوشش کی تھی۔

☆☆☆

کوئی آٹھ ماہ بعد کی بات ہے۔ قندیل اور آصف بات کر رہے تھے۔

''قندیل یار اب جلدی اس بندے سے چھٹکارا حاصل کرو۔ مزید برداشت نہیں ہوتا اب۔'' شہر کے ایک تجارتی علاقے کے مشہور ریسٹورنٹ میں آصف اور قندیل آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کو چاہت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کی گزشتہ زندگی کا باب کب بند ہوا اور کیسے بند ہوا، آصف تو جیسے یہ سب کچھ کب کا بھلا چکا تھا۔ شہلا کا نام اس کی یاد کے صفحے پر سے حرفِ غلط کی طرح مٹ چکا تھا۔

قندیل نے اپنے بالوں کو پیشانی سے پیچھے ہٹایا اور

آصف کی بات کے جواب میں بولی۔ ”یہ سب اتنا آسان تو نہیں ہے ناں سویٹ ہارٹ۔ تم تو جانتے ہی ہو کس قسم کا انسان ہے وہ۔ مجھے تو اب ڈر لگنے لگا ہے کہ اگر ہمارے تعلق کی ہلکی سی بھنک بھی پڑ گئی اسے تو...... شاید مجھے وہ جان سے ہی مار دے۔“ قندیل کے چہرے پر خوف کے سائے سے لہرانے لگے پھر وہ آصف کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ”مجھے یہ بھی خوف رہتا ہے کہ میری وجہ سے تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔“

قندیل کا شوہر ملک باقر بدمعاش ٹائپ بندہ تھا۔ ایم پی اے کی پشت پناہی حاصل تھی اور پیسوں کے عوض اپنے علاقے کے لوگوں کے جائز و ناجائز کام نکلوا لیتا تھا۔ آصف اسی بنا پر اس سے ٹکر لینے سے گھبراتا بھی تھا لیکن دوسری طرف وہ قندیل کو ہر صورت اپنی زندگی کی اس مسند پر بٹھانا چاہتا تھا جو شہلا کے بعد اب بالکل خالی تھی۔ ”تم فکر نہ کرو ڈیئر...... مل کر کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لیں گے اور جلد وہ وقت آنے والا ہے جب ہم اپنی نئی زندگی کے پہلے آزادانہ تفریحی سفر پر نکلیں گے۔ سمجھ رہی ہو ناں...... ہمارا ہنی مون......“ آصف نے آنکھ دباتے ہوئے کہا پھر مزید وضاحت کی۔ ”ناران، کاغان، شوگراں...... جہاں جہاں تم کہو۔“

مستقبل کے خوش آئند خیالات سے دونوں کی نگاہیں مخمور ہو گئیں۔ قندیل نے اپنے آبشاروں جیسے سیاہ ریشمی بالوں کو کیچر کی بندش سے آزاد کر کے ایک ادائے بے نیازی سے آصف کی طرف دیکھا اور آصف کو لگا کہ دو مہینے کی سیونگ سے کرائے گئے اس پُرتکلف ڈنر کے پیسے پورے ہو گئے اور اس وقت انہیں بالکل بھی اندازہ نہیں ہو سکا کہ ان سے چند قدم کی دوری پر قندیل کے شوہر ملک باقر کا ایک قریبی دوست بیٹھا انہیں عقابی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔

☆☆☆

رات کے قریباً دس بج رہے تھے۔ آصف گنگناتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا اُس نے کپڑے تبدیل کیے اور ٹی وی آن کر کے بیڈ پر نیم دراز ہو گیا لیکن اپنا دل و دماغ جیسے وہ قندیل کے روبرو بیٹھے ریسٹورنٹ کی اسی ٹیبل پر ہی چھوڑ آیا ہو۔ اب ہر ملاقات پر اسے ایسا ہی لگتا تھا۔ قندیل کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا تھا اور اب وہ جلد از جلد اسے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ شادی کے پیشِ نظر اس نے کمرے میں کافی تبدیلیاں کر ڈالی تھیں۔ آصف نے چینل چینج کرنے کے لیے ریموٹ ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ اسے کال بیل سنائی دی۔ وہ بڑبڑاتا بادلِ ناخواستہ اٹھا اور پاؤں میں چپل اڑستا ہوا باہر نکل گیا۔

”کون ہے بھئی؟“ دروازے پر پہنچتے ہوئے اس نے اندر سے ہی آواز لگائی۔

”تیرا باپ...... دروازہ کھول!“ آصف اس آواز کو نہیں پہچانتا تھا لیکن بولنے والے کے انداز سے اسے اشارہ مل گیا تھا۔ اس نے دروازے کے ہول سے باہر جھانکا تو اس کا اندیشہ حقیقت کا روپ دھارے کھڑا تھا۔ باہر قندیل کا شوہر ملک باقر ہی تھا۔ اس کی عمر پینتیس سے چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ بڑی مونچھوں اور مضبوط جبڑوں والے چہرے پر ایک عجیب طرح کی سفاکی پھیلی ہوئی تھی۔ آصف کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ آصف ابھی شش و پنج میں تھا جب گیٹ کے ساتھ دیوار پر دو ہاتھ نمودار ہوئے۔ باقر دیوار پھلانگ کر اندر آنے لگا تھا اور اس وقت آصف کے ہاتھوں کے طوطے چھوٹ گئے جب اسے ملک باقر کے ایک ہاتھ میں بلیک ماؤزر صاف دکھائی دی۔ آصف اندھا دھند اپنے کمرے کی طرف دوڑا۔ اس کا پسٹل الماری میں پڑا تھا۔ چند سیکنڈز کے اندر وہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ ملک باقر کا نشانہ بننے سے پہلے وہ خود اس کا بھیجا اڑا دے گا۔ اپنی رفتار میں اس نے کمرے کے اندر داخل ہونے کے لیے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو ایک جھٹکا کھا کر پیچھے کو لڑکھڑا گیا۔ یہ کیا ہوا تھا...... اسے سمجھ نہیں آیا تھا اور پھر ایک سیکنڈ کے دسویں حصے میں جو حقیقت اس پر آشکار ہوئی اس نے جیسے اس کی رگوں میں خون کو جما دیا تھا۔ دروازے کا بولٹ اندر سے گر چکا تھا۔

جرم...... جو مظلوم کے ساتھ ہی دفن ہو چکا تھا۔

جرم...... جو مجرم خود بھی بھول چکا تھا لیکن...... قدرت نہیں بھولی تھی اور آج اس نے اچانک ہی آ کر مجرم کو گریبان سے پکڑ لیا تھا۔

”تمہیں خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ دیکھنا ایک دن خود کو بالکل بے بس اور تنہا پاؤ گے۔“ یہ کسی کے بھولے بسرے الفاظ تھے جو آخری بار اس کے ذہن میں گونجے تھے اور پھر سائیلنسر لگے ماؤزر سے نکلے دو شعلوں نے اس کا کام تمام کر دیا۔ قانون اپنا راستہ نہیں ڈھونڈ سکا تھا مگر مکافات نے اپنا راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔

❖❖❖

عجیب سی وحشت تھی۔ ایسا خوف میں نے کبھی محسوس نہیں کیا ہوگا۔

میں ایک ڈاکٹر تھا اور ہوں۔ مجھے ایک دور افتادہ علاقے کی ڈسپنسری میں بھیج دیا گیا تھا۔ میں اسے ڈسپنسری ہی کہہ سکتا ہوں۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے دو کمروں کے۔ ایک کمرا ایسا بھی تھا جو میرے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔

اس کمرے کی حالت کچھ بہتر تھی۔ اس کی دیواریں سلامت تھیں۔ ایک میز تھی اور دو عدد پرانی کرسیاں بھی

[illegible]

کائنات میں جہاں نکل جائیں... ہر جگہ کوئی نہ کوئی نیا روپ ضرور ملتا ہے... انسانی نفسیات... انسانی رشتوں کی اقدار اور فطرت کا بے پایاں حسن... مختلف نوعیت کے الجھائوں میں گرفتار لوگوں کی عکاس کہانی... انسان کی بے چارگی... تنہائی اور جلاوطنی نے ان کو شدید احساسِ ناکامی سے دوچار کر دیا تھا... صدیوں سے پھیلی نفرت کو وہ اپنے جادو سے ختم کرنا چاہتے تھے...

جادو

سرور اکرام

تھیں۔ یہ علاقہ شہر سے بہت فاصلے پر تھا۔ میں اگر چاہتا تو ایسی جگہ جانے سے انکار بھی کر سکتا تھا لیکن میں اپنے آپ کو ڈاکٹر ہی سمجھتا تھا۔ ایسا ڈاکٹر جو مریضوں کے دکھ درد میں کام آتا ہو۔ خاص طور پر غریب مریضوں کے۔ جو بے چارے بازار سے دوائیں بھی خریدنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔

یہ سب احساسات میرے مزاج میں شامل تھے اسی لیے جب مجھ سے کہا گیا کہ میری تقرری فلاں علاقے میں کر دی گئی ہے تو میں نے انکار نہیں کیا۔

مجھ سے پہلے جو ڈاکٹر تھا، وہ اس جگہ سے جان چھڑا کر بھاگ چکا تھا۔ اس کا نام امجد تھا۔ میں نے وہاں جانے سے پہلے امجد سے بات کی۔ اس نے کہا۔ ''منور بھائی کہاں جا رہے ہو۔ وہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ زندگی عذاب بن جائے گی۔''

''لوگ تو رہتے ہی ہوں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔ لوگ تو رہتے ہیں لیکن کس کام کے۔ وہ تم سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کریں گے۔''

''بھائی میں ان سے بات کرنے نہیں جا رہا، ان کا علاج کرنے جا رہا ہوں۔'' میں نے تحمل سے کہا۔

''تمہیں کہا گیا ہے کہ وہاں کوئی اسپتال ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس دو کمرے ہیں۔ جن کو اسپتال کہہ لو۔ ایک کمرا تمہارا ہوگا۔ ایک الماری ہے جس میں کچھ بینڈیج اور سنگچر وغیرہ رکھے ہیں۔ کچھ مکسچرز ہوں گے۔ بس۔ ہاں ایک کمپاؤنڈر بھی ہوگا۔ جو اسی علاقے کا رہنے والا ہے۔ اس کا کوئی کام ہی نہیں ہے۔''

''اس کے علاوہ کچھ اور؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے لیکن تم خوف زدہ ہو جاؤ گے۔''

''چلو وہ بھی بتا ہی دو۔''

''تم کو تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ وہ ایک پہاڑی علاقہ ہے۔ دور تک پہاڑ ہی دکھائی دیتے ہیں۔ ان پہاڑوں پر بھی گھر آباد ہیں لیکن مقامی لوگ اس طرف نہیں جاتے۔''

''وہ کیوں؟''

''ان کا خیال ہے کہ وہ خطرناک لوگ ہیں۔ ان کو وحشی سمجھ لو۔ کسی کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ان کی زبان بھی مختلف ہے۔ وہ آپس میں ایسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں جو مقامی لوگوں کی سمجھ میں بھی نہیں آتی۔''

''یار تم نے تو مجھے ڈرانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔'' میں نے کہا۔

''بھائی۔ جو کچھ میں جانتا ہوں، تمہیں بتا رہا ہوں۔''

''ڈاکٹر۔ تمہارا بہت شکریہ کہ تم نے بتا دیا ہے لیکن میں اپنے مزاج سے مجبور ہوں۔ میں خدمت کا جذبہ لے کر جا رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اگر دل میں مخلوقِ خدا کی بھلائی کا جذبہ ہو تو پھر کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔''

''تو پھر جاؤ۔ تمہارا اللہ نگہبان ہو۔''

میں رشتہ ویندا کے لیے روانہ ہو گیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں مجھے جانا تھا۔ ریل سے ایک اسٹیشن پر اتر کر پیدل کی مسافت تھی۔ وہ بھی دس میل کی۔ راستے میں سوائے ہولناک ویرانے کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ حالانکہ دن کا وقت تھا۔ اس کے باوجود ایک وحشت سی طاری تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہوا نے بھی یہاں پہنچ کر دم سادھ لیا ہو۔

راستہ بھی بہت خراب اور دشوار تھا۔ گاڑیاں تو جاتی ہی نہیں تھیں۔ میں اسی لیے اپنی گاڑی شہر ہی میں چھوڑ آیا تھا۔

مجھ سے کہا گیا تھا کہ نور دین کمپاؤنڈر مجھے لینے اسٹیشن پہنچ جائے گا لیکن اس کا کوئی پتا نہیں تھا۔ میں انتظار نہیں کر سکتا تھا اسی لیے پیدل ہی چل پڑا۔

دن کے ابھی دو ہی بجے تھے لیکن ہر طرف سناٹا تھا۔ میں نے اپنے بیگ میں فوری ضرورت کی دوائیں بھی رکھ لی تھیں۔ بخار اور پیٹ کی خرابی وغیرہ کی دوائیں۔ ان کے علاوہ مرہم پٹی کا ایسا سامان تھا جو وہاں کام آ سکتا تھا۔

میں چلتا ہوا بہت دور نکل آیا۔ راستے کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ وہاں ہریالی بھی تھی۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا تو میں وہاں رک کر انجوائے کر لیتا۔ لیکن مجھے اپنی منزل تک پہنچنے کی جلدی ہو رہی تھی۔

اچانک کسی نے آواز دی۔ ''رک جائیں ڈاکٹر صاحب۔''

ایک آدمی بلند ٹیلے سے اترتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔ میں رک گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ نیچے آ گیا تھا وہ ایک ادھیڑ عمر انسان تھا۔

''سلام ڈاکٹر صاحب۔'' اس نے کہا۔ ''میں نور دین ہوں۔ کمپاؤنڈر۔''

''اوہ۔'' میں نے سلام کا جواب دیا۔ ''تم کہاں رہ گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔ ''تمہارا انتظار کر کے چلا ہوں۔''

''معاف کیجیے گا۔ میری بیوی کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔ اس کو دوا دے کر آیا ہوں۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ پیدل ہی نکل گئے ہوں گے۔''

''اور کیا کرتا؟''

نور دین نے میرا کچھ سامان خود لے لیا۔ ہم چل

پڑے۔ نوردین راستے میں بتاتا گیا۔ ’’ڈاکٹر صاحب۔ اس جگہ آنے جانے کی بہت تکلیف ہے۔ اگر راستہ ہوتو شاید گاڑیاں بھی چلنے لگیں لیکن آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔‘‘

’’یہ تو ہے۔‘‘ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ’’تم لوگ کھانے پینے کا سامان کہاں سے لاتے ہو؟‘‘

’’وہ سامنے والی پہاڑیاں دیکھ رہے ہیں صاحب۔ اس کی دوسری طرف ایک قصبہ ہے چیلاک۔ وہاں بازار لگتا ہے جس میں ضرورت کی ہر چیز مل جاتی ہے۔ ہم لوگ وہیں سے لے کر آتے ہیں۔‘‘

’’بہت دشوار زندگی ہے تمہاری۔‘‘

’’جی ڈاکٹر صاحب۔ اسی لیے تو کوئی ڈاکٹر یہاں رکتا نہیں ہے۔ اپنا ٹرانسفر کروالیتا ہے۔‘‘

ہم جھاڑیوں سے بھرے اونچے نیچے راستوں سے گزرتے رہے۔ ایک بڑا ٹیلا عبور کر کے ہم بستی میں داخل ہو چکے تھے۔ ایک بڑے میدان کے پاس ہی ایک بیرک سی بنی ہوئی تھی۔ تین چار کمروں کی بیرک۔ نوردین نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ’’یہ لیں ڈاکٹر صاحب۔ آ گئی ہماری ڈسپنسری۔‘‘

اسپتال تو بہت دور کی بات ہے۔ وہ ڈسپنسری بھی اس قابل نہیں تھی کہ اس میں کسی کا علاج ہوسکتا۔ تین کمرے۔ دو کمرے مریضوں کے علاج کے لیے اور ایک کمرا میرا۔ ان کے حال میں پہلے بتا چکا ہوں۔ نوردین نے یہاں کی صفائی کروا رکھی تھی۔ اسی لیے صاف ستھرا دکھائی دے رہا تھا۔

نوردین نے سارا سامان ایک طرف رکھ دیا۔ ’’نوردین۔‘‘ میں نے نوردین سے پوچھا۔ ’’یہاں دوائیں ہیں؟‘‘

’’نہیں جی۔ کیسی دوائیں۔ کون پوچھتا ہے؟‘‘

’’وہ دیکھو۔‘‘ میں نے دواؤں کے بکس کی طرف اشارہ کیا۔ ’’میں اپنے ساتھ کچھ دوائیں لیتا آیا ہوں۔ ان کو الماری میں رکھ دو۔‘‘

’’صاحب۔ آپ تھکے ہوئے آرہے ہیں۔ پہلے وہ گھر دیکھ لیں جہاں آپ کو رہنا ہے۔‘‘

’’وہ کہاں ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’چلیں میرے ساتھ۔‘‘ اس نے کہا۔

میں نے اپنا چھوٹا سوٹ کیس اٹھایا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ یہ علاقہ کتنا خوبصورت ہے۔ یہاں کی ہریالی ابھی تک میری نگاہوں سے اوجھل رہی تھی لیکن اس کے ساتھ چلتے ہوئے پتا چلا کہ ہر طرف سبزے کی بہار ہے۔ راستے میں کچھ لوگ بھی ملے جو سلام کرتے ہوئے خیریت معلوم کرنے لگے۔

نوردین نے بتایا۔ ’’صاحب۔ میں یہاں لوگوں کو بتا چکا ہوں کہ نئے ڈاکٹر صاحب آنے والے ہیں اسی لیے سب آپ کو پوچھ رہے ہیں۔‘‘

وہ بستی بہت کم گھروں پر مشتمل تھی۔ ایک گلی میں کچھ دکانیں بھی تھیں۔ بچے ہمیں حیرت اور تجسس سے دیکھ رہے تھے۔ نوردین مجھے جس مکان کے دروازے تک لایا تھا، وہ ایک منزلہ چھوٹا سا مکان تھا۔

’’صاحب۔ اس میں صرف دو کمرے ہوں گے۔‘‘ اس نے بتایا۔

’’میرے لیے بہت ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’اکیلے آدمی کے لیے دو کمرے بھی بہت ہوتے ہیں۔‘‘

نوردین نے دروازہ کھول دیا۔ ہم اندر آ گئے۔ دو کمرے تھے۔ دونوں کی صفائی بھی کردی گئی تھی۔

ایک کمرے میں ایک چارپائی بھی تھی۔ جس پر بہت سلیقے سے چادر بچھی ہوئی تھی۔ قریب ہی ایک اسٹول تھا جس پر ایک کولر رکھا ہوا تھا۔ ’’واہ نوردین۔ یہ سب تم نے پہلے سے کر کے رکھا ہوا ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’میں نے نہیں صاحب، میری بیٹی نے کیا ہے۔‘‘ اس نے بتایا۔ ’’وہ بہت سلیقے کی بچی ہے۔‘‘

’’اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔ میں خود دیکھ رہا ہوں۔‘‘

پھر اس نے مکان کا غسل خانہ دکھایا۔ بہت چھوٹا لیکن بہت صاف ستھرا تھا۔ ایک بالٹی میں تازہ پانی بھی بھرا ہوا تھا۔

’’نوردین۔ یہاں پانی کہاں سے آتا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’پاس ہی ایک چشمہ ہے صاحب۔‘‘ اس نے بتایا۔ ’’پوری بستی وہیں سے پانی لاتی ہے۔ بہت ٹھنڈا اور میٹھا پانی ہوتا ہے۔ اس کولر میں بھی وہیں کا پانی ہے۔ آپ ذرا ایک دو گھونٹ لے کر دیکھ لیں۔‘‘

میں نے اس کے کہنے پر پانی پی کر دیکھا۔ واقعی بہت میٹھا اور صاف پانی تھا۔ قدرت نے ان لوگوں کے لیے بہت اچھا بندوبست کر رکھا تھا۔

’’آپ نہا دھو کر فریش ہو جائیں صاحب۔ میں آپ کے لیے چائے لے کر آتا ہوں۔‘‘

اس کے جانے کے بعد میں نے اپنے استعمال کی چیزیں

سوٹ کیس سے نکالیں اور تازہ میٹھے پانی سے نہانے چلا گیا۔ نہا کر میں واقعی فریش ہو گیا تھا۔ عجیب سی راحت ملی تھی۔

کچھ دیر بعد نوردین ایک ٹرے میں چائے اور ایک پراٹھا لے کر آ گیا۔ ''یہ لیں سر! چائے اور پراٹھا۔''

''ارے بھائی۔ اس پراٹھے کی کیا ضرورت تھی؟''

''ضرورت تھی صاحب۔ میری بیٹی نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب۔ تھکے ہوئے آ رہے ہیں۔ ان کے لیے یہ لے جاؤ پھر اس نے جلدی جلدی پراٹھا بنا دیا اور ہم کیا کر سکتے ہیں۔ بس یہی لے کر آ گیا۔''

''تمہاری مہربانی نوردین۔ تمہاری وجہ سے یہ علاقہ اب اچھا لگنے لگا ہے۔ ورنہ میں تو ڈر رہا تھا کہ نہ جانے کیسے لوگ ملیں۔''

پراٹھا بہت خستہ اور عمدہ تھا۔ چائے بھی بہت ڈھنگ کی تھی۔ باتوں کے درمیان میں نے اس سے پوچھا۔ ''نوردین۔ تمہارے کتنے بچے ہیں؟''

''دو ہیں صاحب۔ ایک بیٹا جو بڑا ہے اور دوسری بیٹی۔''

''تمہارا بیٹا کیا کرتا ہے؟''

''میں نہیں جانتا ہوں، وہ کیا کرتا ہے؟'' نوردین نے عجیب سا جواب دیا۔

''میں تمہاری بات نہیں سمجھا؟'' میں نے کہا۔ ''کیا وہ تمہارے ساتھ نہیں رہتا؟''

''نہیں صاحب، ایک سال ہوئے...... وہ چلا گیا۔'' اس نے بتایا۔ ''اس کو پہاڑی والے اپنے ساتھ لے گئے۔''

''پہاڑی والے؟'' میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ ''کون پہاڑی والے؟''

''ان کے بارے میں آپ کو بہت کچھ بتانا تھا صاحب لیکن میں نے سوچا کہ آپ تھکے ہوئے آ رہے ہیں۔ ساری کہانی ابھی سے کیوں سنا دوں۔ آہستہ آہستہ آپ کو پتا چل ہی جائے گا۔''

''میری تھکان اب دور ہو چکی ہے نوردین۔ تم مجھے بتاؤ۔ کیا سلسلہ ہے۔ ویسے ڈاکٹر امجد نے بھی ایسی کچھ باتیں بتائی تھیں... لیکن میری سمجھ میں نہیں آ سکیں۔ اب تم بتاؤ گے۔''

''صاحب، ان پہاڑیوں پر کچھ لوگ آباد ہیں۔ برسوں سے۔ وہ خطرناک لوگ ہیں۔ ہم انہیں اپنی بستیوں میں نہیں آنے دیتے۔ وہ جادوگر ہیں۔ جادو کرتے ہیں۔''

''اب یہ ایک دوسری بات پتا چلی ہے نوردین۔'' میں نے کہا۔ ''ان علاقوں میں بھی ایسی باتیں ہوا کرتی ہیں؟''

''جی صاحب۔ بہت ہوتی ہیں۔ پہاڑی والے بہت کچھ کرتے ہیں۔''

''تمہارے بیٹے کے ساتھ کیا ہوا تھا نوردین؟'' میں نے پوچھا۔

''پہاڑی والوں کی ایک لڑکی سے اس کا تعلق ہو گیا تھا۔ وہ بھی اس کی دیوانی ہو گئی تھی۔ پھر وہ میرے بیٹے کو اپنے ساتھ لے گئی۔''

''کیا اس کا پتا نہیں چلا؟''

''پتا چلا ہے صاحب۔ وہ ہم سے ملنے کے لیے آیا کرتا ہے۔ لیکن رہتا پہاڑی پر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بیوی کو وہ اپنے ساتھ رکھے گا۔ لیکن ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔ کیونکہ وہ لوگ خطرناک ہیں۔ جادو کے ذریعے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اس کی بیوی اگر یہاں آ گئی تو نہ جانے میری بیٹی کے ساتھ کیا کر دے۔ اس خوف سے ہم اس کو آنے نہیں دیتے۔ خود بستی والے بھی اس کے خلاف ہیں۔''

میری سمجھ میں یہی آیا کہ اس کے بیٹے نے پہاڑی والوں کی کسی لڑکی سے محبت کی ہو گی پھر اس سے شادی کر لی ہو گی۔ اور جب بستی والے نہیں مانیں ہوں گے تو وہ اس لڑکی کے ساتھ واپس اسی پہاڑی پر چلا گیا ہو گا۔

اس قسم کی کہانیاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔

بہت پُرسکون جگہ تھی۔ وہ دن میں نے اپنے کمرے ہی میں گزارا۔ رات کے وقت نوردین میرے لیے کھانا لے کر آ گیا تھا۔ کھانا بھی بہت سادہ لیکن بہت لذیذ تھا۔

میں نے نوردین سے کہا۔ ''دیکھو نوردین اب تم ایک کام کرو۔ تم مجھ سے پیسے لے لیا کرو۔''

''کیسے پیسے صاحب؟''

''دیکھو۔ اب تو میں یہاں بہت دنوں تک ہوں۔ کوئی ایک دو دن کا مہمان نہیں ہوں۔ کھانے پینے کا بندوبست بھی کرنا ہے۔ یہاں کوئی ہوٹل تو ہے نہیں کہ میں وہاں سے جا کر کھا لیا کروں۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ تم مجھ سے مہینے کے راشن کے پیسے لے لیا کرو... اور میرے لیے صبح کے ناشتے اور دو وقت کے کھانوں کا بندوبست کر دیا کرو۔''

''لیکن صاحب۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے اچھا نہیں لگے گا'' اس نے کہا۔

''اچھا یا برا لگنے کی بات نہیں ہے۔ یہ مجبوری بھی ہے اور ضرورت بھی۔ خود سوچو۔ میں اپنا کھانا خود تو بنا نہیں سکتا۔

تم ہی کو کرنا ہوگا۔‘‘

نوردین بڑی مشکلوں سے راضی ہوا تھا۔ میں نے اسے پانچ ہزار دے دیے۔ وہ راضی نہیں ہو رہا تھا لیکن میں نے زبردستی دے دیے تھے۔

’’اب بتاؤ۔ راشن کہاں سے لایا کرو گے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’چیلاک کے بازار سے۔‘‘ اس نے بتایا۔ ’’چھوٹی پہاڑی اُتر کر چیلاک کا میدان ہے۔ بازار وہیں لگتا ہے۔ ہر چیز مل جاتی ہے۔ کل صبح ہی بازار چلا جاؤں گا۔‘‘

’’ایسا کرنا مجھے بھی اپنے ساتھ لے لینا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’ذرا یہ علاقہ دیکھوں۔ تھوڑی سیر بھی ہو جائے گی۔‘‘

’’ٹھیک ہے صاحب۔ میں آپ کے لیے ناشتا لے کر آؤں گا پھر آپ میرے ساتھ ہی چلیے گا۔‘‘

رات کا کھانا بھی بہت اچھا تھا۔ اس سے اندازہ ہوگیا کہ نوردین کی بیٹی بہت اچھے کھانے بنا لیتی ہے۔ ان کے پاس مہمان کی تواضع کے لیے جو کچھ بھی تھا، وہ سامنے لا کر رکھ دیا تھا۔

اس بستی میں بجلی بھی تھی اسی لیے رات کے وقت میں نے برآمدے کا ایک بلب روشن کر دیا تھا۔

کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ سناٹا اتنا شدید تھا کہ جھینگروں کی آوازیں ہر طرف گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ آس پاس کے گھروں سے بھی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ لگتا تھا کہ یہاں کے لوگ بہت جلد سو جانے کے عادی ہوں۔

مجھے ایک طرح کا خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیوں۔ حالانکہ کچھ بھی نہیں تھا۔ ابھی تک تو کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے سناٹے کے۔ نوردین نے بتایا تھا کہ اس کا گھر وہاں سے کچھ فاصلے پر ہے۔ جہاں مجھے رکھا گیا تھا۔

یہ اتفاق تھا کہ میں اپنے ساتھ دو تین کتابیں بھی لے آیا تھا۔ اس ویرانے اور سناٹے میں وہی کتابیں کام آسکتی تھیں۔ میں ان ہی کا مطالعہ کرتا رہا۔

میرا خیال ہے کہ رات کا ایک بجا ہوگا۔ جب دروازے پر ہونے والی دستک نے پریشان کر دیا۔ اتنی رات گئے کون آسکتا تھا۔ نوردین کو تو صبح آنا تھا۔ بہرحال میں نے دروازے کے پاس پہنچ کر آواز لگائی۔ ’’کون ہے؟‘‘

دوسری طرف سے ایک عجیب منمناتی ہوئی آواز سنائی دی۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا، یہ میری سمجھ میں نہیں

آخری خواہش

اخبار میں اشتہار چھپا:
مرسڈیز کار برائے فروخت صرف 100 روپے میں۔

کوئی بھی اس پر یقین نہیں کر رہا تھا۔

پر ایک صاحب یہ اشتہار دیکھ کر لکھے ہوئے ایڈریس پر جا پہنچے اور دروازے کی بیل بجائی۔ ایک ادھیڑ عمر کی خاتون نے دروازہ کھولا۔

صاحب نے پوچھا۔ ’’آپ ایک مرسڈیز کار بیچ رہی ہیں؟‘‘

خاتون۔ ’’جی ہاں!‘‘

صاحب۔ ’’میں کار دیکھ سکتا ہوں؟‘‘

’’جی شوق سے، آیئے!‘‘ یہ کہہ کے خاتون نے گیراج کھلوایا۔

صاحب نے دھیان سے کار کو دیکھا تو ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

بولے۔ ’’یہ تو ایکدم نئی ہے؟‘‘

جواب ملا۔ ’’ایکدم تو نئی نہیں ہے۔ 18000 ہزار کلو میٹر چل چکی ہے۔‘‘

صاحب۔ ’’لیکن اخبار میں تو اس کی قیمت صرف 100 روپے چھپی ہے؟‘‘

خاتون۔ ’’صحیح چھپی ہے۔ 100 کی ہی ہے۔ آپ 100 روپے دیجیے اور کار لے جایئے!‘‘

صاحب نے کانپتے ہاتھوں سے 100 روپے نکال کے دیے۔

خاتون نے روپے لے کر فوراً رسید بنائی اور کار کے کاغذات چابی کے ساتھ صاحب کو پکڑا دیے۔

شدید بے یقینی کے عالم میں صاحب نے آخر پوچھا۔ ’’بہن جی! اب تو بتا دیجیے کہ معاملہ کیا ہے؟ میں تو حیرت سے مرا جا رہا ہوں۔‘‘

خاتون۔ ’’گھبرایئے مت! کار اب یقینی طور پر آپ کی ہی ہے۔ میں تو بس اپنے مرحوم شوہر کی آخری خواہش پوری کر رہی ہوں۔ وہ اپنی وصیت میں لکھ گئے تھے کہ ان کے مرنے کے بعد یہ مرسڈیز گاڑی بیچ دی جائے اور ملی ہوئی ساری رقم...... ان کی سیکریٹری کو دے دی جائے......‘‘

کوہاٹ سے فلذا غزل کا تعاون

آسکا۔ وہ نہ جانے کون سی زبان بول رہا تھا۔
خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں نے برابر والی چھوٹی کھڑکی کا ایک پٹ تھوڑا سا کھول کر دیکھا۔ ایک لڑکا تھا۔ عجیب سا حلیہ اندھیرے کی وجہ سے پتا نہیں چل رہا تھا لیکن اتنا اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ پندرہ سولہ برس سے زیادہ کا نہیں تھا۔
اس نے پھر منمنا کر کچھ کہا اور دروازے پر ہاتھ مارنے لگا۔ میں نے چونکہ اپنے کمرے میں اندھیرا رکھا تھا اسی لیے وہ مجھے دیکھ نہیں پایا تھا۔
کچھ دیر بعد وہ منمناتا ہوا واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک مجھے نیند نہیں آئی تھی۔ نہ جانے کیسے کیسے خواب دیکھتا رہا تھا۔ بہرحال میں سو ہی گیا تھا۔ صبح ہوئی تو سب کچھ بہت خوشگوار تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ صبح کی روشنی میں اس مقام کا حسن اور نکھر آیا تھا۔ اس روشنی میں اندازہ ہوا کہ یہ جگہ کتنی خوبصورت ہے اور یہاں کی ہوا کتنی تازہ اور شگفتہ ہے۔ میں نے اپنے پھیپھڑوں کو ہواؤں سے بھرلیا۔
اتنی دیر میں نوردین بھی ناشتے کی ٹرے لے کر آگیا تھا۔ پراٹھے انڈے اور چائے۔ واقعی اس کی بیٹی سلیقے کی لڑکی تھی۔ ناشتے کے دوران میں نے اسے رات کے واقعے کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی سن کر پریشان ہوگیا تھا۔
''صاحب۔ بہت اچھا کیا کہ آپ نے دروازہ نہیں کھولا۔''
''کیا ہوجاتا نوردین؟'' میں نے پوچھا۔
''کچھ کہہ نہیں سکتا صاحب۔ خدا جانے اس کا کیا ارادہ تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ لوگ کسی کو اپنے ساتھ لے گئے .... پھر اس کا پتا نہیں چل سکا ہے۔ نہ جانے کہاں لے جاتے ہیں۔''
''یہ تو خطرے والی بات ہے نوردین۔''
''ہاں خطرے والی بات تو ہے لیکن دروازہ ہی نہ کھولیں۔ زبردستی اندر تو نہیں آسکے گا۔''
نوردین کی بات درست تھی۔ ناشتے کے دوران نوردین نے کہا۔ ''صاحب۔ میرا خیال ہے کہ آج آپ میرے ساتھ چیلاک بازار کی طرف چلیں۔ دیکھ بھی لیجیے گا۔ اور اپنی پسند کی چیزیں بھی لے لیجیے گا۔''
''ہاں۔ میں خود بھی تم سے یہی کہنے والا تھا۔ وہاں سے واپس آکر ڈسپنسری کا کام دیکھیں گے۔''
میں نوردین کے ساتھ چیلاک کی طرف چل پڑا۔
جہاں وہ بازار لگا کرتا تھا۔ راستہ بہت دشوار تھا۔ کئی چھوٹی بڑی پہاڑیاں عبور کرنی پڑتی تھیں۔ تب جا کر ایک میدان آتا تھا جس کے چاروں طرف اونچے اونچے صنوبر کے درخت تھے۔
جگہ واقعی بہت خوبصورت تھی۔ سبزہ اتنا تھا کہ آنکھوں میں تراوٹ آگئی تھی۔ وہ بازار اسی میدان میں لگا کرتا تھا۔ اچھا خاصا بازار تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہاں ضرورت کی ساری چیزیں مل جاتی ہوں گی۔ ایک طرف گوشت اور سبزیاں بھی فروخت ہو رہی تھیں۔
کچھ لوگوں نے مجھے دیکھ کر ادب سے سلام بھی کیا۔
میں نے نوردین سے پوچھا۔ ''نوردین۔ یہ کون لوگ ہیں؟''
''یہ اپنی ہی بستی کے ہیں صاحب۔ انہیں آپ کے بارے میں معلوم ہوگیا ہے کہ آپ نئے ڈاکٹر بن کر ان کے علاقے میں آئے ہیں۔''
''لیکن انہیں کیسے معلوم؟''
''میں نے بتایا ہے صاحب اسی لیے وہ آپ کو میرے ساتھ دیکھ کر سمجھ گئے ہیں۔''
میں نے نوردین کو کچھ پیسے دے کر کہا کہ وہ گوشت اور سبزیاں خرید لے۔ وہاں کی سبزیاں اتنی شگفتہ ہو رہی تھیں جیسے دور تک سبزہ بھرا ہوا ہو۔ اتنی تازگی کا تصور بھی شہر میں نہیں تھا۔
ہم سبزیاں خرید کر واپس آگئے۔
ڈسپنسری میں بہت کام تھا۔ ہم بہت دیر تک کام نمٹاتے رہے۔ شام کے وقت واپس آگئے۔ نوردین اپنے گھر چلا گیا۔ میں اپنے کمرے میں آگیا۔ نوردین رات کا کھانا وقت پر لے آیا تھا۔
وہاں میرے پاس کوئی کام ہی نہیں تھا۔
میں نے اپنی پسندیدہ کتاب نکالی اور بستر پر لیٹ گیا۔ کل کی رات جو تجربہ ہوا تھا، وہ پوری طرح ذہن سے نکل چکا تھا۔ اچانک پھر دستک ہونے لگی۔ میں بُری طرح چونک گیا۔
میں بستر سے اتر کر دروازے تک آیا۔ اور کل ہی کی طرح اندھیرے میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ وہی لڑکا تھا جس کو میں گزشتہ رات دیکھ چکا تھا۔ اس بار وہ صرف دستک ہی نہیں دے رہا تھا بلکہ کچھ بول بھی رہا تھا۔
خوف کی کیفیت تو تھی لیکن نہ جانے کیوں میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ ایک لڑکا ہی تو تھا۔ وہ کیا کر لیتا۔ اب

میں اتنا کمزور بھی نہیں تھا کہ اگر وہ مجھ پر حملہ کرتا تو میں اس کا مقابلہ نہیں کر پاتا۔

مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اس نے اپنی زبان میں نہ جانے کیا کہا۔ ایسا لگا جیسے وہ مجھے کچھ سمجھانا چاہتا ہو۔

بس ایک لمحے کا خوف تھا پھر اچانک خوف ختم ہو گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ لڑکا مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ وہ کوئی بھوت نہیں تھا۔ انسان ہی تھا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔

اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے سلام کیا اور پھر کچھ کہا۔ اس کی زبان میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

''کہو، کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بیمار...... بیمار...... ماں...... ماں۔'' اس نے اس کے ساتھ ہی اور بھی کچھ کہا ہوگا۔ لیکن اتنا سمجھ میں آ گیا کہ اس کی ماں بیمار ہے اور یہ مجھے بتانا چاہتا ہے۔

خوف تو تھا لیکن اپنے پیشے کا خیال اس خوف پر غالب آ گیا تھا۔ ''کہاں ہے ماں؟'' میں نے پوچھا۔ اشارے سے پوچھا تھا۔

''وہ اس طرف۔'' اس نے اشارہ کیا۔

اس نے ان ہی پہاڑیوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اب یہ میرا امتحان تھا کہ میں اسے انکار کر دوں یا اس کے ساتھ چل پڑوں۔ فرض کا احساس غالب آ گیا۔ میں نے اشارہ کیا کہ وہ وہیں کھڑا رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ لڑکا مجھ سے بھی زیادہ خوف زدہ ہو رہا تھا۔ میں اندر جا کر اپنا میڈیکل کٹ اٹھا کر لے آیا۔ اس میں ایمرجنسی میں کام آنے والی کچھ دوائیں تھیں۔ باہر آ کر میں نے اشارہ کیا کہ میرے ساتھ چلو۔

اس وقت خیال آیا کیوں نہ نوردین کو بتا دوں لیکن دوسرا خیال یہ تھا کہ نوردین مجھے جانے سے روک دے گا اسی لیے میں نے خدا کا نام لیا اور اس کے ساتھ ہولیا۔ ہر طرف سناٹا اور بھیانک رات کا اندھیرا تھا۔ وہاں گلیوں میں روشنی وغیرہ کا انتظام نہیں تھا۔ (جب ہمارے شہروں میں نہیں ہوتا تو وہاں کیوں ہونے لگا۔)

اس وقت صرف کتے بھونک رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر اس کے گھر میں کوئی بیمار تھا تو ڈسپنسری کیوں نہیں آیا۔ کیا مسئلہ تھا۔

بہر حال میں اس کے ساتھ چلتا رہا۔ اب راستے بہت دشوار ہو گئے تھے۔ قدم قدم پر بڑے بڑے پتھر تھے۔ ان سے بچتے ہوئے ہم آگے بڑھتے رہے۔ ایک جگہ میں نے سوچا کہیں میں کوئی حماقت تو نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے اس طرح رات کو اس کے ساتھ یہاں نہیں آنا تھا۔ جبکہ میں ان لوگوں کے بارے میں بہت کچھ سُن چکا تھا۔

اندھیروں کے پردے ہٹے تو مجھے گھر دکھائی دینے لگے۔ ان گھروں میں لالٹینیں روشن تھیں۔ وہاں تک لائٹ نہیں آئی تھی۔ اسی لیے پورا ماحول اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ لڑکا ایک مکان کے دروازے پر رک گیا۔

اس نے دروزہ کھولا اور مجھے اشارہ کیا کہ میں اس کے ساتھ اندر چلا آؤں۔

اس بار بھی خوف کی ایک لہر سی میری رگوں میں دوڑ گئی۔ دل چاہا کہ میں واپس بھاگ لوں۔ راستہ تو دیکھ ہی چکا تھا لیکن ایسا لگا جیسے اس لڑکے نے میرا ارادہ بھانپ لیا ہو۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے اندر لے آیا۔

اندر ایک کمرا تھا۔ ایک طاق پر لالٹین رکھی ہوئی تھی۔ جس کی کمزور روشنی کسی حد تک کمرے کے اندھیرے کو دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سامنے ایک چارپائی تھی جس پر کوئی چادر اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔

لڑکے نے اشارہ کیا۔ ''ماں۔ ماں۔ بیمار۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ اس کی ماں ہے۔ میں نے قریب جا کر دیکھا۔ لالٹین کی دھیمی روشنی میں اس کے نقوش بہت مدھم ہو رہے تھے۔ میں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ وہ بخار میں تپ رہی تھی۔ میں نے فوری طور پر اس کا ٹریٹمنٹ شروع کر دیا۔ میرے میڈیکل کٹ میں فوری علاج کی دوائیں تھیں۔ میں نے ایک انجکشن دیا اور ایک دوا اس کے حلق میں انڈیل دی۔ میرے اشارے پر وہ لڑکا ایک گلاس میں پانی لے آیا تھا۔

دوا اور انجکشن کا اثر کچھ دیر بعد ہونے لگا تھا۔ اس نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔ مجھے دیکھ کر شاید اس نے چیخنا چاہا تھا لیکن اسی وقت لڑکے نے آگے بڑھ کر اپنی زبان میں اسے سمجھانا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ اس کے تاثرات نارمل ہونے لگے۔

اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ یہ نقاہت کی وجہ سے تھا۔ اس دوران وہ لڑکا اس کے بستر کے پاس ہی رہا تھا۔ میں نے اپنے کٹ سے کچھ اور دوائیں نکالیں اور اس لڑکے سے کہا کہ اب دوسری خوراک صبح کو دینا۔

اسی دوران دروازے پر دستک ہونے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس دستک نے اس لڑکے کو خوف زدہ کر دیا تھا۔ دستک دوبارہ ہوئی تو اس نے جا کر دروازہ کھول دیا۔

ایک آدمی اندر آ گیا۔ وہ ایک بوڑھا لیکن تندرست آدمی تھا۔

اس لڑکے نے میری طرف اشارہ کر کے کچھ کہا۔ وہ آدمی میرے پاس آ گیا۔ اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''آپ کا بہت شکریہ کہ آپ اس لڑکے کے ساتھ یہاں تک چلے آئے۔''

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ آدمی اردو بول رہا تھا۔

''بھائی۔ اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ لڑکا میرے پاس آیا تھا۔ یہ کل بھی آیا تھا لیکن نہ جانے کیوں بھاگ آیا۔''

''اس نے واپس آ کر مجھے بتایا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''یہ عورت میری بہن ہے۔ بہت دنوں سے بیمار چلی آ رہی ہے۔ ہم اس کو گھریلو دوائیں دیتے رہے ہیں۔ لیکن اس سے فائدہ نہیں ہوا۔ بستی میں کوئی ڈاکٹر بھی نہیں تھا۔ جس کے پاس ہم اس کو لے جاتے۔ پھر پتا چلا کہ ایک نیا ڈاکٹر ڈسپنسری میں آ گیا ہے۔ تو یہ میرا بھانجا تمہیں بلانے کے لیے رات کو گیا تھا لیکن کسی کو دیکھ کر ڈر کر بھاگ آیا لیکن آج تم کو لے کر آ گیا ہے۔''

''بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' ''کیوں بھاگ آیا۔ کس کو دیکھ کر ڈر گیا تھا؟''

''اس بستی کے ایک آدمی کو۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ لوگ ہمیں پسند نہیں کرتے۔ ہمیں الگ رکھتے ہیں۔ ہم ان کی بستی میں داخل نہیں ہو سکتے۔''

''یہ تو میں خود دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن کیوں؟''

''ڈاکٹر صاحب۔ اب سے پندرہ بیس سال پہلے کی بات ہے۔ جب ہماری بستی کے ایک بندے نے اس بستی کی ایک لڑکی کو اغوا کر کے اس سے شادی رچالی تھی۔ بات یہ ہے کہ یہ خاندانوں یا دو قبیلوں کی کہانی ہے۔ ہم دو قبیلے ہیں۔ ہماری زبان الگ ہے۔ ہمارا رہن سہن الگ ہے۔ بستی والے ہمیں اسی لیے خود سے الگ سمجھتے ہیں۔ خدا غارت کرے اس بندے کو جس نے یہ حرکت کی تھی۔''

''اب وہ لڑکا اور لڑکی کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کئی برسوں تک ان کا کوئی پتا نہیں چلا پھر بہت دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ وہ دونوں کراچی جا کر آباد ہو گئے ہیں۔ شادی کر لی ہے اور ان کا ایک بچہ بھی ہے۔''

''بھائی۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات تو نہیں ہے جس کے لیے پوری بستی کو سزا دی جائے۔ اس قسم کے واقعات تو ہوتے رہتے ہیں۔''

''اب ان کو کون سمجھائے؟''

''میں نے سنا ہے کہ بستی کے ایک نوجوان نے بھی تمہاری بستی کی ایک لڑکی سے شادی کی ہے۔''

''جی صاحب۔ اور وہ دونوں یہیں ہمارے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ دنوں بہت خوش ہیں۔''

''یہ بتاؤ۔ تم لوگ کون سی زبان بولتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ شنگاری زبان ہے صاحب۔ ویسے ہم مقامی زبان بھی جانتے ہیں۔ اب جیسے میں آپ کے ساتھ بول رہا ہوں۔''

''اچھا ایک بات بتاؤ۔ میں نے سنا ہے کہ تم لوگ جادو بھی جانتے ہو۔ اسی لیے بستی والے تم سے دور رہتے ہیں۔''

''خدا انصاف کرنے والا ہے صاحب اور جہاں تک جادو کا سوال ہے تو میرے ساتھ چلیں۔ آپ کو پتا چل جائے گا۔''

''کہاں چلوں؟''

''آپ آئیں تو۔'' اس نے کہا۔

میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ چلتے ہوئے اس نے اپنے بھانجے سے کہا کہ وہ اپنی ماں کا خیال رکھے۔ پھر ہم اس مکان سے نکل کر اسی گلی کے موڑ پر دوسرے مکان میں آ گئے۔ وہاں گلیوں کا ایسا تصور نہیں تھا جیسا میدانی علاقوں کے مکانوں میں ہوا کرتا ہے۔ بس اونچی نیچی پہاڑیوں کے درمیان بنے ہوئے نیم پختہ مکانات کا سلسلہ تھا۔ جس میں کوئی ترتیب نہیں تھی۔

وہ مجھے اپنے ساتھ ایک چھوٹے سے مکان کے دروازے تک لے آیا۔ اس نے دستک دی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھل گیا۔

دروازہ کھولنے والا ایک نوجوان تھا۔ جو ہم دونوں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

''یہ ڈاکٹر صاحب ہیں۔'' اس شخص نے میرا تعارف کروایا۔ ''تمہاری بستی کی ڈسپنسری میں آئے ہیں۔ گل ریز کی ماں کو دیکھنے آئے تھے۔ تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''ہاں ہاں۔ اندر آ جائیں۔'' اس نے کہا۔ اس کی زبان صاف اردو تھی۔

میں اس مکان میں داخل ہو گیا۔ دو ہی کمرے تھے۔ ایک کمرے کے درمیان دو چار پائیاں بچھی تھیں۔ اس نے ہم دونوں کو اسی کمرے میں بیٹھنے کی دعوت دی تھی۔

''تمہارا بابا نور دین میرے ساتھ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تھا۔''

''جی صاحب۔ بابا خیر سے تو ہے نا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں خیر سے ہے۔ اسی نے مجھے صبح کا ناشتا کرا کر بھیجا ہے۔''میں نے بتایا۔

وہ مسکرا دیا۔''میرا بابا بہت اچھا ہے صاحب۔ اور میری بہن بھی بہت اچھی ہے۔''

''پھر بھی تم ان دونوں کو چھوڑ کر یہاں آکر رہنے لگے ہو؟''میں نے کہا۔

''جی صاحب یہ تو میری مجبوری ہے۔''اس نے کہا۔

''کیسی مجبوری؟''

''شادی جو ہوگئی ہے صاحب۔''اس نے کہا۔''میں یاسمین کو چھوڑ کر کہاں جاسکتا ہوں؟''

''میں نے سنا ہے کہ اس بستی میں جادو ہوتا ہے؟''میں نے پوچھا۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔''میں ایک بات بتاؤں صاحب۔ آپ پڑھے لکھے ہیں اسی لیے میری بات سمجھ لیں گے۔ اصل میں ہوا یہ کہ دونوں بستی والوں نے صرف ایک لفظ سیکھا ہے اور وہ ہے نفرت کا۔ اسی لیے جب محبت ان کے سامنے آتی ہے تو وہ انہیں جادو معلوم ہوتا ہے۔ یہ نفرت صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ نہ جانے کب سے۔ خدا جانے وہ کون بدبخت تھا جس نے دلوں کے درمیان نفرت کا بیج بویا تھا۔ جو آج تک پھل دے رہا ہے۔''

میں حیران ہو کر اس نوجوان کی باتیں سن رہا تھا جو بہ ظاہر غیر تعلیم یافتہ تھا لیکن جس نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔

''صاحب۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ محبت سے بڑا جادو کوئی نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں نا کہ جادوگر لوگ اپنے جادو سے پتھر کو بھی موم کر دیتے ہیں۔ تو محبت بھی سخت دلوں کو موم کر دیتی ہے صاحب۔ انسان آنسو بن کر آنکھوں کے راستے بہہ نکلتا ہے۔''

کیا بات کر دی تھی اس نے۔ کاش اس کی بات دوسرے بھی سمجھ سکتے۔

پھر اس نے آواز دی۔''یاسمین، یاسمین۔''

اندر سے اس کی بیوی نکل کر دوسرے کمرے میں آگئی۔ وہ ایک پیاری سی لڑکی تھی۔ اس علاقے کی آب و ہوا نے اس کے گالوں کا رنگ سرخ کر رکھا تھا۔

اس نے آکر بڑے سلیقے سے سب کو سلام کیا تھا۔

''یاسمین! یہ میری بستی کے نئے ڈاکٹر ہیں۔''اس نے میرا تعارف کروایا۔

''جی ڈاکٹر صاحب۔''

''جانتی ہو۔ یہ یہاں کیوں آئے ہیں؟ یہ معلوم کرنے آئے ہیں کہ تمہیں کون سا جادو آتا ہے۔''

''جادو؟''اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

''ہاں۔ وہی پرانی بات کہ اس بستی کے لوگ جادو کرتے ہیں۔ اور تم نے بھی مجھ پر جادو کر دیا ہے۔''

''جی ڈاکٹر صاحب۔ ہم جادو تو جانتے ہیں۔ لیکن ہمارا جادو نقصان پہنچانے والا نہیں ہوتا۔ بلکہ پیار دینے والا ہوتا ہے۔ پتا نہیں لوگ ایسا کیوں سمجھتے ہیں؟''

''اس لیے کہ جو بھی اس بستی سے تم لوگوں کے پاس آجاتا ہے وہ یہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔''

''اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم پیروں میں زنجیریں ڈال دیتے ہیں۔ لیکن یہ زنجیر لوہے کی نہیں ہوتی بلکہ پیار کی ہوتی ہے۔''

''یہ تو میں نے بھی دیکھ لیا ہے۔''میں نے کہا۔''اور یہ زنجیر بہت مبارک ہوتی ہے۔ خدا تم دونوں کو خوش رکھے۔''

پھر میں نے اس نوجوان کی طرف دیکھا۔''میں نوردین کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔''

''اس کے لیے تو آپ کو دو تین سو برس درکار ہوں گے صاحب۔''اس نے پھر ایک بڑی بات کہہ دی۔''صدیوں کی نفرتیں دو تین دنوں میں تو نہیں جائیں گی صاحب۔ اور ایک بات بتا دوں۔ یہ مسئلہ صرف اس بستی یا صرف ہماری بستی کا نہیں ہے... بلکہ نہ جانے کتنی بستیوں کا ہے۔ کتنے قبیلوں کا ہے۔ کتنے خاندانوں کا ہے۔ ہم اسی طرح ایک دوسرے کو جادوگر سمجھتے رہیں گے۔ ایک دوسرے سے نفرتیں کرتے رہیں گے۔ گولیاں چلتی رہیں گی۔ آپ کہاں تک کوشش کریں گے صاحب۔''

کمرے کی فضا بہت بوجھل ہوگئی تھی۔ وہ نوجوان پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن اس نے ایسی باتیں کی تھیں جو بہت کم کسی کی سمجھ میں آتی ہیں۔

''ایک بات بتاؤ۔''میں نے پوچھا۔''تم نے ایسی باتیں کہاں سے سیکھ لیں؟''

''محبت سے صاحب۔ جو لوگ محبت کرتے ہیں، اللہ ان کو بہت دور تک دیکھنے کی قوت دے دیتا ہے۔''

میں اور کچھ نہیں کہہ سکا۔ بہت کچھ بتا دیا تھا اس نوجوان نے۔

میں اپنی بستی واپس آگیا۔ ایک امید لے کر کہ شاید...

کبھی وہ دن بھی آئے جب دونوں بستیوں کے لوگ بلا خوف ایک دوسرے کی بستیوں میں آجا سکیں۔ اگر جادو بھی ہو تو پیار کا ہو...

❖❖❖

چالاک

شاکر لطیف

ہم شکل ہونا بھی کسی عذاب سے کم نہیں... وہ دونوں بھی ہم شکل تھے... ایک دانا دوسرا ناداں... ایمانداری سے زندگی گزارنے والے صاحبِ کردار پر شکوک کی پرچھائیاں پھیلا دی گئی تھیں... قتل سے شروع ہونے والی واردات کی سنسنی خیزی کے دلچسپ موڑ...

چالاکی سے روزی کمانے والے شخص کی انتہائی کارروائی

جان نے اپنے سامنے بیٹھے بوڑھے شخص اور نوجوان کو خشمگیں نگاہوں سے گھورا اور پھر نوجوان کی جانب متوجہ ہو کر بولا۔ ”یہ میری زندگی کا سب سے حیرت ناک واقعہ ہے۔ میں نے ایک انسان کو جان سے مار ڈالا تھا مگر اب وہ میرے سامنے جیتا جاگتا موجود ہے۔ میں اس بوڑھے کا یہ دعویٰ قبول کر لیتا ہوں کہ تمہارا نام مارٹی ہے مگر تم مورگن نہیں ہو، یہ میں کسی صورت تسلیم نہیں کر سکتا۔“

”تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا نوجوان تحمل سے بولا۔ ”میں مورگن نہیں بلکہ اس کا ہم شکل جڑواں بھائی ہوں۔“

”میرے سامنے تمہاری کوئی چال بازی نہیں چلے گی..... میں جانتا ہوں کہ تم مورگن ہی ہو مگر مجھے اصل حیرت اس بات پر ہے کہ پولیس بھی تمہاری موت کا یقین کر چکی ہے۔ ویسے تمہارے سر میں گولی مارنے کے بعد مجھے بھی تمہاری موت کا سو فیصد یقین تھا، اگر میں نے تمہیں آج اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو کبھی تسلیم نہ کرتا کہ تم زندہ ہو۔“

”یہ حقیقت ہے۔“ نوجوان نے کہا۔ ”میں نے تم سے جھوٹ نہیں بولا...... میں مورگن نہیں بلکہ اس کا جڑواں بھائی مارٹی ہوں۔“

”یہ سچ بول رہا ہے۔“ نوجوان کے ساتھ بیٹھا بوڑھا شخص مداخلت کرتے ہوئے بولا۔ ”اگرچہ میں اسے صرف ایک ماہ سے جانتا ہوں مگر یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کا نام مارٹی ہے۔ یہ وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو، تمہیں کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”میں تمہیں جانتا ہی نہیں تو پھر تمہاری بات کا یقین کیسے کر لوں؟ تم بھی اسی کے ساتھی ہو۔“ جان غصے سے بولا۔ ”زندگی بچانے کے لیے جھوٹ بول رہے ہو ویسے یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر میں نے اسے جان سے مار دیا تو میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں کسی چشم دید گواہ کو زندہ چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتا اگرچہ میں نے آج تک کسی بے گناہ انسان کو نہیں مارا مگر شاید آج مجھے اپنے اصولوں سے انحراف کرنا پڑے۔“

”مجھے اس بات کا کچھ اندازہ ہے۔“ بوڑھا شخص ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”یہ بھی حقیقت ہے کہ میں اس وجہ سے دل ہی دل میں خوف زدہ بھی ہوں کہ کوئی بھی قاتل قتل کرتے وقت کسی گواہ کو زندہ نہیں چھوڑتا مگر یہ حقیقت ہے کہ اس نوجوان کا نام مورگن نہیں مارٹی ہی ہے۔“

”تم اسے کب سے جانتے ؟“ جان نے سوال کیا۔

”تقریباً ایک ماہ سے جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔“

”کیا میں تمہارا نام پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں۔“ نوجوان مارٹی نے جان کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔

وہ کچھ دیر تک مارٹی کو گھورتا رہا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”خوب! مجھے چکر دینے کی اچھی کوشش ہے، تم نے تو مجھے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا ہے۔ میرا نام جان ہے اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو، تم میری بیوی فلاور

کے قاتل ہو اور میں تم سے بدلہ لینے آیا ہوں مگر اس سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میں نے تو تمہارے سر میں گولی ماری تھی پھر تم زندہ کیسے بچ گئے۔ پولیس نے بھی تمہیں مردہ قرار دیا تھا۔ تمہاری آخری رسومات بھی ادا کی گئی۔ وہ کون تھا جو تمہاری جگہ مارا گیا ہے اور تمہاری جگہ تابوت میں کسے دفن کیا گیا ہے؟ مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ گولی چلاتے وقت مجھے اتنا بڑا دھوکا کیسے ہوگیا؟''

''میری جگہ کوئی نہیں مارا گیا، میں مارٹی ہوں۔'' نوجوان پُراعتماد لہجے میں اپنی بات دہرائی۔ ''مگر تم نے میرے بھائی کی جان لے لی، یہ تم نے ظلم کیا ہے۔ میرے پاس خود کو مارٹی ثابت کرنے کا ناقابلِ تردید ثبوت موجود ہے۔''

اس کی بات سن کر جان بے اختیار قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ ''کیا تم نے مجھے بالکل گاؤدی سمجھ رکھا ہے؟ کیا تم یہ سوچ رہے ہو کہ میں تمہارا یہ احمقانہ دعویٰ تسلیم کرلوں گا۔'' بوڑھے نے کہا۔

''اگر تم مجھے اجازت دو تو میں اپنے کوٹ کی جیب میں موجود اپنا پاسپورٹ دکھا سکتا ہوں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میں مارٹی ہوں۔'' نوجوان نے کہا۔

''تم نے اپنے بال ڈائی کرائے ہیں، تمہارے بالوں کا رنگ اصلی نہیں ہے اور یہ بات میرے اس یقین کو مزید پختہ کرتی ہے کہ تم مور گن ہو مگر حیرت کی بات ہے جب میں نے تم پر گولی چلائی تھی تو اس وقت بھی تمہارے بالوں کی یہی رنگت تھی؟'' جان نے کہا۔

''میرے بال وقت سے پہلے سفید ہو گئے ہیں اس لیے میں اپنے بالوں کو ڈائی کرواتا ہوں۔ میرے کاغذات بالکل اصلی ہیں۔ تم پڑھے لکھے انسان دکھائی دیتے ہو، تمہیں آسانی سے اصل اور نقل کا پتا چل جائے گا۔'' نوجوان نے پُرزور لہجے میں کہا۔

''تمہاری یہ بات تو ٹھیک ہے۔'' جان، مارٹی کے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''مجھے کاغذات کے معاملے میں اصل اور نقل کی بڑی پہچان ہے کیونکہ میں ایک عرصے تک پراپرٹی کے بزنس سے منسلک رہا ہوں اور جرائم کی دنیا سے بھی ...... میری انگلی ٹریگر پر ہے اس لیے اپنے کوٹ کی جیب سے کوئی اور چیز نکالنے کی کوشش مت کرنا۔ ممکن ہے تمہارے پاس ریوالور ہو، میں نے ابھی تک تمہاری تلاشی نہیں لی ہے۔''

''میرے پاس کوئی ریوالور نہیں ہے اور نہ ہی میں

ریوالور جیسی خطرناک شے رکھنے کا عادی ہوں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں اور نوکری کر کے اپنی روزی کماتا ہوں۔'' نوجوان نے نرم لہجے میں کہا اور پھر اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا پاسپورٹ نکال کر جان کی طرف اچھال دیا۔ جان نے وہ پاسپورٹ کیچ کیا اور پھر اس کا جائزہ لینے لگا۔

تاہم پاسپورٹ کا جائزہ لینے کے دوران بھی وہ نوجوان اور اس کے ساتھ بیٹھے بوڑھے سے غافل نہیں تھا۔ اس نے اپنے ریوالور کا رخ بدستور ان دونوں کی طرف کر رکھا تھا۔

وہ آج جب اس گھر کے اندر داخل ہوا تھا تو یہ بوڑھا شخص اور نوجوان آمنے سامنے بیٹھے شطرنج کے کھیل سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ گن پوائنٹ پر انہیں قابو کرنا جان کے لیے کوئی مشکل کام ثابت نہیں ہوا تھا۔ گھر میں کوئی اور موجود نہیں ہے یہ تسلی کرنے کے بعد اس نے نوجوان اور بوڑھے کو بیٹھنے کی اجازت دے دی تھی تاہم کسی رسی سے ان کے ہاتھ وغیرہ باندھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اسے خود پر مکمل بھروسا تھا اور پھر وہ ہاتھ میں ریوالور تھامے ہوئے تھا جبکہ اس کے مدِمقابل موجود دونوں افراد غیر مسلح تھے۔

وہ جیسے جیسے کاغذات کا جائزہ لیتا گیا، اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات ابھرتے چلے گئے۔ ''مجھے اصل اور نقل کاغذات کی بڑی پہچان ہے اور یہ پاسپورٹ بالکل اصلی معلوم ہوتا ہے، اس پر تصویر بھی تمہاری ہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا، میرا دماغ چکرانے لگا ہے۔''

''اگر تم مجھے مورگن کا جڑواں بھائی تسلیم کرلو تو تمہاری ساری ذہنی الجھنیں دور ہو جائیں گی۔'' نوجوان نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔ ''کیا دنیا میں جڑواں بھائی نہیں ہوتے اور کیا اُن کی شکلیں آپس میں نہیں ملتیں، اگر میری شکل اپنے بھائی مورگن جیسی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں اس کے جرائم پیشہ ہونے کی وجہ سے ایک عرصۂ دراز سے اس سے نہیں ملا۔''

''میری نگاہ اتنا بڑا دھوکا نہیں کھا سکتی۔'' جان گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری ہر شے مورگن والی ہے، تمہارا لب و لہجہ، بولنے کا اسٹائل اور قد و قامت سب مورگن ہونے کی گواہی دیتا ہے۔''

''مگر میرے کاغذات مورگن والے نہیں، میرے کاغذات گواہی دے رہے ہیں کہ میں مورگن نہیں ہوں، دستاویزی ثبوت کے بعد تمہیں یہ بات تسلیم کر لینی چاہیے۔''

نوجوان نے پُرزور لہجے میں کہا۔

''تمہاری اور اس کی جان پہچان کیسے ہوئی؟'' جان بوڑھے شخص سے مخاطب ہوا۔

''ایک ماہ پہلے یہ میرا واقف بنا ہے۔'' بوڑھے رابرٹ نے جواب دیا۔ ''میں شطرنج کا بہت شوقین ہوں، اس کی اور میری ملاقات سمندر کے کنارے ہوئی جہاں میں اپنے دوست کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا، اس نے کھیلنے کی خواہش کا اظہار کیا تو میں نے اس کے ساتھ بھی ایک گیم لگائی اگرچہ میں جیت گیا مگر ساتھ ہی ساتھ اس کی شطرنج میں مہارت کا بھی قائل ہو گیا۔ میں نے اسے اپنے گھر آکر کھیلنے کی دعوت دی جو اس نے قبول کرلی۔ یہ اکثر میرے گھر آکر شطرنج کھیلتا ہے اور اسی وجہ سے ہمارا تعلق بن گیا۔ یہ شطرنج کا بہت اچھا کھلاڑی ہے، مجھے اس کے ساتھ کھیلنے میں مزہ آتا ہے۔ آج میں نے اسے بلایا تھا کیونکہ آج ہماری آخری گیم ہے، اس کے بعد نہ جانے ہماری کب ملاقات ہو کیونکہ آج اس کو آسٹریلیا چلے جانا ہے لیکن جب ہم کھیل رہے تھے تو تم کھلے دروازے کا فائدہ اٹھا کر اپنی گن سمیت اندر آدھمکے اور اب تم نے گن پوائنٹ پر ہمیں یرغمال بنا رکھا ہے ویسے یہ ایک سنگین جرم ہے۔'' رابرٹ نے بات کرنے کے دوران جان کو قانون سے ڈرانے کی بھی کوشش کی۔ تاہم جان پر اس کی بات کا کوئی خاص اثر نہ ہوا، وہ کچھ دیر تک رابرٹ کو گھورتا رہا پھر بولا۔

''تم یہ بتاؤ اس سے پہلے کہاں رہتے تھے؟'' جان نے سوال کیا۔

''میں ریاست ٹیکساس کا رہائشی ہوں اور عرصے سے وہیں رہ رہا ہوں۔ اب میں آسٹریلیا جارہا ہوں اسی لیے مجھے اپنے کچھ سفری کاغذات کے لیے لاس اینجلس آنا پڑا، اس جگہ رابرٹ سے ملاقات ہوئی جو شطرنج کے شوق کی وجہ سے دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ رابرٹ نے درست کہا ہے میں پچھلے ایک ماہ سے لاس اینجلس میں ہی مقیم ہوں۔ میں نے اس جگہ جو فلیٹ کرائے پر حاصل کیا ہے وہاں بھی میری شناخت مارٹی کے طور پر ہی کی گئی ہے۔ تم جانتے ہو کہ آج کل اچھی طرح چھان بین کرنے کے بعد ہی کسی کو فلیٹ کرائے پر دیا جاتا ہے کیونکہ بسا اوقات جرائم پیشہ افراد بھی اس طرح کے فلیٹس کرائے پر حاصل کر لیتے ہیں۔ بہرحال میں پچھلے ایک ماہ سے رابرٹ کے گھر آکر شطرنج کے کھیل سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔''

''تو تم یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ مجھے غلط فہمی ہوئی

ہے، تم مورگن نہیں بلکہ مارٹی ہو؟'' جان متذبذب لہجے میں بولا۔

''میرے خیال میں، میں ثابت کر چکا کہ میں مارٹی ہوں مورگن نہیں۔'' نوجوان نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ''آج سے پہلے میں نہ تمہیں جانتا تھا اور نہ تمہاری مرحوم بیوی کے نام کو...... تم ٹھنڈے دماغ سے غور کرو، پولیس نے یہ تسلیم کیا ہے کہ مورگن مر چکا ہے۔ کیا پولیس کو بھی دھوکا ہوا ہے، امریکی پولیس اتنا بڑا دھوکا کھا جائے یہ ناممکن ہے۔''

''اونہہ۔'' جان نے ہنکارا بھرا۔ ''مگر میں سو فیصد تسلی کرنے کے بعد ہی یہاں سے جاؤں گا۔ تم ریاست ٹیکساس میں کون سی جگہ پر رہتے تھے؟'' کچھ دیر کے توقف کے بعد جان نے سوال کیا تو نوجوان نے جگہ کا نام بتا دیا۔

''اوہ! اس جگہ کے بارے میں تو میں جانتا ہوں۔'' جان چونک کر بولا۔ ''اس جگہ تو میرا ایک دوست رہتا ہے اور میں ایک دفعہ اس سے ملنے وہاں جا بھی چکا ہوں، اب میں تمہارے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لوں گا۔ اب تمہارا کوئی دھوکا نہیں چلے گا، اگر تم واقعی مارٹی ہو تو اب ثابت ہو جائے گا، بصورت دیگر موت تمہارے سامنے کھڑی ہے۔''

''میں نے تم سے کوئی دھوکا نہیں کیا اور نہ ہی کسی قسم کی غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ میں تمہیں اپنا مکمل ایڈریس بھی بتا دیتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے مارٹی نے اپنا ایڈریس بھی بتا دیا۔ ''اس علاقے کا بچہ بچہ مجھے جانتا ہے، تم جیسے چاہو تسلی کر سکتے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

جان نے اس بار اس کی بات کا کوئی جواب دینے کے بجائے جیب سے موبائل نکال لیا اور کوئی نمبر ملانے لگا۔ مارٹی خاموشی سے اسے ایسا کرتے دیکھنے لگا تاہم اس کے چہرے پر اب امید کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

''ہیلو راک کیسے ہو دوست؟'' جیسے ہی دوسری طرف سے رابطہ ہوا جان نے نرم لہجے میں کہا۔

''راک میری بات غور سے سنو، اس وقت میرے پاس وقت نہیں ہے۔'' دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد جان بولا۔ ''یہ پتا نوٹ کرو اور مجھے بتاؤ اس پتے پر کون رہتا تھا، یہ پتا تمہاری ریاست ٹیکساس کا ہے۔ معلوم کرو کہ کیا ایک ماہ پہلے تک وہاں مارٹی نامی کوئی نوجوان رہائش پذیر تھا، اگر اس کی کوئی تصویر حاصل کر سکو تو میرے موبائل پر سینڈ کر دینا۔ مجھے تفصیلی معلومات درکار ہیں۔'' اس کے بعد جان نے دوسری طرف سے کچھ دیر بات سننے کے بعد

او کے کہہ کر فون بند کر دیا۔

''اب تمہارے بارے میں سب کچھ کنفرم ہو جائے گا اور یہ ثابت ہو جائے گا کہ تم نے سچ کہا ہے یا جھوٹ۔ ویسے تمہارا مورگن کا بھائی ہونے کا دعویٰ درست ہے تو تمہاری اور اس کی مماثلت میرے لیے حیرت انگیز ہے، شکل سے لے کر آنکھوں کی رنگت ماسوائے بالوں کے تمہاری ہر چیز تمہارے بھائی جیسی ہے۔''

''تم اسے میری بدقسمتی سے تعبیر کر سکتے ہو۔'' مارٹی مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہم دونوں میں صرف خون کا رشتہ تھا ورنہ ہمارے خیالات و افکار آپس میں کہیں بھی نہیں ملتے۔ وہ ایک جرائم پیشہ آدمی تھا جبکہ میں ایک شریف النفس نوجوان ہوں جو قانون کا احترام کرتا ہے اور قانون کی بالادستی پر یقین رکھتا ہے۔ میں اور مورگن اپنے والدین کی وفات کے بعد ہی علیحدہ ہو گئے تھے۔ وہ لاس اینجلس چلا گیا جبکہ میں ٹیکساس یعنی اپنی جنم بھومی میں ہی رہا، اس کے بعد ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوئی تاہم فون پر بات ہو جاتی تھی۔''

''تمہاری باتوں اور دلائل سے صرف نظر ممکن نہیں ہے۔'' جان متاثر کن لہجے میں بولا۔ ''اب مجھے بھی ہلکا ہلکا یقین ہونے لگا ہے کہ شاید تم مارٹی ہی ہو، اگر واقعی ایسا ہے تو میں تمہیں زندہ چھوڑ کر چلا جاؤں گا اور میں تم سے امید کروں گا کہ تم اس واقعہ کے بارے میں پولیس کو اطلاع دے کر مجھ سے دشمنی مول لینے کی کوشش نہیں کرو گے۔ مورگن نے میری بیوی کو مارا تھا اور میں نے اسے مار کر حساب چکتا کر دیا۔ یہ چند ماہ پہلے ہی کا واقعہ ہے۔''

''میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں کہ تمہارے ہاتھوں زندہ بچنے کے بعد پولیس کو یہ بتا کر کہ تم مورگن کے قاتل ہو تم سے مخاصمت مول لوں ویسے اگر تم اسے خود مارنے کے بجائے قانون کی مدد حاصل کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔'' مارٹی نرم لہجے میں بولا۔

''ہماری دنیا میں اپنا بدلہ خود لیا جاتا ہے، قانون کی مدد حاصل کرنا بزدلی تصور کیا جاتا ہے۔ ویسے بھی پولیس تفتیش میں مورگن پر شک نہیں کیا گیا، اس سے اس سلسلے میں نہ کوئی بازپرس کی گئی نہ اسے گرفتار کیا گیا۔ دراصل اس کے خلاف کوئی گواہ یا ثبوت نہیں تھا اور ہماری پولیس پہلے ثبوت ڈھونڈتی ہے پھر کسی کو گرفتار کرتی ہے۔''

''تو پھر تمہیں کیسے معلوم ہو گیا کہ تمہاری بیوی کو مورگن نے مارا ہے جبکہ پولیس کو بھی یہ اندازہ نہیں ہو سکا۔

یہ بھی تو ممکن ہے کہ تمہاری بیوی کو مورگن کے بجائے کسی اور نے مارا ہو؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے محض شبے کی بنا پر ہی میرے بھائی کو مار ڈالا ہو؟''

''نہیں میری بیوی کو اسی کمینے شخص نے قتل کیا ہے، وہ واحد آدمی تھا جو مجھ سے دشمنی مول لینے کی ہمت رکھتا تھا اگرچہ وہ میری ٹکر کا نہیں تھا۔'' جان تیز لہجے میں بولا۔

''اگر تم نے اسے اپنی آنکھوں سے قتل کرتے نہیں دیکھا تو پھر تم اسے قاتل کیسے قرار دے سکتے ہو۔''

''تمہارا بھائی ایک جرائم پیشہ شخص تھا اور میں جانتا ہوں کہ اس نے کئی لوگوں کی جان لی ہے مگر ہر بار عدم ثبوت کی وجہ سے پولیس سے بچ نکلتا تھا۔ اس بار بھی شاید وہ بچ نکلتا ہے مگر ایک شخص نے اسے میری بیوی کے گھر سے نکلتے دیکھ لیا تھا، اس شخص نے پولیس کو بتانے کے بجائے مجھے بتایا اور میں نے اسے منع کیا کہ وہ یہ بات پولیس کو نہیں بتائے گا کیونکہ میں مورگن سے خود بدلہ لینا چاہتا تھا۔ وہ حرامزادہ مورگن بہت عرصے سے میری بیوی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ فلاور نے بھی یہ بات مجھے نہیں بتائی۔ اگر وہ یہ بات مجھے بتا دیتی تو میں مورگن کی ٹانگیں توڑ دیتا۔ مجھے بہت اچھی طرح جانتا تھا وہ۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ بہت خوشگوار زندگی بسر کر رہا تھا بس ایک معمولی بات پر جھگڑا ہوا اور وہ مجھ سے علیحدہ رہنے لگی۔ میں اسے منانے کی کوشش کر رہا تھا، اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ یوں اچانک موت کا شکار ہو جائے گی۔ یقین کرو میری جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو وہ مورگن سمیت اس کے پورے خاندان کو مار ڈالتا۔ جرم کی دنیا میں بدلہ لینے کا یہی دستور ہے کہ بدلہ لینے کے لیے دشمن کے پورے خاندان کو ختم کر دیا جائے تاکہ آپ کے دوسرے دشمنوں پر آپ کی دھاک بیٹھ جائے لیکن میں اس طرح کی سوچ نہیں رکھتا، میں ایک اصول پسند آدمی ہوں اسی لیے میں نے ابھی تک تمہیں نہیں مارا۔''

''کسی بے گناہ کے خون سے ہاتھ رنگ کر تمہیں کیا ملے گا، تمہاری بیوی تو واپس نہیں آئے گی۔'' نوجوان نے کہا۔ ''حقیقت تو یہ ہے کہ آج میں اپنے اس بھائی کی وجہ سے پھنس گیا ہوں جس سے میں کبھی ملنے تک نہیں گیا مگر اس کے باوجود اس کے شر کا اثر مجھ تک پہنچ گیا۔''

''میرے خیال میں کچھ ہی دیر میں کنفرم ہو جائے گا۔'' رابرٹ نے ایک دفعہ پھر گفتگو میں مداخلت کی۔ ''اگر مارٹی نے اپنا پتا درست بتایا ہے تو پھر اس پر شک کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہ جاتی۔''

وہ تینوں اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔

اسی اثنا میں جان کے موبائل فون کی گھنٹی بجی تو اس نے اپنا موبائل فون جو کہ اس کے بائیں ہاتھ میں موجود تھا کان سے لگا لیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں اس کا ریوالور موجود تھا جس کا رخ بدستور مارٹی کی جانب تھا۔ ''راک، کیا تم مارٹی کے دوستوں سے بھی ملے ہو اور کیا تم نے اس کی تصاویر حاصل کر لی ہیں۔'' جان نے دوسری طرف کی آواز سنتے ہی اپنے اس دوست سے سوال کیا جس کو مارٹی کے بارے معلومات حاصل کرنے کا ٹاسک دیا تھا۔

''ٹھیک ہے، اس کی ایک تصویر میرے موبائل پر سینڈ کر دو۔'' دوسری طرف کا جواب سن کر اس نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا اور پھر ''اوکے'' کہہ کر فون کاٹ دیا۔ اس کے بعد وہ اپنے موبائل کا جائزہ لینے لگا اسے اب تصویر کا انتظار تھا۔ کچھ دیر میں ہی اس کے پاس تصویر پہنچ گئی تصویر دیکھتے ہی اس کے حلق سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ ''مجھ سے واقعی تمہیں پہچاننے میں غلطی ہوگئی مگر یہ حقیقت ہے کہ میں نے آج تک جڑواں بھائیوں میں اتنی مماثلت نہیں دیکھی۔''

''شکر ہے تمہیں یقین تو آیا۔'' نوجوان نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ ''ورنہ میں اپنے بھائی کے قصور میں ناحق مارا جاتا۔''

''میں جا رہا ہوں مگر جاتے جاتے یاد دہانی کروا دوں کہ پولیس کو مطلع کرنے کی بیوقوفی مت کرنا۔'' جان نے سخت لہجے میں کہا اور پھر کرسی سے اٹھ کر خارجی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ مارٹی اور رابرٹ چند منٹ تک خاموش بیٹھے رہے اگرچہ جان نے جاتے وقت دروازہ بند کر دیا تھا مگر رابرٹ یا مارٹی نے اٹھ کر دروازہ لاک نہیں کیا تھا شاید اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ خطرہ ٹل چکا ہے، اب جان واپس نہیں آئے گا۔

''شکر ہے یہ بلا تو ٹلی۔'' چند منٹ بعد رابرٹ نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ آج تم غلط فہمی میں مارے جاتے اور میں بھی ساتھ مفت میں مارا جاتا ویسے مجھے یقین ہے کہ میری بیوی کو میری موت پر کوئی دکھ نہ ہوتا۔''

''تمہاری بیوی کو اس کا دکھ ہوتا یا نہیں اس کا فیصلہ تو اس وقت ہوگا جب تمہاری بیوی کو تمہاری موت کی اطلاع ملے گی۔'' نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ویسے جان کی بیوی بہت ہی خوبصورت تھی، میں بہت طویل عرصے سے اس کا عاشق تھا مگر مجھے ہمیشہ اس کی بے اعتنائی کا سامنا کرنا

پڑا، اس نے آخری وقت تک مجھے گھاس نہیں ڈالی، بہت ہی مغرور عورت تھی وہ......"

"کیا مطلب؟" اس کی بات سن کر رابرٹ کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے آئی۔ "تم نے تو کہا تھا کہ تم اس کی بیوی کو جانتے ہی نہیں، وہ قصہ تو مورگن کا تھا تم تو مارٹی ہو۔"

"میں مارٹی نہیں ہوں میں مورگن ہوں۔" نوجوان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" رابرٹ نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ "کیا جان کو کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔"

"غلط فہمی تو اسے ہوئی تھی مگر آج نہیں اس دن جب اس نے میرے مغالطے میں میرے بھائی مارٹی کو قتل کر ڈالا تھا۔ اس کے بعد میرے لیے مارٹی بن کر زندہ رہنا ہی آسان تھا ورنہ جان میرا پیچھا کبھی نہ چھوڑتا، وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔"

"تو تم نے جان کے ساتھ ساتھ مجھے بھی دھوکا دیا ہے، میں پولیس کو اطلاع کر دوں گا۔" رابرٹ نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"ایسا تب ہی ممکن ہے جب میں تمہیں زندہ چھوڑ کر جاؤں گا۔" یہ کہتے ہوئے مورگن نے اپنے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ ریوالور کے منہ پر مخصوص نوزل بھی موجود تھی جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بے آواز پسٹل ہے۔

اس کے ہاتھوں میں ریوالور دیکھ کر رابرٹ کے چہرے پر خوف کے تاثرات ابھر آئے۔ یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پہلے مارٹی اور اب مورگن ہونے کے دعویدار اس نوجوان کے پاس کوئی ریوالور بھی ہو سکتا ہے جو ایک ماہ پہلے ہی اس کا دوست بنا تھا۔ "مگر تم مجھے جان سے کیوں مارنا چاہتے ہو؟" رابرٹ نے سوال کیا۔

"کیونکہ میں ایک جرائم پیشہ آدمی ہوں۔ جرم میری زندگی کا حصہ بن چکا ہے، آج میں ہمیشہ کے لیے امریکا کو چھوڑ کر جا رہا ہوں، اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ تمہیں مار کر تمہاری تجوری پر بھی ہاتھ صاف کرتا جاؤں۔ جاتے جاتے تمہاری دوستی کا کچھ فائدہ تو ہو جائے۔ جب تک تمہاری لاش دریافت ہو گی، اس وقت تک میں یہ ملک چھوڑ کر بہت دور جا چکا ہوں گا۔ تمہاری بیوی دوسرے شہر گئی ہے، تم سے ملنے کوئی آتا بھی نہیں اس لیے تعفن اٹھنے تک تمہاری لاش بھی دریافت نہیں ہو پائے گی۔"

"تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو نا؟" رابرٹ نے امید بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "جان نے تو تمہارے بارے میں مکمل تسلی کی ہے پھر ہی وہ واپس گیا ہے۔"

"میں تم سے کسی قسم کا مذاق نہیں کر رہا۔ مجھے حیرت ہے کہ میرے ہاتھوں میں ریوالور دیکھنے کے بعد بھی تم ایسا سوچ رہے ہو، چلو میں تمہیں پوری کہانی سناتا ہوں، مرنے سے پہلے تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارا یہ دوست کس قدر چالاک اور ذہین ہے۔ میں جان کی بیوی فلاور کا بہت پرانا عاشق تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس نے میری محبت کا جواب ہمیشہ نفرت سے دیا تھا۔ مجھے اس کی بے اعتنائی کا شدید قلق تھا اگر وہ جان جیسے غنڈے کی بیوی نہ ہوتی تو میں اسے زبردستی بھی حاصل کر لیتا مگر جان کے معاملے میں، میں بے بس تھا پھر مجھے ایک دن پتا چلا کہ وہ جان سے علیحدہ ہو گئی ہے، میرے لیے یہ بہت بڑی خوش خبری تھی اور میں یہ سوچ کر اس سے ملنے چلا گیا کہ اب وہ میری جانب مائل ہو جائے گی مگر اس نے اس بار بھی مجھے دھتکار دیا۔ میں نے اس کی نفرت کا بارہا سامنا کیا تھا مگر مجھے کبھی اتنا غصہ نہیں آیا تھا۔ اس دن نہ جانے مجھے کیا ہو گیا اور میں نے غصے میں آ کر اسے قتل ہی کر ڈالا۔ میں اسے مارنے کے لیے وہاں نہیں گیا تھا۔ اسے مارنے کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا مگر اس وقت تک پانی سر سے گزر چکا تھا، فلاور مر چکی تھی اور میرا اب وہاں سے فرار ہو جانا ہی بہتر تھا لہٰذا میں وہاں سے نکل بھاگا۔ میں نے کچھ دنوں کے لیے اپنا گھر بھی چھوڑ دیا اور روپوشی کی زندگی بسر کرنے لگا تاہم اس دوران مجھے یہ خبر ہو گئی کہ پولیس نے ابھی تک میرے گھر رخ نہیں کیا۔ یہ بات میرے لیے حوصلہ افزا تھی، مجھے لگا کہ پولیس کو مجھ پر شک نہیں ہوا تاہم اگر میں اسی طرح روپوش رہا تو علاقے سے میری عدم موجودگی انہیں میرے بارے میں شک میں مبتلا کر دے گی لہٰذا میں واپس اپنے گھر آ گیا، دو دن مزید گزرے تو مجھے تسلی ہو گئی کہ پولیس کو مجھ پر شک نہیں ہوا۔ اس وقت یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ مجھے اس دن فلاور کے گھر سے نکلتے ہوئے کسی نے دیکھا تھا اور اس نے یہ خبر جان تک پہنچا دی ہے۔ انہی دنوں ٹیکساس ریاست میں رہنے والا میرا جڑواں بھائی مارٹی مجھ سے ملنے آیا۔ وہ برسوں بعد مجھ سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ اس کی آمد میرے لیے حیران کن تھی تاہم میں نے اس کا پرتپاک استقبال کیا۔

"مارٹی نے مجھے بتایا کہ وہ امریکا چھوڑ کر ہمیشہ کے

لیے آسٹریلیا جا رہا ہے اور اسی لیے مجھ سے آخری بار ملنے آیا ہے۔ تاہم ابھی اسے کچھ ضروری کام نمٹانے کے سلسلے میں لاس اینجلس میں ایک ماہ تک رہائش رکھنی پڑے گی۔

”میں نے اسے آفر کی کہ وہ میرے گھر میں جب تک چاہے رہ سکتا ہے مگر اس نے معذرت کر لی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے شہر کے مضافاتی علاقے میں فلیٹ لے لیا ہے جس کا کرایہ بھی وہ ایڈوانس میں دے چکا ہے۔ اس نے مجھے اپنے فلیٹ کا پتا بھی بتا دیا اور کہا کہ جب تک وہ وہاں موجود ہے، میں اسے ملنے آسکتا ہوں۔

”میں نے مارٹی کو گھر میں بیٹھنے کا کہا اور خود بازار سے کچھ سامان وغیرہ خریدنے چلا گیا تاکہ مارٹی کے لیے کھانا وغیرہ تیار کرسکوں۔ خریداری کر کے جب میں واپس لوٹا تو میں نے اپنے گھر کے بالکل سامنے جان کو دیکھا، وہ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہی ہو رہا تھا، اسے دیکھ کر میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی، اس کی اس وقت یہاں آمد سے میرے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے بھی جنم لینے لگے، کہیں اسے یہ خبر تو نہیں ہوگئی کہ فلاور کو میں نے قتل کیا ہے۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر جا چکا تھا اس کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑی تھی لہٰذا میں بھی آگے بڑھ گیا مگر جیسے ہی میں اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ادھ کھلے دروازے کے اندرونی جانب میرے بھائی مارٹی کی لاش پڑی تھی۔ لاش کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ اسے دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ اسے گولی مار کر قتل کیا گیا تھا تاہم میں نے گولی چلنے کی آواز نہیں سنی تھی، جان نے شاید بے آواز ریوالور استعمال کیا تھا۔ مارٹی کی موت سے میں وقتی طور پر سکتے میں آگیا تھا۔ مجھے صورت حال کا ادراک کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ جان کو کسی طرح یہ بات پتا چل چکی تھی کہ فلاور کو میں نے قتل کیا ہے اور اس نے بدلے میں مارٹی کو اور اپنی دانست میں مجھے قتل کر دیا تھا مگر میں جانتا تھا جیسے ہی یہ عقدہ کھلے گا کہ میں زندہ ہوں وہ دوبارہ مجھے مارنے کی کوشش کرے گا۔ میں اپنے بھائی کی لاش کے پاس حیران و پریشان کھڑا ہوا تھا۔ پہلے میرے ذہن میں آیا کہ میں پولیس کو اطلاع کر دوں مگر پھر میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا اور مجھے ایک آئیڈیا سوجھا۔ بچپن کی طرح مارٹی اور مجھ میں آج بھی سو فیصد مشابہت پائی جاتی تھی۔ ہمارا لب ولہجہ بھی ایک جیسا تھا بس ایک بالوں کی رنگت کا فرق تھا اور یہ فرق بال ڈائی کروا کر دور کیا جاسکتا۔ پولیس فلاور کے قتل کی تفتیش کر رہی تھی اور یہ ممکن تھا کہ ان کی تفتیش کا رخ کسی بھی وقت میری جانب ہو جائے۔ جان کی طرف سے خطرہ اپنی جگہ موجود تھا۔ اسے جیسے ہی معلوم ہوتا کہ میں زندہ ہوں وہ پوری تندہی سے میرے پیچھے پڑ جاتا، میں کب تک اس سے بھاگتا رہتا۔ میں جیسے جیسے سوچتا گیا مجھے اپنا پلان سو فیصد کامیابی سے ہمکنار ہوتا دکھائی دینے لگا۔ کچھ دیر کی مزید سوچ بچار کے بعد میں نے اس پلان پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بھائی کی موت پر ماتم کرنے کے بجائے بھائی کی موت کا فائدہ اٹھانا بہتر تھا میں نے مارٹی کی تلاشی لی..... اس کی جیب سے فلیٹ کی چابی برآمد ہوئی۔ اس کے بعد میں نے اپنے گھر سے کیش اور ضروری سامان سمیٹا اور پھر اس گھر کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر وہاں سے نکل آیا۔ فلیٹ کا پتا مجھے مارٹی بتا چکا تھا لہٰذا مجھے وہاں تک پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ وہاں کی تلاشی لینے کے بعد مجھے وہاں وہ تمام کاغذات بھی مل گئے جن کی مدد سے مارٹی آسٹریلیا جانے کا پروگرام بنائے بیٹھا تھا۔ اب مجھے ان کاغذات کو استعمال کرنا تھا اور میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ کیسے کرنا ہے۔ اگلے دن میں نے بالوں کا کلر بھی چینج کروا لیا، اب مارٹی اور مجھ میں کوئی فرق نہیں رہا تھا۔ مارٹی نے اپنے کون سے ضروری کام نمٹانے کے لیے ایک ماہ تک لاس اینجلس میں رہنا تھا یہ مجھے نہیں معلوم تاہم میں چاہتا تو اس کے نام سے اگلے ہی دن آسٹریلیا روانہ ہوسکتا تھا مگر ایک وجہ سے مجھے رکنا پڑ گیا۔ مجھے اس کے فلیٹ سے اس کا پاسپورٹ اور دیگر سفری کاغذات مل گئے تھے، ساتھ ہی ساتھ اس کی چیک بک اور بینک کے دیگر کاغذات بھی ملے تھے‘ ان میں کچھ کاغذات پر اس کے دستخط بھی موجود تھے ان کاغذات کے مطابق اس کے اکاؤنٹ میں چار ہزار ڈالرز کی رقم موجود تھی۔ میں مارٹی کے روپ میں وہ رقم کیش کروا سکتا تھا مگر مارٹی کے دستخط کرنا میرے لیے اتنا آسان نہ تھا۔ اسی وجہ سے میں پچھلے ایک ماہ سے یہاں موجود ہوں۔ میں ایک ماہ سے مارٹی کے دستخط کرنے کی پریکٹس کر رہا تھا۔ اس دوران اس فلیٹ کا مالک بھی مجھ سے ملا جہاں میں مارٹی بن کر رہ رہا تھا اور یہ جان کر میرے اعتماد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا کہ وہ بھی مجھ کو نہیں پہچان پایا۔ کل میں مارٹی کے روپ میں بینک سے رقم نکلوانے میں کامیاب ہوگیا اس لیے میں نے آج کی فلائٹ بک کروالی۔ اگرچہ تم سے دوستی میں نے وقت گزاری کے لیے کی تھی مگر میں جاتے جاتے تمہاری تجوری پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہتا تھا۔ آج اسی پلان کے تحت

میں تمہارے گھر آیا تھا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ تمہیں لوٹنے کے بعد تمہیں جان سے مار دوں گا اور اس کے بعد آرام سے آسٹریلیا روانہ ہو جاؤں گا۔ اس وقت یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ میں جان کی نگاہوں میں آ جاؤں گا۔ اس نے مجھے تمہارے گھر داخل ہوتے دیکھ لیا اور پھر اچانک ہی کھلے دروازے کا فائدہ اٹھا کر اندر آ دھمکا۔ اسے دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ میرا سارا پلان فیل ہو گیا ہے، اب میرا زندہ بچنا محال ہے مگر پھر خیال آیا کہ اس وقت میں مورگن نہیں مارٹی ہوں اور میرا پاسپورٹ بھی میری جیب میں ہے، اس کے بعد کی بحث سے تم واقف ہو۔ میں نے مارٹی ہونے کا دعویٰ کیا اور اس کے پتے سے میں آگاہ ہی تھا اس لیے میں نے جان کو سب کچھ درست بتایا۔ جان نے ریاست ٹیکساس اپنے دوست کے ذریعے مارٹی کے بارے میں معلوم کیا اور تصویر بھی حاصل کر لی مگر ظاہر ہے وہ مارٹی کی تصویر اور مجھ میں کوئی فرق نہیں کر سکتا تھا اسی لیے دھوکا کھا گیا۔ میں نے بڑی چالاکی سے کام لیتے ہوئے اسے بے وقوف بنا دیا اور اب تمہاری تجوری کا صفایا کرنے کے بعد میں آرام سے آسٹریلیا روانہ ہو جاؤں گا مگر ساتھ ہی ساتھ تمہاری موت بھی ضروری ہے۔''

رابرٹ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ششدر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مورگن نے کس قدر چالاکی سے مارٹی کا روپ دھارا تھا اور جس کمالِ ہوشیاری سے جان کو ڈاج دیا تھا اس کا صحیح اندازہ اسے اب ہوا تھا۔

''تمہاری تجوری کی چابی کہاں ہے؟'' اسے خاموش بیٹھا دیکھ کر مورگن نے پوچھا۔

''تجوری کی چابی میرے پاس نہیں ہے۔'' رابرٹ نے جواب دیا۔ ''چابی میری بیوی کے پاس ہوتی ہے اور وہ اس شہر میں نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں، میں تجوری کو بغیر چابی کے بھی کھول سکتا ہوں، میں ایسے کاموں میں ماہر ہوں۔ آخر میری عمر ایسے کاموں میں ہی گزری ہے، اب اگلی دنیا روانہ ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' یہ کہتے ہوئے مورگن نے اپنے ریوالور کا رخ اس کی جانب کر دیا۔ رابرٹ نے بے اختیار اپنی آنکھیں بند کر لیں، اسے اپنی موت سامنے نظر آ رہی تھی، بچنا ناممکن تھا مگر اسی لمحے دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور جان اندر داخل ہوا، اس سے پہلے کہ مورگن کو خطرے کا ادراک ہوتا، جان کی چلائی گولی اس کی کھوپڑی کے آر پار ہو گئی۔

وہ کھڑے کھڑے زمین پر جا گرا۔ سر میں لگنے والی گولی نے اسے چند سیکنڈز میں ہی موت سے ہمکنار کر دیا تھا۔

جان نے دروازہ بند کیا اور لاک کر کے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا رابرٹ کے قریب آ گیا جو خوف زدہ نگاہوں سے اُسے تک رہا تھا۔

''یہ واقعی بہت چالاک تھا اس لیے وقتی طور پر مجھے دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا مگر یہ نہیں جانتا کہ میں اس سے زیادہ چالاک ہوں۔'' جان، مورگن کی لاش کی جانب دیکھتے ہوئے پُرخیال لہجے میں بولا۔

''میں نے اس کے اور تمہارے درمیان ہونے والی تمام بات چیت سنی ہے۔''

''مگر گھر کا دروازہ تو بند تھا اگرچہ لاک نہیں تھا مگر اتنی دور تک ہماری آواز نہیں جا سکتی، تم نے ہماری بات چیت کیسے سن لی؟'' رابرٹ نے حیرت اور خوف سے بھرپور لہجے میں پوچھا۔

جان اسے جواب دینے کے بجائے اس کرسی کی جانب بڑھ گیا جہاں وہ بیٹھا تھا اس نے کرسی کے نیچے ہاتھ ڈالا اور پھر اس کے ساتھ چپکی ہوئی ایک چھوٹی سی ڈیوائس برآمد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

''میں نے اس ڈیوائس کی مدد سے تم دونوں کی بات سنی ہے۔ یہ ایک جدید ڈیوائس ہے، اس کا اسپیکر میرے پاس ہے وہ بھی اس کی طرح بہت چھوٹے سائز کا ہے۔ اس ایجاد کی مدد سے میں چار سو میٹر دور بھی تم لوگوں کی گفتگو بہ آسانی سن رہا تھا کیونکہ میں جرائم کی دنیا سے منسلک ہوں اس لیے مجھے اس طرح کی سائنسی ایجادات استعمال کرنے کی عادت ہے۔ میں اکثر اس ڈیوائس کو اپنے دوستوں کے پاس چھپا دیتا ہوں اور پھر خود دور جا کر ان کی گفتگو سنتا ہوں اس طرح مجھے کھرے اور کھوٹے کی پہچان ہو جاتی ہے، کون پیٹھ پیچھے میری برائی کرتا ہے، کون اچھائی سب پتا چل جاتا ہے۔ یہ ہمیشہ میری جیب میں رہتی ہے اور میں اسے کسی بھی وقت استعمال کر سکتا ہوں۔ آج بھی میں نے اسے تم دونوں کی نظریں بچا کر کرسی کے نیچے چپکا دیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ مورگن آج مجھے دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں اسے مارٹی سمجھ کر یہاں سے جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ تاہم میں نے آخری چال کے طور پر یہ ڈیوائس اس کرسی کے نیچے چپکا دی تھی کہ ذرا سنوں تو سہی کہ یہ میرے جانے کے بعد تم

سے کیا بات چیت کرتا ہے، پھر جیسے ہی حقیقت کا علم ہوا میں واپس اس طرف آ گیا۔ جب اس نے تمہیں مارنے کا فیصلہ کرلیا تو میں گھر کے دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا اس لیے میں تیزی سے اندر داخل ہو گیا اور میں نے اسے کوئی موقع دیے بغیر شوٹ کر دیا۔ بہرحال اب یہ خبیث آدمی اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔'' جان نے اپنے آخری جملے حقارت بھرے انداز میں مورگن کی لاش کو تکتے ہوئے کہے۔

''اب تم میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والے ہو؟'' رابرٹ نے خوف زدہ سے لہجے میں پوچھا۔

''یہ تم پر منحصر ہے۔ میرے دل میں اب بھی تمہارے لیے نرم گوشہ موجود ہے میں اس کے بھائی مارٹی کو ناحق مار چکا ہوں۔ اب تمہیں نہیں مارنا چاہتا مگر مسئلہ یہ ہے کہ تم میرے جانے کے بعد پولیس کو مطلع کر دو گے۔'' جان نے متذبذب لہجے میں کہا۔

''میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔'' رابرٹ نے کہا۔ ''تم میرے محسن ہو، تم نے میری جان بچائی ہے اگر تم بروقت نہ پہنچتے تو مارٹی میرا مطلب ہے مورگن مجھے جان سے مارنے والا تھا، یہ انتہائی گھٹیا انسان تھا۔ اس نے اپنے بھائی کی موت اور میری دوستی کو بھی کیش کرنا چاہا۔ انسانیت جیسے جذبات ایسے لوگوں میں سرے سے ہی مفقود ہوتے ہیں۔ مجھے اس کے عبرتناک انجام پر کوئی افسوس نہیں ہے اب تمہاری مرضی ہے مجھے مار دو یا زندہ چھوڑ دو۔ اگر تم مجھے زندہ چھوڑ دو تو میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا، میں وعدہ کرتا ہوں کے اس قصے کو بھلا دوں گا۔''

''کیا میں تم پر اعتبار کر سکتا ہوں؟'' جان نے استفسار طلب نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا اصول ہے کہ میں نے آج تک.... کسی بے گناہ کو نہیں مارا اور میں چاہتا ہوں کہ آج بھی میرا یہ اصول قائم رہے۔ مارٹی بھی غلط فہمی میں مارا گیا تھا۔''

''میں تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔'' رابرٹ نے کہا۔ ''میں پولیس کو انفارم نہیں کروں گا مگر میں اس لاش کا کیا کروں؟''

رابرٹ کی بات سن کر جان کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''تمہارے سوال کو سن کر مجھے یقین آ گیا ہے کہ تم واقعی میں پولیس کو مطلع نہیں کرو گے، تمہیں اب بس اتنا کرنا ہے کہ اس لاش کو میری کار کی ڈکی میں منتقل کرنے میں میری مدد کرنی ہے، لاش کو میں خود ٹھکانے لگا لوں گا اس کے بعد تم اس واقعے کو ہمیشہ کے لیے بھول جانا اور مارٹی اور مورگن کو بھی۔''

''او کے تو پھر ایسا کرو کہ اپنی کار میرے گھر کے سامنے لے آؤ۔ میں گیراج کا گیٹ کھولتا ہوں تم کار اندر لے آنا اور میں گیٹ بند کر دوں گا اس کے بعد ہم گھر کے اندر سے ہی اس لاش کو کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر تمہاری کار کی ڈگی میں منتقل کر دیں گے۔'' رابرٹ نے کہا۔

یہ اچھا آئیڈیا ہے۔'' جان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں کار لے کر آتا ہوں وہ کچھ دور کھڑی ہے اس وقت تک تم دروازہ اندر سے لاک کر دو تاکہ اچانک کوئی اندر نہ آ جائے۔'' جان نے کہا۔

''مجھ سے ملنے ویسے تو کوئی نہیں آتا بس یہ مورگن ہی تھا جو مارٹی کے روپ میں آ جاتا تھا تاہم پھر بھی میں دروازہ اندر سے لاک کر لیتا ہوں، تم کار گیراج میں لے آؤ اور پھر گیراج کے راستے ہی ادھر آ جانا، میں بوڑھا آدمی ہوں اکیلا اس لاش کو اٹھا کر گیراج تک نہیں لا سکوں گا، مجھے تمہاری مدد درکار ہوگی۔'' رابرٹ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا اور پھر جان کے ہمراہ دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

''ویسے میں اس پوزیشن میں تو نہیں ہوں کہ تم سے کچھ مانگ سکوں مگر کیا تم یہ ڈیوائس اور اس کا اسپیکر مجھے دے سکتے ہو؟'' دروازے کے پاس پہنچ کر رابرٹ نے متذبذب لہجے میں کہا تو جان بے اختیار چونک پڑا۔

''ہاں مگر تم اس کا کیا کرو گے؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''دراصل میری بیوی اکثر اپنی دوست خواتین کو اپنے گھر بلاتی ہے اور پھر اُن کے ساتھ اپنے کمرے کو اندر سے بند کر کے گپ شپ کرتی ہے، میں نے کان لگا کر اُن کی باتیں سننے کی بہت کوشش کی ہے مگر مجھے ہمیشہ ناکامی ہوئی ہے اگر تم مجھے یہ جدید ڈیوائس دے دو تو میں اسے اس کے کمرے میں چھپا کر بہ آسانی اس کی گفتگو سن سکوں گا اس طرح مجھے پتا چل جائے گا کہ وہ اپنی سہیلیوں کو میرے بارے کیا کہتی ہے۔'' رابرٹ نے جھجکتے ہوئے اور کھسیانے لہجے میں کہا تو جان چند لمحوں تک حیرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا اور پھر اس کے حلق سے بے ساختہ ایک قہقہہ برآمد ہوا۔

''ارے تم تو مورگن اور مجھ سے بھی زیادہ چالاک ہو۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس بار اس کی ہنسی میں رابرٹ کی کھسیانی ہنسی بھی شامل ہو گئی۔

❖❖❖

دیر آید

ڈاکٹر سبا ارشد

انسان خوبصورت اور عجیب و غریب عادات کا مجموعہ ہے... کبھی کسی عادت کی بدولت کامیابی کے زینے عبور کر لیتا ہے... اور کبھی کسی عادتِ بد کے باعث ہمیشہ زندگی کی آخری قطار میں کھڑا نظر آتا ہے... ایسے ہی ایک کردار کی جھلک... جس کی ایک عادت نے اس کی زندگی میں بگاڑ پیدا کر دیا تھا...

[illegible]

بائیک کھڑی کرتے ہی میں بھاگتے دوڑتے پہلی منزل کی جانب گامزن تھا۔ ٹریفک میں پھنسے میں نے کئی دفعہ گھڑی پر نگاہ ڈالی تھی اور ہر لمحہ دل سے خیریت کی دعائیں نکل رہی تھیں، جی چاہ رہا تھا کہ وقت تھم جائے لیکن وقت کا کام تو تیزی سے گزرنا ہی ہوتا ہے۔ میں جتنی جلد منزل تک پہنچنا چاہتا تھا اتنی ہی دیر ہو رہی تھی۔ چوک پر ٹریفک کی مجموعی رفتار کم ہوئی تو میں نے بائیک فٹ پاتھ پر چڑھا دی اور ٹریفک اہلکار کی غصیلی نظروں کی پروا کیے بغیر

نکل گیا۔ وہ میرے خاندانی اطوار پر زیرِ لب ''روشنی'' ڈالنے لگا۔ اس کے بعد گھڑی دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ منزل تک پہنچ کر میں نے اوپر جانے سے قبل نگاہ ڈالی۔

''اوہ شٹ نو بیں ہو گئے۔'' بوکھلا کر پہلی منزل پر دوڑ لگائی۔ گو کہ لفٹ موجود تھی لیکن اس کا کھڑے ہو کر انتظار کرنے میں جتنا وقت لگتا، اتنے میں اوپر پہنچا جا سکتا تھا اور ویسے بھی پہلی منزل پر اکثر لفٹس رکتی ہی نہیں۔ لفٹ مین ہی پہلی کا لفظ سن کر گھور کر دیکھنے لگتا ہے اور آپ کو اوپر سے نیچے دیکھ کر کوئی ''ڈس ایبلیٹی'' تلاش کرتا ہے۔

راہداری میں پہنچ کر میں اپنی جگہ جامد ہو گیا۔ امید ایک دم مایوسی میں ڈھل گئی۔ بے شمار لوگ سامنے سے آرہے تھے اور خوش گپیاں کرتے میرے دائیں بائیں سے نکل رہے تھے۔ لیکن مجھ پر اوس انعم کو دیکھ کر پڑ گئی تھی جو گھورتی ہوئی میری طرف آرہی تھی۔

''ڈبا لینے آئے ہو؟ اب تو ڈبے ہی بٹ رہے ہیں جا کر اپنا لے لو۔ تمہارا ابھی ہے۔'' اس نے پڑا کا ڈبا لہراتے ہوئے کہا اور ٹک ٹک کرتی غصے سے نکل گئی۔

سیمینار تو مقررہ وقت سے بھی قبل ختم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

میرا نام لطیف ہے لیکن میری عادتوں کے طفیل مجھے یار لوگ لیٹ لطیف کہتے ہیں اور ایسے میں لطیفے جیسی صورتِ حال پیدا ہو جائے تو لیٹ لطیفہ کہنے میں بھی حرج نہیں سمجھتے۔

ہر جگہ مقررہ وقت سے انتہائی تاخیر سے پہنچنا میری پرانی عادت ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پختہ ہوتی جا رہی ہے۔

الارم میں اسنوز کا بٹن میرے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔ لیکن خرابی تب ہوتی ہے جب نیند میں ہاتھ اسنوز کے بجائے اسٹاپ پر پڑ جائے اور اطمینان سے پھر گھوڑے یہ سوچ کر بیچ دیے جائیں کہ ابھی الارم جگا دے گا پھر وہ الارم مختلف لوگوں کی کالز کی صورت ہی میں بجتا ہے جس میں پوچھا جاتا ہے کہ کہاں رہ گئے۔ اب انہیں یہ جواب تو نہیں دیا جا سکتا کہ سوتے رہ گئے۔ لہٰذا کہہ دیتا ہوں کہ راستے میں ہوں، دس منٹ میں پہنچتا ہوں۔

کبھی کبھی الارم کو بھی شرارت سوجھ جاتی ہے اور ایک آدھ دن وہ چھٹی کر لیتا ہے۔ الارم کے عادی افراد کو اس کا تجربہ ہو گا۔ ایسے میں آپ کی چھٹی بھی پکی ہو جاتی ہے۔ معاملہ حساس نوعیت کا ہو تو ہمیشہ کی چھٹی بھی ہو سکتی ہے۔ خیر، تو بات ہو رہی تھی تاخیر سے آنے کی۔ میرے دوست میری اس پختہ عادت سے اس قدر تنگ ہیں کہ کہیں گھومنے پھرنے کا پلان ہوتا ہے تو مجھے طنزیہ ایک گھنٹا قبل پہنچنے کا کہتے ہیں۔ بہرحال چونکہ مجھے علم ہوتا ہے کہ میرے لیے خصوصی وقت مقرر کیا گیا ہے لہٰذا انہیں سبق سکھانے میں اپنے لیے طے شدہ وقت سے دو گھنٹے بعد پہنچتا ہوں۔ ایک گھنٹا ان کے مطابق وقت کرنے کے لیے اور ایک گھنٹا اپنی روٹین لیٹ لگانے کے لیے......

☆☆☆

''پھر سب صبح پانچ بجے پہنچ جانا۔'' علی نے ہاتھ ہلا کر سب کو تاکید کی۔

''پانچ بجے۔'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''اوہ، میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم لیٹ لطیف ہو پانچ بجے تو تمہیں پریاں جھولا جھلا رہی ہوتی ہیں۔'' علی نے طنزیہ کہا اور باقی سب ہنسنے لگے۔

''یہ بات نہیں ہے لیکن پانچ بجے بہت جلدی نہیں ہو جائے گا؟'' میں مشکوک تھا۔

''ہرگز نہیں۔ ساحلِ سمندر پر پورا دن پکنک منانے والے اتنی صبح ہی نکلتے ہیں بلکہ تم تو ذہن میں چار بجے کا وقت ہی رکھو جب ہی پانچ تک پہنچ سکو گے۔'' شہزاد نے سنجیدگی کی اداکاری کرتے کہا۔

''تم لوگ مجھے پانچ کا اسی لیے کہہ رہے تا کہ چھ بجے تک سب پہنچو۔'' میں نے آنکھیں نکالیں۔

''اس خوش فہمی میں نہ رہنا۔'' فارس نے فوراً ٹوکا۔

''بیچ پر صبح ہمیں جلدی پہنچنا ہے۔ پانچ ساڑھے پانچ تک نکلیں گے تو سات تک پہنچیں گے اور تفریح کر سکیں گے اگر دس گیارہ تک ہی جانا ہے تو رہنے ہی دو۔'' اس کا انداز حتمی تھا۔

میں مشکوک نظروں سے سب کو دیکھنے لگا۔

صبح سویرے پکنک کا پروگرام تھا۔ علی نے ساحلِ سمندر پر ہٹ بک کرا لیا تھا۔ صبح پہنچنے اور ساحل پر چہل قدمی کے بعد شام میں باربی کیو کے بعد واپسی کا پلان تھا۔ شامی نے ایک ہائی روف کرائے پر لے لی تھی تا کہ سامان سمیت آسانی سے جایا جا سکے لہٰذا صبح اس کے گھر کی طرف پہنچنے کے لیے ایک مقام طے کر لیا گیا تھا۔

''یار یہ بہت جلدی ہے، تم لوگ بطور سازش مجھے اتنی صبح کا ٹائم دے رہے۔'' میں نے کہا۔

''چل پھر تو آٹھ بجے ہی پہنچنا اور اکیلے آنا ہم انتظار نہیں کریں گے۔'' شیراز تو بُرا مان گیا۔

بہرحال میں نے بے دلی سے انہیں یقین دلایا کہ میں صبح پانچ بجے پہنچنے کی پوری کوشش کروں گا۔ وہ سنجیدہ لگنے کی پوری کوشش کر رہے تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے ستانے کو ایسا کر رہے ہیں اور مجھے چھوڑ کر بھلا کیسے جا سکتے تھے؟

میں نے آرام سے پانچ بجے کا الارم سیٹ کیا۔ سوچا یہی تھا کہ چھ تک مطلوبہ مقام تک پہنچ جاؤں گا اور اس اطمینان کے ساتھ سو گیا کہ مجھے ہمیشہ کی طرح ایک گھنٹا قبل کا وقت دیا گیا ہے۔

پانچ بجے الارم پر میں نے اپنی عادت کے مطابق دس منٹ کا اسنوز لگایا اور پھر سو گیا۔

دس کے بجائے دوسرے ہی لمحے فون بجنے لگا۔ میں حیرت سے سوچنے لگا کہ دس منٹ اتنی جلدی کیسے گزر سکتے لیکن وہ تو فارس کی کال تھی۔ میں نے گھبرا کر ریسیو کی۔

''لطیف تم کہاں ہو ابھی تک نہیں پہنچے؟'' اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''میں، میں...... میں بس راستے میں ہوں، دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔ میں واقعی حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

''فوراً پہنچو ورنہ ہم نکل جائیں گے۔'' اس نے تاکید کی اور فون بند کر دیا۔

میں نے بستر چھوڑنا چاہا لیکن اگلے لمحے سوچا۔ یقیناً یہ لوگ مجھے بے وقوف بنا رہے ہیں۔ خود بھی نہیں پہنچے ہوں گے بس مجھے ٹینشن دے رہے ہیں۔ بھلا اتنا صبح کون پہنچ سکتا ہے۔ میں نے اسنوز الارم پر ہی اٹھنے کا ارادہ کیا اور پھر لمبی تان کے سو گیا۔ دو دفعہ اسنوز کے بعد میں آرام سے اٹھا لیکن فارس کی کال پھر آ رہی تھی۔

''تیرے دس منٹ ابھی تک نہیں ہوئے۔'' اب آواز میں غصہ نمایاں تھا۔

''ہو گئے یار بس پہنچ گیا۔'' اس دفعہ میں واقعی گھبرا گیا تھا۔ یہ کہہ کر میں نے فون پھینکا اور دوڑ کر واش روم کی راہ لی، ہلکا سا ابھی بھی شک تھا کہ یہ لوگ شرارت نہ کر رہے ہوں۔

ان کو بھی مزہ چکھاتا ہوں۔ میں اطمینان سے تیار ہونے لگا، چھ بجے علی کی کال آ گئی۔

''تو نہیں آ رہا نا۔ سوتا پڑا رہ۔ ہم نکل رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''ارے بس نکل گیا، پہنچ رہا ہوں۔''

''صبح پانچ بجے سے ٹوپیاں کرا رہا ہے، اب سوچا آرام سے ہم جا رہے ہیں۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''ارے صرف دس منٹ لگیں گے۔'' میں نے بائیک کو کک لگائی۔

''نہیں رہنے دے تجھ سے نہ ہوگا، پانچ بجے سے دس منٹ ہی کہے جا رہا۔''

''آ گیا بس میری جان۔'' میں نے فون رکھ دیا۔

اب حالات کی نزاکت کا احساس ہو رہا تھا، علی واقعی برہم تھا جبکہ مطلوبہ مقام کا راستہ ہی بیس منٹ کا تھا۔

صبح سویرے اور چھٹی کے دن کی وجہ سے سڑکیں خالی تھیں لیکن اچانک بائیک گھرر گھرر کر کے رک گئی۔ پیٹرول ختم ہو گیا، یہ خیال آتے ہی میرا سر بھک سے اڑ گیا۔ رات میں ٹنکی فل کرانا تو یاد ہی نہ رہا تھا۔ میں نے پرانا طریقہ استعمال کیا اور بائیک ''لٹا'' دی اس طرح دو چار منٹ تک مزید چل جاتی۔ ابھی یہ کارروائی جاری تھی کہ شہزاد کی کال آ گئی۔

''ہم نکل جائیں پھر؟'' اس نے گویا اجازت لی۔

''یار پیٹرول ختم ہو گیا ہے، دس منٹ انتظار کر لو۔'' میں نے بے چارگی سے کہا۔

''شاباش ہے۔'' اس نے طنزیہ کہا۔

''اب تم پیٹرول بھروا کر واپس چلے جانا کیونکہ ہم نکل رہے ہیں۔'' اس نے انتہائی بے مروتی سے کہا۔

''ایسے کیسے نکل رہے ہو...... مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ میں بس آ رہا۔'' یہ کہہ کر میں نے بائیک جھٹکے سے سیدھی کی اور اسے گویا گھسیٹتے ہوئے اسٹارٹ کیا۔

رو پیٹ کر میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں سب کو جمع ہونا تھا لیکن وہ سب غائب تھے۔ میں نے گھڑی دیکھی سات بج چکے تھے۔

'یہ لوگ واقعی مجھے چھوڑ کر چلے گئے' میں نے دلگیر ہو کر سوچا ایسا کیسے ہو سکتا ہے ادھر اُدھر کہیں ہوں گے میں نے خود کو تسلی دی اور علی کو فون گھمایا۔

''کہاں ہو تم لوگ؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''تو پہنچ گیا؟'' اس نے مشکوک ہو کر پوچھا۔

''ارے ہاں نا۔ تم سب کدھر کھڑے ہو۔''

''ہم تو کب کے نکل چکے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''کک کیا مطلب؟ تم لوگ واقعی مجھے چھوڑ گئے؟''

میرا دل ڈوب گیا اور دوستوں کی بے وفائی والے کئی گانے

دماغ میں گھومنے لگے۔
''ہاں تو۔ ہم نے سوچا ایک دفعہ تجھے سبق سکھا ہی دیا جائے۔'' اس نے حتمی انداز میں کہا۔
''مجھے یقین نہیں آرہا کہ ایسے دوست بھی ہوتے ہیں جو دوستوں کو چھوڑ جاتے ہیں۔'' میں نے رُندھی آواز میں کہا۔
''چل تو بیٹھ کر افسوس کر۔'' اس نے مزے سے کہا۔
''گاڑی واپس گھماؤ اور مجھے پک کرو۔'' میں نے غصے سے کہا۔ پھر بے چارگی سے اضافہ کیا۔ ''میری بائیک میں تو پیٹرول بھی نہیں کہ تم لوگوں کے پیچھے آسکوں۔''
''اچھا انتظار کر، ہم پہنچتے ہیں آٹھ تک۔'' اس نے آرام سے کہا۔
''کیا مطلب؟'' میرا پارا ایک دم بلند ہوا۔ ''کدھر مرے ہو تم سب؟''
''ہم گھر سے نکل رہے ہیں۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔
''کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے بے ساختہ چلاّ کے کہا۔
''بیٹا ہر دفعہ ہمیں گھنٹا انتظار کراتا ہے آج تو ذرا ایک گھنٹا کر لے ہم آٹھ تک پہنچ جائیں گے۔'' اس نے مزے سے کہا۔
''کمینے' میں واپس جا رہا ہوں پھر......'' میرا پارا ساتویں آسمان پر تھا۔
''چلا جا......لیکن سوچ لے پھر آج تو نے ہمارا انتظار نہ کیا تو ہم بھی پھر کبھی تیرا انتظار نہیں کریں گے۔'' اس نے فون رکھ دیا۔
یہ آخری دھمکی کارگر تھی چونکہ مجھے یقین تھا کہ میری عادت نہیں بدل سکتی لہٰذا پیچ و تاب کھاتا ایک گھنٹے اُن کا انتظار کرتا رہا۔

☆☆☆

اس سب کے باوجود میری لیٹ ہونے کی عادت نہ بدل سکی۔ یار دوست تو اس طرح بدلہ لے ہی لیتے تھے لیکن انعم میری اس عادت سے واقعی تنگ تھی۔
انعم میری یونیورسٹی کے پہلے سال میں دوست بنی تھی انجینئرنگ ساتھ کرنے کے بعد ہم نے جاب کے لیے بھی ہر جگہ ساتھ ہی سی وی جمع کرائی تھی۔
ایک جگہ انٹرویو والے دن سب کو دس بجے کا وقت دیا گیا تھا جبکہ میں ساڑھے دس پہنچا تھا۔ انتظار گاہ میں کچھ اور تازہ گریجویٹ بھی موجود تھے۔ انعم بھی ایک طرف منہ بنائے بیٹھی تھی۔
''اب ایسی جگہوں پر لیٹ آنے میں بھلا کیا ناراضی؟ یہاں تو لیٹ آنے میں ہی عقلمندی ہے اب دیکھو انتظار ہی کرنا ہے نا باری کا۔'' میں نے بے پروائی سے اس کے پھولے منہ کے ساتھ استقبال کرنے کے جواب میں منطق پیش کی۔
''وہ فارم لے لو وہاں سے اور بھر لو سب نے جمع بھی کرا دیا ہے اور اس کے ٹائم کے مطابق ہی انٹرویو ہوگا اب پتا نہیں تمہیں دیتے بھی ہیں کہ نہیں؟'' اس نے غصے سے ایک کاؤنٹر کی طرف اشارہ کیا۔
میں کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔
کاؤنٹر پر ایک چھوٹا سا فارم فل کرنا تھا جس پر ذاتی معلومات وغیرہ سے متعلق سوال تھے۔ میں نے وہ بھر کر پوچھا۔ ''ابھی کتنی دیر لگے گی۔''
''بس شروع ہونے والے ہیں۔'' ریسپشنسٹ نے کہا۔
انعم کا دوسرا ہی نمبر تھا جبکہ مجھے تمام امیدواروں کے بعد بلایا گیا کیونکہ میرا فارم آخر میں جمع ہوا تھا۔ انعم میرے فارغ ہونے کا انتظار کرتی رہی اور پیچ و تاب بھی کھاتی رہی۔ کئی دفعہ اس نے پرس اٹھا کر خاموش دھمکی دی کہ وہ جا رہی ہے لیکن میں نے اشاروں کنایوں میں منت سماجت کر کے روک لیا۔
باہر نکلتے ہی وہ پھٹ پڑی۔
''مجھے تو لگتا ہے ساری عمر تمہارا انتظار ہی کرنا پڑے گا، ہر چیز میں لیٹ ہو تم۔''
''بے فکر رہو شادی سے پہلے لڑکیوں کو انتظار کرنا پڑتا ہے اس کے بعد تو ساری عمر شوہر بے چارے ہی انتظار کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔
''تمہاری عادت جتنی پکی ہے اس سے آثار تو یہی لگ رہے کہ میں ہی کھڑی انتظار کیا کروں گی بلکہ تمہیں مزید اطمینان ہو جائے گا کہ اب چڑیا کو تو قید کر ہی لیا ہے، اس نے اُڑ کر جانا کہاں ہے۔'' وہ جلے کٹے لہجے میں بولی۔
''ارے رہنے دو بلکہ میری یہ دیر کی عادت سے تمہیں سراسر فائدہ ہی ہوگا۔''
''اچھا وہ کیسے؟'' وہ اچنبھے سے بولی۔
''اب دیکھو نا شوہر حضرات تو دس منٹ میں تیار ہو جاتے ہیں اور خواتین کو میک اَپ کے لیے وقت چاہیے ہوتا ہے۔ میں جتنی دیر کروں گا تمہیں میک اَپ کے لیے اتنا وقت

مل جائے گا۔'' میں نے مثبت پہلو کی طرف توجہ دلائی۔
''ہونہہ میں پورا بیوٹی پارلر بھی تھوپ لوں تو تمہاری جتنی ''رفتار'' تک نہ پہنچ سکوں گی۔'' اس نے طنز کیا۔
''واقعی ایسا ہی لگ رہا ہے کیونکہ سارا بیوٹی پارلر تھوپنے کے باوجود تم یہاں مجھ سے گھنٹا پہلے ہی پہنچی ہو۔'' میں نے غور سے اسے دیکھ کر سر کھجایا۔
''شٹ اَپ، میں نے صرف لپ اسٹک ہی لگائی ہے۔'' وہ ناراض ہوئی۔
''واقعی تم تو نیچرل بیوٹی ہو۔'' میں اسے مزید ناراض نہیں کرسکتا تھا۔ ''ویسے میری دیری کا ایک مزید مثبت پہلو بھی ہے، کہو تو عرض کروں؟''
''ویسے تو کچھ بونگا سا ہی ہوگا لیکن پھر بھی بتا دو۔'' اس نے منہ بنایا۔
''تمہیں میکے سے پک کرنے میں دیر کردوں گا تو تمہیں زیادہ دیر رکنے کا موقع مل جائے گا۔''
''ہاہا...... لیکن چھوڑنے میں بھی تو دیر کردو گے نا تو حساب برابر ہوجائے گا۔'' اس نے لاجواب کردیا۔
''یہ بھی ہے۔''
''لیکن لطیف میں تمہیں پہلے بتا رہی ہوں، تمہیں یہ اپنی عادت بدلنی ہوگی اور ہاں جلد رشتہ بھجوا دو اگر تم نے شادی میں بھی دیر کی تو میں نے کسی اور سے بیاہ کرلینا ہے۔'' اس نے وارننگ دی۔
''ارے شادی میں کون تاخیر چاہتا ہے لیکن میرے جیتے جی تم کہیں اور بیاہ کرکے تو دکھاؤ۔'' میں نے سینہ تان کے کہا۔
''تم لیٹ لطیف رہے تو کرنا ہی پڑے گا۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔
''ٹھیک ہے کرلینا، میں بھی شادی میں آکر نعرہ لگا دوں گا کہ یہ شادی نہیں ہوسکتی۔'' میں نے اسٹائل مارا۔
''تم وہاں بھی رخصتی کے بعد ہی پہنچو گے۔ پھر خالی اسٹیج پر بیٹھ کر ہاتھ ملنا۔'' اس نے موقع پر پھر چوکا مار دیا۔
''ارے نہیں اب اتنے بُرے حالات بھی نہیں ہیں۔ کم از کم کھانا کھلنے تک تو لازمی پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے ڈھٹائی سے کہا۔
''واقعی میں بھول ہی گئی تھی کہ تم تقریبات میں عین کھانے کے ٹائم ہی پہنچتے ہو۔''
میں شرمندہ کم ہی ہوتا تھا لہٰذا اب بھی نہ ہوا۔

☆☆☆

خیر زندگی اسی طرح گزر رہی تھی اور میں لیٹ لطیف برقرار تھا اکثر خود کو سمجھاتا رہتا تھا۔
ہمیشہ تہیہ کرتا کہ کچھ بھی ہو اب وقت پر پہنچنا ہے لیکن دن کے ٹائم تو پھر بھی وقت پر آمد ہوجاتی لیکن صبح اٹھنا ہمیشہ مشکل ہوجاتا۔
انعم سے شادی کے بعد بھی میرے حالات میں کچھ خاص سدھار نہ آسکا اور بالآخر اس نے بھی میرے دوستوں والی پالیسی اختیار کرلی یعنی ایک گھنٹے قبل کا ٹائم بتانا۔
پرانے لوگ میرے وقت کے مطابق ڈھل گئے اور میری عادت پختہ رہی لیکن کسی نئے فرد سے واسطہ پڑتا تو وہ بے چارہ میری عادت کے ہاتھوں خوار ہوجاتا۔
''لطیف آج یاد سے آجانا۔ صدیقی صاحب سے ملوانا ہے۔'' علی نے فون کرکے یاد دلایا۔
''ہاں میں آفس سے واپسی پر چکر لگالوں گا، تم بھی آجانا۔'' میں نے یقین دلایا۔
صدیقی صاحب پراپرٹی ڈیلر تھے جن سے غائبانہ تعارف علی نے ہی کروایا تھا۔ شہر سے باہر ان کی نئی ہاؤسنگ اسکیم کا بھی آغاز ہوا چاہتا تھا جس میں علی نے معمولی ایڈوانس دے کر پلاٹ بک کروایا تھا۔ باقی اقساط کافی عرصے تک جمع کروانی تھیں۔
کافی دن سے امی میرے پیچھے پڑی تھیں کہ اب کرائے کے فلیٹ سے جان چھڑا کر اپنا گھر ہوجانا چاہیے۔
اس حوالے سے ابو کی ریٹائرمنٹ کی رقم کے علاوہ اپنی بھی کافی جمع شدہ رقم تھی۔ امی ابو انعم اور میں متفقہ طور پر یہ طے کرچکے تھے کہ اقساط کے چکر میں لمبے عرصے پھنسے رہنے کے بجائے ایک دفعہ ہی گھر لیا جائے یا کم از کم چند اقساط ہی ہوں۔ اس حوالے سے ہمارے تحفظات یہی تھے کہ اقساط میں دھوکا دہی اور فراڈ کے امکانات ہوتے ہیں اور بندہ ایک عرصے تک قرض کے ذہنی بوجھ تلے بھی دبا رہتا ہے۔
''بس تم وقت پر پہنچ جانا صدیقی صاحب کسی کا زیادہ انتظار نہیں کرتے۔'' اس نے پرانی عادت کے طفیل مجھے وارننگ دی۔
''اب آفس سے واپسی میں دیری کیسی، پانچ بجے نکلوں گا تو زیادہ سے زیادہ چھ تک پہنچ جاؤں گا۔'' میں کسی قدر چڑ گیا۔
''چلو ٹھیک ہے۔'' وہ مطمئن ہوگیا۔
شام میں صدیقی صاحب کے دفتر پر میں اور علی موجود تھے۔ محمد علی صدیقی صاحب پچاس کے قریب کی شخصیت تھے۔

گھنے بال اور ہلکی داڑھی مونچھ نے شخصیت کو کافی رعب دار اور معزز بنا رکھا تھا۔

گلشن کے علاقے میں ان کا دفتر مختصر لیکن صاف ستھرا اور خوبصورت تھا۔ ابتدائی تعارف اور معانقے کے بعد انہوں نے پوچھا۔

''تو جناب آپ کس قسم کا مکان چاہتے ہیں؟''

''چھوٹا سا مناسب مکان ہی چاہتا ہوں اچھے علاقے میں......'' میں نے وہی بات کی جو ہر متوسط طبقے کے معزز شہری کا خواب ہوتا ہے۔

''خریدنے کا ارادہ ہے یا زیرِ تعمیر بک کرائیں گے۔'' انہوں نے پوچھا۔

''اگر مکمل تعمیر شدہ مل جائے تو زیادہ مناسب ہے۔'' میں نے محتاط انداز میں کہا۔

''ہوں......'' وہ کچھ دیر سوچنے لگے۔

میں پراپرٹی وغیرہ کے معاملات میں اناڑی تھا اس لیے علی کو لایا تھا۔ وہ ان معاملات میں قدرے تیز تھا اور چونکہ کچھ عرصے پہلے صدیقی صاحب کی اسکیم میں ہی پیسہ لگا چکا تھا لہٰذا لاشعوری طور پر میرے لیے قابلِ اعتماد ریفرنس سا بن گیا تھا۔

تھوڑی تفصیلات کے بعد جب صدیقی کو اندازہ ہو گیا کہ میں کیا چاہ رہا ہوں تو پھر وہ گویا ہوا۔

''دیکھیں جناب آپ کی ڈیمانڈ کے عین مطابق میرے پاس دو مکانات ہیں جن کے مالکان باہر شفٹ ہو رہے ہیں اور جلد از جلد بیچنا چاہتے ہیں، جلدی کے چکر میں قیمت بھی شاید مناسب کر لیں۔ میں آپ کو وہ دکھا دیتا ہوں، اگر آپ کو پسند آجائیں تو بتا دیجیے گا۔''

انہوں نے شہر کے دور دراز علاقوں پر مقامات بتائے۔

''صدیقی صاحب یہ تو شہر کی حدود سے ہی تقریباً باہر ہیں یہاں تو رہائش آسان نہ ہوگی۔'' مجھے تحفظات تھے۔

''دیکھیں آنے والے وقت میں شہر مزید پھیل جائے گا اور پھر یہ مقام شہری حدود میں ہی سمجھے جائیں گے۔'' صدیقی صاحب خالص کاروباری انداز میں گھیرنے لگے۔

''لیکن ابھی کیا سہولیات ہوں گی وہاں؟'' میں نے اپنی ہچکچاہٹ کا اظہار کیا۔

''کیوں نہیں ہیں جناب...... بہت سہولتیں ہیں۔ جو فروخت کر کے جا رہے ہیں وہ بھی تو رہ رہے تھے نا...... اور ضروری تو نہیں کہ آپ خریدتے ہی وہاں رہائش اختیار کر لیں، کچھ عرصے کرائے پر دے دیں اور جب آسانی محسوس کریں تب شفٹ ہو جائیں کم از کم ہاتھ میں کوئی ملکیت تو ہو گی۔'' وہ کافی ہوشیار تھے اور کیوں نہ ہوتے لیکن یہ نکتہ میرے دل کو لگا۔

''اچھا چلیں دکھا دیں، پھر مشورہ کر کے طے کر لیں گے۔'' میں نے کہا۔

اگلے دن ہم مطلوبہ جگہ پہنچ گئے۔ علی میرے ساتھ ہی تھا۔ وہ چھوٹا سا گھر میری ڈیمانڈ کے عین مطابق تھا علاقہ بھی صاف ستھرا اچھا تھا لیکن مکان ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے اور کسی قدر ویرانی کا احساس تھا لیکن راستے پختہ بن چکے تھے۔ قریشی صاحب نے بطور مالک مکان اپنا تعارف کرایا۔

''آپ مکان کیوں بیچنا چاہ رہے ہیں؟'' اس دفعہ علی نے حق دوستی ادا کرتے ہوئے تحقیقات کا آغاز کیا۔

''بس میاں کیا بتائیں سب بچے باہر سیٹل ہو گئے ہیں اب وہ مجھے بھی اپنے ساتھ ہی لے جانا چاہ رہے اب یہاں مکان کی دیکھ بھال کون کرے گا لہٰذا بیچنا ہی مناسب لگ رہا ہے۔'' وہ اپنا ''فارغ البال'' سر ہلا کر بولے۔

میں جاننا چاہ رہا تھا کہ اگر کبھی پاکستان کا چکر لگے تو کہاں رہائش اختیار کریں گے لیکن پھر یہ سوال بہت ذاتی محسوس ہوا۔

''آپ نے یہ نہ سوچا کہ کرائے پر دے دیں منافع بھی ملتا رہے گا اور کبھی واپسی کا چکر لگا تو رہائش کا بھی مسئلہ نہ ہوگا۔'' میں نے سوال گھما کر اپنا مقصد پورا کیا۔ اس وقت میں خود کو بے حد ذہین فطین محسوس کر رہا تھا لیکن وہ جواباً ایسے مسکرائے جیسے میں نے چالاکی نہیں بلکہ بے وقوفی کی بات کی ہو۔

''امریکا سے واپس کون آتا ہے پلٹ کر اور کرائے پر دینے میں کرایہ لینے کی ذمے داری کون لے ایسے میں کرایہ دار قابض ہو جاتے ہیں لہٰذا ایک دفعہ ہی حساب کتاب کر دینا چاہیے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے مجھے ایسی مشکوک نظر سے دیکھا جیسے میں بھی مستقبل بعید میں قابض کرایہ دار کا کردار ادا کروں گا یا مفت مکان ہتھیا لوں گا۔

''اچھا اچھا یہ بات ہے۔'' مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ علی اپنی ہنسی دبانے کی کوشش کرنے لگا۔

''چلیں میں آپ کو جلد جواب دیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''جلد ہی جواب دے دینا لطیف صاحب...... کیونکہ ایک دو اور پارٹیوں کو بھی میں یہ مکان دکھا رہا ہوں۔'' صدیقی صاحب نے تاکید کی۔

علی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ میں نے اُسے گھور کر دیکھا۔

''میرا مطلب تھا کہ ہاں...... لطیف جلد جواب ہی دے گا لطیف اپنی جلد بازی کے لیے ہی تو مشہور ہے۔'' علی نے سنجیدگی کی پوری اداکاری کی۔

''اوہ اچھا لگتا ہے برخوردار نے جلدی بازی کی تاریخ رقم کی ہے۔'' قریشی صاحب مسکرانے لگے۔

''کوئی ایک جناب۔ انہوں نے واقعی تاریخیں رقم کی ہیں، جلد بازوں کی فہرست میں ان کا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔'' علی اب پٹری سے اتر رہا تھا۔

''صدیقی صاحب میں آپ کو ایک دو دن تک بتاتا ہوں۔'' میں نے گفتگو کو سنجیدہ رخ دیا۔

''ٹھیک ہے لیکن میرے پاس مزید آئیں گے لوگ تو میں انتظار نہیں کروں گا آپ کے لیے۔ بس ایک دو دن کا ٹائم ہے آپ کے پاس۔'' انہوں نے گویا احسان کیا۔

''بڑی مہربانی جی......'' میں نے خفیف سا طنز کیا۔

بہر حال جانتا تھا کہ یہ بات کاروباری لوگ خریدار پر دباؤ بڑھانے کے لیے کرتے ہیں۔

سودے بازی کی کچھ ابتدائی بات چیت کے بعد ہم نے اپنی اپنی راہ لی۔

گھر میں سب خوش تھے۔ مکان سب کو پسند آگیا تھا۔ میں بیعانہ اور دیگر معاملات طے کرنے ایک بار پھر صدیقی صاحب کے آفس میں بیٹھا تھا۔ علی ایک دفعہ پھر میرے ساتھ تھا چونکہ یہ ایک بڑی ڈیل تھی لہٰذا مجھے اس کی موجودگی میں اطمینان رہتا تھا۔

ابھی باتوں کا آغاز ہی ہوا تھا کہ ایک صاحب آفس میں داخل ہوئے۔

''ارے سعید صاحب، کیا حال ہیں یوں اچانک؟'' صدیقی صاحب نے نووارد کا پُرتپاک استقبال کیا۔

علی اور میں نے بھی رسمی مسکراہٹ دی۔

''میں غلط وقت پر تو نہیں آگیا، لگتا ہے آپ کے کلائنٹ بیٹھے ہیں۔'' آنے والے کسی قدر ہچکچائے جو رسمی ہی لگی۔

''آپ بالکل ٹھیک وقت پر آئے ہیں۔'' صدیقی صاحب نے زور دے کر کہا۔

''میں یہاں سے گزر رہا تھا سوچا دعا سلام کرتا جاؤں لیکن کلائنٹ کی موجودگی میں مناسب نہیں لگتا نا۔'' وہ بولے۔

''آپ بھی کبھی ہمارے کلائنٹ ہی تھے، اب دیکھیں دوستوں کی طرح ہیں۔'' صدیقی صاحب تو جیسے فریفتہ لگ رہے تھے۔

''ہاں بالکل۔'' پھر وہ ہماری طرف متوجہ ہو کر بولے۔ ''صدیقی صاحب سچے کھرے بندے ہیں، مجھے کچھ خریدنا بیچنا ہوتا ہے تو ان سے ہی رابطہ کرتا ہوں۔''

''ارے کیوں شرمندہ کر رہے ہیں ہمارا کام ہی یہی ہے۔''

''بالکل بالکل لیکن آج کل آپ جیسے حضرات کہاں ملتے ہیں مارکیٹ میں۔ ہر طرف دھوکا فراڈ ہے۔'' وہ سر ہلا کر بولنے لگے۔ بالکل بالکل جیسے ان کا تکیہ کلام تھا۔

جانے کیوں ان دونوں کی ''بونگیاں'' اور ریشہ خطمیاں عجیب لگ رہی تھیں۔ عمر کا تقاضا ہے میں نے دل

کلاس روم

کلاس میں سمندری مخلوق پر گفتگو کرتے ہوئے میڈم نے بتایا کہ وھیل مچھلی 30 دن تک بغیر کچھ کھائے زندہ رہ سکتی ہے۔ جس پر ایک بچہ حیرت میں ڈوب گیا اور کھڑے ہو کر کہنے لگا۔

''لیکن میڈم! میں نے تو بایولوجی کی کتاب میں پڑھا تھا کہ وھیل مچھلی بغیر کھائے صرف 10 دن زندہ رہ سکتی۔''

میڈم سٹپٹا گئیں۔ اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے بولیں۔ ''نہیں! وہ 30 دن تک زندہ رہتی ہے۔''

بچے نے میڈم کے غصے اور بحث سے بچنے کے لیے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ جب میں جنت میں جاؤں گا تو وھیل مچھلی سے خود ہی پوچھ لوں گا۔''

میڈم نے بچے کو مزید چڑانے کے لیے فاتحانہ انداز میں چوٹ کی۔

''لیکن اگر وھیل مچھلی جنت کے بجائے جہنم میں چلی گئی تو......''

''تو میڈم۔ پھر آپ پوچھ لیجیے گا'' بچے نے کندھے اچکا کر جواب دیا۔

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی...... دے تھپڑ تے تھپڑ......''

کراچی سے محمد ادریس خان کا تعاون

میں سوچا۔
بہرحال صدیقی صاحب نے سب کے لیے چائے منگوائی اور ہمارے مکان کے حوالے سے گفتگو ہونے لگی۔
طے یہ پایا کہ بیعانہ ادا کرنے کے بعد کاغذات ہمارے ہاتھ آجائیں گے۔ کچھ دیگر کاغذی معاملات کے بعد میں کچھ مقررہ عرصے میں بقیہ رقم ادا کرنے کا پابند ہوتا۔
یہ کافی بڑی ڈیل تھی۔ میں کچھ گھبرا بھی رہا تھا بہرحال میں نے انہیں ہاں میں جواب دے دیا۔

☆☆☆

''یار صدیقی صاحب نے مجھے بتایا کہ مکان کے لیے ایک پارٹی اور بھی... آگئی ہے اگر تمہیں لینا ہے تو بیعانہ ادا کردو وہ ویسے بھی دو دن بعد دبئی جارہے ہیں۔'' میں دفتر میں تھا جب علی کا فون آیا۔
''ہیں! اچھا...... یار بس سمجھ نہیں آرہا، کیا کروں؟'' میں بے چارگی سے گویا ہوا۔
''مسئلہ کیا ہے؟'' وہ چڑ گیا۔
''بس گھبراہٹ ہورہی ہے۔''
''ایسے معاملات میں ہوتی ہے لیکن انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ تم کل رقم نکلوا لینا اور آفس آجانا۔'' اس نے ہدایت جاری کی۔
''رقم نکلوالوں؟ کیا مطلب، چیک سے کام نہیں چلے گا۔'' میں نے اچنبھے سے پوچھا۔
''نہیں وہ چیک نہیں لیتے۔ رقم ہی لیتے ہیں اُن کا ایک اصول ہے کیش پیمنٹ۔'' اس کا انداز حتمی تھا۔
''اچھا یہ عجیب بات ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔
''ہاں بس اُن کا خیال ہے چیک میں دھوکے کا امکان ہوتا اس لیے کیش پیمنٹ ہونی چاہیے۔''
''اچھا چلو ٹھیک ہے، کب آنا ہے؟''
''کل لازمی چھ سات تک پہنچ جانا وہ آٹھ بجے چلے جائیں گے اور پرسوں ان کی فلائٹ ہے پھر کام رہ جائے گا۔''
''وہ مکان کا سودا چھوڑ کر چلے جائیں گے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔
''ہاں کہہ رہے تھے، ضروری کام سے جانا ہے اس لیے کل ہی رقم ادا کردیں۔ اور ان کا کام ہی یہی ہے ابھی نہیں تو واپسی پر انہیں کوئی مل ہی جائے گا کونسا ان کا نقصان ہوجائے گا۔'' وہ بولا۔
''یہ بہت جلدی نہیں ہے؟'' میں ابھی تک متذبذب تھا۔
''لطیف تم ابھی تک لیٹ لطیف ہی ہو۔'' وہ چڑ کر بولا۔
''اچھا نا یار۔''
''اور ہاں کل لیٹ نہ ہونا۔'' اس نے آخری تاکید کی۔
''نہیں ہوں گا۔'' میں نے یقین دلایا لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

☆☆☆

تقدیر کا لکھا کون جانتا ہے؟ میں نے گھر میں بتادیا تھا کہ آج مکان کے ملکیتی کاغذات ملیں گے۔ انعم تو خوش تھی ہی امی بھی واری صدقے ہورہی تھیں۔
انہوں نے واپسی پر مٹھائی لانے کی ہدایت بھی کردی تھی جبکہ نوافل کا اہتمام بھی کرنا تھا۔
میں آفس میں مصروف تھا جب صدیقی صاحب کی کال آئی' میں خود بھی فون کرنا چاہ رہا تھا۔ علی نے کہا بھی تھا کہ خود بات کرلوں لیکن مجھے یاد نہیں رہا تھا۔
''لطیف صاحب آج پھر میں انتظار کروں؟''
''جی بالکل کریں۔'' میں نے کہا۔
''کب تک پہنچیں گے؟'' انہوں نے پوچھا۔
''جی میں انشاء اللہ چھ بجے تک پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے حتمی انداز میں کہا۔
''میں آٹھ تک ہی رک سکتا ہوں کیونکہ اس کے بعد مجھے بہت سے کام ہیں۔ صبح ڈھائی بجے کی فلائٹ ہے۔'' انہوں نے کہا۔
''بے فکر رہیں، میں وقت پر پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے یقین دلایا۔
کھانے کے وقفے میں' میں نے بینک کی طرف دوڑ لگادی۔ بینک میں رش دیکھ کر میرا دل ڈوب گیا۔ ایک گھنٹے کا ہی بریک تھا جس میں مجھے رقم نکلوانی تھی۔ بڑی رقم کی وجہ سے مختلف رسمی کارروائیاں بھی جاری تھیں۔ بہرحال مجھے انتظار میں بٹھادیا گیا۔
''دیکھیں، مجھے ذرا جلدی ہے واپس دفتر بھی پہنچنا ہے۔'' میں نے کاؤنٹر پر موجود شخص سے کہا۔
''سر میں سمجھ سکتا ہوں لیکن بڑی رقم ہے، اس کے انتظام میں وقت لگے گا'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔
مجھے خود پر غصہ آیا کہ کم از کم رقم کا مجھے پہلے سے ہی بندوبست کرنا چاہیے تھا۔ ہر کام عین وقت پر چھوڑنے کی تو میری پرانی عادت تھی اور یہی تو میری تاخیر کی وجہ ہوتی تھی۔ اس پر بعدازاں میں کئی دفعہ پچھتا چکا تھا لیکن کونسا بدل گیا تھا۔
پیچ و تاب کھاتا انتظار کرتا رہا۔ کھانے کا وقت بھی نکل

چکا تھا لیکن مجھے لازمی توانائی کی ضرورت تھی لہٰذا ہلکا پھلکا زہر مار کر کے واپس آفس پہنچا تو ایک کے بجائے دو گھنٹے گزر چکے تھے جس کے نتیجے میں کام بھی میز پر زیادہ جمع ہو گیا تھا جسے نمٹاتے نمٹاتے ساڑھے پانچ ہو گئے۔

''کوئی بات نہیں، آدھا گھنٹا بہت ہے پہنچنے کے لیے۔'' میں نے اطمینان سے سوچا۔

آگے پیچھے سے محتاط ہو کر گاڑی گلشن صدیقی صاحب کے آفس کی طرف دوڑا دی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ سڑکوں پر معمول سے زیادہ ٹریفک ہے۔ پہلے تو یہی گمان ہوا کہ لوگوں کی واپسی کے مخصوص اوقات کی وجہ سے یہ رش ہے لیکن جلد اندازہ ہو گیا کہ ایسا نہیں بلکہ ٹریفک کی رفتار سست پڑتی جا رہی ہے۔

''بھائی صاحب یہ کیا مسئلہ ہے، پہلے تو کبھی اس سڑک پر ایسا ٹریفک جام نہیں ہوا۔'' سگنل پر متعین اہلکار سے میں نے بیزار ہو کر پوچھا۔

''وہ آگے انڈر پاس بن رہا ہے' پانی کی لائن پھٹ گئی ہے روڈ پر سب پانی جمع ہے۔'' اہلکار نے مجھے خوفناک صورت حال سے آگاہ کیا۔

''اوہ خدایا...... مطلب اب یہاں کتنا وقت ضائع ہو گا۔'' میرے منہ سے نکلا۔

''یہ گاڑیاں پچھلے دو گھنٹے سے پھنسی ہیں۔'' اس نے بے پروائی سے کندھے اچکا کر بتایا اور میرا رنگ اُڑنے لگا۔

خواری کی اذیت تو تھی لیکن مکان بھی ہاتھ سے نکلتا لگ رہا تھا۔ میرے پرانے شاندار ریکارڈ کی وجہ سے کسی نے میری وضاحت بھی نہیں سننی تھی۔

میں نے گھڑی دیکھی سوا چھ ہو چکے تھے۔

گاڑیاں رینگ رینگ کر آگے بڑھ رہی تھیں اور میں بھی ان کے ساتھ رینگ رہا تھا لیکن وقت گھوڑے پر سوار تھا۔

ٹریفک اہلکار کی بات میرے ذہن میں تھی کہ گاڑیاں کافی دیر سے پھنسی ہوئی ہیں۔ میں نے راستہ بدلنے کا سوچا لیکن نکلنا آسان نہ تھا پیچھے بھی طویل قطار تھی۔ تھوڑا آگے جا کر ایک بغلی تنگ سڑک موجود تھی۔ میری طرح جلدی کا شکار لوگ وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

کراچی کے عمومی مزاج کے عین مطابق میں نے بھی اس گلی میں گاڑی موڑ دی جہاں پہلے ہی موٹر سائیکل سوار ''زن زناتے'' پھر رہے تھے مزے کی بات یہ تھی کہ ان گلی نما سڑکوں پر مجھے راستے کا اندازہ ہی نہ تھا بس عوامی مزاج کے مطابق میں اپنے سے آگے والوں کی پیروی کر رہا تھا۔

اس دوران صدیقی صاحب کی کال آگئی۔

''کہاں رہ گئے لطیف۔ میں تو اب اٹھنے لگا ہوں تم نے چھ بجے کا کہا تھا سات بج گئے۔'' ان کے لہجے میں بیزاری تھی۔

''جی جی بس پہنچنے والا ہوں، ٹریفک میں پھنس گیا ہوں۔'' میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''واقعی ٹریفک میں پھنسے ہو؟'' ان کا لہجہ مشکوک تھا۔

''جی ہاں...... راستے میں پائپ لائن پھٹ گئی ہے اس لیے......'' میری بات ادھوری رہ گئی۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے جلدی پہنچو میں آٹھ بجے تک ہوں۔'' انہوں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

مجھے حیرت ہوئی لیکن اس وقت ان کے رویے پر غور کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔

بات کے دوران میں نے دھیان نہ دیا تھا اب جو سامنے دیکھا تو گاڑیوں کو واپس پلٹتے دیکھا۔

''کیا ہوا بھائی یہ سب واپس کیوں پلٹ رہے ہیں؟'' میں نے گاڑی سے جھانکتے ایک صاحب سے پوچھا۔

''آگے راستہ بند ہے۔'' وہ بیزاری سے بولے۔

''ہائیں۔ اب کہاں جائیں۔'' لیکن ظاہر ہے یہاں میں خود سے ہی مخاطب تھا، وہ صاحب گزر چکے تھے۔

پیچھے موجود دیگر گاڑیوں نے تنگ اور یک طرفہ سڑک پر واپسی کی جس طرح راہ لی، وہ ایک الگ کہانی تھی' وہاں سے جب واپس سڑک پر نکلے تو وہ پہلے سے بھی زیادہ پھنسے تھے۔ معلوم ہوا کہ جنہوں نے صبر اور ضبط کا دامن تھامے رکھا تھا اور صراط مستقیم پر چلتے رہے تھے، وہ کب کے سرخرو ہو چکے تھے مطلب پل صراط سے گزر چکے تھے جب کہ ہم راستہ بدلنے والے بارہ آنے والا گلاس توڑے بیٹھے تھے۔ بغیر کچھ کھائے پیے......!

اب افسوس سے ہاتھ ملنے کا کیا فائدہ۔ ان کی رفتار بھی تو اس لیے بڑھ گئی تھی کیونکہ ہم نے جگہ خالی کر دی تھی۔

واپس آنے والوں کو اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا لہٰذا گاڑیوں کو گلیوں میں مڑتا دیکھ کر سب درست رہنمائی کرنے کے بجائے چالاکی سے خاموش رہے جس کے نتیجے میں ہماری راہ آہستہ آہستہ کھلنا شروع ہو گئی۔

آگے جا کر معلوم ہوا کہ پائپ لائن پھٹنے سے تو اتنا پانی نہ آیا تھا بلکہ تعمیراتی کام کی وجہ سے ہی سڑک تنگ تھی، دل ہی دل میں اس ٹریفک اہلکار کو خوب کوسا۔

کھلی سڑک ملنے پر میں نے سکون کی سانس لی لیکن

گھڑی دیکھ کر سانس پھر بے سکون ہوگئی سوا آٹھ ہو چکے تھے اس خجل خواری میں۔

بدقسمتی سے اگلی نگاہ میری فیول میٹر پر چلی گئی اور اس کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ آج صدیقی صاحب مجھے سو سو صلواتیں سنا کر چلے جائیں گے۔ آخری امید کے طور پر میں نے انہیں فون کیا۔

''جی لطیف صاحب۔'' ان کی آواز سے بے اعتنائی مترشح تھی۔

''صدیقی صاحب آپ ابھی ہیں؟ میں تقریباً پہنچ گیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اب تو گھر ہی پہنچو میاں۔ میں زیادہ دیر رک نہیں سکتا تھا اور تمہارا تو پتا ہی نہیں تھا کہ کہاں ہو۔'' انہوں نے کسی قدر تلخی سے کہا۔

''میں نے بتایا تو تھا کہ راستے میں ہوں۔'' میں نے بے چارگی سے کہا۔

''اب تمہارے راستے کا مجھے کیا پتا۔'' وہ بے مروتی سے بولے۔

''بہرحال آپ ہو کر آجائیں دبئی سے تو پھر طے کر لیتے ہیں۔'' میں نے رسماً کہا ورنہ میرا ان کے رویّے سے دل اُچاٹ ہو گیا تھا۔

''پھر کوئی اور مکان دکھا دوں گا ابھی تو وہ مکان دوسری پارٹی لے گئی۔'' انہوں نے اطمینان سے کہا۔

''کیا مطلب دوسری پارٹی لے گئی۔ اگر ایسا تھا تو مجھے کیوں خوار کرا رہے تھے آپ؟'' مجھے کسی قدر غصہ آ گیا۔

''میں خوار کرا رہا تھا یا تم مجھے کر رہے تھے؟ اس پارٹی کو بھی مکان پسند تھا، تم نے اتنی دیر کی تو انہیں فون کر دیا، وہ میرے اعتبار کے بندے ہیں انہوں نے رقم ٹرانسفر کرادی اکاؤنٹ میں۔'' وہ بھی تلخی سے بولے۔

''واہ، یہ کام تو میں بھی کر سکتا تھا۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''لیکن تم کاغذات بھی تو ایک ہاتھ دے اور لے کرتے نا مذکورہ پارٹی سے ایسا ایشو نہ تھا بہرحال دیکھیں گے ابھی میں مصروف ہوں۔'' انہوں نے انتہائی بے مروتی سے کال کاٹ دی۔

مجھے غصہ تو آیا لیکن بعد از اں شرمندگی بھی ہوئی۔ میں مایوسی سے گھر کی جانب چل دیا۔ اتنی خواری کے بعد حاصل بھی کچھ نہ ہوا تھا۔

گھر پر میرے استقبال کو انعم اور امی تیار بیٹھی تھیں۔ میں نے ایمانداری سے ساری صورتِ حال سنا دی۔

''لطیف تمہاری ابھی تک عادت نہیں بدلی دیر کی۔'' انعم نے چھوٹتے ہی کہا۔

''اس میں عادت کی کیا بات ہے بتایا تو ہے سب۔'' میں چڑ گیا۔

''عادت ہی کی بات ہے تم جلدی نکل سکتے تھے، بینک پہلے جا سکتے تھے۔ گاڑی کا فیول چیک کر کے بیٹھ سکتے تھے۔ اور گلیوں میں گھسنے کی کیا ضرورت تھی؟'' انعم نے ایک ہی سانس میں میری ساری غلطیاں گنوا دیں۔

''اچھا اب چھوڑو جو ہونا تھا، ہو گیا۔'' میں نے کہا۔

''کوئی نقصان تو نہیں ہوا نہ پھر دیکھ لیں گے۔'' میں بات ختم کرنا چاہتا تھا۔

''بس یہی اطمینان رکھنا ہمیشہ اچھے اچھے چانس کھو کر یہی کہنا کہ نقصان تو نہیں ہوا نا'' انعم اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اچھا چانس تو خیر میں کبھی نہیں چھوڑتا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''مثلاً کونسا اچھا چانس نہیں چھوڑا۔'' اس نے پوچھا۔

''تم سے شادی کا چانس نہیں چھوڑا۔'' غصے کے باوجود وہ مسکرانے پر مجبور ہوگئی۔

''ہاں پتا نہیں، یہاں کیسے تم نے بروقت کارروائی کر لی۔'' وہ ہنسنے لگی

☆☆☆

اگلے دن علی کی عدالت میں پیشی ہوگئی۔

''یار تو ابھی تک لیٹ لطیف ہی رہا۔'' وہ غصے سے بولا۔

''اچھا چھوڑو نا۔ کیا فائدہ ہوا تمہارے تعلق کا۔ صدیقی صاحب نے کون سا لحاظ کر کے مکان میرے لیے رکھ لیا۔'' میں نے الٹا شکوہ کیا۔

''ارے یہ کاروباری لوگ کسی کے نہیں ہوتے ویسے بھی میرے کون سے رشتے دار ہیں لیکن تماری وجہ سے شرمندگی تو ہوئی نا مجھے۔ آج کل کون کسی کا اتنا انتظار کرتا ہے۔'' وہ بولا۔

''اچھا اب چھوڑو۔ چڑ گیا ہوں میں اس موضوع سے۔''

مجھے افسوس تو تھا لیکن کوئی مجھے سمجھ ہی نہ رہا تھا حالانکہ پہلی دفعہ حالات کا بھی دخل تھا صرف میری غلطی نہ تھی لیکن پرانی عادت کی وجہ سے اشک شوئی کے بجائے طعنے ہی مل رہے تھے۔

☆☆☆

میرے معمولات جاری تھے چند دن طعنے ملتے رہے پھر سکون ہو گیا۔ میں پھر نئے مکان کی تلاش میں تھا اس دن آفس میں بیٹھا تھا جب علی کا فون آیا۔

''یار لطیف آج گھر پر ملنا۔ تیرے لیے ایک خبر ہے۔'' وہ رنجیدہ لگ رہا تھا۔

''کیا خبر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس تیرے لیے خوشی کی اور میرے لیے غم کی خبر ہے۔'' وہ مایوسی سے بولا۔

''اس کا مطلب تیری شادی طے پا گئی ہے، میرے لیے یہی خوشی کی خبر تیرے لیے غم کی ہو سکتی ہے۔'' میں نے خوش دلی سے کہا۔

''دفعہ دور...... یہ میرے لیے غم کی خبر کیوں ہو گی۔'' وہ غصے سے بولا۔

''یہ تو شادی کے بعد سمجھے گا۔'' میں نے کہا۔

شام میں، میں علی کے گھر تھا۔

''یہ لے دیکھ اپنے صدیقی صاحب کے کارنامے۔'' اس نے ایک اخبار اٹھا کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

''کیا ہوا۔ بحریہ ٹاون میں اسکیم شروع کر دی کیا جو اخبار میں خبر آ گئی۔'' میں نے طنزاً کہا۔

''چھتر نہ پڑتے تو شاید اگلا کام یہی کرتا۔'' وہ جل کر بولا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے فوراً دھیان سے خبر دیکھی۔

صدیقی کے ساتھ سعید کی تصویر بھی تھی اور خبر کی شہ سرخی جمی تھی۔

''پلاٹس اور مکانات کی فروخت کی آڑ میں لاکھوں روپے ٹھگنے والے فراڈ افراد گرفتار۔''

''ارے یہ فراڈیا تھا؟'' میں تو شاک میں چلا گیا۔

''ہاں اور جانے کتنوں کو چونا لگا چکا ہے۔'' علی کا منہ لٹکا ہوا تھا۔

''مطلب میں بچ گیا۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

''ہاں اور میں لٹ گیا۔'' علی نے بے چارگی سے کہا۔

ضبط کے باوجود میری ہنسی چھوٹ گئی۔

علی نے مجھے غصے سے گھورا۔ ''سوری یار افسوس ہوا لیکن میں تفصیل پڑھ لوں۔'' میں نے کہا۔

خبر کی تفصیل میں درج تھا کہ ایک اونچی پارٹی کو دونوں صاحبان نے چونا لگانے کی کوشش کی لیکن وہ ہوشیار تھے انہیں شک ہو گیا اور تحقیقات سے پتا چلا کہ پہلے بھی کافی لوگوں کو مذکورہ افراد لارے لگا چکے تھے۔ انہوں نے پولیس کی مدد سے صدیقی کو پکڑوا لیا۔ ڈرائنگ روم کی زیارت کے بعد اس نے اپنے سارے فراڈ اگل دیے جبکہ سعید بطور معاون پکڑا گیا جو ہر پارٹی کے سامنے آ کر صدیقی کے لین دین کی گواہی دیتا تھا۔

پوری تفصیل پڑھ کر دل ہی دل میں، میں نے شکر ادا کیا۔

''علی یار تیرے لیے افسوس ہے لیکن میری کافی بڑی رقم بچ گئی۔'' میں نے علی کے دکھ کا لحاظ کرتے اپنی بے مثال خوشی دبائی۔

''ہاں پہلی دفعہ تو لیٹ ہو کر بھی لطیفہ نہیں بنا۔'' وہ منہ لٹکا کر بولا۔

''یار لیکن یہ بات سمجھ نہ آئی وہ تو دبئی جا رہا تھا۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

''وہ تجھ سے جلد رقم نکلوانے کے لیے تھا۔ اسے شک ہو گیا تھا کہ ایک پارٹی پیچھے لگی ہوئی ہے اس لیے مال سمیٹ کر جلد رفو چکر ہونا چاہتا تھا۔ تجھے دیر ہوئی تو اسے شک ہو گیا کہ تو بھی مذکورہ پارٹی کا کوئی ایجنٹ نہ ہو اس لیے رقم کے بغیر ہی فرار ہو گیا۔'' اس نے تفصیل سے جواب دیا۔

''تجھے کیسے پتا؟''

''تیرے اس بھائی نے بھی کچھ ڈوریاں ہلائی ہیں آخر......'' اس نے کہا۔

''یہ ڈوریاں تُو پہلے ہلا لیتا تو نقصان نہ ہوتا۔'' میں نے کہا۔

''اچھا اب چوڑا نہ ہو...... آئندہ بھی دیر کرتے رہنا۔'' اس نے جل کر کہا۔

''چل یار ناراض نہ ہو جو قسمت میں ہوتا ہے، وہی ہوتا ہے۔ بالآخر زندگی میں پہلی دفعہ میری اس عادت کا مجھے فائدہ ہو گیا چل اس خوشی میں تجھے کچھ کھلا دیتا ہوں۔'' میں نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر باہر دھکیلا......

☆☆☆

میں آج بھی لیٹ ہو جاتا ہوں اور آج بھی اسی دلجمعی کے ساتھ اپنی اس عادت کو نہ دہرانے کا اعادہ کرتا ہوں لیکن پھر بھی ہو جاتا ہوں۔

لیکن اس کے بعد یہ ضرور ہوا کہ میری لیٹ لطیف کے طعنے سے جان چھوٹ گئی کیونکہ سب کو پتا چل گیا کہ کبھی کبھی دیر آید درست آید بھی ہوتا ہے......

❖❖❖

گھات

محمد فاروق انجم

زندگی روح اور مادے کا مرکب ہے... روح ابدی ہوتی ہے... مرتی کبھی نہیں... مادے کا مقدر فنا ہونا ہے... یعنی ہمارا جسم... جو مٹی سے بنا ہے... مٹی میں مل جاتا ہے... اگر مادی جسم حکم ربی کے مطابق زندگی گزارے... خود کو آلودگی... گندگی... گناہ اور دنیاوی حرص و ہوس کی لذتوں سے باز رکھے تو یہ جسم فنا نہیں ہوتا... جسم کی اپنی خواہشات... مطالبات ہوتے ہیں... تسکین و راحت حاصل کرنے کے اپنے ذرائع ہوتے ہیں... ایک ایسے ہی شخص کی کہانی... جس کے گرد انجانا جال بنا جارہا تھا... وہ حیران و پریشان تھا کہ اس کی زندگی مکرو فریب... دنیاوی ہوس اور لذتوں سے مبرا ہے... اس کی زندگی کو کبھی کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا... مگر آہستہ آہستہ وہ انجانا خطرہ اس کے قریب آرہا تھا... دشمن چاروں طرف سے گھات لگائے بیٹھے تھے...

شہر کے پوش علاقے کے سب سے بڑے اسٹور میں اس وقت رش معمول کے مطابق تھا۔ خواتین و حضرات خریداری میں مصروف تھے۔ ان لوگوں میں ایک شخص اپنے قریب ٹرالی میں بہت سا سامان لادے ریک میں رکھی چیزوں کو بڑے انہماک سے دیکھ رہا تھا۔

اس شخص کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی۔ اس نے کھلی پینٹ کے اوپر ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اس شخص کی شیو بڑھی ہوئی تھی، یا پھر اس کی اتنی داڑھی بڑھی رہتی تھی۔ اس عمر میں بھی اس کی نظر ٹھیک کام کر رہی تھی۔ وہ ایک ایک چیز کو اُٹھا کر دیکھتا تھا، اسے پڑھتا تھا، اگر اس نے چیز لینی ہوتی تھی تو ٹرالی میں رکھ لیتا تھا ورنہ وہ چیز واپس ریک میں اپنی جگہ پر چلی جاتی تھی۔ وہ ٹرالی دھکیل کر دو قدم آگے جاتا تھا اور رک کر کوئی اور چیز دیکھنے لگ جاتا تھا۔ وہ ریک کے بالکل آخر میں پہنچ گیا تھا اور اس جگہ وہ اکیلا ہی کھڑا تھا۔

وہ شخص ایک جگہ رک کر ریک میں کوئی چیز تلاش کر رہا تھا کہ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے عقب سے اُس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر اُٹھا لیا ہو۔ اس نے اسے اپنا واہمہ خیال کرتے ہوئے اس جانب کوئی توجہ نہیں دی اور انہماک سے چیزوں کو دیکھتا رہا۔ ایک بار پھر اسے لگا کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہوا ہے۔

اس کی توجہ ریک میں رکھی چیزوں سے ہٹ گئی اور اس نے اپنے کندھے کی طرف دیکھا۔ ایک ہاتھ اس کے کندھے پر تھا۔ وہ اسی جانب گھوم گیا تو اس کے پیچھے ایک اجنبی کھڑا تھا۔

اس اجنبی کا قد پانچ فٹ دس انچ ہوگا۔ اس کا پیٹ اندر اور بازو مضبوط تھے۔ اس نے پینٹ شرٹ کے اوپر چمڑے کی جیکٹ زیب تن کی ہوئی تھی۔ اس نے شاید چار، پانچ دن سے شیو نہیں کی تھی۔ سر پر اونی ٹوپی تھی اور آنکھوں پر شاید نظر کا چشمہ تھا۔ اس شخص نے بغور اس اجنبی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا کہ یہ کون ہے؟

''تم فیروز عاقل کے ملازم ہو؟'' اس اجنبی نے پوچھا۔

''جی میں اُن کا ملازم ہوں۔'' اس شخص نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''تمہارا نام خالد ہے۔'' وہ زیرِ لب مسکرایا۔

''آپ کون ہو؟'' اس شخص نے حیرت کا اظہار کیا جو اس کا نام بھی جانتا تھا۔ اس کی نگاہیں اس کے چہرے پر جم گئی تھیں۔ اس کی دانست میں اس کے سامنے کھڑا اجنبی اس کا جاننے والا ہے جو بھیس بدل کر اس سے کوئی شرارت کر رہا ہے۔

''فیروز دبئی سے کب واپس آرہا ہے؟'' اجنبی نے سوال کیا۔

''آپ ہیں کون؟'' خالد کے چہرے پر حیرت اور بھی گہری ہوگئی تھی۔

''تم میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے مجھ سے سوال کررہے ہو۔ تمہیں میرے سوال کا جواب دینا چاہیے۔''

''میں آپ کو نہیں جانتا۔''

''میں تو آپ لوگوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے تمہارے مالک کا نام بتایا۔ پھر تمہارا نام بھی بالکل ٹھیک لیا۔ اس کا مطلب ہے کہ میں تم لوگوں کو بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔'' وہ اجنبی سپاٹ لہجے میں بولا۔

''میں جاننا چاہتا ہوں آپ کون ہو؟'' خالد بولا۔

''یہ بتاؤ فیروز عاقل دبئی سے کب واپس آرہا ہے؟'' اس نے خالد کا سوال نظر انداز کر کے متانت سے پوچھا۔

''آپ کیوں پوچھ رہے ہو؟'' خالد نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

اجنبی خاموشی سے اُس کا چہرہ دیکھتا رہا جبکہ خالد کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں پھر وہ اجنبی سنسنی خیز انداز میں بولا۔ ''میں اس لیے پوچھ رہا ہوں...... کیونکہ میں فیروز عاقل کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔''

خالد نے سنا تو وہ دم بخود رہ گیا۔ اس کی خیرہ نگاہیں کھل سی گئیں اور دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہوگئی۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ اور کہتا، اس کا منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا جب اجنبی نے اس کے عقب کی جانب ہاتھ کا اشارہ کر کے کہا۔ ''اپنے پیچھے دیکھو۔''

خالد ایک دم پیچھے کی طرف گھوما۔ اس کے عقب میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ پھر اس اجنبی کی طرف گھوما لیکن وہ متحیّر رہ گیا جب اس نے دیکھا کہ وہ اجنبی غائب ہو چکا تھا۔ اس نے متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا مگر نہیں، کوئی نہیں تھا۔

اس بات نے خالد کے جسم میں سنسنی دوڑا دی تھی۔ ایک اجنبی نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر بڑی آسانی سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کے مالک کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ خالد نے

اپنے ماتھے پر آئے پسینے کو ہاتھ سے صاف کیا اور ٹرالی کو تیزی سے دھکیلتا ہوا کاؤنٹر تک لے گیا۔ جب تک ... بل بنتا رہا، وہ مضطرب دائیں بائیں بھی دیکھتا رہا اور بار بار اپنے چہرے پر ہاتھ بھی پھیرتا رہا۔ اسے وہ اجنبی کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔

خالد نے کانپتے ہاتھوں سے پیسے دیے اور ٹرالی کو دھکیلتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کی کار ایک طرف کھڑی تھی۔ اندر بیٹھا ڈرائیور موبائل فون میں مصروف تھا۔ خالد نے اس کے قریب جاتے ہی چڑھے ہوئے شیشے پر انگلی ماری۔ آواز سنتے ہی اس نے چونک کر دیکھا تو جلدی سے شیشہ نیچے کر دیا۔

''ڈکی کھولو......'' خالد نے کہا اور تیزی سے ٹرالی لے کر گاڑی کے پچھلے حصے کی طرف چلا گیا۔ اس کی متلاشی نظریں اب بھی اس اجنبی کو تلاش کر رہی تھیں، ڈرائیور نے اندر بیٹھے ہی ڈکی کھول دی اور پھر موبائل فون میں مگن ہو گیا۔

خالد نے ڈکی کھولی اور سامان اندر رکھنے لگا۔ جب وہ آخری چیز اندر رکھ کر ڈکی بند کرنے ہی والا تھا کہ اس کے کان کے قریب اسی اجنبی کی آواز آئی۔

''تم نے بتایا نہیں کہ فیروز کب واپس آ رہا ہے؟''

خالد پہلے تو گم صم کھڑا رہا۔ پھر اس نے ایک دم گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ وہی اجنبی کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری متانت تھی اور ... الیہ نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''تم نے مجھ سے کیا کہا تھا؟'' خالد نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

''میں نے کہا کہ فیروز کب واپس آ رہا ہے؟'' اس نے اپنا سوال دہرایا۔

''مجھے تم نے اندر کیا کہا تھا؟'' خالد کو گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

''میں نے تم سے یہ کہا تھا کہ میں فیروز کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔'' اجنبی نے سفاک مگر دھیمے لہجے میں دہرایا۔ خالد ہکا بکا اسے دیکھتا رہا۔ خوف اس کی آنکھوں .... میں اتر آیا تھا۔

''تم میرے ساتھ کوئی مذاق کر رہے ہو؟'' خالد نے کچھ توقف کے بعد پوچھا۔

''میں یہ بات بڑی سنجیدگی اور ذمے داری سے کہہ رہا ہوں۔ فیروز کو اکیس دن ہو گئے ہیں دبئی گئے...... میں اس کا بے تابی سے انتظار کر رہا ہوں۔ مجھے بتاؤ وہ کب آ رہا ہے؟'' اس اجنبی کے لہجے نے خالد کے جسم میں پھر سے سراسیمگی پھیلا دی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا جیسے وہ کسی کو مدد کے لیے بلانا چاہتا ہو۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اس کی کار کا ڈرائیور مزے سے اپنی سیٹ پر براجمان اس سے بے خبر تھا کہ اس کے عقب میں کیا ہو رہا ہے۔

''کسی کو اپنی مدد کے لیے بلانا چاہتے ہو؟ آواز دے کر دیکھ لو۔ تم کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ تمہاری گردن پر تیز دھار بلیڈ کس وقت اپنا کام کر کے تمہیں موت کی طرف دھکیل دے گا۔ بہتر ہے میرے سوال کا جواب دو اور چلے جاؤ کہ فیروز کب آ رہا ہے۔'' اجنبی سفاک لہجے میں بولا۔

خالد کانپ گیا۔ اس نے اپنی ہمت کو ایک جگہ جمع کیا اور ایک دھماکے سے ڈکی بند کی اور بولا۔ ''میں نہیں جانتا۔''

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھا اور دروازہ کھول کر ڈرائیور کی برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ بُری طرح سے گھبرایا ہوا تھا۔

خالد نے غصے سے کہا۔ ''تم کیا ہر وقت موبائل فون کے ساتھ لگے رہتے ہو۔ جلدی کار چلاؤ۔''

''کس چیز کا غصہ ہے تمہیں؟'' ڈرائیور اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''یہاں سے چلو...... مجھ سے سوال مت کرو۔'' خالد اُلجھا ہوا تھا۔ اس نے گردن گھما کر اپنے عقب میں دیکھا تو اجنبی غائب تھا۔ اس نے بائیں اور پھر دائیں دیکھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''

''اسٹور سے کوئی چیز تو نہیں چرائی؟'' ڈرائیور کہہ کر مسکرایا۔

''اپنی بکواس بند کرو اور چلو یہاں سے۔'' خالد کا لہجہ درشت ہو گیا۔ ڈرائیور نے مسکراتے ہوئے کار اسٹارٹ کی اور اسے بیک کر کے آگے بڑھائی ہی تھی کہ خالد نے ایک دم سے کہا۔

''گاڑی روکو...''

ڈرائیور نے ایک دم بریک لگا دیا۔ ''اب کیا رہ گیا ہے۔ کیا بھول آئے ہو؟''

خالد نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور... ایک طرف دیکھتا رہا۔ کچھ فاصلے پر وہی اجنبی سرخ رنگ کی کار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ خالد کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس

نے اپنی انگلی سیدھی کر کے ایسا اشارہ کیا تھا جیسے وہ پستول چلا رہا ہو۔ پھر وہ اجنبی مسکرایا اور ایک طرف چل دیا۔

''کیا ہوا ہے، کیا دیکھ رہے ہو؟'' ڈرائیور کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پھر پوچھا۔

''چلو تم۔'' خالد نے کہا۔ ڈرائیور نے کار آگے بڑھا دی۔ خالد پریشان تھا کہ وہ کون ہے اور کیا وہ واقعی اس کے مالک فیروز کو قتل کرنا چاہتا ہے، یا اس نے کوئی سنگین مذاق کیا ہے؟

☆☆☆

اس پوش علاقے میں ایک بڑا بنگلا فیروز عاقل کی ملکیت تھا۔ اس بنگلے میں اس کی بیوی نجمہ اور اٹھارہ سال کی اکلوتی بیٹی ماہم رہتی تھیں۔ ان کے علاوہ ایک ڈرائیور، چوکیدار، خانساماں، نوکرانی اور خالد جو، ان کا پرانا ملازم تھا اور باہر سے سامان لانے کے علاوہ ان کے تمام وہ ضروری کام کیا کرتا تھا جو وہ خود باہر جا کر نہیں کرتے تھے۔ خالد دن میں کئی بار مارکیٹ اور اپنے مالکان کے کام کرنے کے لیے گھر سے باہر جاتا تھا۔ اس کے پاس ایک بائیک تھی اور اگر ضروری ہوتا تو وہ ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں جاتا تھا۔

سامان ملازمہ کے حوالے کر کے خالد نے ایک گلاس پانی پیا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس اجنبی کی صورت اور دماغ میں اس کی باتیں گھوم رہی تھیں۔ وہ بار بار کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس کی صورت کو پہچان لے۔ بہت کوشش کے بعد بھی وہ اسے پہچان نہیں سکا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا۔

''یہ مذاق نہیں ہو سکتا۔ اسے میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔ مجھے یہ بات کسی اور سے کرنے کے بجائے سب سے پہلے اپنے مالک سے کرنی چاہیے۔''

''گھر کا سامان آ گیا ہے؟'' نجمہ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے آواز آئی تو خالد چونکا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''جی سارا سامان لے آیا ہوں۔'' خالد نے بتایا۔ ساتھ اسے خیال آیا کہ وہ اجنبی کی باتیں اپنی مالکن سے کر دے۔

''خانساماں سے کہہ کر رات کے کھانے میں کچھ اچھا سا بنوا دینا۔ فیروز آ رہے ہیں۔'' نجمہ صوفے کی ایک جانب بیٹھ گئی۔

''جی بہتر۔'' خالد فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ بات کرے، یا رات تک کا انتظار کر لے۔

''تم پریشان ہو؟'' نجمہ نے اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

خالد چونکا۔ ''نہیں بالکل بھی نہیں۔''

''مجھے لگ رہا ہے جیسے تم پریشان ہو۔'' نجمہ اب بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں خانساماں کو بتا دوں کہ وہ رات کو کھانے میں کیا تیار کرے گا۔'' خالد یہ کہہ کچن کی طرف جانے لگا تو نجمہ نے اسے روک لیا۔

''کل ماہم کا آخری پیپر ہے۔ اس کے بعد وہ فری ہو جائے گی۔ تم کل ماہم کے ساتھ چلے جانا اور اس وقت تک کالج کے باہر رہنا جب تک ماہم پیپر سے فری ہو کر باہر نہ آ جائے۔''

خالد کا ماتھا ٹھنکا۔ ''خیریت ہے بی بی جی...... ماہم بی بی اکیلی ہی پیپر دینے جاتی رہی ہیں؟''

''تم یہ بات فیروز سے مت کرنا۔ رات میں نے کوئی اچھا خواب نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ ماہم پر کوئی بھاری چیز گر گئی ہے اور وہ اس کے نیچے دب گئی ہے۔'' نجمہ پریشانی کے عالم میں بولی۔

خالد کے چہرے پر پریشانی عیاں ہو گئی۔ ''خواب محض خواب ہی ہوتے ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔''

''بعض اوقات خواب سچ بھی ہو جاتے ہیں۔'' نجمہ نے کہا۔

''میں ماہم بی بی کے نام کا صدقہ خیرات کر دیتا ہوں۔'' خالد کے دل میں تشویش دوچند ہو گئی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ نجمہ کو اس اجنبی کے بارے میں بھی آگاہ کر دے۔ جب اس نے نجمہ کا چہرہ دیکھا تو اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ نجمہ اس وقت پریشان تھی۔ خالد نے سوچا اگر اس نے اجنبی کے بارے میں بھی بتا دیا تو شاید نجمہ اپنی بیٹی کو پیپر دینے کے لیے باہر ہی نہ جانے دے۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ تم کچھ صدقہ خیرات بھی کر دینا یاد سے۔ اور دیکھو اس بات کا ذکر فیروز سے مت کرنا، وہ پہلے ہی کہتے ہیں کہ میں وہمی ہوں اور کبھی ایسا اُلٹا سیدھا خواب دیکھ کر پریشان ہوتی رہتی ہوں۔'' نجمہ نے تاکید کی۔

''میں اس کا ذکر.... ان سے بالکل نہیں کروں گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔'' خالد نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔

''ایک بات اور سنو۔'' نجمہ سوچتے ہوئے بولی۔ خالد

اسی جگہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی سوالیہ نگاہیں نجمہ کی جانب مرکوز تھیں اور نجمہ کچھ کہنے سے پہلے شاید یہ سوچ رہی تھی کہ اسے یہ بات کرنی چاہیے، یا نہیں۔

''آپ کچھ کہنے والی تھیں؟'' جب نجمہ کی خاموشی نے طول پکڑا تو خالد نے پوچھا۔

نجمہ چونکی۔ ''کوئی بات نہیں ہے..... تم جاؤ اور اپنا کام کرو۔'' نجمہ نے کچھ کہنے کا ارادہ بدل لیا۔ خالد کھڑا رہا۔ وہ اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس چہرے پر عجیب سی پریشانی تھی۔ خالد سوچتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

ائرپورٹ سے مسافر باہر نکل رہے تھے۔ ان مسافروں میں ایک شخص خراماں خراماں چلتا ہوا خارجی گیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ٹرالی بیگ تھا۔ اس نے قیمتی پینٹ، شرٹ اور کوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کے سر کے بال بہت زیادہ جھڑ چکے تھے جس سے اس کا گنجا پن عیاں تھا۔ اس کی آنکھوں پر قیمتی چشمہ لگا ہوا تھا۔ اس کے داڑھی مونچھ سے مبرّا چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اس کی نگاہیں دائیں بائیں گھومنے کے بجائے سامنے خارجی دروازے کی جانب مرکوز تھیں۔

اس کا نام فیروز عاقل تھا۔ وہ شہر کا بڑا بزنس مین تھا۔ جتنا اس کے پاس پیسہ تھا اس سے کہیں زیادہ اس کے اندر عاجزی تھی۔ وہ اپنے ملازم کے ساتھ بھی دھیمے اور تمیز دار لہجے میں بات کرتا تھا۔ وہ ایسا شریف النفس شخص تھا جس کی شرافت اور کاروباری لین دین کی مثالیں دی جاتی تھیں۔

فیروز اپنی بیوی نجمہ اور اکلوتی بیٹی ماہم سے..... بہت پیار کرتا تھا۔ وہ نجمہ کے ساتھ اس کے دوست کی طرح تھا۔ وہ اس کی اتنی فکر کرتا تھا کہ جب بھی اپنے کاروباری سلسلے میں ملک سے باہر ہوتا تو وہ دن میں کئی بار فون کر کے اپنی بیوی کی خیریت دریافت کرتا تھا۔ اس کی شوگر کے بارے میں پوچھتا تھا، شوگر کی دوائی کھائی یا نہیں، اس بارے میں دریافت کرتا اور اتنی ہی بار وہ اپنی بیٹی کو بھی فون کرتا تھا۔

نجمہ اپنے آپ کو خوش نصیب کہتی تھی کہ اسے فیروز جیسا شوہر ملا جو اس سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور ماہم کا بھی یہی کہنا تھا کہ کاش اس کے باپ جیسے دنیا کے سارے باپ ہو جائیں جو اپنی اولاد کی ہر خواہش کو اس کے لبوں تک آنے سے قبل پورا کر دیتا ہے۔

فیروز جب گیٹ عبور کر کے باہر نکلا تو اس کا ڈرائیور اور خالد تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا ''کیسے ہو خالد......؟''

''جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' خالد نے آگے بڑھ کر فیروز کے ہاتھ سے بیگ لے لیا۔

''تم کیسے ہو نعیم؟'' فیروز نے اپنے ڈرائیور سے ہاتھ ملا کر دریافت کیا۔

''جی آپ کی دعا ہے۔'' نعیم کے لہجے میں عاجزی تھی۔

فیروز ان دونوں کے ساتھ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ جب تک فیروز اپنی کار میں بیٹھ نہیں گیا اس وقت تک خالد کی نگاہیں دائیں بائیں گھومتی رہی تھیں۔ اسے ڈر تھا کہیں وہ اجنبی کہیں سے نکل کر فیروز پر حملہ نہ کر دے۔ گاڑی ائرپورٹ سے نکل کر اب سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ خالد کی نظریں اس وقت بھی سامنے، دائیں بائیں مستعد تھیں۔ سارے راستے.... فیروز کسی نہ کسی سے فون پر ہی باتیں کرتا رہا تھا۔

جس وقت فیروز کی کار اپنے بنگلے کی طرف جا رہی تھی اس دوران اس کی بیٹی ماہم سڑک کنارے اپنی کار کھڑی کر کے بے چینی کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھ گاڑی کے اسٹیئرنگ پر رکھے اپنی انگلیاں اس پر مار رہی تھی۔ اس کی متلاشی نگاہیں سامنے کی طرف بھی دیکھ رہی تھیں۔ اس سڑک پر سناٹا تھا اور کبھی کوئی گاڑی اس سڑک سے گزر جاتی تھی۔ اس کے پیچھے ایک بینک کی عمارت دکھائی دے رہی تھی اور اے ٹی ایم کا بورڈ واضح روشن تھا۔

اس خاموشی میں اچانک ماہم کا موبائل فون بجا اور اس نے چونک کر اپنے موبائل فون کی طرف دیکھا اور جلدی سے اس پر نمبر دیکھ کر اس نے فون کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف سے مردانہ آواز آئی۔

''اپنی کار کا دروازہ کھولو اور رقم والا لفافہ سڑک پر رکھ کر اسی وقت یہاں سے چلی جاؤ۔''

حکم دیتے ہی کال ختم ہو گئی۔ ماہم نے ڈیش بورڈ سے ایک خاکی لفافہ نکالا اور دروازہ کھول کر اسے باہر گرا دیا اور کار کو اسٹارٹ کرتے ہی اس جگہ سے لے گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی کار دور کہیں گم ہو گئی اور ایک بائیک سڑک پر گرے لفافے کے پاس آ کر رکی۔ بائیک پر جو بھی سوار تھا، اس نے ہیلمٹ پہنا ہوا تھا۔ اس نے جھک کر وہ لفافہ اُٹھایا اپنی جیکٹ کے اندر رکھا اور واپس چلا گیا۔

ابھی فیروز اپنے بنگلے میں نہیں پہنچا تھا کہ ماہم پہنچ گئی

اور اس نے گاڑی سے اترتے ہی دیکھا کہ اس کے پپا کی کار گیراج میں موجود نہیں ہے۔ وہ تیزی سے اندر چلی گئی اور سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں جاتے ہی تیز تیز سانس لینے لگی۔

جب فیروز اپنے بنگلے میں پہنچا تو ماہم بھاگتی ہوئی نیچے آئی اور اپنے پپا سے لپٹ گئی۔ فیروز نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک پیک کی ہوئی کوئی چیز نکالی اور ماہم کی طرف بڑھا کر کہا۔ ''یہ لو یہ میری پیاری جان کے لیے ہے۔''

''اس میں کیا ہے پپا؟'' پُرجوش ماہم نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تو میری جان ہی دیکھے گی کہ اس میں کیا ہے۔'' فیروز نے کہا۔

''ابھی کھول لوں؟''

''ابھی کھول لیا تو پھر آپ تو پپا کو بھول ہی جائیں گی۔'' فیروز مسکرایا۔

''میں اسے بعد میں دیکھ لوں گی۔ ابھی میں اپنے پپا سے باتیں کروں گی۔'' ماہم نے پیک کی ہوئی چیز ایک طرف رکھ دی۔

''پیپرز کیسے ہو رہے ہیں؟'' فیروز نے پوچھا۔

''بہت اچھے۔''

''اتنے اچھے ہونے چاہئیں کہ میرا بچہ پڑھنے کے لیے باہر چلا جائے۔'' فیروز نے کہا۔

''میرے اتنے اچھے نمبر آئیں گے کہ مجھے باہر پڑھنے کے لیے جانے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔''

''یہ باتیں پھر کر لینا پہلے آپ فریش ہو جائیں تاکہ کھانا کھائیں۔'' نجمہ نے مسکراتے ہوئے مداخلت کی۔

''جب میں گھر آجاتا ہوں تم دونوں کو دیکھ لیتا ہوں تو اس کے بعد مجھے فریش ہونے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ تم دونوں کو دیکھا، باتیں ہوئیں میں بالکل فریش ہو گیا۔ جلدی سے کھانا لگواؤ ہم کھانا کھائیں گے۔'' فیروز نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ جاتے ہیں تو ہم آپ کو بہت مس کرتے ہیں۔'' ماہم نے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے جیسے گھر خالی ہو گیا ہے۔''

''مجھے بھی باہر جا کر تم دونوں بہت یاد آتے ہو۔ لیکن کیا کروں بزنس ہے بلکہ میں نے تو اس بار سوچا ہے کہ بزنس کو ذرا سمیٹ دوں۔ اتنا کروں جو میں تم دونوں کے پاس رہ کر کر سکتا ہوں۔''

''ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بزنس جتنا پھیل جائے برکت ہے۔ مہینے میں چار، پانچ دن کے لیے تو آپ جاتے ہو۔'' نجمہ نے کہہ کر ملازم کو آواز دی کہ وہ کھانا لگا دے۔

☆☆☆

رات کا کھانا کھانے کے بعد نجمہ اور ماہم اپنے اپنے کمرے میں چلی گئیں جبکہ معمول کے مطابق فیروز لان میں چہل قدمی کے لیے نکل گیا۔ فیروز کے ہاتھ میں موبائل فون تھا اور وہ لان میں ٹہلتے ہوئے کسی سے آہستہ آہستہ بات بھی کر رہا تھا۔ کال زیادہ طویل نہیں تھی۔ فیروز نے کال ختم ہوتے ہی کسی کو میسج کیا اور موبائل فون جیب میں ڈال لیا۔

خالد لاؤنج کی کھڑکی کے پاس کھڑا فیروز کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جونہی فیروز نے موبائل فون جیب میں ڈالا وہ تیزی سے اس کے پاس پہنچ گیا۔

''کیا بات ہے خالد...... تم بھی آج چہل قدمی کرو گے۔'' فیروز نے اسے دیکھ کر مسکرا کر پوچھا۔

''آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔'' خالد نے فیروز کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''کیا ضروری بات کرنی ہے۔ پیسوں کی ضرورت ہے تو جتنے چاہے لے لو۔'' فیروز بولا۔

''یہ بات نہیں ہے صاحب...... میں آج دوپہر سے پریشان ہوں۔'' خالد نے کہا۔

''تم کیوں پریشان ہو؟'' فیروز نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''آج میں گھر کا سامان لینے اسٹور پر گیا تھا۔ میں سامان کی خریداری کر رہا تھا کہ اچانک ایک اجنبی میرے پیچھے آگیا۔'' خالد نے بات شروع کی۔

''کون اجنبی......؟''

''میں اُسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے میں نے اس کو کبھی نہیں دیکھا تھا اور نہ کبھی اس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ میرے بارے میں جانتا ہے کہ میں اس گھر کا ملازم ہوں۔ وہ آپ کے بارے میں بھی جانتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ آپ دبئی گئے ہوئے ہیں۔'' خالد بتانے لگا۔

''اچھا...... اور کیا جانتا ہے وہ؟'' فیروز کو حیرت ہوئی۔

''شاید وہ کچھ اور بھی ہمارے بارے میں جانتا ہو۔ لیکن میرے ساتھ اس نے یہی دو باتیں کی تھیں۔ ایک یہ کہ

اس نے میرا نام بالکل صحیح بتایا تھا اور دوسری بات یہ کہ وہ جانتا تھا کہ آپ دبئی گئے ہوئے ہیں۔''

''اور کیا کہا تھا اُس نے؟'' فیروز بھی سوچنے لگا تھا۔

''وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ آپ دبئی سے کب واپس آرہے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم کیوں پوچھ رہے ہو'' خالد کہہ کر چپ ہوگیا۔ فیروز چہل قدمی کرتا ہوا رک گیا۔ اس کی سوالیہ نگاہیں خالد کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''پھر اس نے کیا جواب دیا؟''

''اس نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ وہ آپ کے بارے میں کیوں پوچھ رہا ہے۔ جب میں نے اس کے بار بار پوچھنے پر اس سے جاننا چاہا کہ وہ کیوں پوچھ رہا ہے تو اس نے جو بات کی اس نے مجھے خوفزدہ کردیا اور میں تب سے پریشان ہوں۔'' خالد بولا۔

''اس نے کیا بات کی تھی کہ تم پریشان ہوگئے اور خوفزدہ بھی......؟'' فیروز کو حیرت ہورہی تھی۔

خالد نے دائیں بائیں نظر گھمائی اور تھرتھراتے ہونٹوں سے بولا۔ ''میرے پوچھنے پر اُس نے کہا......وہ آپ کو قتل کرنا چاہتا ہے۔''

''کیا......؟ اس نے یہ کہا تھا؟'' سنتے ہی فیروز کی حیران کن آواز نکلی۔ اس کی خیرہ نگاہیں خالد کے چہرے پر منجمد ہوگئی تھیں۔

''اس اجنبی نے یہی کہا تھا۔''

''اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے قتل کرنا چاہتا ہے؟'' فیروز نے پھر اپنی بات دہرائی۔

''جی ہاں......اس نے یہی کہا تھا۔'' خالد نے اثبات میں سر ہلایا۔

''وہ مجھے کیوں قتل کرنا چاہتا ہے؟''

''اس نے مجھے یہ نہیں بتایا اور اچانک چلا گیا تھا......بلکہ میں خوف سے اسے کھڑا چھوڑ کر کار میں بیٹھ گیا تھا۔ میں بہت زیادہ ڈر گیا تھا۔'' خالد بولا۔

فیروز سوچ میں پڑ گیا۔ ''میں نے کبھی چیونٹی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور وہ مجھے قتل کرنا چاہتا ہے؟ اس نے مذاق کیا ہوگا۔ وہ کوئی بہروپیا ہوگا۔ تم سے پیسے لینے کے چکر میں ایسی بات کر رہا ہوگا؟''

''صاحب......کوئی بہروپیا اتنی بڑی بات نہیں کرسکتا۔'' خالد متانت سے بولا۔ اس کی بات سن کر فیروز پھر سوچ میں پڑ گیا۔ خالد ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ایسا بھیانک مذاق ایک بہروپیا نہیں کرسکتا تھا۔

''تم نے یہ بات بیگم صاحبہ سے تو نہیں کی؟''

''نہیں، میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔''

''تم نے اچھا کیا کہ ان سے کوئی بات نہیں کی......بہرحال تمہارے ساتھ کسی نے مذاق کیا ہے۔ میں نے کبھی کسی کے ساتھ بُرا نہیں کیا......اس لیے یہ مذاق سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔'' فیروز نے ان باتوں کو نظر انداز کردیا۔

''پھر بھی صاحب آپ احتیاط ضرور کیجیے گا۔''

''کچھ نہیں ہوگا خالد......جس نے مجھے قتل کرنا ہوگا، وہ پہلے میرے ملازم کو آگاہ نہیں کرے گا کہ وہ مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔'' فیروز نے کہہ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''وہ تمہارا کوئی جاننے والا ہوگا جو تم سے مذاق کر گیا ہے۔ ان باتوں کو اپنے دماغ سے نکال دو اور آرام کرو۔''

خالد کچھ دیر کھڑا رہا۔ فیروز مسکرا رہا تھا۔ اس نے پھر خالد کو اشارہ کیا کہ وہ جا کر آرام کرے۔ خالد چلا گیا اور فیروز کچھ دیر مزید چہل قدمی کرتا رہا اور اس کے بعد وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ فیروز نے اس بات کو واقعی نظر انداز کردیا تھا۔

☆☆☆

ماہم کا آخری پیپر تھا، جب وہ کالج کے سامنے پہنچی اور گاڑی سے اترنے لگی تو اس نے خالد کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''جب میں آپ کو فون کروں تب آپ مجھے لینے کے لیے آجائیے گا۔''

''بیگم صاحبہ نے کہا تھا کہ ہم آپ کا یہیں انتظار کریں۔'' خالد نے کہا۔

ماہم نے اس کی طرف متحیر نظروں سے دیکھا۔ ''کیوں کیا بات ہے؟ آپ میرا یہاں کیوں انتظار کریں گے؟''

''یہ بیگم صاحبہ کا حکم ہے۔'' خالد عاجزی سے بولا۔

ماہم نے اپنا موبائل فون نکالا اور جونہی اس کا رابطہ نجمہ سے ہوا، اس نے کہا۔ ''مما آج میرا آخری پیپر ہے اور ہم دوستوں نے پیپر کے بعد باہر لنچ کرنے اور کچھ گھومنے کا پروگرام بنایا ہے۔ جبکہ بابا کہہ رہے ہیں کہ وہ مجھے واپس لے کر جائیں گے۔''

''میں نے سوچا تھا کہ خالد یہیں تمہارا انتظار کرلے گا۔'' نجمہ نے کہا۔

''میں اپنی تمام دوستوں کے ساتھ ہوں گی، میں ان کو واپس بھیج رہی ہوں۔'' ماہم بولی۔

''اچھا تم اپنا خیال رکھنا اور جیسے ہی تم فری ہو تو مجھے

فون کر دینا۔'' نجمہ تذبذب کے انداز میں بولی۔ ماہم نے فون بند کر دیا اور خالد سے کہا۔ ''آپ جائیں۔ میں آپ کو فون کر دوں گی۔''

خالد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ماہم گاڑی سے باہر نکلی اور اندر کالج میں چلی گئی۔ خالد نے ڈرائیور کو واپس چلنے کے لیے کہا۔

پیپر ختم ہوا تو ماہم اپنی دوستوں کے ساتھ کالج سے باہر آگئی۔ انہوں نے پہلے ہی پروگرام بنایا ہوا تھا۔ وہ اس جگہ سے ٹیکسی میں بیٹھ کر ایک ریسٹورنٹ میں پہنچیں، وہاں انہوں نے آپس میں خوش گپیوں میں مصروف کھانے پینے کا سامان منگوایا اور کھانے سے فارغ ہو کر وہ ایک دوسری جگہ پر چلی گئیں جہاں بہترین کافی ملتی تھی۔

اس جگہ دن اور رات کافی رش رہتا تھا۔ کافی پینے کے دوران بھی ان کی ہنسی اور باتیں ختم نہیں ہوئی تھیں۔

''اب واپس چلیں۔'' ایک نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھ کر سب کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''کچھ دیر اور انجوائے کرتے ہیں۔'' دوسری بولی۔

''اب فری ہیں ہم..... جب پروگرام بنایا کریں گے یوں جمع ہو کر انجوائے کر لیا کریں گی۔ میرا بھی خیال ہے کہ اب ہم چلیں۔'' ماہم نے اپنا بیگ سنبھالا۔

وہ سب اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ باہر جاتے ہوئے ماہم نے کہا۔ ''میں ڈرائیور کو بلا لیتی ہوں ہم ایک ساتھ چلے جائیں گے۔ تم سب کو میں ڈراپ کر دوں گی۔''

''ہم سب کے گھر الگ الگ جگہوں پر ہیں۔ کوئی اِس طرف ہے تو کوئی اُس طرف..... تمہارا ڈرائیور ہمیں لیے کہاں گھومتا رہے گا۔ بہتر ہے ہم ٹیکسی کر لیتے ہیں۔ تم یہیں ڈرائیور کو بلا لو۔ ہم چلتے ہیں۔''

''میں اکیلی ڈرائیور کا انتظار کروں گی؟'' ماہم بولی۔

''تم اکیلی کہاں ہو۔ اتنے سارے لوگ یہاں موجود ہیں۔'' ہر ایک کی ہنسی چھوٹی اور وہ سب باری باری اس کے گال پر بوسہ دے کر چلی گئیں۔ آخر میں عالیہ گئی تھی جو اس کی سب سے اچھی دوست تھی۔ ماہم نے ابھی موبائل فون نکالا ہی تھا کہ اس کے دائیں طرف سے ایک دھیمی آواز اس کی سماعت میں پڑی۔

''کیسی ہو ماہم.....؟''

ماہم کال کرنا بھول گئی اور اس نے چونک کر اس جانب دیکھا۔ اس کے سامنے ایک خوبصورت نوجوان کھڑا تھا۔ کلین شیو چہرے پر مسکراہٹ تھی اور چمکتی ہوئی آنکھیں ماہم کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''آپ کون ہیں؟'' ماہم اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

''مجھے نہیں پہچانا؟ کیا تم نے مجھے واقعی نہیں پہچانا؟'' اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ ''ہاں پہچانو گی بھی کیسے..... کئی سالوں کے بعد تو ہم مل رہے ہیں۔''

''کئی سال پہلے ہماری ملاقات ہوئی تھی؟''

''ایک نہیں..... کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔''

''میرا نہیں خیال کہ میں آپ سے کبھی ملی ہوں؟'' ماہم نے کہا۔

''کیا ہم تھوڑی دیر کے لیے وہاں بیٹھ جائیں۔ اس جگہ کھڑے ہو کر بات کرنا مناسب نہیں ہے۔'' نوجوان نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ماہم بادلِ ناخواستہ اس کے ساتھ اس طرف چلی گئی۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ماہم کے چہرے پر ابھی تک حیرت تھی۔

''چند سال پہلے آپ لوگوں کی رہائش لطیف آباد کے علاقے میں ہوتی تھی۔ تب آپ کے پپا بہت بڑے بزنس مین نہیں تھے..... آپ اس وقت چھوٹی تھیں۔ غالباً بارہ سال کی ہوں گی اور میں بھی آپ سے ایک دو سال بڑا تھا اور آپ کے ساتھ والے فلیٹ میں رہتا تھا۔''

''ہمارے ساتھ تو نانو کا گھر ہوتا تھا۔'' ماہم ایک دم سے بولی۔

''وہ میری نانو تھیں جن سے آپ کو بھی بہت محبت تھی اور آپ ان کی گود میں ہی رہتی تھیں۔''

''تم توقیر ہو.....؟؟'' ماہم پُرجوش انداز میں مسکرائی۔

نوجوان کے چہرے پر مسکراہٹ اور بھی گہری ہوگئی۔ ''جی میں توقیر ہوں۔''

''نانو کیسی ہیں؟''

''وہ بہت اچھی ہیں۔ بس یہ ہے کہ وہ اس دنیا سے آسمان کی بلندیوں میں چلی گئی ہیں۔'' توقیر نے بتایا تو ماہم کا چہرہ اداس ہو گیا، پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

''کتنی اچھی تھیں وہ۔ مجھ سے وہ بہت پیار کرتی تھیں۔ میں ہر وقت آپ کے فلیٹ میں گھسی رہتی تھی۔ اور نانو نے جو آپ کے حصے کی چیز رکھی ہوتی تھی، وہ میں معصوم سی صورت بنا کر نانو سے تھوڑی تھوڑی مانگ کر ساری کھا جاتی تھی۔'' ماہم کہہ کر ہنسنے لگی۔

''مجھے سب یاد ہے۔ ایسا ہی ہوتا تھا۔'' توقیر بھی

ماضی میں کھو گیا۔
''تمہارے امی ابا کیسے ہیں؟''
''وہ بالکل ٹھیک ہیں اور زندگی انجوائے کر رہے ہیں۔''
''اتنے سالوں کے بعد تم نے مجھے پہچانا کیسے؟'' ماہم نے پوچھا۔
تمہارے اس کان کے نیچے جو نشان ہے اس سے میں نے پہچانا۔ یاد ہے یہ نشان کیسے پڑا تھا؟''
''یہ تو میرا پیدائشی نشان ہے۔''
''یہ نشان مجھے یاد تھا۔ اچانک دیکھا تو مجھے لگا کہ تم ماہم ہو۔ تاہم ڈرتے ڈرتے میں نے تم کو مخاطب کر ہی لیا۔'' توقیر بولا۔ ''تم بتاؤ تمہاری مما اور پپا کیسے ہیں۔ سنا ہے وہ بہت بڑے بزنس مین بن گئے ہیں؟''
''ہاں بہت بڑے بزنس مین بن گئے ہیں۔ تم اُن سے ملنا چاہو گے؟'' ماہم نے کہا۔
''بالکل ملنا چاہوں گا۔ لیکن آج نہیں۔ آج میرا انٹرویو ہے۔ دعا کرو مجھے نوکری مل جائے اور میری بیروزگاری ختم ہو جائے۔'' توقیر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''تم بیروزگار ہو؟''
''ہاں...... نوکری تلاش کر رہا ہوں۔ ہر بار یہی امید ہوتی ہے مجھے نوکری مل جائے گی اور ہر بار میری امید ٹوٹ جاتی ہے۔''
''تم میرے پپا سے ملو۔ آج ہی تم کو نوکری مل جائے گی۔'' ماہم نے مشورہ دیا۔
وہ مسکرایا۔ ''تم میری سفارش کرو گی؟''
''میں ایسی سفارش کروں گی کہ پپا انکار نہیں کر سکیں گے۔ میں گھر جانے کے لیے ڈرائیور کو بلا رہی ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو۔''
''ماہم تم میری بات اپنے پپا سے مت کرنا۔ میں کسی کی سفارش سے نوکری لینا نہیں چاہتا۔ اپنے بل بوتے پر نوکری حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' توقیر متانت سے بولا۔
وہ طنزیہ ہنسی۔ ''پھر تم نے کر لی نوکری...... یہاں سفارش سے کام ملتا ہے۔ ڈگریاں ہماری الماری میں رکھنے کے لیے ہوتی ہیں۔''
''اگر میں اپنے بل بوتے پر نوکری نہ حاصل کر سکا تو پھر تم کو سفارش کے لیے کہوں گا۔ ابھی مجھے کوشش کرنے دو۔ بس ایک ریکویسٹ ہے۔'' توقیر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''کیا ریکویسٹ ہے؟''
''مجھ سے مل لیا کرو۔ فون پر بات کر لیا کرو۔ میرا کوئی دوست نہیں ہے۔ تم سے باتیں کر کے مجھے اچھا لگے گا۔''
''یہ کونسی مشکل بات ہے۔ مجھے اپنا فون نمبر دو اور میرا نمبر لے لو۔'' ماہم نے جلدی سے کہا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے فون نمبر لیے اور ایک دوسرے سے الگ ہونے سے قبل توقیر نے کہا۔
''ایک اور ریکویسٹ ہے ابھی تم میرا ذکر اپنی مما اور پپا سے نہیں کرو گی۔ مجھے نوکری ملی تو مٹھائی لے کر خود آؤں گا۔ اور ان کو سرپرائز دوں گا۔ اگر نوکری نہ ملی تو پھر تمہاری سفارش کے لیے تمہارے پاس آ جاؤں گا۔''
''یہ بتاؤ تم انٹرویو میرے پپا کے آفس میں دینے جا رہے ہو؟'' ماہم نے سوال کیا۔
''نہیں نہیں...... میں کہیں اور جا رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔
''ٹھیک ہے ابھی میں تمہارا گھر پر ذکر نہیں کروں گی۔'' ماہم مسکرائی۔ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو کر اپنی اپنی سمت چل دیے۔ جاتے ہوئے توقیر کے چہرے پر سفاک اور معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

رات کا کھانا کھاتے ہوئے فیروز نے اچانک چونک کر کہا۔ ''ارے ایک بات تو میں بتانا ہی بھول گیا۔''
''وہ کیا بات ہے؟'' نجمہ اس کی طرف دیکھنے لگی جبکہ ماہم نے بھی کھانا چھوڑ دیا۔
''تم کو یاد ہے جب ہم ایک بلڈنگ میں رہتے تھے۔ ہمارے فلیٹ کے ساتھ نانو کا فلیٹ ہوتا تھا جو پورے اپارٹمنٹ کی نانو تھیں۔'' فیروز بولا۔
''ہاں ہاں یاد ہے...... ہماری ماہم تو نانو کی گود سے ہی نہیں اترتی تھی۔ بڑی بھی ہو گئی تھی تو نانو کے پاس جانے کی ہی ضد کیا کرتی تھی۔'' نجمہ نے کہا تو ماہم مسکرانے لگی۔
''میں دبئی ائیرپورٹ پر تھا اور ابھی فلائٹ میں کچھ وقت تھا۔ میری نگاہ اچانک توقیر پر پڑی۔ وہ مجھے چھ ماہ پہلے بھی یہاں اچانک شہر میں ملا تھا۔ میں اس کے پاس گیا تو اس نے بتایا وہ چار ماہ سے دبئی میں تھا۔ جو اسے یہاں لے کر آیا تھا اس نے جو بات کی تھی، وہ پوری نہیں کی اور وہ خوار ہو کر اب واپس جا رہا ہے۔'' فیروز نے بتایا۔

''اچھا......'' نجمہ کو حیرت اور تاسف ہوا۔ ''بہت اچھے لوگ ہیں۔ ہمارے ساتھ تو ان کا ایک خاص تعلق تھا۔''

''پرانے ہمسائے تھے، بہت اچھے لوگ ہیں، ان کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا تھا...... مجھے تو اس پر بہت ترس آیا میں نے اسے اپنے آفس آنے کے لیے کہا اور آج وہ میرے آفس آیا، میں نے اسے نوکری دے دی ہے۔'' فیروز نے خوش ہو کے بتایا۔

''ویسے مجھے آپ کی یہی عادت اچھی لگتی ہے کہ آپ نہ تو اپنا ماضی بھولے ہیں اور قدرت نے ہمیں ہر نعمت سے نوازا ہے پھر بھی آپ کے اندر عاجزی ہے، تکبّر نام کو نہیں ہے۔''

''نجمہ بیگم ...... میں اپنا ماضی کیسے بھول سکتا ہوں...... ویسے میں نے توقیر کو بلایا ہے۔ وہ نو بجے کے قریب آئے گا۔ میں نے کہا کہ تم گھر آ کر نجمہ سے بھی مل لو۔'' فیروز کہہ کر پھر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ ماہم کھاتے ہوئے حیران تھی کہ توقیر تو اسے ملا تھا۔ وہ دبئی کیسے پہنچ گیا۔ وہ اسی وقت اپنے پپا سے پوچھنا چاہتی تھی لیکن فی الحال چپ رہی۔

کھانا ختم کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے توقیر کو کال کی۔

''کیسے یاد کر لیا......؟'' رابطہ ہوتے ہی دوسری طرف سے توقیر کی چہکتی ہوئی آواز آئی۔

''مبارک ہو۔''

''کس بات کی؟''

''تم کو نوکری مل گئی ہے...... اس بات کی مبارک دے رہی ہوں۔'' ماہم نے وضاحت کی۔

کچھ توقف کے بعد توقیر نے پوچھا۔ ''تم کیسے جانتی ہو کہ مجھے نوکری مل گئی ہے؟''

''اب اتنے بھی بھولے نہ بنو۔ جہاں انٹرویو دینے گئے تھے اس کمپنی کے مالک سے تمہاری بات ہو چکی ہے، تم دونوں ایک دوسرے کو پہچان چکے ہو اور پھر بھی کہہ رہے ہو کہ مجھے کیسے پتا چلا...... ابھی پپا نے بتایا ہے کہ تم انٹرویو دینے گئے تھے اور انہوں نے تم کو نوکری دے دی ہے۔'' ماہم دراصل جاننا چاہتی تھی کہ جو توقیر اسے ملا ہے، وہ کوئی دھوکا تو نہیں تھا۔

''اوہ...... ہاں...... اور کیا بتایا پپا نے۔'' توقیر مسکرایا۔

''پرانی باتیں یاد کرتے رہے، تم لوگوں کی تعریف کرتے رہے اور بس یہی بتایا ہے۔''

''ہاں تمہارے پپا نے نوکری دے دی ہے...... اور وہ ماضی کی باتیں میرے ساتھ بھی کرتے رہے تھے۔'' توقیر نے کہا۔

''مجھے اچھا لگا کہ تم نے میری سفارش کے بغیر نوکری حاصل کر لی۔ اپنے بل بوتے پر۔''

''ہاں میں یہی چاہتا تھا۔''

''اب پارٹی کب دو گے؟''

''جب تم کہو گی۔'' توقیر کی آواز میں متانت تھی۔

''تمہاری آواز میں اتنی سنجیدگی کیوں ہے؟ کوئی پریشانی ہے کیا۔'' ماہم نے پوچھا۔

''ایسا تو بالکل بھی نہیں ہے۔ میں بہت خوش ہوں، تم کو شاید لگ رہا ہے کہ میں سنجیدہ ہوں؟'' توقیر نے کہا۔

''تمہاری آواز سے لگ رہا ہے تم سنجیدہ ہو۔ اچھا میں تم کو پھر فون کروں گی۔ بلکہ فون کیا کرنا...... پپا بتا رہے تھے کہ تم ہماری طرف آ رہے ہو، تم آؤ گے تو باقی باتیں آمنے سامنے بیٹھ کے کریں گے۔'' ماہم نے کہا۔

''ہاں میں بس آ ہی رہا ہوں۔'' توقیر نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ ماہم نے جان بوجھ کر دبئی کا ذکر نہیں کیا تھا، وہ سوچ رہی تھی کہ توقیر کی کسی بات سے یہ ظاہر نہیں ہوا ہے کہ وہ کسی فریب کا شکار ہے۔ ابھی ماہم نے فون کان سے الگ کیا ہی تھا کہ اس کے کمرے کے دروازے پر ہلکی دستک ہوئی تو اس نے کہا۔ ''جی آ جائیے......''

ملازمہ نے دروازہ کھولا اور بولی۔ ''آپ کو بیگم صاحبہ نے بلایا ہے...... توقیر صاحب آئے ہیں۔''

ماہم سن کر دم بخود رہ گئی۔ ابھی اس سے بات ہوئی تھی اور اس نے کہا تھا کہ وہ آنے کے لیے نکل رہا ہے اور وہ نیچے بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ اسی گھر میں بیٹھ کر اس کا فون سن رہا تھا۔

''میں آ رہی ہوں۔'' ماہم آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنا جائزہ لیا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

ڈرائنگ روم میں فیروز اور نجمہ کے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ماہم اندر گئی تو وہ ٹھٹک گئی۔ نجمہ اور فیروز کے سامنے صوفے پر جو نوجوان بیٹھا تھا، وہ توقیر نہیں تھا۔ وہ عام شکل و صورت کا نوجوان تھا۔

''آؤ ماہم...... اس سے ملو یہ ہے توقیر جس کی چیزوں کو تم کھا جایا کرتی تھیں اور وہ بھی نانو کے سامنے معصوم بن کے۔'' نجمہ ہنستے ہوئے بولی تو وہ دونوں بھی ہنسنے لگے۔ توقیر

کھڑا ہو گیا۔ اس نے ماہم کو سلام کیا، اس کی خیریت دریافت کی اور جواب میں ماہم نے رسمی سے جواب دیے اور ایک طرف بیٹھ گئی۔

ڈرائنگ روم میں ماضی کی باتیں ہونے لگیں اور ماہم سوچ رہی تھی کہ اس کے والدین کو دھوکا ہوا ہے.....توقیر تو اسے ملا تھا جو بہت خوبصورت تھا۔ ابھی اس سے بات بھی ہوئی تھی......پھر یہ کون ہے؟

توقیر چائے پی کر اور ماضی کی باتوں کو یاد کر کے چلا گیا۔ نجمہ بھی اُٹھ گئی۔ فیروز جانے لگا تو ماہم نے پوچھا۔

''پپا آپ کو یقین ہے کہ یہ ہی توقیر ہے؟''

''کیا مطلب......؟''فیروز نے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے نہیں لگتا کہ یہ توقیر ہے۔''

''تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ توقیر نہیں ہے۔تم نے تو اسے نوعمری میں دیکھا تھا۔ میں نے انٹرویو کے دوران اس کے شناختی کارڈ کی کاپی اور تعلیمی اسناد دیکھی ہیں جو میرے آفس میں موجود ہیں۔ اور پھر میں تو اسے اچھی طرح سے پہچانتا ہوں۔''فیروز نے کہا۔

''اگر یہ توقیر ہے تو پھر وہ کون ہے جو آج مجھے ریسٹورنٹ میں ملا تھا؟''ماہم بولی تو فیروز اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔

''تم کو کون ملا تھا؟''

ماہم نے ساری بات بتائی کہ ریسٹورنٹ میں اسے ایک خوبصورت نوجوان ملا تھا جس نے اپنا نام توقیر بتایا تھا اور اسے وہ سب باتیں معلوم تھیں جو اس کے ماضی کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں۔ فیروز اس کی ساری بات خاموشی سے سنتا رہا۔

''تم ایسا کرو ابھی اُسے کال کرو اور کل اسی ریسٹورنٹ پر بلالو۔''فیروز نے سوچنے کے بعد کہا۔

ماہم نے اپنے موبائل فون سے اسے کال کی تو اس کا نمبر بند تھا۔ اس نے تین، چار بار کال کی لیکن نمبر بند جارہا تھا۔

''اس کا نمبر بند ہے۔''ماہم کو تشویش ہونے لگی تھی۔

''اس بات کا ذکر تم اپنی ماں سے مت کرنا۔ وہ بہت جلدی پریشان ہوجاتی ہے۔تم پھر کوشش کرنا جیسے ہی رابطہ ہو اُسے ریسٹورنٹ میں آنے کو کہنا اور مجھے بتا دینا۔''

''ویسے آپ کے خیال میں وہ کون ہے؟''

''اس کا تو مجھے معلوم نہیں لیکن ابھی جو ہمارے گھر میں آیا تھا وہ سو فیصد توقیر ہے۔''فیروز اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔

''کل آفس جا کر آپ اس توقیر کے کاغذات ایک بار پھر اچھی طرح سے چیک کر لیجیے گا۔ تاکہ کوئی شک نہ رہے۔''ماہم نے کہا۔

''میری اس طرف سے تسلی ہے۔ میں اس توقیر کے بارے میں سوچ رہا ہوں جو آج تمہیں ملا تھا جسے یہ بھی معلوم تھا کہ ہمارے فلیٹ کے ساتھ ایک نانو بھی تھی اور تم سے وہ بہت پیار کرتی تھی۔ بہرحال تم فکر نہیں کرو اور جا کر سو جاؤ۔''فیروز نے کہہ کر پیار سے ماہم کے ماتھے پر بوسہ لیا اور ماہم چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی فیروز کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری ہوگئی تھی۔ خالد کی جس بات کو اس نے مذاق کہہ کر نظرانداز کر دیا تھا پہلی بار وہ اس بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا کہ کوئی اسے واقعی قتل کرنا چاہتا ہے اور اس کے گرد ایک ایسا جال بچھا رہا ہے کہ جس سے وہ نکل نہ سکے؟

فیروز سوچنے لگا اسے کیا کرنا چاہیے۔ انتظار کرے، یا پھر اس بارے میں کسی کو آگاہ کر دے تاکہ وقت سے قبل وہ مدد لے سکے۔ جس سے اس کا بچاؤ ممکن ہو سکے۔ فیروز کو اگر اس بات کی فکر اور تشویش ہونے لگی تھی تو وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اچانک اس کا کون دشمن پیدا ہو گیا ہے جو اُسے جان سے مارنے کے لیے پوری تحقیق کے ساتھ منصوبہ بندی کیے بیٹھا ہے؟

☆☆☆

اپنے کمرے میں جا کر ماہم نے ایک بار پھر توقیر کو کال کی تو بیل جانے لگی۔ ماہم مضطرب ہوگئی۔ اچانک دوسری طرف سے توقیر کی آواز آئی۔

''ہیلو ماہم......''

''تم نے فون بند کیا ہوا تھا۔''

''مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ اس کی بیٹری کب ختم ہوگئی ہے۔''توقیر نے جواب دیا۔

''اچھا میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''تم نے تو کہا تھا کہ میں آرہا ہوں تمہارے گھر اور اب تم مجھ سے ملنا چاہتی ہو؟''

''میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا تھا۔''ماہم ہنسی۔

''اچھا کہاں ملنا چاہتی ہو؟''توقیر نے پوچھا۔

''تم بتاؤ۔''ماہم کال کرتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی اور بغیر آہٹ پیدا کیے سیڑھیاں اترنے لگی۔

’’تم کل دس بجے اسی ریسٹورنٹ کے سامنے آجاؤ۔ ویسے میں پوچھ سکتا ہوں تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہو؟‘‘

’’کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ میں مل کے تم سے بات کروں۔‘‘ ماہم نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ اور کچھ دوسری باتوں کے بعد کال بند کردی۔ اس وقت ماہم کے قدم فیروز کے کمرے کے دروازے کے پاس رک چکے تھے۔ اس نے ہلکی سی دستک دی تو تھوڑی دیر کے بعد فیروز باہر نکلا۔ ماہم اس کا بازو پکڑ کر ایک طرف لے گئی۔

’’میری بات اس توقیر سے ہوچکی ہے۔ کل دس بجے ملنے کا کہا ہے۔‘‘ ماہم نے سرگوشی کی۔

’’ٹھیک ہے۔ صبح تم اپنی گاڑی میں جانا، میں تمہارے پیچھے ہوں گا۔ جونہی تم اس سے ملوگی میں فوراً تم لوگوں کے پاس آجاؤں گا اور اس بہروپیے کی طبیعت صاف کردوں گا۔‘‘

’’کیا ہوا......؟‘‘ اچانک پیچھے سے نجمہ نے کمرے سے.... نکل کر متحیّر لہجے میں پوچھا۔

’’کچھ نہیں...... صبح اس نے اپنی دوستوں کے ساتھ کہیں جانے کا پروگرام بنایا ہے، مجھ سے اجازت لے رہی تھی۔‘‘ فیروز نے بات کو گھمایا۔

’’مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے بات کوئی اور ہے۔ اجازت تو صبح ناشتے کی میز پر بھی لی جاسکتی تھی۔‘‘ نجمہ نے کہا۔

’’ماہم تم اپنے کمرے میں جاؤ اور تم چلی جانا۔‘‘ فیروز نے ماہم کو بھیجا اور نجمہ کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

صبح ساڑھے نو بجے ماہم اپنی گاڑی لے کر نکل گئی۔ اس سے دس منٹ کے بعد فیروز بھی خالد کے ساتھ چلا گیا۔ فیروز نے ڈرائیور کو روک کر خالد کو گاڑی چلانے کے لیے کہا تھا۔

راستے میں خالد نے پوچھا تھا کہ بات کیا ہے۔ فیروز نے فی الحال کوئی جواب نہیں دیا تھا اور اتنا کہا تھا۔

’’میں بتاتا ہوں۔‘‘

فیروز کی نظر سامنے ماہم کی گاڑی پر تھی جو ایک فاصلے پر جارہی تھی۔ ماہم نے اس ریسٹورنٹ کے پاس جاکر ایک طرف گاڑی کھڑی کردی۔ اس نے متلاشی نظروں سے دائیں بائیں اور پھر اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ دس بج کر دس منٹ ہوگئے تھے۔

فیروز نے بھی اپنی گاڑی ایک طرف رکوالی تھی۔ خالد ابھی بھی کچھ نہیں سمجھا تھا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا لیکن فیروز نے اسے فی الحال کچھ بتانے سے منع کیا تھا اس لیے وہ چپ تھا۔

ماہم اپنی سیٹ پر بیٹھی تھی کہ اچانک اس کے برابر والا دروازہ کھلا اور ایک دم توقیر اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ ماہم نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرادی۔ فیروز نے بھی دیکھ لیا تھا کہ کوئی نوجوان اس کی کار میں بیٹھا ہے۔

’’تم اسی جگہ رکو جب تک میں اشارہ نہ کروں تم اسی جگہ رہنا۔‘‘ فیروز نے کہہ کر اپنا پیر نکال کر زمین پر رکھا اور ماہم کی کار کی طرف چل پڑا۔

ماہم نے توقیر کی طرف دیکھ کر کہا۔ ’’کیسے ہو؟‘‘

’’میں ٹھیک ہوں۔ فی الحال تم اس جگہ سے چلو۔‘‘

’’وہاں ریسٹورنٹ میں چلتے ہیں۔ ناشتا کرتے ہیں اور باتیں بھی کرتے ہیں۔‘‘

’’تم گاڑی چلاؤ، کہیں اور جاکر بات کرتے ہیں۔‘‘ توقیر کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی، اس نے پستول نکال کر ماہم کی پسلیوں کے ساتھ لگادیا تھا۔ ماہم ایک دم ڈر گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف مترشح تھا۔ توقیر نے اسے پھر چلنے کا اشارہ کیا اور ماہم کے پاس گاڑی آگے بڑھانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ ماہم کی گاڑی اچانک آگے بڑھ گئی تھی اور فیروز ابھی درمیان میں ہی تھا۔ جونہی اس نے دیکھا کہ گاڑی آگے چلی گئی ہے۔ فیروز رکا اور اپنی کار کی طرف بھاگا۔ خالد بھی دیکھ چکا تھا کہ ماہم کی کار چلی گئی ہے اور فیروز اس کی طرف آرہا ہے تو اس نے کار اسٹارٹ کی اور فیروز کے پاس جاکر روک دی۔ فیروز اندر بیٹھتے ہی چلایا۔

’’ماہم کی کار کا پیچھا کرو۔‘‘

خالد نے کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھائی لیکن چوراہے پر لال بتی کی وجہ سے ان کی کار رک گئی۔ فیروز چلایا۔

’’اشارہ توڑ دو۔ آگے چلو...... مت روکو......‘‘

خالد کے لیے اشارہ توڑنا بھی ممکن نہیں رہا تھا کیونکہ ٹریفک کا رش تھا۔ دائیں اور بائیں سے ٹریفک کا ازدہام گزر رہا تھا۔ فیروز جھنجھلا رہا اور پیچ و تاب کھاتا رہا تھا۔ جب ان کو گرین سگنل ملا تو خالد نے گاڑی بڑھائی لیکن اب بے سود تھا۔ ماہم کی کار کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ فیروز پریشانی کے عالم میں خالد کے ساتھ ایک سڑک سے دوسری اور اس سے تیسری سڑک پر دوڑتا رہا اور دور تک اپنی متلاشی نگاہیں دوڑاتا رہا لیکن ماہم کی کار ایسے غائب ہوگئی تھی جیسے زمین کھا گئی ہو۔ اس نے جلدی سے اپنا موبائل فون نکالا اور

ماہم کا نمبر پش کر دیا۔ ماہم کا موبائل آف تھا۔
فیروز دھڑکتے دل، خوفزدہ آنکھوں اور پریشان چہرے کے ساتھ ناچار سامنے دیکھتا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

ماہم گھبرائی ہوئی تھی اور کار کو دوڑا رہی تھی۔ توقیر اس کے برابر میں بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا پستول ماہم کی پسلیوں کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ جبکہ اس کے دوسرے ہاتھ میں ماہم کا موبائل فون تھا جو اس نے ماہم سے لے کر آف کر دیا تھا۔
''تمہارے ساتھ کوئی تھا؟'' توقیر نے پوچھا۔
''نن..... نہیں میں اکیلی آئی تھی۔'' ماہم نے گھبرا کر جواب دیا۔
''تمہارے گھر توقیر آیا تھا؟''
''تم توقیر نہیں ہو؟'' ماہم نے جواب دینے کے بجائے سوال کر دیا۔
''میرے سوال کا جواب دو۔'' وہ چیخا اور ماہم دبک گئی۔ ''مجھے بتاؤ تمہارے گھر توقیر آیا تھا؟''
''ہاں آیا تھا۔'' ماہم خوفزدہ لہجے میں بولی۔
اس نے ہونٹ بھینچ لیے اور خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''میری ہی غلطی تھی۔ میں نے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا تھا اور سوچا نہیں تھا کہ اصل توقیر کی بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔ میری ساری محنت پر اس نے پانی پھیر دیا۔'' اس نے کہہ کر غصے سے ہاتھ کو جھٹکا۔ پھر وہ ماہم کی طرف متوجہ ہوا۔ ''جب وہ تمہارے گھر آ گیا تھا تو تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں؟ تم نے اپنے گھر والوں سے بات کی تھی؟ تمہارے ساتھ کوئی آیا تھا؟''
''میں ایسے ہی تم سے ملنا چاہتی تھی۔ میرے ساتھ کوئی نہیں آیا تھا، میں اکیلی آئی تھی۔''
''تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' اس نے آنکھیں نکالیں۔
''میں سچ بتا رہی ہوں۔'' ماہم نے ہمت سے کام لیا۔
''مجھ سے ملنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے، جبکہ تمہارے گھر اصل توقیر آ گیا تھا۔ تم سے پہلی بار ملنے سے پہلے اس توقیر کو گولی مار دینی چاہیے تھی مجھے۔'' وہ پھر غصے میں آ گیا اور تاسف سے بولا۔
''تم کون ہو اور توقیر بن کر مجھ سے کیوں ملے تھے؟'' ماہم نے ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا۔
''میں توقیر نہیں ہوں۔ میں ریحان ہوں۔ میری تمہارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے۔ مجھے اچانک معلوم ہوا تھا کہ تم لوگ پہلے ایک اپارٹمنٹ میں رہتے تھے۔ وہاں ایک نانو کا گھر انا ہوتا تھا۔ میں نے ایک ایک بات جاننے کے لیے بڑی محنت کی..... ایک ایک بات جاننے کے بعد تم سے ملا اور وہ کمینہ اسی دن انٹرویو دینے تمہارے باپ کے آفس میں پہنچ گیا۔ میں نے اسے مار کیوں نہیں دیا تھا۔'' اسے رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ گاڑی چلاتے ہوئے ماہم اس کی طرف بھی دیکھ رہی تھی۔
''تم ایسا کیوں کر رہے تھے؟'' ماہم نے پوچھا تو اس نے ایک دم اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی میں دہشت تھی۔ اس کا چہرہ غصے سے بھرا ہوا تھا۔ ایسا چہرہ دیکھ کر ماہم اور بھی ڈر گئی۔ اس نے اپنا چہرہ سامنے کر لیا۔ ریحان اسے بدستور اسی انداز میں دیکھتے ہوئے بولا۔
''مجھے ایسا کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔''
''کس نے مجبور کیا ہے؟''
''جس نے کیا ہے اسی تک پہنچنا ہے مجھے۔ تمہارے ساتھ میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔'' وہ سفاک انداز میں بولا۔ ماہم کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ اُسے لگ رہا تھا وہ کار کہیں مار دے گی۔
''کس تک پہنچنا چاہتے ہو تم؟'' ماہم نے ہمت کر کے پوچھا۔ اس نے بمشکل اپنے حواس قابو میں رکھے ہوئے تھے۔
وہ خاموش رہا اور اپنے دانتوں کو چباتا رہا اور پھر معنی خیز انداز میں بولا۔ ''ہے کوئی..... ہے ایک.....''

☆☆☆

فیروز پریشانی کی تصویر بنا ہوا تھا جبکہ خالد کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اصل بات کو ابھی بھی نہیں جان سکا تھا۔
''خالد..... ماہم اغوا ہو گئی ہے..... ماہم کو اغوا کر لیا ہے اُس نے۔'' طویل خاموشی کے بعد فیروز پریشانی کے عالم میں چلّایا۔
''وہ کون تھا..... اور یہ سب کیا تھا۔ آپ مجھے کچھ بتائیں گے؟'' خالد کے چہرے پر تشویش تھی۔
فیروز نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور اختصار سے اسے توقیر کے بارے میں بتانے لگا۔ جب فیروز نے سب کچھ اس کے گوش گزار کر دیا تو خالد نے کہا۔
''ایسی بات تھی تو مجھے بتاتے۔ میں آپ کو ایسا کرنے

کا بالکل مشورہ نہ دیتا۔ آپ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے۔ یہ چھوٹی غلطی نہیں ہے صاحب۔''

''ہاں مجھ سے واقعی بڑی غلطی ہوگئی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ کوئی عام بہروپیا ہوگا لیکن وہ عام نہیں تھا...... اب کیا کروں...... پولیس کے پاس چلیں؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے خالد کی طرف دیکھا۔

''پولیس کے پاس جانا مناسب نہیں ہوگا صاحب۔'' خالد نے سوچتے ہوئے کہا۔

''کیوں مناسب نہیں ہوگا۔ ہم پولیس کو اطلاع کرتے ہیں وہ کار ٹریس لیں گے۔''

''ایسے لوگ اپنا کام اسی کار میں نہیں کرتے۔ وہ کار کسی سڑک کنارے کھڑی ملے گی اور وہ ماہم بی بی کو کسی دوسری کار میں آگے لے جائیں گے۔'' خالد بولا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ جانے وہ ماہم کو کہاں لے گیا ہوگا۔ پھر بھی ہمیں پولیس کو تو اطلاع کرنی چاہیے۔ تم کار بیک کرو اور پولیس اسٹیشن چلو۔'' فیروز نے جلدی سے کہا۔

''میرا ایک مشورہ ہے صاحب۔'' خالد نے سوچنے کے بعد زبان کھولی۔

''کیا مشورہ ہے؟''

''آپ پولیس کے بجائے کمال صاحب سے رابطہ کریں۔ وہ آپ کو بہتر بتا سکتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے۔'' خالد نے مشورہ دیا تو فیروز سوچ میں پڑ گیا۔

''وہ پولیس انسپکٹر میرا جگری دوست ہے لیکن ایک نمبر کا راشی اور حرامی ہے۔ اس وقت وہ لائن حاضر ہے۔ معطل ہے وہ۔''

''وہ ساری دنیا کے لیے برے ہیں، آپ کے لیے نہیں.... اور پھر وہ ماہم بی بی سے بہت پیار کرتے ہیں ان کو اپنی بیٹی کہتے ہیں۔'' خالد نے کہا۔

فیروز نے کچھ سوچنے کے بعد فوراً خالد کو کمال کی طرف جانے کا حکم دے دیا۔ خالد نے گاڑی گھمائی اور اس کا رخ کمال کے گھر کی طرف کر دیا۔

☆☆☆

کمال خان پولیس انسپکٹر تھا۔ اس کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی لیکن اس کی صحت ایسی تھی کہ وہ چالیس سال کا .... لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر مونچھیں تھیں اور آنکھوں میں عجیب قسم کی دہشت تھی۔ وہ ایک ذہین انسپکٹر تھا، اکیلا رہتا تھا اور اس نے تین شادیاں کی تھیں اور تینوں کو وہ طلاق دے کر چوتھی شادی کے بارے میں بہت سنجیدہ تھا۔ اب

اسے پھر محبت ہوگئی تھی۔ وہ عورت بہت خوبصورت تھی اور دونوں ایک دوسرے کے لیے سنجیدہ تھے، بلکہ کمال تو اس کے لیے ایسا سنجیدہ تھا کہ وہ کہتا تھا یہ اس کی آخری شادی ہوگی، اسے واقعی اس سے بہت محبت تھی لیکن جانے کیا ہوا کہ وہ محبت اس سے دور ہوگئی اور وہ ہاتھ ملتا رہ گیا تھا۔

کمال راشی پولیس والا تھا۔ اس نے بہت سی جائداد بنائی ہوئی تھی۔ وہ کئی بار اپنی ڈیوٹی سے معطل اور کئی بار بحال ہوا تھا۔ اس وقت بھی وہ معطل تھا اور اپنے قریبی دوستوں کے ساتھ مزے سے وقت گزار رہا تھا۔

جب فیروز اور خالد اس کے گھر پہنچے تو وہ لانگ نیکر پہنے لاؤنج میں بیٹھا کافی پیتے ہوئے اپنے کتے کے ساتھ کھیل بھی رہا تھا۔ فیروز اور خالد کے آنے سے اس نے اپنے پالتو کتے کو باہر لان میں بھیج دیا۔

''آج کیسے راستہ بھول گئے ہو۔ بھابی سے لڑ کر آرہے ہو، یا آج دل چاہا ہے کہ انسپکٹر کی کمائی کا ناشتا کیا جائے۔'' کمال کہہ کر ہنسا۔

''میں بہت پریشان ہوں کمال۔'' فیروز نے اپنے اترے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا تو اس کی طرف دیکھتے ہوئے کمال نے کافی کا مگ ایک طرف رکھ دیا اور متانت سے پوچھا۔

''کیا بات ہے...... کیوں پریشان ہو؟''

''بہت بڑا مسئلہ ہوگیا ہے۔''

''کیا مسئلہ ہوگیا ہے؟''

''ماہم اغوا ہوگئی ہے۔'' کچھ توقف کے بعد فیروز نے بتایا تو کمال دم بخود سا اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا کہہ رہے ہو یار...... کیسے ہوا یہ؟'' کمال نے پوچھا۔

فیروز اُسے تفصیل سے ساری بات بتانے لگا۔ جسے سننے کے بعد کمال نے کہا۔ ''تم کو اس وقت میرے پاس آنا چاہیے تھا جب تم لوگوں کو یہ پتا چلا تھا کہ ماہم کو نقلی تو قیر ملا تھا۔ تب میں بتاتا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ تم نے تو ماہم کو اغوا ہونے دیا ہے۔''

''بس یہی مجھ سے غلطی ہوگئی۔''

''تم تو بڑے بھلے مانس ہو، نیٹ کلین بزنس کرتے ہو۔ کسی کے ساتھ تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ پھر ماہم کو کس نے اغوا کرلیا ہے۔'' کمال بولا۔

''یہی میں سوچ رہا ہوں۔'' فیروز نے کہا۔

کمال سوچنے کے بعد بولا۔ ''ماہم کی کسی کے ساتھ

کوئی دوستی تو نہیں تھی۔ جس کا تم لوگوں کو علم نہ ہو۔''
''اس نے کبھی کوئی ایسا ذکر نہیں کیا تھا۔'' فیروز نے سوچ کر جواب دیا۔
کمال نے ایک نظر خالد کی طرف دیکھا تو خالد فوراً اشارہ سمجھ گیا اور اُٹھ کر باہر چلا گیا۔ اس نے باہر جاتے ہوئے جان بوجھ کر دروازہ ٹھیک سے بند نہیں کیا تھا اور قریب ہی ٹہلتا رہا تھا اور اس کی کوشش تھی کہ اندر سے آنے والی آواز اس کو سنائی دے۔
کمال اُٹھ کر فیروز کے پاس بیٹھ گیا۔ ''جو میں کہنا چاہتا ہوں میری اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرنا۔ ماہم کی کسی لڑکے کے ساتھ دوستی تو نہیں تھی؟ وہ اُسے ورغلا کر لے گیا ہو۔''
''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے بلکہ ایک بات میں نے تم کو نہیں بتائی تھی، وہ مجھے ابھی یاد آئی ہے۔ خالد کو ایک اجنبی ملا تھا تب میں دبئی میں تھا۔ اس نے خالد سے پوچھا تھا کہ میں کب واپس آرہا ہوں۔ جب خالد نے اس سے پوچھا کہ وہ کیوں پوچھ رہا ہے تو اس نے کہا کہ وہ مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔''
کمال نے اس کی بات کو غور سنا اور اسی وقت خالد کو آواز دے کر پوچھا۔ ''اس کا حلیہ کیسا تھا جو تم کو ملا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ فیروز کو قتل کرنا چاہتا ہے؟''
خالد کو اس کا جو حلیہ یاد تھا اس نے بتا دیا۔ کمال نے فیروز سے پوچھا۔ ''تم اس شکل کے کسی نوجوان کو جانتے ہو؟''
''میں نہیں جانتا۔ میں نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ میں نے اسے محض ایک مذاق سمجھا تھا۔''
''میں نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی مذاق تھا۔ مجھے اس کے پیچھے کوئی کہانی لگتی ہے۔ ایسی کہانی جو ہمارے سامنے لبادہ اوڑھے کھڑی ہے۔'' کمال سوچتے ہوئے بولا۔
''اس بارے میں ہم بعد میں سوچ لیں گے۔ پہلے تم ماہم کا کچھ کرو۔ ماہم کو تلاش کرو۔ کیسے کرنا ہے؟''
''اگر میں پولیس کو انوالو کرلوں تو کہیں ماہم کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ میرا خیال ہے کہ ہم کو ابھی انتظار کرنا چاہئے۔ فون کال کا......''
''تم فون کال کا انتظار کرتے رہ جاؤ گے اور وہ ماہم کو جانے کہاں لے جائیں۔ ماہم کی زندگی تباہ ہوسکتی ہے۔'' فیروز تیز آواز میں بولا۔
کمال اس کے سامنے کھڑا ہوگیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر متانت سے کہا۔ ''فیروز...... ایک بات یاد رکھنا...... اگر ان کا ارادہ ماہم کے بدلے میں رقم لینا ہے تو وہ تم سے اس کا تاوان مانگیں گے۔ اگر اس اغوا کا تعلق اس بات سے ہے جس میں یہ کہا گیا تھا کہ وہ تم کو قتل کرنا چاہتا ہے تو ماہم کو کچھ نہیں ہوگا۔ خالد کو جو ملا تھا وہ اور جو ماہم کی گاڑی میں بیٹھ کر اسے لے گیا...... دونوں نوجوان ہیں اور میرا دل کہتا ہے کہ وہ ایک ہی نوجوان ہے۔''
کمال کی بات سن کر فیروز دم بخود اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''اب ہم کیا کریں؟''
''انتظار کرو۔'' کمال نے سوچنے کے بعد جواب دیا۔
''ہم سوچتے رہ گئے اور اس نے اگر ماہم کو کوئی نقصان پہنچا دیا تو کیا ہوگا۔'' فیروز مضطرب ہوگیا تھا۔ ''تم پولیس کو اطلاع دو تاکہ ماہم کی گاڑی ٹریس ہوجائے اور ہم ان تک پہنچ جائیں۔''
''پولیس کو اطلاع دینا بھی مناسب نہیں ہوگا۔ میرا نہیں خیال کہ وہ اس وقت ماہم کے ساتھ اسی کی گاڑی میں ہوگا۔ ایسا کرتے ہیں ہم تمہارے گھر چلتے ہیں۔'' کمال نے کہا۔
''وہاں جا کر کیا کرو گے؟'' فیروز کی حیرت دوچند ہورہی تھی۔ اس کے اندر بے چینی کا طوفان اُٹھ رہا تھا۔
''میں ماہم کے کمرے کی تلاشی لوں گا اور اس دوران اگر کوئی کال آئی تو پھر اس کے مطابق مجھے سوچنا پڑے گا۔'' کمال نے وضاحت کی۔
''گھر میں نجمہ ہے۔'' فیروز کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔
''نجمہ بھابی سے ہم کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھ سکتے۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا علم ماں کو ہوتا ہے اور وہ باتیں باپ تک نہیں پہنچتی ہیں۔'' کمال نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
''تم ایک ہی رخ پر کیوں سوچ رہے ہو کہ ماہم کا کسی کے ساتھ کوئی تعلق ہوگا اور وہ اُس کے ساتھ......'' فیروز کا لہجہ کچھ تیز ہوگیا اور وہ بولتے بولتے رک گیا۔
''تم کو ایسا لگ رہا ہے کہ میں ایک ہی رخ پر سوچ رہا ہوں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس وقت میرے دماغ میں بہت سی باتیں ہیں اور میں ان میں اُلجھا ہوا ہوں۔ میں ایک پولیس والا ہوں اور پولیس والا جب کوئی کام دل سے کرتا ہے تو پھر وہ بہت کچھ سوچتا ہے۔'' کمال نے کہہ کر اپنی

جیکٹ اور چھوٹا بیگ اُٹھالیا۔ اس نے فیروز کی طرف دیکھا جو پریشانی کے عالم میں کھڑا تھا۔ کمال نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ ’’میرے ساتھ چلو۔‘‘

فیروز اس کے پیچھے بے بسی چل رہا تھا وہ تینوں ایک ہی گاڑی میں اس جگہ سے روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

ماہم کانپتے ہاتھوں سے گاڑی چلا رہی تھی اور جب گاڑی اس جگہ سے دور چلی گئی تو اچانک اس نوجوان نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ’’گاڑی روک دو...... اسی جگہ گاڑی روک دو۔‘‘ ماہم کا پیر بریک پر پڑا اور اس نے گاڑی روک دی۔

ریحان نے اپنے عقب میں دیکھا۔ وہ شہر کی مین سڑک تھی جس کے دائیں بائیں بڑی بڑی عمارتیں کھڑی تھیں اور اس جگہ زیادہ بڑے نام کے شاپنگ سینٹر تھے۔ جس جگہ اس نے کار رکوائی تھی، اس کے دائیں جانب پارکنگ تھی۔

’’گاڑی اس جگہ پارک کردو۔‘‘ ریحان نے ایک طرف دیکھ کر ماہم سے کہا۔ ماہم نے کار اسٹارٹ کی اور اس خالی جگہ پر پارک کردی۔ ان کی گاڑی کے دائیں بائیں گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ریحان نے ایک بار پھر تسلی کی اور اپنی طرف کا شیشہ نیچے کرکے اس نے بازو باہر نکالا اور اس کے برابر میں کھڑی کار کے دروازے کے لاک میں ہاتھ میں پکڑی تار داخل کرکے اسے ہلانے لگا۔

ماہم اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اس تاک میں تھی کہ ایک دم سے وہ کار کا دروازہ کھول کر بھاگ جائے۔ ریحان نے جس ہاتھ میں پستول پکڑا تھا، اس کا رخ ماہم کی طرف تھا۔

تھوڑی کوشش کے بعد اس نے کار کا لاک کھول لیا۔ اس نے اپنا بازو اندر کیا اور ماہم سے بولا۔ ’’کار سے باہر نکلو اور اس برابر والی کار میں بیٹھ جاؤ۔ اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا میں تم کو گولی ماردوں گا اور تم مفت میں ماری جاؤ گی جبکہ میں تم کو نقصان بالکل نہیں پہنچانا چاہتا۔‘‘

ریحان نے کچھ اس انداز میں کہا تھا کہ ماہم ڈر گئی اور اس نے جو ہمت اپنے اندر جمع کی تھی، وہ بھی بکھر گئی۔ اس نے کار کا دروازہ کھولا اور جونہی وہ اپنی طرف سے باہر نکلی ریحان بھی کار سے باہر نکل آیا۔ ریحان کی نگاہیں ماہم کی طرف مرکوز تھیں۔ اس نے پستول والا ہاتھ اپنی جیکٹ کے اندر کیا ہوا تھا۔ ماہم اس کار میں ریحان کے اشارہ کرنے پر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی جبکہ ریحان دوسری طرف سے اس کی برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اندر بیٹھتے ہی اس نے نیچے جھک کر تاروں کے ساتھ چھیڑ خانی کی اور کار اسٹارٹ ہوگئی۔ جب ریحان جھکا ہوا تاروں کے ساتھ کھیل رہا تھا تو ماہم کا دل چاہا وہ اس کے سر پر کوئی چیز مار دے لیکن کار میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ آس پاس بھی کوئی دکھائی نہیں دیا تھا کہ وہ شور مچا دیتی یا پھر ہمت کرکے کوئی دوسرا قدم اُٹھاسکتی۔

جونہی کار اسٹارٹ ہوئی ریحان بولا۔ ’’گاڑی نکالو اس جگہ سے...... فوراً۔‘‘

ماہم نے کار بیک کی اور اس جگہ سے نکال کر لے گئی۔ ریحان کے کہنے پر اس نے کار کی رفتار تیز رکھی تھی۔ چوڑی سڑک پر اس رفتار میں کار چلانا ماہم کے لیے مشکل نہیں تھا۔ ریحان کا پستول اب بھی ماہم کی طرف ہی تھا۔

’’میری تمہارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے، مجھے کیوں پکڑا ہے تم نے۔ مجھے تو جانے دو۔‘‘ ماہم نے کہا۔

’’چپ رہو۔‘‘ اس نے ڈانٹا۔

’’تم مجھے ڈھال بنا رہے ہو؟‘‘ ماہم نے پھر ہمت کی۔

ریحان نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ ’’تم نے مجھے اس بات کا جواب نہیں دیا کہ جب توقیر تمہارے گھر آگیا تھا تم اس سے مل بھی چکی تھیں پھر تم نے مجھ سے کیوں ملنا چاہا تھا...... تم نے اس کا ذکر کسی سے کیا تھا؟ تمہارے ساتھ کون آیا تھا؟‘‘

’’میرے ساتھ کوئی بھی نہیں آیا تھا۔‘‘ ماہم نے اٹکتے ہوئے جواب دیا۔

ریحان نے اُسے گھورا۔ ’’تم میرے سوال کا جواب دوگی یا تم کو میں چلتی کار سے باہر دھکا دے دوں؟ بتاؤ کون تھا تمہارے ساتھ؟‘‘

ماہم ڈر گئی۔ ’’میرے ڈیڈ تھے۔‘‘

’’تمہارے پپا تمہارے ساتھ تھے...؟‘‘ اس کا جواب سن کر اسے شدید حیرت ہوئی تھی۔ وہ کچھ کہنے کے بجائے چپ ہوگیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے اندر بے چینی اور بھی بڑھ گئی ہو۔ پھر ایک دم اس نے اپنا ہاتھ سامنے ڈیش بورڈ پر مارا اور اس کا چہرہ غصے سے بھر گیا۔

’’آگے سے دائیں موڑ لینا......‘‘ سامنے دیکھ کر ریحان نے ماہم کو غصے سے حکم دیا۔ ماہم نے ڈرتے ہوئے خوفزدہ انداز میں کار دائیں طرف موڑ لی۔ اس سڑک کے

دائیں بائیں دور تک درخت ایک قطار میں کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ ریحان نے اسے پھر حکم دیا۔ ''گاڑی روک دو۔''

ماہم نے کار روک دی۔ وہ جلدی سے باہر نکلا اور ماہم کو بھی باہر نکلنے کا کہا۔ جونہی ماہم باہر نکلی ریحان نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف کچے راستے پر اتر گیا۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ اچانک ایک نوجوان درخت کی اوٹ سے نکل کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا اور دونوں اسی جگہ رک گئے۔

☆......☆......☆

نجمہ دم بخود اور ساکت بیٹھی تھی۔ جب اسے بتایا گیا تھا کہ ماہم کو کسی نے اغوا کر لیا ہے تو نجمہ کی ایسی حالت ہو گئی تھی۔ فیروز اس کے قریب بیٹھا اسے تسلی دے رہا تھا جبکہ کمال تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھنے کے بعد ماہم کے کمرے میں چلا گیا تھا۔

کمال نے ماہم کے کمرے کی اچھی طرح سے تلاشی لے لی تھی لیکن اسے کوئی ایسی چیز نہیں ملی تھی جس سے اسے کوئی اشارہ مل سکے یا جس کے ذریعے سے کمال کو اس اغوا کے پیچھے کی بات کا علم ہو جائے۔ جب وہ سب کچھ دیکھ چکا تو وہ جانے سے پہلے دروازے کے پاس رک کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اچانک اس کی نظر بیڈ کے پاس رکھے ڈسٹ بن پر پڑی۔

وہ آگے بڑھا، اس نے جھک کر ڈسٹ بن اُٹھایا اور اس کے اندر دیکھا۔ اسے کچھ پھاڑے ہوئے کاغذ دکھائی دیئے۔ اس نے ہاتھ سے ان کو اِدھر اُدھر کر کے دیکھا تو اس کے ہاتھ چرمرا ایک کاغذ لگ گیا۔ کمال نے ڈسٹ بن نیچے رکھ دیا اور اس کاغذ کو کھولا۔ وہ اے ٹی ایم کی پرچی تھی۔ تین دن پہلے پرچی پر لکھے اکاؤنٹ سے پچاس ہزار روپے کی رقم نکالی گئی تھی۔

کمال نے پرچی جیب میں ڈالی اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ نجمہ کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور وہ رو رہی تھی۔

''کوئی کال آئی؟'' کمال نے پوچھا۔

''کوئی کال نہیں آئی۔ کمال تم وقت ضائع مت کرو اور پولیس کو اطلاع کرو۔ ماہم کو تلاش کرو۔ وہ اسے نقصان پہنچا سکتا ہے۔'' فیروز مضطرب تھا۔

''فیروز تم شاید بھول گئے ہو کہ میں پولیس انسپکٹر ہوں۔ تمہارے سامنے کوئی عام آدمی نہیں کھڑا۔ مجھے معلوم ہے کہ کیا کرنا ہے۔ جب ماہم اغوا ہو چکی تھی تو اس کے آدھا گھنٹے کے بعد تم میرے پاس آئے تھے۔ آدھا گھنٹا بہت اہم ہوتا ہے۔ اگر میں اپنے محکمے کو اطلاع دیتا اور اس گاڑی کو ٹریس بھی کیا جاتا تو وہ کہیں سڑک کنارے ہی کھڑی ملتی۔ اب بھی وہ کہیں کھڑی ہی ملے گی۔'' کمال نے دھیمے لہجے میں بات کی۔

''ہم بہت پریشان ہیں۔ وہ بہروپیا ماہم کو لے گیا ہے۔ جانے وہ کون ہے۔'' فیروز نے کہا۔

کمال اُسے ایک طرف لے گیا۔ ''ماہم کے اکاؤنٹ میں کتنے پیسے ہوں گے؟''

''مجھے معلوم نہیں ہے۔'' فیروز نے نفی میں گردن ہلائی۔

''تم اسے ماہانہ کتنا خرچہ دیتے ہو؟''

''سب کچھ اسی کا ہے۔ وہ جتنا مانگتی ہے میں دے دیتا ہوں۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ اب اس نے کتنا لیا ہے۔ میں نے اپنے اکاؤنٹینٹ کو کہہ رکھا ہے کہ ماہم جو مانگے، اس کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیا کرو۔'' فیروز بولا۔

کمال نے نجمہ کی طرف دیکھا۔ ''بھابی جی......دو، چار دن پہلے ماہم نے کوئی بڑی شاپنگ کی تھی؟ آپ کے علم میں ہو؟''

''وہ جو خریداری کرتی ہے، مجھے دکھاتی بھی ہے اور بتا بھی دیتی ہے۔ اس نے ایک ہفتہ پہلے تک کوئی خریداری نہیں کی تھی......'' نجمہ نے جواب دیا۔

''آپ یقین سے کہہ رہی ہیں؟''

''میں اس کی عادت سے واقف ہوں اور وہ جو خریدتی ہے مجھے ضرور دکھاتی ہے۔''

''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' فیروز نے پوچھا۔

''چار دن پہلے اس نے اپنے اکاؤنٹ سے پچاس ہزار نکلوائے تھے۔ وہ رقم اس نے کیوں نکلوائی تھی جبکہ اس نے کوئی شاپنگ بھی نہیں کی تھی۔'' کمال نے بتانے کے بعد اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

فیروز سوچنے لگا۔ پھر اس نے اپنے اکاؤنٹینٹ کو فون کیا اور ایک طرف کھڑا ہو کر معلومات لیتا۔ جب اس نے بات کر لی تو اس نے متانت سے کمال کو بتایا۔ ''ایک ماہ میں اس نے ڈھائی لاکھ روپے لیے ہیں......ڈھائی لاکھ روپے ماہم نے کیوں لیے......؟'' فیروز کے چہرے پر تو حیرت تھی ہی کمال بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

نجمہ اُن کے پاس چلی گئی تھی۔ اس نے سننے کے بعد کہا۔ ''ماہم کی ایک ہی اچھی اور قریبی دوست ہے

عالیہ...... اُسے ضرور علم ہوگا۔ خالد کو بھیج کر اسے یہاں بلا لیں۔''

''خالد کو بھیجیں وہ عالیہ کو ابھی لے آئے۔'' کمال بولا۔ فیروز نے اسی وقت خالد کو بھیج دیا۔

☆☆☆

ریحان اور ماہم کے سامنے اچانک آنے والے نوجوان کا نام فیصل تھا۔ اس نے ریحان کو اشارہ کیا اور وہ ماہم کو لے کر اس کے پیچھے چلنے لگا۔ کچھ آگے ایک کار کھڑی تھی۔ ریحان نے ماہم کو پچھلی سیٹ پر اپنے ساتھ بٹھالیا اور فیصل نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ کار کسی تیر کی طرح اس جگہ سے نکلی اور جس طرف سے وہ آئے تھے، اس کی مخالف سمت جانے لگے۔

آدھے گھنٹے کا سفر کرنے کے بعد وہ ایک بڑے سے گھر میں موجود تھے۔ کار اس گھر کے گیٹ کے پاس کھڑی کر کے فیصل نے گیٹ کھولا... اور پھر وہ کار اندر لے گیا تھا پھر گیٹ بند ہو گیا تھا۔ ریحان نے ماہم کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا، اسے وہ ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرے میں لے جا کر اس نے ماہم کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ فیصل بھی ساتھ تھا۔

''تم رقم چاہتے ہو، کتنی رقم چاہتے ہو مجھے بتاؤ میں ابھی منگوا دیتی ہوں۔'' ماہم نے پوچھا۔

''تمہاری قیمت رقم نہیں ہے۔'' ریحان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''پھر مجھے اغوا کیوں کیا ہے؟ تم چاہتے کیا ہو۔ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟'' ماہم چلّائی۔

ریحان اطمینان سے اس کا موبائل فون ہاتھ میں لیے کھڑا رہا۔ ''زیادہ اونچی آواز میں بات مت کرو۔ اس گھر کی دیواریں بہت اونچی ہیں تمہاری آواز باہر نہیں جائے گی۔''

تھوڑی دیر ماہم چپ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ریحان اس کا موبائل فون آن کر رہا تھا۔ ماہم نے سوال کیا۔ ''تم کو ہمایوں نے بھیجا ہے...؟''

ماہم کا سوال سن کر اس نے پوچھا۔ ''ہمایوں کون ہے؟''

''مجھے سچ بتاؤ اسی نے بھیجا ہے تم کو؟ تم اسی کے دوست ہو؟'' ماہم نے پھر جاننا چاہا۔

''میں کسی ہمایوں کو نہیں جانتا۔'' ریحان نے بے پروائی سے کہا۔ شاید ماہم کو اس کے جواب پر تسلی نہیں ہوئی تھی۔

''تم اسی کے دوست ہو۔ ورنہ ہماری کسی کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے۔ کوئی اور مجھے اغوا کر ہی نہیں سکتا۔ میرے پپا ایک شریف انسان ہیں، ان کی بھی کسی کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے۔''

ریحان اس کے قریب جا کر اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔ ''شرافت کا لبادہ اب عام بات ہوگئی ہے۔ لبادہ اپنے پیچھے کیا چھپائے ہوتا ہے، یہ وہی جانتے ہیں جو زخم کھائے بیٹھے ہوں۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''تمہیں بتاؤں گا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ تھوڑا انتظار کرلو۔'' ابھی ریحان نے اتنا ہی کہا تھا کہ ماہم کے موبائل فون پر بیل ہونے لگی۔ ریحان نے دیکھا کہ اسکرین پر صرف 'ایچ' لکھا ہوا تھا۔ ریحان نے موبائل فون کی اسکرین ماہم کی طرف کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ کس کی کال ہے؟''

ماہم نے ایک نظر اسکرین کی طرف اور دوسری نظر ریحان کی طرف مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہمایوں کی کال ہے...... کیا واقعی تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے؟''

مسلسل بجنے کے بعد بیل بند ہوگئی۔ ریحان نے ایک لمحے میں سوچا اور بولا۔ ''اب اگر اس کا فون آئے تو تم بس اتنا کہہ کر کال کاٹ دینا، وہ تمہیں دس منٹ کے بعد کال کرے......''

ریحان نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ پھر اس کی کال آنے لگی۔ ریحان نے فون آن کر کے اس کے کان سے لگا دیا۔ ماہم بولی۔

''پلیز مجھے دس منٹ کے بعد کال کرنا...... اوکے۔''

ریحان نے کال کاٹ دی۔ اس نے ماہم کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور دوسری کرسی اُٹھا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا جبکہ فیصل اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

''مجھے سچ بتاؤ کہ یہ ہمایوں کون ہے ...... مجھے جو بھی بتانا سچ بتانا......'' ریحان نے پوچھا۔

ماہم نے کچھ توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔

☆☆☆

فیروز کے کہنے پر خالد جلد ہی عالیہ کو لے آیا تھا۔ اس وقت عالیہ صوفے پر سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے برابر میں نجمہ بیٹھی تھی اور سامنے کمال براجمان اس کی طرف دیکھ رہا تھا جبکہ فیروز پریشان سا ایک طرف کھڑا تھا۔

عالیہ کو ماہم جب چاہتی تھی خالد کو بھیج کر اپنے گھر بلوا لیتی تھی اس کے گھر والے بھی ماہم پر اعتبار کرتے تھے اس

لیے اس بار بھی عالیہ کو آنے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔ اسے اس بات کی حیرت ضرور ہوئی تھی کہ اس سے قبل جب بھی ماہم نے اسے اپنے گھر بلانا ہوتا تھا تو وہ کال کر کے کہہ دیتی تھی کہ وہ تیار ہوجائے پندرہ منٹ میں انکل خالد اسے لینے کے لیے آرہے ہیں۔ عالیہ تب تک تیار ہوجاتی اور خالد کے ساتھ بیٹھ کر آجاتی تھی لیکن اس بار اچانک ڈرائیور اس کے گھر پہنچ گیا تھا۔

عالیہ کو جب علم ہوا تو اس نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ ابھی ماہم کا فون آیا تھا اور وہ وقت پر تیار نہیں ہوسکی تھی۔

کمال نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''دیکھو بیٹا گھبرانا نہیں ہے۔ مجھے کچھ باتیں پوچھنی ہیں۔ صحیح صحیح جواب دینا...... یہ بہت اہم ہے۔''

عالیہ نے متلاشی نظروں سے دائیں بائیں دیکھ کر نجمہ سے پوچھا۔ ''آنٹی...... ماہم کہاں ہے؟''

''ماہم کو کسی نے اغوا کرلیا ہے۔'' کمال نے اچانک انکشاف کیا تو عالیہ کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اس کی خوفزدہ نگاہیں نجمہ پر مرکوز ہوگئی تھیں۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے وہ خوف سے گر جائے گی۔

''ماہم...... اغوا ہوگئی ہے؟'' عالیہ نے ایک ایک لفظ رک کر اور خوف سے ادا کیا۔

''مجھے چند سوالوں کا جواب چاہیے تاکہ مجھے ماہم تک پہنچنے میں آسانی ہوسکے۔ میں فیروز کا پرانا دوست اور پولیس انسپکٹر ہوں...... مجھے یہ بتاؤ ماہم کی کسی کے ساتھ کوئی دوستی تھی؟'' کمال نے پوچھا۔

عالیہ مضطرب انداز میں اپنے ہاتھ ملنے لگی۔ ''اس کا کسی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔''

''تم سچ کہہ رہی ہو؟'' کمال اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔''

''نجمہ بھابی بتارہی تھیں کہ تم اس کی گہری اور سب سے قریبی دوست ہو، تمہیں تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ اتنی رقم کہاں خرچ کرتی تھی؟'' کمال کی نگاہیں مسلسل اس کے چہرے ...... پر مرکوز تھیں۔

اس سوال کو سن کر وہ چونکی۔ ''کک...... کتنی رقم خرچ کی ہے اُس نے؟''

''تم مجھے میرے سوال کا جواب دو۔ دیکھو کچھ مت چھپاؤ یہ ماہم کی زندگی کا معاملہ ہے...... مجھے اسے بچانا ہے...... وہ اتنی رقم کہاں خرچ کرتی تھی؟'' کمال نے کہا۔

''وہ رقم کہیں خرچ نہیں کرتی تھی۔'' تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد عالیہ نے جیسے اپنے اندر ہمت جمع کرلی تھی۔

''پھر اتنی رقم اس نے اپنے اکاؤنٹ سے کیوں نکالی تھی۔ کوئی تو وجہ ہوگی؟'' کمال نے سوال کیا۔

''اس کی وجہ میں ہوں۔'' عالیہ بولی تو سبھی اس کی طرف چونک کر دیکھنے لگے۔

''اس کی وجہ تم ہو......؟ مجھے کھل کے بتاؤ۔'' کمال نے جلدی سے کہا۔

''اب کچھ چھپانے کا فائدہ نہیں ہے لیکن یہ باتیں میرے گھر والوں تک نہ پہنچیں تو اچھا ہوگا۔''

''تم بے فکر ہوکر بتاؤ۔'' کمال نے اُسے تسلی دی۔ فیروز بھی اس کے قریب آکر بیٹھ گیا تھا۔

عالیہ نے ایک بار پھر خاموشی اختیار کی اور پھر وہ بولی۔ ''میری دوستی اچانک ہمایوں سے ہوگئی اور ہم ایک دوسرے سے فون پر باتیں کرنے لگے۔ پھر ہم ڈنر پر بھی گئے اور ہماری دوستی بے تکلفی میں بدل گئی۔ اس بے تکلفی میں ہم نے ایک دوسرے کو کچھ میسجز بھی کیے اور ایک دوسرے سے تصویریں بھی شیئر کردیں...... اس کے بعد وہ مجھے بلیک میل کرنے لگا اور میں بہت پریشان ہوگئی۔ میں ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ ماہم میری اچھی دوست ہے۔ میں نے اس سے ذکر کیا تو اس نے میری جان چھڑانے کے لیے اسے پچاس ہزار روپے دے دیئے۔ لیکن وہ باز نہیں آیا اور پیسوں کی ڈیمانڈ کرتا رہا جو ماہم پوری کرتی رہی...... اس نے میری چیزیں بھی واپس نہیں کیں اور......'' عالیہ بولتے بولتے رک گئی۔

''اور......؟'' کمال نے پوچھا۔ نجمہ اور فیروز انہماک سے اس کی بات سن رہے تھے۔

''اُلٹا وہ ماہم کو مجبور کرنے لگا کہ وہ اس سے ملے، وہ اسے پسند کرنے لگا ہے، وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ ماہم نے انکار کیا تو وہ دھمکیاں دینے لگا۔'' عالیہ پھر چپ ہوگئی۔

''اس کے بعد کیا ہوا......؟'' کمال نے آگے جاننا چاہا۔

''ابھی ماہم سوچ رہی تھی کہ وہ کیا کرے کہ آج مجھے پتا چل رہا ہے کہ وہ اغوا ہوگئی ہے۔ یہ اسی کا کام ہوگا۔ وہ ماہم بہت دھمکیاں دیتا تھا۔ مجھے بھی کہتا تھا کہ میں ماہم کو اس سے ملنے پر مجبور کروں ورنہ وہ میرے گھر والوں کو سب بتادے گا۔'' عالیہ نے بتایا۔

’’تمہارے پاس اس کی کوئی تصویر ہوگی‘ مجھے وہ دکھاؤ۔‘‘ کمال نے کہا۔

عالیہ نے جواب دیا۔ ’’میں نے اپنے موبائل فون سے سب کچھ ڈیلیٹ کر دیا تھا۔ میرے پاس اس کی کوئی تصویر نہیں ہے۔ اس نے میری کچھ چیزیں ماہم کو سینڈ کی تھیں۔ اس کے موبائل فون میں ہوں گی۔‘‘

’’ماہم کا موبائل فون سی کے پاس ہے۔‘‘ فیروز نے ناچاری سے ہاتھ جھٹکا۔

کمال سوچتے ہوئے اپنی ٹھوڑی کھجانے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اب تک ماہم کے بدلے میں کسی طرح کے تاوان کا فون نہیں آیا تو اس کا مطلب ہے کہ اسے اغوا کرنے والا ہمایوں ہی ہے۔ کمال نے پوچھا۔ ’’ماہم کبھی اُس سے ملی تھی؟‘‘

’’ماہم نے اس سے ایک بار ملاقات کی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ وہ اسے سمجھانے کے لیے گئی تھی لیکن اس کی ضد تھی کہ وہ اس سے شادی کرلے...... ہاں یاد آیا...... ایک بار مجھے ماہم نے فون پر بتایا تھا کہ ہمایوں کی کال آئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اگر میں نے اس سے شادی نہیں کی تو وہ مجھے اغوا کرلے گا۔‘‘ عالیہ کے اس انکشاف نے سب کو ششدر کر دیا تھا۔

’’یہ اسی کا کام ہے۔ اسی نے ماہم کو اغوا کیا ہے۔‘‘ فیروز ایک دم بولا۔ ’’کیا تم یہ جانتی ہو کہ وہ رہتا کہاں ہے؟‘‘

’’نہیں اس بارے میں کبھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔‘‘ عالیہ نے جواب دیا۔

’’وہ ماہم کو ڈرا دھمکا کر اس سے شادی کرلے گا۔ کمال کچھ بھی کرو ماہم کو اس سے رہائی دلاؤ۔‘‘ فیروز نے ہیجانی کیفیت میں کہا۔

’’مجھے اس کا نمبر دو۔‘‘ کمال نے کہا تو عالیہ نے اپنے موبائل فون سے ہمایوں کا نمبر دے دیا۔

کمال نے موبائل نمبر دیکھا اور گہری سوچ میں چلا گیا اسی دوران فیروز کا موبائل فون بجا تو سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ فیروز نے دیکھا کہ ماہم کی کال تھی۔ اس نے موبائل فون کا رخ کمال کی طرف کیا تو اس نے اشارہ کیا، وہ کال اٹینڈ کرے۔

☆☆☆

ماہم چپ تھی اور وہ دونوں اس کے سامنے کھڑے تھے۔ ماہم نے ابھی ہمایوں کے بارے میں ریحان کو اختصار سے آگاہ کر کے بات ختم کی تھی۔ اچانک پھر ہمایوں کی کال آنے لگی۔ ریحان نے اسپیکر آن کر کے فون ماہم کے منہ قریب کر دیا۔

’’ہیلو......‘‘ ماہم بولی۔

’’کیسی ہو میری جان...... کہیں مصروف تھیں کہ کال کاٹ دی تھی۔‘‘ دوسری طرف سے محبت بھری آواز آئی۔

’’بولو کیا بات ہے؟‘‘

’’ایک ہی بات ہے۔ تم سے شادی کرنی ہے اور دوسری بات یہ کہ مجھے ارجنٹ پچاس ہزار کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ تم ایسا کرنا شام سے پہلے پیسوں کا انتظام کرلو، میں پھر کال کر کے بتادوں گا کہ پیسے کہاں پہنچانے ہیں۔‘‘ دوسری طرف سے کہا گیا۔

ماہم نے ریحان کی طرف دیکھا، ریحان نے اشارہ کیا کہ وہ اسے بتادے کہ وہ اسے پیسے دے دے گی۔

’’تم نے کہا تھا کہ وہ سب کچھ ختم کر دوں گا اور اب بار بار پیسے مانگ رہے ہو۔‘‘ ماہم بولی۔

’’جیسے ہی تم مجھ سے شادی کرلو گی، میں تم سے پیسے لینے بند کر دوں گا۔ ورنہ تمہاری سہیلی کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ ویسے میں نے پہلی بار دیکھا کہ کوئی دوستی میں اتنی قربانی دے رہا ہے۔ خیر تم پیسوں کا انتظام کرلو، میں کال کرتا ہوں۔‘‘ اس نے کہہ کر فون بند کر دیا۔

ریحان اس کی باتیں سن رہا تھا لیکن اس کے دماغ میں ایک نیا منصوبہ آ گیا تھا۔ وہ ایک تیر سے دو شکار کر سکتا تھا۔ ریحان نے فیصل کو اشارہ کیا اور وہ ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس نے پستول بھی نکال لیا تھا۔ ریحان کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس نے فیروز کا نمبر ملایا اور فون کان سے لگا لیا۔

’’ہیلو......‘‘ دوسری طرف سے فیروز کی آواز آئی۔

’’کیسی ہو ماہم، کہاں ہو، سب خیریت تو ہے؟‘‘

’’میں بول رہا ہوں۔ تیری بیٹی بالکل خیریت سے ہے۔‘‘ ریحان نے کہا۔

’’کیا چاہتے ہو تم؟ ماہم کی رہائی کے عوض کیا چاہیے تمہیں؟ کتنی دولت دے دوں تمہیں کہ تمہارا منہ بند ہو جائے، اپنی کونسی جائداد تمہارے نام کر دوں، کسی دوسرے ملک میں جانا چاہتے ہو تو وہاں بھیج دیتا ہوں...... ایک بار منہ کھولو تمہارا منہ نوٹوں سے نہ بھر دوں تو کہنا......‘‘

’’مجھے ماہم کے بدلے میں ایک پیسہ بھی نہیں چاہیے۔‘‘ ریحان نے متانت سے کہا۔

’’اور کیا چاہیے...... وہ بول دو۔ جو منہ سے نکالو گے،

وہ بات پوری کردوں گا۔'' فیروز بلا تامل بولا۔

''ماہم کے بدلے میں مجھے نہ پیسہ چاہیے اور نہ کوئی اور چیز...... ماہم کے بدلے میں مجھے فیروز عاقل چاہیے۔''

فیروز کے ساتھ ساتھ کمال بھی چونکا۔ ''میری کیا دشمنی ہے تمہارے ساتھ؟''

''ملو گے تو بتاؤں گا...... پہلے ایک کام کرو۔ پچاس ہزار روپے جیب میں ڈال لو جب میں کال کروں تو اُس جگہ پہنچا دینا...... میرا آدمی آئے گا اور تم اُس جگہ پچاس ہزار روپے رکھ دینا...... اس کے بعد میں تم کو دوسرا حکم دوں گا...... تم وہاں پہنچ جانا اور جیسے ہی تم میرے پاس آؤ گے، میں تمہاری بیٹی کو بھیج دوں گا۔'' ریحان بولا۔

کمال اور فیروز کے لیے یہ بات بڑی حیران کن تھی کہ وہ ماہم کے بدلے میں معمولی رقم محض پچاس ہزار روپے کسی جگہ لے کر آنے کا کہہ رہا تھا اور اس کے بعد وہ ماہم کو چھوڑنے کی صورت میں فیروز کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتا تھا۔ کمال کے لیے بھی یہ بات حیرت انگیز تھی۔

''اگر تم کو میں ہی چاہیے تھا تو ماہم کو کیوں اغوا کیا تھا تم نے؟'' فیروز نے پوچھا۔

''میں ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن ایسا ہو گیا۔ اب اس کے بدلے میں تمہاری ڈیمانڈ کر رہا ہوں۔ بس اس پر عمل کرو اور ماہم کو میں خیریت سے چھوڑ دوں گا۔'' ریحان نے کہا۔

''تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟''

''تم کو تمہارے ملازم خالد نے کچھ نہیں بتایا تھا؟'' ریحان نے کہا۔

فیروز بولا۔ ''تم نے اُسے کچھ کہا تھا؟''

''تمہارا وفادار ہے، کئی سالوں سے نمک کھا رہا ہے، مجھے نہیں لگتا کہ وہ اتنی بڑی بات کو چھپا کر بیٹھا ہوگا۔ پھر بھی تم فیصلہ کرلو اور اپنے ملازم خالد سے پوچھنا کہ اسے کوئی اسٹور میں ملا تھا تو اس نے کیا کہا تھا۔'' ریحان نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

☆☆☆

فیروز موبائل فون ہاتھ میں لیے حیرت کی تصویر بنا ہوا تھا۔ خالد کے بتائے ہوئے الفاظ اسے یاد آ رہے تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ کوئی اسے خریداری کے دوران ملا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ تمہارے مالک کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ وہ سب یاد کر کے فیروز کے جسم میں سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ دہشت سے اس کے ہاتھ کانپنے لگے تھے۔

''تم نے سنا...... وہ کیا کہہ رہا تھا۔ یہ وہی ہے جو خالد کو ملا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔'' فیروز سے بولنا مشکل ہو رہا تھا۔ نجمہ بھی سن کر سکتے میں آگئی تھی۔ کمال اُس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

فیروز بولا۔ ''میں جس بات کو مذاق سمجھ رہا تھا، وہ انتہائی سنجیدہ ہے۔ وہ مجھے جان سے مارنا چاہتا ہے...... میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے کہ وہ مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔''

کمال سوچتے ہوئے بولا۔ ''میری سالوں سے تم سے دوستی ہے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ تم نے کسی کے ساتھ زیادتی کی ہو۔ تم سب کا احساس کرتے ہو، کاروباری معاملات تمہارے ایسے ہیں کہ لوگ تمہاری مثال دیتے ہیں...... پھر وہ تمہیں کیوں قتل کرنا چاہتا ہے؟''

''میری زندگی کی کتاب تم سب کے سامنے ہے۔ اب میں کیا کروں۔ وہ مجھے مار دے گا۔ اور اگر میں اس کے پاس نہیں جاتا تو وہ ماہم کو نقصان پہنچا دے گا۔ میرے دوست کمال کچھ کرو...... کچھ کرو میرے دوست ورنہ ہم برباد ہو جائیں گے۔'' فیروز کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ کمال نے عالیہ کو کچھ ہدایت دی، ہمایوں کا نمبر لیا اور اپنا نمبر اسے دے کر خالد کے ساتھ بھیج دیا کہ وہ اسے گھر چھوڑ آئے۔ عالیہ اور خالد چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد کمال سوچ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، وہاں خاموشی چھا گئی تھی۔ کمال ٹہلتا رہا اور اسی طرح پندرہ منٹ گزر گئے۔ اچانک فیروز کے فون پر بیل ہونے لگی۔ کمال اور فیروز کی بیک وقت نظر موبائل فون کی اسکرین کی طرف چلی گئی تھی۔ اسکرین کی طرف دیکھتے ہی فیروز نے کال کاٹ دی تھی۔

''شام کو پہلے تم اسے پچاس ہزار روپے دو۔ میں کچھ آدمی وہاں مامور کرتا ہوں جو پیسے اُٹھانے والے کا پیچھا کریں گے اور......'' کمال نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ کال پھر آنے لگی۔ فیروز نے اسکرین کی طرف دیکھا اور کال کاٹ دی۔ کمال نے بھی دیکھ لیا تھا کہ اسی نام سے کال آ رہی ...... کمال نے وہ نام پڑھ لیا تھا۔

''تم کیا کہہ رہے تھے؟'' فیروز نے پوچھا۔

''میرے آدمی اس کو پکڑ لیں گے......'' کمال کی بات پھر ادھوری رہ گئی اور فیروز کے موبائل فون پر میسج ٹون بجی۔ فیروز نے اس ٹون کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ کمال نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اس آدمی کو پکڑ کر ہم پوچھ گچھ کریں گے اور کوشش کریں گے اس تک پہنچ

جائیں۔''
''مجھے ماہم کو بھی بچانا ہے۔ میں ماہم کی خاطر اپنے آپ کو اس کے حوالے کردوں گا۔'' فیروز نے فیصلہ کرلیا تھا۔
''وہ آپ کو ماردیں گے۔'' نجمہ فوراً بولی۔
''اگر میں اپنے آپ کو بچاتا ہوں تو وہ ماہم کو ماردیں گے اور یہ میں نہیں چاہتا۔'' فیروز نے جلدی سے کہا۔
''کمال بھائی ہماری آخری امید آپ ہی ہو۔'' نجمہ پریشانی کے عالم میں آنسو بہاتے ہوئے بولی۔
''خدا پر بھروسا کریں۔ میں پوری کوشش کرتا ہوں کہ فیروز اور ماہم کو کچھ نہ ہو۔'' کمال بولا۔ ''فیروز تم ایسا کرو بھابی جی کو ان کے کمرے میں چھوڑ آؤ۔''
نجمہ بضد تھی کہ وہ اپنے کمرے میں نہیں جائے گی۔ کمال اور فیروز کے مجبور کرنے پر وہ فیروز کے ساتھ جانے لگی تو کمال نے کہا۔
''فیروز اپنا موبائل فون مجھے دینا شاید کال آجائے۔''
فیروز نے اپنا موبائل فون کمال کی طرف بڑھادیا اور نجمہ کو لے کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی کمال نے اس کا موبائل فون کھولا، ایک نظر دیکھا اور اس موبائل کو ایک طرف رکھ کے اپنا موبائل فون نکال کے ایک میسج کیا اور وہ انتظار کرنے کے انداز میں ٹہلنے لگا۔
فیروز کمرے سے باہر آگیا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی موبائل فون اٹھایا اور پوچھا۔ ''کوئی کال آئی۔''
''کوئی کال نہیں آئی۔ تم ایک کام کرو۔ یہیں رہنا۔ میں ایک کام سے جارہا ہوں۔ اگر تمہیں کوئی کال آئے تو گھبرانا نہیں ہے اس سے بات کرنا اور مجھے فوری آگاہ کردینا۔''
''تم کہاں جارہے ہو؟''
''میں اسی کام کے سلسلے میں جارہا ہوں۔ اطمینان رکھو کہ میرے پاس اس کام کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے۔''
''کب تک آجاؤ گے؟''
''جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔'' کمال نے کہا اور باہر چلا گیا۔ باہر جاتے ہی اس نے اپنے موبائل فون سے کال کی اور بولا۔ ''میں نکل پڑا ہوں۔ مجھے ابھی معلومات سینڈ کردو۔''
اس کال کو ختم کرنے کے بعد اس نے ایک دوسری کال کی اور رابطہ ہوتے ہی بولا۔ ''میری کال کا انتظار کرنا۔ جونہی میں کال کروں، فوراً اس جگہ پہنچ جانا۔''
کمال نے ایک ٹیکسی کو روکا اور اس میں بیٹھ گیا۔ اس دوران میں اسے ایک میسج موصول ہوا اس نے پڑھا اور ٹیکسی والے کو اس علاقے کا بتانے لگا۔
ٹیکسی اس علاقے میں پہنچ گئی اور کمال کرایہ ادا کر کے باہر نکلا اور ایک طرف چل پڑا۔ وہ ایک بڑی کالونی تھی۔ بڑے بڑے گھر اور کشادہ گلیاں تھیں۔
ایک اسٹور کے پاس جا کر اس نے ایک مکان کے بارے میں پوچھا اور وہاں سے چل پڑا۔ تھوڑا آگے جا کر وہ ایک گھر کے سامنے رک گیا۔ وہ گھر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس نے بیل دی تو تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور ایک خوبصورت عورت کا چہرہ نمودار ہوا۔ اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو کمال بھی اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔
''جی فرمائیے......'' اس عورت نے مترنم لہجے میں پوچھا۔
''آپ مس شمیم ہیں؟''
''جی ہوں۔''
''مجھے آپ سے ہی ملنا ہے۔ دراصل مجھے فیروز نے بھیجا ہے۔'' کمال مسکرایا تو اس نے ایک نظر کمال کا جائزہ لینے کے بعد دروازہ چھوڑ دیا۔ کمال اندر گیا تو مس شمیم نے دروازہ بند کردیا۔
شمیم کا گھر چھوٹا تھا لیکن بہت خوبصورت اور قرینے سے سجا ہوا تھا۔ گھر کا جائزہ لینے کے بعد کمال نے بتایا۔
''میرا نام کمال ہے اور میں پولیس انسپکٹر ہوں۔ آپ کے نمبر سے میں نے اس گھر کا ایڈریس معلوم کیا تھا...... مجھے کچھ باتیں معلوم کرنی ہیں...... سچ شرط ہے ورنہ میرے اندر کا وہ پولیس والا باہر نکل آئے گا جس کا روپ صرف لاک اپ میں دکھائی دیتا ہے۔'' کمال کے لہجے میں تغیر آگیا تھا۔ مس شمیم کی آنکھوں میں خوف کے سائے مترشح ہونے لگے تھے۔
کمال اس کے سامنے بڑے رعب سے کھڑا تھا۔

☆☆☆

ماہم کے موبائل پر پھر ہمایوں کی کال آئی تو ریحان نے موبائل فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
''میں تم کو بتاچکا ہوں کیا کہنا ہے۔''
ماہم نے فون کان سے لگایا اور بولی۔ ''ہاں بولو ہمایوں۔''
''مجھے پچاس ہزار روپے شام سات بجے چاہئیں۔ اسی سڑک پر اسی جگہ آجانا۔ بینک بھی قریب ہے۔ تم کو اے

ٹی ایم سے پیسے نکلوانے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ اپنی گاڑی میں رہنا اور جب میں فون پر بتاؤں تو اسی طرح پیسے سڑک پر چھوڑ کر چلی جانا۔''

''یہ آخری بار ہوگا۔''

''یہ تم پر منحصر ہے۔ تم میرے ساتھ شادی کر لو تو آخری بار پیسے لوں گا۔ ورنہ میری ضرورت کو تم پورا کرتی رہو گی۔'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

''تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔'' ماہم کو غصہ آ گیا۔ ''ایک معصوم لڑکی کی زندگی برباد کرنے پر تُلے ہوئے ہو تم۔''

''تم اس کا ساتھ دے رہی ہو ناں۔ تم جیسی دوست کو سلام...... ٹھیک سات بجے تم اسی جگہ پہنچ جانا۔'' ہمایوں نے کہا اور کال منقطع کر دی۔ ریحان نے فون پکڑ کر اس جگہ کا ماہم سے پوچھا اور باہر جاتے ہی فیروز کو کال کی۔

جونہی رابطہ ہوا ریحان نے پہلے اس جگہ کے بارے میں بتایا اور پھر بولا۔ ''پچاس ہزار روپے لے کر ٹھیک اسی جگہ پہنچ جانا۔ کار میں کوئی لڑکی بیٹھی ہو اور اندر کی لائٹ بند ہو۔ لڑکی کے پاس موبائل فون ہو جس کا رابطہ تمہارے ساتھ ہوگا۔ جو میں ہدایت دوں، وہ تم اس لڑکی کو بتاؤ گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' فیروز نے مریل سے انداز میں کہا۔

''اس کے بعد جب یہ کام ہو جائے تو پھر میں تم کو جہاں کہوں وہاں پہنچ جانا۔ ماہم کو چھوڑ دوں گا اور تم میرے پاس آ جاؤ گے۔'' ریحان نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس کے چہرے پر کرب کی پرچھائیاں تھیں جیسے اسے کچھ یاد آنے لگا ہو۔ وہ اداس ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

''فیروز میں تم کو نہیں چھوڑوں گا...... تمہیں اپنے ہاتھوں سے مار کر دم لوں گا۔'' ریحان دل ہی دل میں بولا اور اس کے چہرے پر سختی عیاں ہو گئی۔

☆☆☆

فیروز شدت سے کمال کا انتظار کر رہا تھا کہ خالد اندر آیا اور فیروز کے قریب آ کر اس نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

''میں عالیہ کو چھوڑ کے واپس آیا تو میں نے ابھی اندر آنے کے لیے دروازہ کھولا ہی تھا کہ میں نے دیکھا کمال آپ کے موبائل فون کو دیکھ رہا تھا۔''

خالد کی بات سنتے ہی فیروز ایک دم چونکا۔ اس نے اپنا موبائل فون دیکھا اور وہ میسج پڑھا جو اسے اس وقت موصول ہوا تھا جب وہ کمال کے ساتھ کھڑا تھا۔ فیروز نے پریشان سا ہو کر کہا۔ ''وہ میرے موبائل فون کو دیکھ رہا تھا۔''

''جی ہاں...... اور جب وہ جانے کے لیے باہر گیا ایک ٹیکسی میں بیٹھا تو میں نے بھی کار اس کے پیچھے لگا دی۔'' خالد نے کہا۔

''پھر وہ کہاں گیا؟'' فیروز نے پُرتجسس انداز میں دریافت کیا۔

''آپ کو سن کر حیرت ہوگی۔''

''مجھے بتاؤ وہ کہاں گیا تھا؟'' فیروز مضطرب ہو گیا۔

''کمال سیدھا شمیم کے گھر گیا تھا۔'' خالد نے بتایا تو فیروز ایسے چونکا جیسے اس کے پیر انگاروں پر آ گئے ہوں۔ اس نے تعجب خیز نگاہوں سے خالد کی طرف دیکھا۔

''وہ واقعی شمیم کے گھر گیا تھا؟''

''جی بالکل وہ اسی کے گھر میں تھا اور میں تھوڑی دیر رکنے کے بعد واپس آ گیا۔ کیونکہ میں اپنا موبائل فون گھر ہی چھوڑ گیا تھا اس لیے آپ کو جلدی اطلاع دینے کے لیے واپس آ گیا۔''

''جب کمال میرے پاس کھڑا تھا تو شمیم کی کالز آ رہی تھیں۔ پھر اس نے میسج بھی کیا تھا اور کمال نے اسکرین کی طرف شاید دیکھ لیا تھا۔ وہ پولیس والا ہے، اس نے کچھ محسوس کر لیا تھا۔ یہ اچھا نہیں ہوا...... میں ابھی شمیم کو فون کرتا ہوں۔'' فیروز نے کہہ کر اپنا موبائل سیدھا کیا۔

''آپ مس شمیم کو کال مت کریں۔ ممکن ہے وہ اسی کے پاس ہو۔ آپ کا پرانا خادم ہوں، آپ کے رازوں کو میں نے اپنے دل کے گڑھے میں دفن کیا ہوا ہے۔ نمک حرامی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ کمال مس شمیم تک پہنچ گیا ہے، اب بہتر ہے کہ اسے میں گولی ماردوں۔'' خالد نے سفاکی سے کہا۔

فیروز نے سوچا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ابھی مجھ سے پچاس ہزار روپے کی ڈیمانڈ کی ہے جس نے ماہم کو اغوا کیا ہے، کمال آئے تو اس سے بات کر کے میں پچاس ہزار روپے دینے جاؤں گا۔ اور شاید... ماہم کے بدلے میں مجھے اس کے پاس جانا پڑے، اس دوران تم کمال کو گولی مار دینا...... الزام اس پر آ جائے گا جس نے ماہم کو اغوا کیا ہے۔ اور تم پولیس کو سب بتا دینا کہ فیروز کی بیٹی کو اغوا کیا ہوا ہے اور تاوان کی رقم کے دوران ایسا ہوا ہے۔'' فیروز نے سمجھایا۔ خالد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد کمال بھی آ گیا۔ اس نے آتے ہی پوچھا کہ کوئی کال آئی ہے۔ فیروز نے سب کچھ بتا دیا۔ کمال بولا۔ ''میرے آدمی اس جگہ جائیں گے اور گاڑی میں بھی جو لڑکی بیٹھی ہوگی اس کا بھی میں انتظام کر دوں گا۔ اور اس کے

بعد وہ یقیناً ماہم کو چھوڑنے کے بدلے تمہاری ڈیمانڈ کرے گا۔“

”میں ماہم کو بچانے کے لیے اس کے پاس چلا جاؤں گا۔“ فیروز نے جلدی سے کہا۔

”میں تمہارے پیچھے ہوں گا۔ تم کوئی فکر نہیں کرنا۔“ کمال نے کہنے کے بعد خالد کو اس جگہ سے جانے کا اشارہ کیا۔ جب وہ چلا گیا تو کمال نے سوال کیا۔ ”فیروز تم سوچ کر بتاؤ تم نے کسی کے ساتھ کوئی ایسی زیادتی تو نہیں کی تھی کہ کوئی تم سے اس بات کا انتقام لینا چاہتا ہو؟“

کمال کا سوال سن کر فیروز کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بہت کچھ اس کی سوچوں میں دوڑنے لگا۔ لیکن ایک نام واضح تھا جو اس کے دماغ میں آیا تو وہ صورت بھی اس کی آنکھوں کے سامنے آگئی تھی۔ فیروز سچ بولنا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

”میں نے زندگی میں کبھی ایسا کوئی کام نہیں کیا جس کی وجہ سے کوئی مجھ سے انتقام لینے پر مجبور ہو جائے۔ ویسے تم کہاں گئے تھے؟“

”میں کچھ انتظامات کرنے گیا تھا۔“ کمال نے بتایا۔ فیروز نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھنے کے بعد کہا۔

”کمال میری بیٹی کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔“

”میں تمہاری بیٹی کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔“ وہ بولا۔

فیروز نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ کمال کسی کو فون کرنے لگا اور فیروز اپنی بیوی کے پاس چلا گیا۔ اس نے الماری سے پچاس ہزار روپے نکال کر ایک لفافے میں ڈالے اور گم صم بیٹھی نجمہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تم حوصلہ رکھو، کچھ نہیں ہوگا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا اور ماہم واپس آجائے گی۔“

”ماہم واپس آجائے گی اور تم......؟“ نجمہ نے سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

”میں بھی واپس آجاؤں گا۔“ فیروز نے جواب دیا۔ اس کا کندھا تھپتھپایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

☆☆☆

بینک کے قریب، اسی سڑک پر ایک طرف اندھیرے میں فیروز کی کار کھڑی تھی اور اس کے اندر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اندھیرے کی وجہ سے کوئی یہ نہیں جان سکتا تھا کہ اندر کون ہے۔

کمال نے اپنے خاص آدمیوں کا جال دائیں بائیں بچھا دیا تھا۔ اس گاڑی سے دور ایک درخت کے نیچے مکمل اندھیرے میں ایک بائیک کھڑی تھی اور اس پر ایک نوجوان بیٹھا تھا جس نے ہیلمٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ دائیں بائیں کا اچھی طرح سے جائزہ لے رہا تھا۔ شاذ و نادر کوئی گاڑی اس سڑک پر گزر جاتی تھی ورنہ پچھلے پندرہ منٹ سے وہ گاڑی اسی جگہ کھڑی تھی۔

اس نوجوان نے جب پوری تسلی کر لی تو اس نے ماہم کو فون کیا۔ رابطہ ہوا تو وہ بولا۔ ”ڈارلنگ...... میرا دل چاہتا ہے ہم ایک ملاقات کر لیں......“

”شٹ اَپ۔“ ماہم نے ڈانٹ دیا۔

وہ ہنسا۔ ”او کے...... اس بار میں پچاس ہزار روپے میں اپنی ضرورت پوری کر رہا ہوں۔ اگلی بار میری ڈیمانڈ کچھ اور ہوگی ورنہ تمہاری سہیلی کی زندگی برباد کر دوں گا...... اب تم پیسوں کا لفافہ اسی طرح کار کا دروازہ کھول کر نیچے گرا دو اور یہاں سے چلی جاؤ۔“

کال بند ہوئی تو اسی وقت ماہم نے فیروز کو کال کی، فیروز نے کال گاڑی میں بیٹھی لڑکی کو کی اور اس لڑکی نے کار کا دروازہ کھول کر لفافہ نیچے گرایا اور گاڑی آگے لے گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد کار نظر سے اوجھل ہوگئی۔

اب دور تک سناٹا تھا۔ نوجوان نے بائیک اسٹارٹ کی اور گرے ہوئے لفافے کے پاس چلا گیا۔ ابھی اس نے جھک کر لفافہ اُٹھایا ہی تھا کہ کمال کے آدمی اس سرعت سے دائیں بائیں سے نکل کر اس کے پاس پہنچے کہ نوجوان کو سنبھلنے کا بھی موقع نہیں ملا۔

نوجوان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے تھے۔ وہ بُری طرح سے گھبرا گیا تھا۔ کمال بھی اس جگہ پہنچ گیا تھا اور اس نے نوجوان کا ہیلمٹ اتارا تو وہ ڈرا ہوا تھا۔

”کون ہو تم...... مجھے بتاؤ کون ہو تم؟“ کمال نے غصے سے پوچھا۔

”مم...... میں ہمایوں ہوں......“ نوجوان نے بتایا تو کمال اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ اس دوران فیروز جو اس جگہ سے دوسری سڑک پر کھڑا تھا، اسے ماہم کی کال آئی۔

فیروز نے کال سنی تو ماہم کی آواز آئی۔ ”پپا مجھے اس نے چھوڑ دیا ہے، میں بینک کی پچھلی گلی میں کھڑی ہوں...... جلدی آجائیں پلیز۔“

”او کے...... میں آرہا ہوں۔“ فیروز نے اسی وقت

غدار...... خود غلامی کر رہا ہے اور مجھے دیگ میں ڈلوا دیا۔

گاڑی گھمائی اور بینک کی پچھلی سڑک پر پہنچ گیا۔ اس نے کار روکی، باہر نکل کر متلاشی نظروں سے دیکھنے لگا تو اچانک ایک طرف سے ماہم نکلی۔ اسے ریحان نے پکڑا ہوا تھا اور پستول اس کی کنپٹی پر تھا۔ فیروز اسے دیکھتے ہی چونکا۔

''سوری پپا...... مجھے اس نے ایسا ہی بولنے کے لیے کہا تھا......'' ماہم نے اپنے باپ کو دیکھتے ہی ناچاری سے کہا۔

''جلدی سے میرے پاس آجاؤ...... جلدی کرو ورنہ میں اِسے گولی ماردوں گا اور تمہاری جگہ اس کا خون ہو جائے گا۔'' ریحان نے سفاکی سے کہا تو فیروز کے قدم اس کی طرف بڑھنے لگے۔

جب وہ اس کے قریب پہنچا تو ریحان نے ماہم کو ایک طرف دھکا دے دیا۔ وہ دور جا گری۔ ریحان نے اسی وقت فیروز کو گریبان سے پکڑ لیا اور اسے کھینچتا ہوا ایک طرف لے جانے لگا۔ ماہم جلدی سے اُٹھی اور پیچھے بھاگی۔ ریحان نے رک کر پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

''یہاں سے چلی جاؤ ورنہ گولی ماردوں گا......''

ماہم کے قدم رک گئے تو فیروز بولا۔ ''ماہم تم چلی جاؤ۔ گاڑی میں چابی لگی ہوئی ہے۔ میری فکر نہیں کرو...... تم یہاں سے جاؤ۔''

اسی اثنا میں فیصل کار لے کر آ گیا۔ ریحان اسے کار کی پچھلی سیٹ پر لے کر بیٹھ گیا اور کار آگے بڑھ گئی۔ ماہم چیختی ہوئی پیچھے بھاگی لیکن کار بڑی تیزی سے غائب ہو گئی تھی۔

☆☆☆

ریحان نے فیروز کا گریبان چھوڑ دیا تھا اور اس کے پستول کا رخ اس کی طرف تھا۔ جس سڑک پر ان کی کار دوڑ رہی تھی اس سڑک پر گڑھے زیادہ تھے اس لیے کار کی رفتار کبھی تیز اور کبھی بہت آہستہ ہو جاتی تھی۔

''میں نے کہا بھی تھا کہ اس راستے کی طرف مت جانا۔'' ریحان نے کہا۔

''دوسری طرف ناکا لگ جاتا ہے۔ یہ راستہ محفوظ ہے۔'' فیصل گاڑی چلاتے ہوئے بولا۔

''تم مجھے کیوں مارنا چاہتے ہو؟'' فیروز نے پوچھا۔

''تمہیں مارنے سے پہلے سب کچھ بتاؤں گا تاکہ تمہارے دل میں یہ حسرت نہ رہ جائے کہ جرم بتائے بغیر تم کو میں نے جان سے مار دیا ہے۔'' ریحان نے کہا۔ گاڑی ٹوٹی ہوئی سڑک پر ہچکولے کھا رہی تھی۔

''میں نے کوئی جرم نہیں کیا......'' فیروز ابھی کچھ کہہ رہا تھا کہ ریحان نے اس کی بات کاٹ کر درشت لہجے میں کہا۔

''تمہارے جرم میں صدف کا نام لکھا ہوا ہے...... یاد کرو صدف کو......''

ریحان کے منہ سے صدف کا نام سن کر فیروز چونکا۔ وہ دم بخود اس کی طرف دیکھنے لگا۔ صدف کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔ فیروز کا اندیشہ صحیح ثابت ہوا تھا۔

اسی اثنا میں گاڑی کا ٹائر ایک گڑھے میں جا پڑا اور گاڑی کے اندر ایک بھونچال سا آ گیا۔ اس جھٹکے سے گاڑی

رک گئی۔ فیروز نے اسی وقت کار کا دروازہ کھولا اور باہر نکلتے ہی ایک طرف دوڑ لگا دی۔ ریحان بھی باہر نکلا اور اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔

اس ٹوٹی پھوٹی سڑک کی دوسری طرف سڑک کی تعمیر کے لیے گاڑیاں کھڑی تھیں۔ فیروز ان گاڑیوں کے پیچھے ہوتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ وہ اس عمر میں بھی بڑی پھرتی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ اپنی طاقت سے زیادہ بھاگ رہا تھا، جان بچانے کے لیے انسان کسی حد تک بھی چلا جاتا ہے۔ وہ بھاگتے بھاگتے بجری کے انبار کے پیچھے جا کر لیٹ گیا۔ اس کے دائیں بائیں ڈرم رکھے تھے اور وہ ان کے بیچ چھپ گیا تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور وہ ہانپ رہا تھا۔ اس جگہ مکمل اندھیرا تھا۔ ریحان اس کے پیچھے بھاگتا ہوا آیا تو وہ آگے نکل گیا۔

فیروز نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اسے صدف نظر آنے لگی تھی۔ اس کا خوبصورت چہرہ اس کی بند آنکھوں میں سمایا ہوا تھا۔ صدف اس کے آفس کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔ جس کی مسکراہٹ دلکش اور چلنے کا انداز کسی کو بھی سحر زدہ کر دیتا تھا۔

ایک دوپہر صدف نے فیروز کے آفس میں آ کر کہا۔

''سر مجھے چھٹی چاہیے۔ میری امی ماموں کے پاس شہر سے باہر گئی ہوئی ہیں، ان کی واپسی چار بجے تک ہے اور مجھے ماموں کا فون آیا ہے کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ ان کو واپس لے کر آ رہے ہیں۔''

''ابھی تو ایک بجا ہے۔'' فیروز نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''سر...... پلیز آپ مجھے آدھے دن کی چھٹی دے دیں۔'' صدف نے مزید تفصیل میں جانے کے بجائے ایک بار پھر چھٹی کی استدعا کی۔

''کوئی بات نہیں، تم جا سکتی ہو۔'' فیروز نے مسکرا کر جانے کی اجازت دے دی۔ صدف شکریہ ادا کر کے جانے لگی تو فیروز نے روک لیا۔ ''تم ہارون روڈ پر رہتی ہو ناں؟''

''جی سر......'' اس نے جواب دیا۔

''میں بھی اسی طرف جا رہا ہوں۔ تم میرے ساتھ چل سکتی ہو۔ میں تم کو ڈراپ کر دوں گا۔'' فیروز اپنی کرسی سے اُٹھتے ہوئے بولا اور صدف کا جواب لیے بغیر کمرے سے باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد صدف بھی فیروز کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور وہ اسے اس عمارت کے سامنے لے آیا جس کی تیسری منزل پر صدف کا فلیٹ تھا۔

''بہت شکریہ سر۔'' صدف اترنے لگی تو فیروز بولا۔

''ایک گلاس پانی کا نہیں پلاؤ گی اس گرمی میں۔''

''آ جائیے سر...... سیڑھیاں ہیں یہاں لفٹ اکثر خراب رہتی ہے۔'' صدف نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' فیروز کہہ کر باہر نکلا اور دونوں سیڑھیاں چڑھ کر فلیٹ کے سامنے پہنچ گئے۔ صدف نے لاک کھولا اور وہ اندر چلے گئے۔ فیروز کو ایک کرسی پر بٹھا کر جب وہ پانی کا گلاس لے کر آئی تو گلاس کے ساتھ فیروز نے صدف کا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔ اس نے پانی کا گلاس ایک طرف رکھا اور صدف کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''میرے آفس کا تم بہت خوبصورت ہیرا ہو۔ تم نہیں جانتیں کہ میں تم کو دن میں کتنی بار دیکھتا ہوں۔ میں حُسن کا شیدائی ہوں۔ خوبصورتی کے آگے میں پگھل جاتا ہوں۔ میرا یہ روپ صرف وہی دیکھ پاتے ہیں جو مجھے اپنی قربت دیتے ہیں۔ آج تم بھی میرا یہ روپ دیکھو اور اس کے بعد میری عنایت تم پر بارش کی طرح برسے گی۔''

صدف نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

''صدف اس خلوت میں، میں اور تم ہو......''

''شٹ اپ سر...... آپ چلے جائیں یہاں سے۔ میں آپ کی بیٹی کی عمر کی ہوں اور آپ مجھ سے ایسی گھٹیا بات کر رہے ہیں۔'' صدف کو غصہ آ گیا۔

''خلوت میں، میں بہت گھٹیا ہوں۔'' وہ کہہ کر ڈھٹائی سے ہنسا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ ایسا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں۔ میں لعنت بھیجتی ہوں آپ پر، آپ کی نوکری پر ...... لیکن آپ کا اصل چہرہ دکھا کر ان معصوم کی زندگیوں کو ضرور بچاؤں گی جن کو آپ کی اصلیت ایسی تنہائی میں دکھائی دیتی ہے۔'' صدف کہہ کر دروازے کی طرف بڑھی اور دروازہ کھول کر وہ شاید چلانا چاہتی تھی، یا کسی کو بلانے کا ارادہ تھا...... فیروز اپنی اصلیت کے ظاہر ہونے کے خوف سے اُٹھا اور اس نے قریب سے کپڑا اُٹھا کر اسے عقب سے صدف کے منہ پر لپیٹا، پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ بند کیا اور اس کا منہ دبانے لگا۔

''آج تک کسی نے ایسا نہیں کیا، میں نے جس کے ساتھ بھی جو کچھ کیا، اس نے خاموشی سے اس راز کو نگل لیا۔ تم مجھے ننگا کرنا چاہتی ہو۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے پیچھے سے

کپڑا پکڑ کے اس کا سر دیوار سے دے مارا۔ ایک دم دیوار پر خون کا دھبا عیاں ہوگیا اور وہ کپڑا صدف کے خون سے سرخ ہونے لگا۔ فیروز نے اس کا سر پھر دیوار میں مارا...... صدف کا جسم ڈھلک گیا۔ اس نے اسے فرش پر لٹا دیا۔ کپڑا ہٹایا تو صدف کا چہرہ خون میں لت پت تھا اور سر سے خون بہہ رہا تھا۔

فیروز نے اس کی نبض چیک کی تو وہ رک چکی تھی۔ وہ ڈر کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ دم بخود ایک طرف کھڑا رہا اور پھر خالد کو فون کیا۔ رابطہ ہوتے ہی بولا۔

''خالد...... میرے ہاتھوں ایک لڑکی ماری گئی ہے۔''

''وہ کیسے صاحب؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''میری بات نہ مان کر میری شرافت کا لبادہ اتارنا چاہتی تھی۔ میں نے مار دیا۔ تم آجاؤ اور اسے کہیں ٹھکانے لگادو۔''

''صاحب جی...... میرا مشورہ ہے۔ اگر کسی نے نہیں دیکھا تو خاموشی سے نکل آئیں۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' فیروز نے فون بند کیا۔ اردگرد دیکھا، وہ گلاس جس میں صدف اس کے لیے پانی لے کر آئی تھی وہ اُٹھا کر اس نے پانی کچن میں گرایا اور گلاس اپنے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ اس کے بعد اس نے اردگرد کا جائزہ لیا اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا...... کوئی نہیں تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکل کر سیڑھیاں اترا اور اپنی کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔

فیروز نہیں جانتا تھا کہ صدف کی سانسیں ابھی چل رہی تھیں۔ خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ صدف کے کزن قیصر کو اس کی طرف آنا تھا۔ جب فیروز سیڑھیاں اتر رہا تھا تو وہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

جونہی قیصر اس کے فلیٹ میں گیا، وہ صدف کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس نے اسی وقت ایمرجنسی مدد کے لیے فون کیا، گاڑی آگئی اور اسے اسپتال لے گئی۔

جب صدف کو فوری طبی ٹریٹ منٹ دیا جارہا تھا تو صدف نے آخری سانسیں لیتے ہوئے بتادیا کہ اس کا یہ حال کس نے اور کیوں کیا ہے۔ صدف مرگئی لیکن قیصر جو اس کا کزن اور منگیتر تھا، اس نے اپنے دل پر اس کے بیان کو نقش کرلیا۔

ریحان دراصل قیصر ہی تھا۔

☆☆☆

فیروز کو اچانک فون کی سرسراہٹ نے چونکا دیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر اردگرد دیکھا اور فون کان سے لگالیا۔ دوسری طرف خالد تھا۔

''صاحب جی آپ کہاں ہو؟''

''میں اس ٹوٹی سڑک پر ہوں جو بن رہی ہے۔ پُل کے بالکل دائیں طرف جو جاتی ہے۔ تم ابھی یہاں آجاؤ۔''

''میں آرہا ہوں۔''

''دھیان سے آنا۔ وہ پاگل میری تلاش میں ہے کیونکہ میں اس کے چنگل سے بھاگ گیا ہوں۔''

''میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔''

''تم نے کمال کا کام کیا کہ نہیں؟''

''صاحب جی موقع نہیں ملا...... وہ بھی مجھے دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ میں ابھی پہنچ رہا ہوں پھر کچھ کرتے ہیں۔'' فون بند ہوا تو فیروز نے گردن اُٹھا کر اردگرد کا جائزہ لیا اور وہاں سے نکل کر پُل کی طرف بھاگنے لگا۔ وہ بھاگتا ہوا پل کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت اسے کمال کی کال آئی۔

''تم کہاں ہو فیروز......؟''

''وہ میرے پیچھے ہے۔ میں اس سے جان بچانے کے لیے بھاگ رہا ہوں۔ اس وقت میں پرانے پل کے پاس ہوں۔'' فیروز نے بتایا۔

''میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔'' کمال نے کہہ کر فون بند کردیا۔

فیروز ایک طرف چھپ کر بیٹھ گیا۔ اچانک وہاں جو کار پہنچی وہ خالد لے کر آیا تھا۔ فیروز اُٹھا اور اس کی طرف بھاگا عین اس وقت اس کے عقب سے ایک کار نمودار ہوئی جسے فیصل چلا رہا تھا اور دوسری طرف سے بھاگتا ہوا ریحان آیا...... خالد نے اسے دیکھتے ہی باہر نکل کر پستول تان لیا اور ریحان پر فائر کھول دیا۔ گولی اسے نہیں لگی اور وہ ایک طرف ہوگیا۔ فیروز بھاگ کر کار میں بیٹھ گیا اور خالد نے بھی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اسی وقت فیصل نے اپنی کار اس کی کار کے سامنے ایسی کھڑی کردی کہ آگے جانے کے لیے اس کے پاس راستہ نہیں بچتا تھا۔

خالد نے کار بیک کی اور اسے تیزی سے نکال کر لے گیا۔ ریحان بھی بھاگ کر کار میں بیٹھ گیا۔ انہوں نے پیچھا کیا لیکن خالد کار کو تیزی سے نکال کر لے گیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد جب کمال وہاں پہنچا تو اس جگہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے فیروز کو کال کی لیکن اس نے فون اٹینڈ ہی نہیں کیا۔

☆......☆......☆

فیروز نے جاتے ہوئے فون کر کے معلوم کیا کہ ماہم گھر پہنچ گئی ہے۔ نجمہ نے بتایا کہ وہ گھر پر ہے۔ فیروز بولا، وہ تھوڑی دیر کے بعد آ رہا ہے اس کے بعد اس نے خالد سے کہا۔

''تم شمیم کے گھر چلو، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کمال نے اس سے کیا پوچھا تھا۔''

خالد نے گاڑی کا رخ شمیم کی طرف کر لیا۔ اس کے گھر پہنچ کر فیروز نے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر کے بعد اندر سے آواز آئی۔ ''کون ہے......؟''

''میں فیروز ہوں دروازہ کھولو۔'' فیروز بولا تو دروازہ شمیم نے کھولا۔ خالد گاڑی میں بیٹھا رہا اور فیروز اندر چلا گیا۔

''تمہارے پاس کمال آیا تھا؟'' فیروز نے اندر جاتے ہی سوال کیا۔

''ہاں...... انسپکٹر کمال میرے پاس آیا تھا۔'' شمیم نے جواب دیا۔

''کیا پوچھا تھا اُس نے؟''

''وہ سب کچھ پوچھا اس نے جو تمہارے ماضی کا حصہ ہے۔'' شمیم نے جواب دیا۔

''تم نے سب کچھ بتا دیا؟''

''میں اگر نہ بتاتی .... تو وہ مجھے جان سے مار دیتا۔'' شمیم بولی۔

''میرے قریب رہنے والا میرا دوست جسے کبھی شک بھی نہیں پڑا تھا کہ میں کیا ہوں، وہ میرے بارے میں سب کچھ جان گیا۔'' فیروز نے تاسف سے کہا۔

''اس نے سب کچھ جاننے کے بعد جانتے ہو کیا کہا تھا...... اس نے کہا تھا کہ فیروز انسان نہیں بھیڑیا ہے۔''

''میں بھیڑیا ہوں۔ جسے جسم کی بھوک بے چین رکھتی ہے۔ میرا یہ بھیڑیا پن راز کی دیواریں پھلانگ کر باہر نکل آیا ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ سب تمہاری اس کال کی وجہ سے ہوا ہے جو تم مجھے بار بار کر رہی تھیں۔'' فیروز نے اسے گھورا۔

''میں شکارن ہوں، تمہارے لیے شکار کرتی ہوں۔ اور تم نے ہی مجھے کہا تھا کہ میرے لیے شکار کر کے مجھے کال کرنا...... اس میں میرا قصور نہیں ہے۔'' شمیم نے کہا۔

''تم نے مجھے میسج کیا کیا تھا؟'' فیروز نے پوچھا۔

''میرا کیا ہوا میسج تم نے پڑھا نہیں تھا؟'' جواب دینے کے بجائے شمیم نے اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے تو نہیں البتہ کمال نے وہ میسج پڑھ لیا تھا۔'' فیروز ایک دم چپ ہو گیا، اس نے سوچا اور شمیم سے پوچھا۔ ''کہیں تم نے وہ بات بھی تو نہیں بتا دی جو کم از کم کمال کو پتا نہیں چلنی چاہیے تھی۔''

''جب اس نے بہت سے سوال کیے، مجھ سے بہت کچھ کُرید کُرید کر پوچھا تو اس نے وہ بات بھی پوچھ لی اور میں نے بتا دیا کہ میں نے ہی اسے سبز باغ دکھایا تھا اور میں نے ہی اسے راضی کیا تھا...... وہ میرے کہنے پر فیروز کی طرف مائل ہوئی تھی۔''

''اسے یہ جان کر دکھ تو بہت ہوا ہوگا کہ اس کی محبوبہ کو میں نے اس سے اس خاموشی سے چھینا تھا کہ اسے خبر تک نہیں ہوئی تھی۔''

''اسے دکھ بھی ہوا اور بہت غصہ بھی آیا تھا۔''

فیروز اس کے قریب ہو کر بولا۔ ''میری غلطی تھی کہ میں اپنا راز ایک گھڑے میں ڈالتا رہا، وہ گھڑا بھرتا رہا اور کمال نے آ کر اس گھڑے کو الٹا اور میرے ہر راز کو جان لیا...... میرا لبادہ اور بھیڑیا پن اس کے سامنے عیاں ہو گیا۔ مجھے اس کچے گھڑے پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' فیروز کہتا ہوا کچن میں چلا گیا۔ شمیم اس کی طرف دیکھتی رہی۔ جب فیروز کچن سے باہر نہیں آیا تو اس نے جاننے کے لیے کہ وہ اندر کیا کر رہا ہے، آگے بڑھی۔ جونہی وہ دروازے کے پاس پہنچی، ایک دم بجلی کی سی تیزی سے فیروز باہر نکلا اور ہاتھ میں پکڑی چھری اس نے دستے تک شمیم کے سینے میں اتار دی۔ چھری کے دستے پر اس نے کپڑا رکھا تھا جو اس نے اتار لیا اور شمیم فرش پر گر کر تڑپنے لگی۔ وہ اسے تڑپتا ہوا چھوڑ کر باہر چلا گیا۔

وہ گاڑی میں بیٹھا اور بولا۔ ''تم میرے فارم ہاؤس کی طرف چلو۔ کمال کو ٹھکانے لگانا ضروری ہو گیا ہے۔ اُسے اسی جگہ بلاؤں گا۔''

خالد نے چپ چاپ گاڑی آگے بڑھا دی۔ فیروز کے کہنے پر کار کی رفتار خالد نے تیز رکھی تھی جو جلد ہی شہر کی حدود سے نکل کر فارم ہاؤس کی اس سڑک پر دوڑنے لگی تھی جس کے دائیں بائیں فصلیں اور جابجا درخت تھے۔ تب فیروز نے خاموشی توڑی۔

''خالد تم میرے راز دار ہو۔ شمیم بھی میری راز دار تھی۔ اس نے میرے سارے راز کھول دیے...... کمال کو سب کچھ پتا چل گیا۔ یہ بھی پتا چل گیا کہ وہ جس سے محبت

کرتا تھا جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا، اسے بھی میں نے اس سے دور کیا تھا۔ شمیم نے بتایا تو اسے پتا چلا ورنہ اسے کبھی مجھ پر شک بھی نہیں ہوا تھا۔ تمہارے پاس بھی میرے بہت سے راز ہیں۔''

''میں نے ہمیشہ نمک حلالی کی ہے صاحب۔'' خالد نے جلدی سے کہا۔

''جب وقت کڑا آتا ہے تو نمک نکل کر دور جا پڑتا ہے اور پھر اپنی جان بچانا یاد رہ جاتا ہے۔ اور کچھ یاد نہیں رہتا۔''

''میں نے کبھی آپ کے خلاف زبان نہیں کھولی اور نہ کبھی کھولوں گا۔'' خالد گھبرا کر بولا۔

''اب کسی پر کوئی اعتبار نہیں رہا۔'' فیروز نے کہہ کر پستول نکال کر خالد کی پسلی پر رکھ دیا۔ ''شمیم کو میں انجام تک پہنچا آیا ہوں۔ تم بھی انجام تک پہنچ جاؤ تو میرے لیے اچھا ہے۔ کمال کو میں سنبھال لوں گا۔ اس کے لیے میں نے سوچ لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''

''آپ میرے ساتھ ایسا مت کریں۔ میں آپ کا پرانا خادم ہوں۔'' خالد گھبرا گیا تھا۔

''میں مجبور ہوں۔ مجھے ایسا کرنا ہی پڑے گا۔ میں چاہتا ہوں' میں اپنے وہ تمام قدموں کے نشان مٹا دوں جو چلتے ہوئے پڑ گئے تھے۔ فیروز کی آنکھوں میں سفاکی اتری ہوئی تھی۔ خالد گاڑی چلا رہا تھا اور ساتھ ساتھ وہ گردن گھما کر فیروز کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔

''تجھے ماروں گا میں اور پولیس کو بتاؤں گا ریحان نے مارا ہے۔ پولیس اسٹیشن جا کر اپنی بیٹی کے اغوا کی رپورٹ بھی درج کراؤں گا۔ یہاں گاڑی روک دو۔'' فیروز نے کہا تو خالد نے گاڑی روک دی۔

رات کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دور تک خاموشی اور ویرانی تھی۔ دونوں کار سے باہر نکلے اور فیروز اسے درختوں کی طرف لے گیا۔ خالد ڈر اور خوف میں مبتلا تھا۔ اتنے سال اس کے گناہوں کی رازداری کا صلہ اسے اپنے مالک سے موت کی صورت میں ملنے والا تھا۔

ایک جگہ رک کر فیروز نے کہا۔ ''جب تم سب مر جاؤ گے میرے سب ثبوت مٹ جائیں گے اس کے بعد میں پھر اپنی زندگی کی طرف لوٹ آؤں گا اور کوئی رازداں نہیں بناؤں گا۔'' فیروز نے کہتے ہی خالد کو گردن سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اس کے پیٹ...... پر پستول کی نال رکھ کر ایک ساتھ تین فائر کر دیئے۔ سناٹے میں آواز گونجی لیکن اتنی زیادہ نہیں...... خالد اسی جگہ ڈھیر ہو گیا اور فیروز کار کی طرف بھاگا، اندر بیٹھا اور کار کو اس جگہ سے نکال کر لے گیا۔

راستے میں اس نے کمال کو فون کیا اور بولا۔ ''کمال تم کہاں ہو؟''

''میں اسی پُل کے پاس کھڑا ہوں۔ تم کہاں ہو، میں نے تم کو فون بھی کیا تھا لیکن تم نے میری کال نہیں سنی۔''

''وہ کہاں ہے؟ کیا تم نے اُسے پکڑ لیا ہے؟'' فیروز نے پوچھا۔

''مجھے وہ نہیں ملا۔ کہیں بھاگ گیا ہے۔'' کمال نے بتایا۔

''کیا تم اکیلے ہو یا تمہارے آدمی تمہارے ساتھ ہیں؟'' فیروز نے سوال کیا۔

''تم جانتے ہو کہ میں لائن حاضر ہوں۔ بڑی رشوت کا الزام ہے مجھ پر۔ اپنے تعلق اور دوستی کی بنیاد پر جو بندے میں نے بلائے تھے، وہ واپس بھیج دیے ہیں۔ اس وقت اکیلا کھڑا ہوں۔ تم سے وعدہ کیا تھا کہ تم کو اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔'' کمال نے بتایا۔

''تم ایسا کرو اسی پُل کے آگے ایک قبرستان ہے وہاں آجاؤ میں اسی طرف آرہا ہوں۔'' فیروز نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس نے کار کی رفتار اور بھی تیز کر دی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے ایک ایک کر کے اپنے ماضی کے ہر رازداں کو ختم کر دیا ہے، ایک کمال رہ گیا ہے جسے شمیم کے ذریعے سے اس کے بارے میں پتا چل گیا تھا کہ فیروز کا اصل چہرہ کیا ہے۔ اب وہ کمال کو بھی ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اس کے بعد اس کا کوئی رازداں نہیں رہے گا۔ وہ پھر سے شرافت کے لبادے میں اپنے آپ کو لپیٹ کر اپنی بیوی، بیٹی اور اپنے ملنے والوں کے سامنے لے آئے گا۔

قبرستان کے قریب پہنچ کر اس نے اپنے پستول میں گولیاں بھریں اور اسے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کمال کی کار بھی اس جگہ پہنچ گئی۔ فیروز نے دیکھا، وہ کار میں اکیلا ہی بیٹھا ہے۔

فیروز اپنی کار سے باہر نکلا اور تیزی سے چلتا ہوا کمال کی کار میں اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

''ماہم گھر پہنچ گئی ہے، میں نے کال کر کے معلوم کیا تھا۔'' کمال اس کے بیٹھتے ہی بولا۔

''میں نے بھی پتا کر لیا تھا۔ تم نے اُسے ابھی تک نہیں پکڑا۔ یہ میری ہمت تھی کہ میں اس کے ہاتھ سے بھاگ نکلا۔ ورنہ وہ مجھے اب تک مار چکا ہوتا۔'' فیروز نے کہا۔

''میں نے پوری کوشش کی تھی کہ اسے پکڑ لوں۔ میں نے اس کا تعاقب بھی کیا تھا لیکن وہ بھاگ جانے میں کامیاب ہوگیا۔ تم جانتے ہو کہ میں صرف یہ تمہاری دوستی میں کر رہا ہوں۔ ورنہ میں آن ڈیوٹی نہیں ہوں اور ایسا ہرگز بھی نہیں کر سکتا۔'' کمال بولا۔
''ایک بات بتاؤ؟''
''پوچھو۔''
''شمیم سے کیوں ملے تھے؟'' فیروز نے پوچھا۔
''تمہارے موبائل فون پر کال آرہی تھی، اس پر لکھا تھا ڈارلنگ...... میں چونکا اور تم کو بھابی جی کو کمرے میں چھوڑنے کے بہانے بھیج کر تمہارا موبائل فون لے لیا اور اس کا میسج بھی پڑھ لیا۔ اپنے دوست کے ذریعے سے اس کا نمبر دے کر اس کا ایڈریس لیا اور اس کے گھر پہنچ گیا...... تم جانتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ مخلص دوستی رکھتا تھا اس لیے اب بھی جھوٹ نہیں بولا'' کمال نے بتایا۔
''تم میرے مخلص دوست تھے...... یعنی کہ اب نہیں ہو؟'' فیروز نے اس کی نظروں میں جھانکا۔
''اب نہیں ہوں۔ کیونکہ تم نے میری اُس محبوبہ پر غلط نظر رکھی جس سے میں شادی کرنا چاہتا تھا۔ تم نے مجھے پتا بھی نہیں لگنے دیا اور اسے میری نظروں کے سامنے لے گئے۔'' کمال کے لہجے میں کرب آ گیا تھا۔
''جب تم نے مجھے اس سے ملوایا تو میں اس کا حُسن دیکھتا ہی رہ گیا۔ بڑی خوبصورت ہے وہ۔ خوبصورتی میری کمزوری ہے، یوں کہہ لو خوبصورتی آگ اور میں موم کا بنا ہوا پتلا ہوں...... ایسا پگھل جاتا ہوں کہ کسی اور چیز کا خیال ہی نہیں رہتا۔'' فیروز مسکرایا۔
''مجھے یہ جان کر بڑا دکھ ہوا کہ تم واقعی ایک بھیڑیئے ہو...... جس کی نظر میں اپنوں کے لیے بھی حیا نہیں ہے۔''
''تم جو کہہ لو مجھے پروا نہیں ہے۔ میں نے شمیم کو مار دیا اور خالد کو بھی ختم کر دیا۔ اپنے ماضی کو میں نے جن کے دلوں میں دفن کیا تھا ان کو ہمیشہ کی نیند سلا کر میں نے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا ہے۔ ایک تم رہ گئے ہو اور تم کو میں اب ختم کر رہا ہوں۔ اس کے بعد میں پھر نہایا دھویا گھوڑا بن جاؤں گا۔'' وہ کہہ کر ہنسا اور اس نے پستول نکال کر کمال پر تان لیا۔
کمال نے اطمینان سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک پولیس والے کو اس کھلونے سے ڈرا رہے ہو۔ یہ تمہارا خیال ہے تم اپنا ماضی مٹا رہے ہو لیکن تم اپنے گناہوں کا ایک نیا صفحہ لکھ رہے ہو جو ایک ایسی عدالت میں پیش ہوگا جہاں پورا پورا انصاف ہوتا ہے۔''
''فی الحال تم کو خدا حافظ......'' فیروز نے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھانا چاہا تھا کہ کمال نے کہا۔
''بس ایک بات کہنے کا موقع دے دو۔''
''پرانی دوستی کی وجہ سے موقع دے رہا ہوں۔ بولو کیا بولنا چاہتے ہو؟'' فیروز بولا۔
''تم مجھے اچھی طرح سے جانتے ہو کہ میں دوست اچھا ہوں لیکن افسر بُرا ہوں۔ راشی ہوں...... کئی بار الزام لگے کئی بار معطل ہوا اور کئی بار بحال ہوا...... آج زندگی میں پہلی بار ڈیوٹی پر نہ رہتے ہوئے میں نے رشوت لی ہے اس لیے کہ تم نے مجھے بھی دھوکا دیا تھا میری محبت کو تم نے چھینا......''
''تم نے کس سے رشوت لی ہے...... اور کیوں لی ہے؟'' فیروز نے حیرت سے پوچھا۔
کمال معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''میں نے ریحان سے رشوت لی ہے۔ اچھی آفر کی تھی اُس نے...... میں نے قبول کر لی...... مجھے دھوکا دینے کی بھی تو تم کو سزا ملنی چاہیے تھی۔''
''تم نے کیا رشوت لی ہے ریحان سے؟؟'' فیروز کو حیرت ہو رہی تھی۔
''میں نے اس سے اس بات کی رشوت لی کہ میں فیروز کو اس کے حوالے کر دوں گا۔ اور اب میں تجھے اس کے حوالے کر رہا ہوں۔'' کمال نے کہہ کر آنکھوں سے اشارہ کیا کہ اپنے پیچھے دیکھو۔ فیروز نے اسی وقت گردن گھمائی تو اس کے عقب میں ریحان کھڑا تھا۔ اس نے اسی وقت کار کا دروازہ کھولا اور فیروز کو کار سے کھینچ کر باہر نکال لیا۔
کمال اسی وقت اس جگہ سے چلا گیا۔ ریحان، فیروز کو کھینچتا ہوا ویران قبرستان میں لے گیا۔ فیروز کے ہاتھ سے پستول گر چکا تھا۔ ریحان نے اسے ایک گڑھے میں دھکا دے دیا۔ ساتھ ہی اس نے یکے بعد دیگرے فائر کیے اور فیروز کو ٹھنڈا کر دیا۔
ریحان جس کا اصل نام قیصر تھا، نفرت سجائے اس جگہ سے چلا گیا اور اندھیرے کا حصہ بن گیا۔ مرتے ہوئے فیروز کو کمال کے الفاظ یاد آ رہے تھے، اس نے کہا تھا۔
''یہ تمہارا خیال ہے تم اپنا ماضی مٹا رہے ہو لیکن تم اپنے گناہوں کا ایک نیا صفحہ لکھ رہے ہو جو ایک ایسی عدالت میں پیش ہوگا جہاں پورا پورا انصاف ہوتا ہے۔''

❖❖❖

قاتل ہیولا

مظہر سلیم ہاشمی

دھند پھیلی ہو تو بہت کچھ آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی اوجھل رہتا ہے... انسانی ذہن کی نیرنگیاں تو ہر پل ایسے نظارے پیش کرتی ہیں کہ غور کرنے والے دنگ رہ جاتے ہیں... تحلیلِ نفسی آشکار کرتی ہے کہ انسان کو بعض اوقات خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ جو کررہا ہے، اس کا مقصد کیا ہے؟ خواہشات کے زیرِاثر ایسے حالات میں اس کا ذہن جو تاویلیں گھڑتا ہے وہی اس کے نزدیک حقیقت شمار ہوتے ہیں... وہ عزم و ہمت کا ایک ایسا ہی پیکر تھی جسے زندگی کے ہر قدم پر محبت، دوستی اور خلوص جیسے جذبوں کا سہارا حاصل تھا... اپنی دنیا میں ترقی کی راہ پر گامزن وہ یہ بھول گئی تھی کہ ماضی کبھی بھی پلٹ کے وار کر سکتا ہے... تمام تر وسائل و تربیت کے باوجود اس کا مقابلہ ایک ایسے بے رحم مجرم سے تھا جو ظلم کی ایک الگ ہی داستان رقم کررہا تھا...

ایک ہی صورت میں ڈھلے دو متضاد مزاجوں کا شاخسانہ... سرورق کی تیکھی کہانی...

رات کسی کالے ناگ کی طرح سیاہ تھی۔ ہوا کے سرد تھپیڑے کپڑوں اور گوشت پوست سے گزر کر ہڈیوں کا گودا جما رہے تھے۔ اپنے لکڑی کے کیبن میں ان تمام موسمیاتی اثرات سے محفوظ وہ سامنے موجود میز پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ ایک بدشکل سا کیک وہاں موجود تھا جس پر جلتی ہوئی ایک موم بتی قدرے خوش کن تاثر دے رہی تھی۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹومی......'' وہ بولا تو اپنی ہی آواز کی اجنبیت سے چونک اٹھا۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹومی...... ہیپی برتھ ڈے ڈیئر......''
وہ اپنی سالگرہ کا گانا گا ہی رہا تھا کہ سامنے سے آنے والی بھنچی بھنچی آواز نے اس کا ارتکاز توڑ دیا۔

''امم...... امم......'' ایسا لگتا تھا کہ متوجہ کرنے والی آواز ماحول کی سنگینی سے بھرپور طریقے سے آشنا تھی۔

اس نے ایک نفرت بھری نگاہ آواز کے ماخذ پر دوڑائی اور پھر سے کیک کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹومی......''

''ہیپی برتھ ڈے ٹومی......''

اس کا ہاتھ بلند ہوا تو اس میں کیک کاٹنے والی چھری کے بجائے ایک خوفناک شکل کا شکاری خنجر موجود تھا۔ موم بتی کی لرزتی زرد روشنی میں اس کا چہرہ نہایت خوفناک لگ رہا تھا۔ اس نے یک لخت اپنا بازو نیچے کیا اور کیک کو اس بُری طرح سے کاٹ ڈالا جیسے کسی جانور کے حصے بخرے علیٰحدہ کر رہا ہو۔

''یہ میرا آخری شکار ہوگا؟'' اس نے خود سے سوال کیا اور پھر ایک بے ہنگم قہقہہ لگاتے ہوئے کیبن میں موجود بے بس وجود کی جانب خنجر سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... میرا آخری شکار...... تو ہے میرا آخری شکار......''

اس کے قہقہوں کے درمیان کیبن میں گونجنے والی دوسری بھنچی بھنچی آوازیں تیز تر ہوتی جارہی تھیں۔ اس کا خنجر بکف ہاتھ بلند ہوا، تیزی سے نیچے آیا اور پھر یکلخت ماحول میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔

☆☆☆

دارالحکومت کے پوش علاقے میں واقع اس آفس میں گہرا سکوت اور خاموشی طاری تھی۔ صرف کی بورڈ پر چلنے والی انگلیوں کی تھرتھراہٹ اس سناٹے کو مرتعش کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ وجیہہ نقوش والا شخص ایک فائل سے نقل کر کے کمپیوٹر کی ایکسل شیٹ میں ڈیٹا کا اندراج کر رہا تھا۔ کمپیوٹر اسکرین پر ایک سوفٹ ویئر بھی متحرک تھا جس کی بدولت وہ سارا ڈیٹا خودکار انداز میں مجرموں کی درجہ بندی میں مصروفِ عمل تھا۔ ہر مجرم اپنے جرم کے مطابق علیٰحدہ فولڈر میں مندرج ہو رہا تھا اور بڑے سائنٹیفک انداز میں مجرموں کی کیٹیگریز بن رہی تھیں۔

''تیرا نام ہتھیلی پر لکھ کر اسے چومتی رہتی ہوں......''

اونچی آواز میں اس کے موبائل پر گانے کی آواز کسی خوفناک چنگھاڑ کے مانند محسوس ہوئی اور وہ چونک کر رہ گیا۔ وہ عام طور پر کام کے دوران میں موبائل سائلنٹ پر لگانے کا عادی تھا لیکن آج نجانے وہ کن خیالوں میں مگن تھا کہ یہ کام کرنا بھول گیا۔

''بیگم کالنگ۔'' اس کے اسمارٹ فون نے گنگناتے ہوئے مطلع کیا۔ اس نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کال کاٹ دی۔ یہ گانا اس کی بیگم کی خصوصی فرمائش پر بطور رِنگ ٹون لگایا گیا تھا کیونکہ وہ کہتی تھی:

''یہ بھی محبت بڑھانے کا ایک طریقہ ہے......''

''ہونہہ......'' گلفام نے سر جھٹکا۔ ''محبت بڑھانے کا طریقہ......''

''ابھی مصروف ہوں بعد میں بات کرنا۔'' ایک بار پھر کال آنے لگی تو اس نے فوراً رابطہ منقطع کر کے ایک ڈیفالٹ ٹیکسٹ میسج بھیج دیا۔

گلفام نام کا ہی نہیں اپنی شخصیت کے حوالے سے بھی کسی شہزادہ گلفام سے کم نہیں تھا۔ لڑکیاں اور خواتین اس کی وجاہت پر بے ساختہ مرتی تھیں لیکن وہ کسی کے عشق میں مبتلا ہونے کا قائل ہی نہیں تھا۔ اسے لگتا تھا کہ بس وہ خود چاہے جانے کے قابل ہے...... محب سے زیادہ اسے محبوب بننے میں مزہ آتا تھا۔ قدرے سست اور کام چور ہونے کی اس کی پرانی عادت تھی۔ پچھلا کچھ عرصہ جاب پر ہونے کے باوجود اس نے جس طرح سستی جیسی عیاشی کی تھی، وہ وزن بڑھنے کا موجب بن گیا تھا۔ ہلکی پھلکی توند اس کی چھ فٹ کی قامت پر بُری نہیں لگتی تھی لیکن پھر بھی اب وہ فٹ نیس کے اس لیول پر نہیں تھا جو اس کی جاب کا تقاضا تھا۔

شام کے سات بج چکے تھے اور گلفام ابھی تک فائلوں کے ڈھیر میں دھنسا ہوا تھا۔ کام سے زیادہ اسے اپنی باس نازیہ کرمانی پر غصہ تھا جو کہ باقی سب کو چھٹی دینے کے بعد خود بھی آفس سے روانہ ہوگئی تھی اور اسے کام مکمل کرنے کی ذمے داری سونپ گئی تھی۔

نازیہ بطور باس اسے بالکل بھی پسند نہیں آئی تھی۔ وہ حال ہی میں اس نئے محکمے میں آیا تھا۔ حکومتِ وقت نے چیدہ چیدہ اور اہم نوعیت کے کیس نمٹانے کے لیے کرائم ٹاسک فورس مختصراً سی۔ ٹی۔ ایف کے قیام کی منظوری دی تھی۔ یہ ادارہ اپنے دائرۂ کار کی نوعیت میں اگرچہ آزاد تھا لیکن محکمۂ پولیس کے تحت ہی کام کرتا تھا۔ ابھی اس کی ابتدائی تشکیل ہی کی جارہی تھی۔

''تیرا نام......'' ایک بار پھر فون کی بیل بجی تو اس نے جھٹکے سے فون اٹھالیا۔

''بزی ہوں یار......'' وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔''کام ابھی بہت زیادہ رہتا ہے...... رات دیر سے آؤں گا۔'' اس نے بیگم کو بولنے کا موقع دیے بغیر ہی ایک سانس میں سب کہہ ڈالا۔

''ہوتا رہے گا کام......'' فون کے اسپیکر سے کھنکھناتی ہوئی تحکمانہ آواز آئی۔''فوراً گھر پہنچو...... میں نے تمہارا پسندیدہ کشمیری آب گوشت بنایا ہے......''

''یار...... میری سڑیل باس نے اتنا کام دے دیا ہے کہ لگتا ہے کھانا تمہیں اکیلے ہی کھانا پڑے گا۔'' گلفام کے انداز میں چھیڑنے کا عنصر نمایاں تھا۔ اپنی پسند کے کھانے کا سن کر ہی اس کے مزاج پر چھائی برہمی رفع ہوگئی تھی۔

''تمہاری باس کی ایسی کی تیسی...... اسے کہنا کہ 'ہوم منسٹر' کا حکم آیا تھا اس لیے کام چھوڑ چھاڑ کر آنا پڑا......'' بیگم نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''اچھا آرہا ہوں...... باس۔'' گلفام نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔''ایک تو جتنے ظلم ڈھاتی ہو...... اس سے زیادہ بجلیاں گراتی ہو...... بندہ بشر اب کہاں جائے کہ بات نہ مانی تو گھر میں ہی نہ گھسنے دوگی۔''

''اچھا اب زیادہ باتیں نہ بناؤ...... میں واقعی انتظار کر رہی ہوں۔'' نازیہ نے ایک ادا سے بات مکمل کی اور فون بند کر دیا۔

نازیہ کرمانی...... گلفام کرمانی کی باس ہونے کے ساتھ ساتھ بیگم بھی تھی۔ یونیورسٹی میں ہی دونوں نے ایک دوسرے کو... پسند کر لیا تھا پھر گھر والوں کی رضامندی سے نکاح کے مقدس بندھن میں بندھ گئے تھے۔ ان کی شادی کو چھ سال سے زائد کا عرصہ بیت گیا تھا پر ابھی تک صاحب اولاد نہ ہوئے تھے۔ ڈاکٹر سے چیک اپ کروانے کے بعد ثابت ہوا تھا کہ دونوں میں کسی قسم کی کمی نہیں۔ بس رب کی جانب سے دیر تھی اس وجہ سے دونوں راضی برضا تھے۔

تعلیم کے بعد ایک ہی شعبے میں آنا ان کے مزاج کی ہم آہنگی کا ثبوت تھا۔ آفس میں نازیہ جتنی سخت مزاج اور سڑیل قسم کی باس تھی، گھر پر اس سے کہیں زیادہ گرم جوش اور اس کا خیال رکھنے والی بیوی تھی۔ ہر کام دل و جان سے کرتی تھی اور وہ اس سے بہت زیادہ خوش تھا۔ اب بھی اس نے گلفام کے پسندیدہ ''آب گوشت'' کا تذکرہ کیا تو اس کے منہ میں آفس میں بیٹھے بیٹھے ہی پانی آ گیا۔ اچھا کھانا اس کی کمزوری تھی اور نازیہ اس کمزوری سے فائدہ اٹھانا خوب جانتی تھی۔

اس نے تیزی سے کام سمیٹا اور کمپیوٹر اسکرین لاک کرنے کے ساتھ ہی سسٹم شٹ ڈاؤن کر دیا۔ اس کا کام انتہائی حساس نوعیت کا ہوتا تھا اس لیے وہ اسے گھر لے جاکر اپنے ذاتی لیپ ٹاپ پر نہیں کر سکتا تھا۔ آفس سے نکل کر جب وہ گاڑی کی جانب جا رہا تھا تو اسے بالکل بھی احساس نہیں تھا کہ پارکنگ لاٹ میں سے وہ اپنی قیمتی سفید ٹویوٹا آخری بار نکال رہا ہے۔ سڑک پر آکر اسے احساس ہوا کہ رات میں اترتی دھند نے ماحول کو مزید تاریک کر دیا تھا۔

☆☆☆

اس نے کھڑکی کے دھند آلود شیشے کے پار دیکھنے کی کوشش کی لیکن ہر سُو تاریکی چھائی تھی۔ یہاں سے اکثر اسے بھیڑیے نظر آجاتے تھے۔ ان کے چیخنے چلاّنے کی آوازیں سننا تو معمول کی بات تھی۔ اب بھی وہ اسی آس پر باہر دیکھ رہا تھا کہ کوئی ذی روح نظر آجائے تو وہ اپنی ذات کی تشنگی کا احساس کم کر سکے۔

ذات کی تشنگی کا احساس ہوتے ہی سرد یادیں ایسے اس کے بدن میں اتر آئیں جیسے کوئی بدروح حلول کر دی گئی ہو۔ ایسا بہت سال قبل ہوا تھا لیکن تازہ ترین واقعہ بھی کسی بھیانک خواب کے مانند اس کے دماغ کے دروازے پر ہمہ وقت دستک دیتا رہتا تھا۔

اس نے اپنے خنجر کی جانب نظر دوڑائی...... دس انچ کے پھل والا وہ شکاری خنجر ایک جانب سے تیز دھار رکھتا تھا جبکہ دوسری جانب سے وہ دندانے دار تھا۔ اس کی دھار اتنی تیز کی گئی تھی کہ یہ خنجر کسی بھی جاندار کو منٹوں میں چیر پھاڑ سکتا تھا۔ خنجر کو دیکھتے ہوئے یونیورسٹی کی ایک یاد اس کے ذہن کی اسکرین پر نمودار ہوگئی، وہ اسٹیج ڈرامے میں ایک موالی کا کردار ادا کر رہا تھا۔ گردن میں رومال باندھے اور ہاتھ میں ایک چاقو لہراتے ہوئے وہ چاقو کے غلط تلفظ والا مشہور ڈائیلاگ بار بار بولتا تھا۔''پاس مت آنا، چقّو ہے میرے ہاتھ میں۔'' خنجر کا بغور معائنہ کرتے ہوئے اس نے اس کی دھار پر اپنا انگوٹھا رکھ دیا۔

''سی......'' ایک سسکاری سی اس کے حلق سے خارج ہوئی۔

خنجر کی دھار اپنے مالک کو بھی معاف کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ اس نے اپنے انگوٹھے کی جانب دیکھا جہاں پر ایک پتلی باریک خونی لکیر بن گئی تھی اور خون ٹپکنے والا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اس بہتے خون سے نظریں نہیں ہٹا پا رہا تھا اور دماغ پر ایک عجب سی دھند چھا رہی تھی۔ خود اذیتی میں اتنا

مزہ نہیں تھا لیکن بہتا خون دیکھ کر اس کے پژمردہ پڑتے اعصاب پر ایک روانی...... ایک سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ یک ٹک دیکھتے ہوئے اسے وقت گزرنے کا احساس تک نہیں رہا تھا۔

اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو ڈوبتے چاند کی زرد چاندنی دیودار اور صنوبر کے درختوں کی شاخوں سے منجمد آنسوؤں کے مانند ٹپکتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنے انگوٹھے پر نگاہ دوڑائی جہاں خون جمنے لگا تھا۔

اس کی ذہنی حالت روز بروز تباہ ہوتی جا رہی تھی۔ سر کا درد اب قابلِ برداشت نہیں رہا تھا۔ پچھتاوے کی آگ کسی رستے ناسور کی طرح اس کے وجود کو خاکستر کر رہی تھی۔ ہر رات وہ ایک ہی بھیانک خواب دیکھ رہا تھا جو کہ اس کی زندگی کے سب سے بڑے حادثے سے جُڑا تھا۔

اچانک ہی اس کے بدن کو جھٹکا سا لگا اور وہ اس آرام کرسی پر مچل کر رہ گیا جس پر بیٹھا تھا۔ کھڑکی اور اس سے دکھائی دینے والا منظر ویسے کا ویسے تھا لیکن اب اس میں وہی فرق تھا جو کہ اندھیری شب اور روزِ روشن میں ہوتا ہے۔ دن کے اجالے نے باہر کا نظارہ بہت خوبصورت کر دیا تھا۔ دیودار، صنوبر اور چیڑ کے درختوں پر چہچہاتے پرندے غضب کی دلکشی کا باعث بن رہے تھے۔

اس نے اپنے کیبن کے در و دیوار پر ایک نگاہ دوڑائی اور ایک جانب موجود باورچی خانے تک پہنچ گیا۔ اگرچہ یہ بھی کیبن کا ایک حصہ ہی تھا لیکن شیلف لگا کر اسے کچن کا تاثر دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایک بھٹی موجود تھی جسے بطور اوون استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس علاقے کے ہر گھر میں ایسے تندور موجود تھے جس میں روٹیاں بھی پکائی جا سکتی تھیں اور کیک، بسکٹ وغیرہ بھی بنائے جا سکتے تھے۔

کل کا بچا ہوا کیک نکال کر اس نے کھانا شروع کیا۔ یہ ابھی تک تازہ و خوش ذائقہ تھا اور اتنی مقدار میں موجود تھا کہ اسے ناشتے کے لیے مزید تردّد کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ چائے کی طلب اسے ستانے لگی تھی۔

اس نے چولھا جلا کر کیتلی اس پر رکھ دی اور ساتھ کیک کو تھوڑا تھوڑا کاٹ کر کھاتا رہا۔ کیتلی میں پانی گرم کر کے اس نے چائے بنائی اور پھر اس میں ایک پُڑیا کھول کر ڈال دی۔

''یہ دوا لینا ہرگز نہ بھولنا......'' حکیم صاحب نے اسے خصوصی تاکید کی تھی۔

وہ اپنی دوا لینا کبھی نہیں بھولتا تھا لیکن کچھ عرصے سے اسے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ جب اس کے دماغ پر دھند چھائی ہوتی ہے، ان لمحات میں وہ وقت کا حساب کتاب بھول جاتا ہے۔

اس نے چائے کے مگ پر ایک گہری نگاہ ڈالی اور ایک بڑا گھونٹ لیا۔ چہرے پر ناگواری کے تاثرات چھا گئے۔ اسے سمجھ نہیں آیا تھا کہ وہ خود اتنی بدذائقہ چائے بناتا ہے یا پھر اس میں گھلی دوا کا اثر ہے۔ اس کے دماغ میں پچھلے دو ماہ کی باتیں چکرانے لگیں...... غالباً زوداثر دوا نے کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اپنے مقام سے کھو جانے والے کسی جانور کی مثل پرانی باتیں اس کے دماغ میں اِدھر اُدھر بھٹکتی پھر رہی تھیں۔

''خون ہی خون...... آخری واقعہ کب ہوا تھا؟'' اس نے دماغ پر زور دیتے ہوئے سوچا۔

اس نے تیزی سے اپنے خون آلود ہاتھوں کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ وہ صاف کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتا...... لیکن وہاں کوئی خون تھا ہی نہیں۔ اس نے اپنے سخت اور کھردرے ہاتھ کن پٹیوں پر رکھ دیے اور پوری قوت سے دبانے لگا۔

''یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟'' اذیت کے عالم میں اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں بھی نکل رہی تھیں۔

اچانک ہی اس کے ذہن پر چھائی دھند چھٹنے لگی...... ست رنگی چنری میں لپٹا ایک خوبصورت چہرہ تھا...... ایک نہایت خوبصورت لڑکی کا لیکن اس چہرے پر موت کی زردی چھائی تھی...... ایسے جیسے اس کے بدن کا تمام خون کسی نے نچوڑ لیا ہو۔

''ٹھک ٹھک ٹھک......'' لکڑی سے تیار شدہ اس کیبن میں ٹین کے بنے دروازے پر دستک کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔

وہ ان واقعات کے ٹرانس میں ہی کھویا تھا کہ گونج دار دستک اسے حالتِ خواب سے ہوش میں لے آئی۔

''ٹھک ٹھک ٹھک......'' ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا ہو۔

''کون ہے......؟ کیا مسئلہ ہو گیا؟'' اس نے چلّاتے ہوئے سوال کیا۔

''پولیس...... دروازہ کھولو......'' باہر سے ایک پاٹ دار آواز آئی تو اس کے جسم میں سراسیمگی کی لہریں دوڑ گئیں۔ یہ پکار سن کر اسے ایسا لگا جیسے بھیانک موت اسے پنجوں میں دبوچنے کے لیے بے تاب ہو گئی ہو۔

☆☆☆

موت جب جھپٹتی ہے تو انسان پوری شدت سے فرار ہوتا ہے۔ وہ بھی اس شدت سے پہلی بار واقف ہو رہی تھی۔ ایسا لگتا کہ جیسے یقینی موت اس کے تعاقب میں ہے اور وہ آج بچ نہیں پائے گی۔

اس کے داہنے پیر میں درد کی شدید لہریں اٹھ رہی تھیں لیکن وہ گھسٹنے کے بجائے پوری جان سے دوڑ رہی تھی۔ پتھریلے راستوں سے ہٹ جانے کے باعث وہ برف کی موٹی اور نرم تہ والے حصے سے گزرنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ بار بار اس کے قدم برف میں دھنس سے جاتے تھے لیکن موت کے خوف سے وہ مسلسل دوڑے جا رہی تھی۔

ایک جانب اسے جھاڑیاں نظر آئیں تو وہ ان کی اوٹ میں ہوگئی اور اپنی بکھری سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ دور دور تک اسے ''شکاری'' نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بڑی دیر سے اس کے تعاقب میں تھا لیکن ابھی تک قابو پانے میں ناکام رہا تھا۔

نازیہ نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں اپنے پیر کو سہلانے لگی جہاں اسے چوٹ لگی تھی۔

''یہ چوٹ کیسے لگی تھی؟'' اس نے خود سے سوال کیا لیکن کوئی بھی جواب دینے سے قاصر تھی۔ اسے یاد ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچی اور کیسے اس ''قاتل شکاری'' سے بچ کر بھاگنے میں کامیاب ہوئی۔

''میرا فون کہاں گیا؟'' جیکٹ کی جیب ٹٹولنے پر موبائل فون غائب پایا تو جھنجلا گئی۔ شاید بھاگ دوڑ میں وہ راستے میں ہی کہیں گر گیا تھا۔

سلیٹی رنگ کے اوورکوٹ میں ملبوس وہ لمبے بالوں والا شخص ہاتھوں میں ایک خوفناک خنجر لیے جانے کب سے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔

''وہ چاہتا تو گن کا ایک ہی برسٹ فائر کر کے میری جان لے سکتا تھا..... تو اس نے کیا مجھے زندہ پکڑنے کا تہیہ کیا ہوا ہے؟'' نازیہ اپنی سوچ پر خود ہی کانپ کر رہ گئی۔

''نہیں..... مجھے اس کے ہاتھ زندہ ہرگز نہیں آنا چاہیے.....'' نازیہ نے خود کلامی کرتے ہوئے عزم کا اظہار کیا اور جھاڑیوں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ ایک بار پھر سے دوڑنے کے لیے تازہ دم ہو چکی تھی۔

جھاڑیوں کے بعد درختوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو رہا تھا۔ وہی اسے اپنے لیے راہِ نجات نظر آ رہی تھی۔ وہاں برف کافی کم تھی جس کی وجہ سے اس کی رفتار میں خود بخود تیزی آتی جا رہی تھی۔

''آآاغ.....'' اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بمشکل اپنی چیخ کو نکلنے سے روکا۔

ایک قدرے موٹے تنے والے درخت کی اوٹ سے وہ یک دم ہی اس کے سامنے آ گیا تھا۔ لمبا چوڑا..... اپنی تمام تر خوفناکی کے ساتھ وہ اس کے سامنے کسی دیو کے مانند تن کر کھڑا تھا۔ خوفناک خنجر اس کی شخصیت کی خطرناکی میں اضافہ کر رہا تھا۔

''کک..... کیا چاہتے ہو تم؟'' وہ اپنے لرزیدہ اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''ہاہاہا..... ہاہاہا..... ہاہاہا.....'' جواب میں وہ بے ہنگم قہقہے لگانے لگا۔ ''تم آنکھوں والی اندھی ہو..... سب کچھ سامنے ہوتے ہوئے بھی پوچھ رہی ہو، میں کیا چاہتا ہوں؟'' اس کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی بجری اور ریت مکس کرنے والی مشین میں بیٹھ کر بول رہا ہو۔

''کک..... کیا مطلب؟'' نازیہ کے الفاظ حلق میں ہی اٹکنے لگے کیونکہ شکاری نے اپنے خنجر کا رخ اس کے سینے کی جانب کر دیا تھا۔

''رکو.....'' وہ ہاتھ آگے کرتے ہوئے چلائی لیکن شپاک شپاک کی بھیانک آواز میں اس کی آواز دب کے رہ گئی اور درد کی شدت سے اس کے حلق سے دردناک چیخ نکل گئی۔

''نازی..... نازی میری جان اٹھو..... کیا ہوگیا؟'' گلفام کی آواز جیسے کسی کنویں سے آ رہی تھی لیکن ایک دم ہی اسے ہوش کی وادی میں لے آئی۔

وہ اس وقت کسی برف زار میں بے یار و مددگار کسی قاتل کی مشقِ ستم کا نشانہ ہرگز نہیں تھی بلکہ اپنے نرم و گداز بستر پر موجود تھی۔ گلفام کے ہاتھوں کی سختی وہ اپنے بازوؤں پر محسوس کر سکتی تھی کیونکہ وہ اسے پوری شدت سے جھنجوڑ رہا تھا۔ چند لمحوں تک تو وہ ماحول کی تبدیلی کو سمجھ ہی نہیں پائی پھر آہستہ آہستہ اسے ادراک ہوا کہ وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی تھی۔

''نازی..... تم ٹھیک ہو نا؟'' گلفام کے لہجے میں نرمی تھی لیکن نیند بھری متوحش آنکھیں یہ راز عیاں کر رہی تھیں کہ وہ بھی نازیہ کی کیفیت سے پریشان ہوگیا ہے۔

''ہاں ٹھیک ہوں..... اب تم میرے بازو دبانا بند کر سکتے ہو.....'' اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور ماحول کا تناؤ کم کرنے کی کوشش کی۔

گلفام نے اسے چھوڑ دیا اور اٹھ کر کمرے کی ساری

لائٹس جلا دیں جس سے بیڈروم میں دن کا سماں ہو گیا۔ سائڈ لیمپ وہ نازیہ کو جگانے سے قبل ہی آن کر چکا تھا۔ ماحول کا اندازہ ہوتے ہی نازیہ کے چٹختے اعصاب نارمل ہوتے چلے گئے۔

''کیا ہو گیا تھا جو ایسے بُری طرح چلا رہی تھیں؟'' وہ اس کے سامنے آکر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس دوران وہ اپنی محبوب بیوی کا ہاتھ تھامنا نہیں بھولا تھا۔

''کچھ نہیں...... بس خواب میں ڈر گئی تھی......'' نازیہ نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا، وہ ان خوفناک لمحات کو دوبارہ ہرگز یاد نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''ایسا......'' گلفام کچھ کہتے کہتے رکا اور پھر بولا۔ ''پہلے تو کبھی نہیں ہوا......''

''نہیں...... کبھی بھی نہیں......'' نازیہ نے سوچتے ہوئے جواب دیا لیکن اس دوران نظریں چُرا گئی۔

وہ اتنے سالوں سے ساتھ تھے اور گلفام کو ایک بھی ایسی رات یاد نہ تھی جس میں نازیہ کا ایسا رویہ سامنے آیا ہو۔ وہ اس کی نگاہیں چُرانے کو صرف شرمندگی پر ہی محمول کر پایا۔ اتنے بڑے ادارے کی ڈپٹی ڈائریکٹر اور خواب میں ڈر جائے، یہ سوچ کر ہی ہنسی آجاتی تھی۔

''کیا دیکھا تھا......؟'' وہ اس کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔ پنک کلر کی نائٹی میں نازیہ کی شہابی رنگت دمک رہی تھی اور خوف کا تاثر کم ہونے کے بعد وہ ہمیشہ کی طرح حسن و جمال کا پیکر لگ رہی تھی۔

''مجھے...... یاد نہیں۔'' وہ ایک بار پھر نظریں چُرا گئی۔

اسے اب احساس ہو رہا تھا کہ گلفام اس کی ہر بات کا اعتبار کر رہا ہے اور اس کے انداز میں شک کے بجائے تشویش تھی جو کہ کسی بھی محبت کرنے والے شوہر کا خاصہ ہوتی ہے۔

اس کے ذہن میں برسوں پرانے حادثے کے واقعات چکرانے لگے لیکن اس نے سختی سے اپنی توجہ گلفام کی جانب مبذول کی۔ اگرچہ گلفام بھی اس حادثے سے کماحقہ واقفیت رکھتا تھا لیکن اس وقت وہ یہ پنڈورا بکس کھولنے کے لیے بالکل بھی آمادہ نہیں تھی۔

''کیا بالکل بھی یاد نہیں......؟'' گلفام نے اپنے بازو اس کے گلے میں حمائل کرتے ہوئے کہا تو اس کی شرارت سمجھ گئی۔

''ہاں جی...... بالکل بھی نہیں......'' وہ مسکراتے ہوئے اس کی مضبوط بانہوں میں تقریباً پگھل گئی۔

وہ جانتی تھی کہ گلفام یہ سب اس کی توجہ بٹانے کے لیے کر رہا ہے لیکن وہ اس کا ساتھ دینے پر مجبور تھی کیونکہ وہ خود بھی اس خوف کے تاثر سے نجات چاہتی تھی۔ وہ لاکھ بہادر سہی لیکن تحفظ کا احساس اسے اپنے شوہر کی بانہوں میں ہی ملتا تھا۔ وہ اس کے کندھے سے سر ٹکا کر قریب ہو گئی اور وہ اس کا ہولے ہولے سر تھپتھپاتا رہا یہاں تک کہ وہ خوابوں کی حسین وادیوں میں کھو گئی جہاں کوئی اسے ڈرانے والا موجود نہ تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی یا شاید احساس نہیں کر پائی تھی کہ اس کے بدن میں ابھی تک لرزش جاری تھی۔

☆☆☆

جسم میں کپکپی کی دوڑتی لہروں پر اس نے بمشکل قابو پایا اور دروازے کی سمت بڑھ گیا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ پولیس کا نام سن کر وہ اس قدر خوفزدہ کیوں ہو گیا ہے۔

''کون ہے؟'' اس نے ایک بار پھر سوال کیا۔

''بتایا تو ہے...... پولیس۔'' پھر سے کرخت آواز آئی۔

''کیا چاہیے؟'' وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''کیا آپ ہی جاوید وارثی ہو؟'' ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال پوچھا گیا۔

''ہاں جی......'' مختصر جواب دے کر وہ پھر خاموش ہو گیا لیکن دروازہ کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔

''مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔'' کرخت آواز کی بے تابی بڑھ رہی تھی۔

''کس حوالے سے؟'' وہ اب بھی دروازہ کھولنے پر آمادہ نہ تھا۔

''وارثی صاحب...... دروازہ کھولیں......'' کرخت آواز والے پولیس آفیسر کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ اس بار اس کی آواز میں سختی کے ساتھ ساتھ تحکم کا عنصر بھی تھا۔

جاوید کو اس کے لہجے کا بخوبی اندازہ ہو گیا اس لیے اس نے مزید چون و چرا کیے بغیر دروازے سے منسلک دھاتی زنجیر ہٹائی اور چٹخنی گرا دی۔ مکمل دروازہ کھولے بغیر اس نے باہر جھانکا تو ایک عدد موٹا تازہ پولیس حوالدار عین اس کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ اپنی وردی کے سوئیٹر کے ساتھ ساتھ اس نے اوپر ایک لیدر جیکٹ بھی پہن رکھی تھی جو کہ موسم کی مناسبت سے تھی۔

''آپ جاوید وارثی ہی ہو نا؟'' اس نے اپنی توند سے پھسلتی پتلون کو اوپر کھینچتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں میں ہی ہوں......'' جاوید نے نخوت بھرے لہجے میں کہا۔ اب اس انداز کی وجہ پولیس والے کا نچلے

درجے کا رینک تھا یا اس کا اکیلا ہونا، اس کا اندازہ خود جاوید کو بھی نہیں ہو پایا تھا۔
''میں حوالدار شیر خان ہوں۔'' وہ بولا۔ ''اور تھانیدار صاحب نے مجھے یہاں تفتیش کے لیے بھیجا ہے......''
''کس چیز کی تفتیش کے لیے......؟'' جاوید کا لہجہ مزید اکھڑ ہو گیا۔ بھاری تن و توش کے مالک حوالدار کی غیر متاثر کن شخصیت دیکھ وہ دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ 'دکھتے بھالو جیسے ہیں اور نام شیر رکھ لیتے ہیں......اونہہ۔'
اس کا دل کر رہا تھا کہ دروازہ اس طرح سے بھالو کے منہ پر بند کرے کہ وہ اُڑتا ہوا دور جا گرے لیکن ایک ٹھنڈی آہ خارج کرتے ہوئے وہ بولا۔ ''اندر آ جاؤ...... باہر بہت زیادہ ٹھنڈ ہے......''
وہ اپنی کنپٹیاں ایک بار پھر سے سلگتی ہوئی محسوس کر رہا تھا...... درد پوری شدت کے ساتھ عود آیا تھا۔ اس نے اپنی ہتھیلیوں پر غیر موجود خون کو اپنے ٹراؤزر سے رگڑ کر صاف کرنے کی کوشش کی اور پھر حوالدار کو راستہ دینے کے لیے دروازے کی ایک جانب ہٹ گیا۔
''ہاں اب بتاؤ کس معاملے کی تفتیش کے لیے میری ضرورت پڑ گئی......؟'' وہ مضطرب ہو کر بولا۔
اس نے شیر خان کو چند لمحے دیے کہ وہ مطلب کی بات کرے اور چلا جائے لیکن وہ جس طرح سے گھوم پھر کر مشکوک انداز میں اس کے مختصر کیبن کا جائزہ لے رہا تھا، وہ اس کے لیے باعثِ اضطراب تھا۔
''میں یہاں جنگل کے ساتھ والی چراگاہ میں ہونے والی ہلاکت کی تفتیش کرنے آیا ہوں...... کیا آپ کسی ماریہ بخاری کو جانتے ہیں؟''
اس کا گلا جیسے اندر سے کسی نے بھینچ دیا، سانس بھی رک سی گئی تھی۔ وہ جانتا تھا...... وہ ماریہ کو جانتا تھا...... دماغ کے نہاں خانوں سے کسی ماریہ نامی لڑکی کی صدائیں آ رہی تھیں...... ماریہ یا مائرہ؟ جو بھی تھی، اسے پکار رہی تھی۔ اس کے دماغ پر ایک بار پھر سے دھند چھانے لگی تھی۔ یہ خواب تھا یا حقیقت...... وہ اندازہ کرنے سے ایک بار پھر قاصر تھا۔ سخت سردی میں بھی اس کی حالت ایسی ہو گئی کہ وہ اپنی ریڑھ کی ہڈی پر پسینے کی بوندیں رینگتے ہوئے محسوس کر سکتا تھا۔
''میرا خیال ہے میں اس نام کی کسی خاتون کو نہیں جانتا...... کون ہیں یہ؟'' وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''ہیں نہیں...... تھی۔ اس کی موت واقع ہو چکی ہے...... اسے کسی شکاری خنجر سے بڑی بے رحمی سے مار دیا گیا ہے۔ اس کی بے گور و کفن لاش چراگاہ کی 'کیمپنگ سائٹ' سے کوئی دو کوس کے فاصلے پر ندی کے کنارے سے ملی ہے۔ ایک مقامی نے اس لاش کو پہلی بار دیکھا...... اگر وہ وقت پر نہ پہنچتا تو بھیڑیئے اس کی لاش کو مکمل صفاچٹ کر چکے ہوتے اور ہم بالکل بھی اندازہ نہ لگا پاتے کہ یہ حادثہ نہیں بلکہ قتل ہے۔ وہ دو ماہ قبل آنے والے طوفان کے بعد سے غائب تھی۔''
حوالدار جو اتنی دیر سے خاموش تھا، جب بتانے پر آیا تو پوری تفصیل سے سب بتانے لگا۔ اس دوران اس کی گہری نگاہیں جاوید کے بدلتے تاثرات کا بھی تفصیلاً جائزہ لینے میں مشغول تھیں۔
''مم...... میں نے غیاب کے بارے میں سنا تھا لیکن قتل...... اس بارے میں کوئی خبر نہیں تھی...... کیا قاتل پکڑا گیا؟'' اس نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے سوال کیا۔
''قاتل کی تلاش جاری ہے وارثی صاحب...... ہم لوگ اسی معاملے کی تفتیش کر رہے ہیں اور آپ سے بھرپور تعاون کی امید رکھتے ہیں۔'' حوالدار نے معنی خیز لہجے میں کہا۔
''ہاں...... ہاں کیوں نہیں......'' جاوید تیزی سے تائیدی انداز میں بولا۔ اس کے لہجے کی ساری درشتگی ہوا ہو چکی تھی۔
''آپ کو یہاں رہتے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے وارثی صاحب؟'' حوالدار شیر خان نے اچانک باتوں کا رخ موڑتے ہوئے عام سے انداز میں سوال کیا۔
''تقریباً چھ ماہ پہلے آیا تھا...... مئی میں...... تب یہاں کا موسم بڑا ہی خوشگوار تھا اور سیاحوں کی اکثریت یہاں چراگاہ میں کیمپنگ کے لیے آتی تھی۔ وہ لوگ ندی سے اور جنگل سے شکار بھی کرتے تھے......'' جاوید بتاتے ہوئے شاید چھ ماہ پہلے کے دور میں پہنچ گیا تھا کیونکہ بات کرتے ہوئے وہ دور کہیں خلا میں دیکھنے لگا تھا۔
''تو کیا یہ کیبن خریدا ہے آپ نے...... یہ آپ کی ملکیت ہے؟'' حوالدار نے جاوید کی جھاڑ جھنکار والی داڑھی میں چھپے چہرے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی سلیٹی آنکھوں میں گھورتے ہوئے پوچھا۔
''ارے نہیں...... یہ میرا نہیں ہے۔ میں صرف کرایہ دیتا ہوں...... وہ بھی بڑا معمولی سا۔'' وہ کندھے اُچکاتے

ہوئے بولا۔
''ہمم...... صحیح...... تو کام کہاں کرتے ہو آپ؟''
''میں کام نہیں کرتا...... میں تقریباً چھ سال سے معذور ہوں...... نئی حکومت نے محتاج لوگوں کے لیے کافی کام کیا ہے...... میں اب کمانے کی فکر سے آزاد اپنے علاج پر توجہ دے رہا ہوں۔'' جاوید نے بتایا تو حوالدار اسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔
''معذور...... محتاج......؟ تم تو اچھے بھلے ہٹے کٹے نظر آتے ہو......'' شیر خان سخت لہجے میں بولا۔
''میں پہلے کمراٹ وادی میں تھا، چھ سال پہلے ایک حادثے میں کھائی میں گر گیا تھا۔ میرے سر پر ایسی چوٹ آئی کہ میں اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ وہاں ایک حکیم صاحب کے زیرِ علاج رہا۔ چند ماہ قبل مجھے اپنا ماضی یاد آنے لگا تو حکیم صاحب نے مجھے شہر آ کر رہنے کا کہا۔ میں تو اپنی تمام زندگی ان کی خدمت میں گزار دینا چاہتا تھا لیکن انہوں نے بتایا کہ نئی حکومت نے میرے جیسے ذہنی معذور لوگوں کے لیے بہت سہولت کر دی ہے...... تو میں یہاں چلا آیا...... میرے والدین یہیں رہتے تھے...... لیکن مجھے اب بھی بہت سی باتیں بھول جاتی ہیں...... اور اکثر سر درد کی شکایت بھی رہتی ہے...... میں زیادہ دیر تک یکسوئی کے ساتھ کوئی کام نہیں کر سکتا۔'' جاوید اپنے بارے میں رک رک کر تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔
''سرکار نے بھی عجیب چوچلے پال لیے ہیں......'' شیر خان نے مختصر تبصرہ کیا۔
''میں پوچھ سکتا ہوں کہ میری ذات کے متعلق ان سوالات کا خاتون کے قتل سے کیا لینا دینا ہے؟'' جاوید نے کافی دیر تک شیر خان کو سر دائیں بائیں ہلاتے دیکھ کر آخر کار جھلا کر پوچھا۔
''چھ سال تک وادی کمراٹ میں رہے...... اس سے پہلے کہاں تھے تم؟'' شیر خان نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ غیر محسوس انداز میں آپ سے تم پر آ گیا تھا۔
''میں اس سے قبل ایبٹ آباد یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا...... بتایا تو ہے کہ اس سے پہلے یہیں اسی گاؤں میں میرے والدین رہتے تھے تو میں بھی یہیں پر ہی رہتا تھا۔''
''جو عرصہ تم بتا رہے، اس زمانے میں تو ''قاتل شکاری'' کا بڑا چرچا تھا۔ سنا ہے اس نے ایبٹ آباد میں اس وقت چار عورتوں کو خنجر کے پے در پے وار کر کے قتل کیا تھا۔''
حوالدار شیر خان بولا۔
''ہاں...... مجھے لگتا ہے کہ اس بارے میں کافی کچھ سنا تھا میں نے بھی......'' جاوید کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔
اس کے اندر غصے کا ایک زہریلا ناگ، جو نجانے کب سے کنڈلی مارے سو رہا تھا، پھنکاریں مارتا ہوا بیدار ہونے لگا۔
''ان تمام خواتین کو قتل کرنے کے لیے پچیس بار خنجر گھونپا گیا تھا...... اور ماریہ بخاری کی لاش پر بھی پچیس بار ہی خنجر گھونپنے کے نشانات ہیں......'' شیر خان ایسے بولا جیسے کوئی بہت بڑا انکشاف کر رہا ہو۔
''میرا خیال ہے کہ ہمارے ملک میں جرائم بہت زیادہ ہوتے ہیں اور مجرم اپنے سہولت کاروں کی وجہ سے بچ جاتے ہیں......'' جاوید نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پولیس پر طنز کیا۔ اس کے اندر کا غصہ، اس کے سرخ پڑتے چہرے پر جھلکنے لگا تھا۔
''جاوید وارثی...... کیا تم بتا سکتے ہو کہ اگست کی بیس تاریخ کو تم کہاں تھے؟'' شیر خان نے ایک بار پھر اس کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ وہ اس وقت ایک نہایت کائیاں پولیس والا نظر آ رہا تھا جو تفتیش کے تمام گر بخوبی جانتا ہو۔
''آخر مسئلہ کیا ہے......؟ میں بتا چکا ہوں کہ مجھے واقعات صحیح سے یاد نہیں رہتے ہیں...... دو ماہ پہلے کا ایک دن خصوصی طور پر یاد رکھنا میرے لیے ناممکن ہے۔ ہو سکتا ہے میں اپنے مالک مکان نصیر خان صاحب کے پاس قہوہ پینے چلا گیا ہوں یا پھر شکار پر......'' جاوید کو کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا تھا کہ تفتیش کس جانب رخ کر رہی ہے اس لیے وہ قدرے خوفزدہ انداز میں بولا۔
غصے کا سمندر البتہ اس کے وجود میں ہی کہیں ٹھاٹیں مار رہا تھا۔
''نصیر صاحب کے بیٹے نے کہا ہے کہ تم اس دن ان کے ہاں نہیں آئے بلکہ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ تم اس دن اپنے کیبن کے آس پاس بھی نظر نہیں آئے...... ایسا لگتا ہے کہ اس کی یادداشت بہت اچھی ہے۔''
''پھر میں نہیں جانتا کہ میں دو ماہ پہلے کہاں تھا اور کیا کر رہا تھا......'' جاوید نے ایک بار پھر اپنے ہاتھوں کو ٹراؤزر پر رگڑنے کا عمل شروع کر دیا تھا جیسے ان پر خونی نشانات پھر سے ابھر آئے ہوں۔
''کیا تمہارے پاس کوئی شکاری خنجر ہے؟'' شیر خان نے پوچھا۔
''ہاں ہے...... میں شکار کے بعد جانوروں کی کھال

اتارنے کا کام لیتا ہوں اس سے......'' جاوید اثبات میں بولا لیکن اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اتنا شدید غصہ کیوں محسوس کر رہا ہے۔

''کیا میں دیکھ سکتا ہوں وہ خنجر؟'' شیر خان کا انداز پوچھنے سے زیادہ اب حکم دینے والا ہو گیا تھا۔

جاوید نے ایک نگاہ غلط اس بھاری بھرکم پولیس والے پر ڈالی اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے آہستگی سے الماری کی جانب بڑھ گیا۔

اس کے وجود میں غصے کا طوفان آیا ہوا تھا اور سر کا درد جیسے کن پٹیوں پر ٹھوکریں مار مار کر باہر آنے کی تگ و دو میں مصروف تھا۔ اپنا شکاری خنجر دیکھ کر اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہو گئی۔ خنجر اپنے ہاتھ میں لے کر وہ ایک دم سے خود میں توانائی سی محسوس کرنے لگا تھا۔ تمام تر اندرونی کیفیات کے باوجود اس کے لبوں پر مسکان دوڑ گئی۔ الماری کے پٹ کی اوٹ میں ہونے کی وجہ سے حوالدار شیر خان اس کے بدلتے تاثرات دیکھنے سے قاصر تھا۔ وہ خنجر کو مضبوطی سے تھام کر آہستگی سے مڑ گیا۔

☆☆☆

نازیہ نے پارکنگ سے گاڑی ریورس کی اور دائیں جانب آہستگی سے موڑ کاٹ کر اپنے آفس کی جانب بڑھ گئی۔ وہ ابھی ایک ہائی پروفائل میٹنگ سے فارغ ہوئی تھی۔ آئی جی صاحب نے اسے ایمرجنسی میں کال کیا تھا۔

''نازیہ......فوراً میٹنگ کے لیے پہنچو۔ آج کیسز کی نوعیت کے حوالے سے سی ٹی ایف کی کارکردگی اور دائرہ کار پر خصوصی بات چیت ہونی ہے۔'' انھوں نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں اسے فوراً پہنچنے کا حکم جاری کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ابھی نکلتی ہوں سر......'' وہ یہ کہتے ہوئے سیٹ سے اٹھ گئی۔

اس کی سرکاری گاڑی کا ڈرائیور کسی گھریلو مسئلے میں پھنس گیا تھا اور اسے آنے میں تاخیر تھی اس لیے وہ گلفام کی سفید ٹویوٹا کی چابی لینے پہنچ گئی۔

''کرمانی صاحب...... اپنی گاڑی کی چابی دیں ذرا......'' وہ گلفام کے ورکنگ ڈیسک کے پاس پہنچ کر بولی۔

وہ کمپیوٹر پر اپنے کام میں مصروف تھا، ایک دم ہی چونک گیا۔ سفید لباس کے ساتھ نازیہ کا ہلکے گلابی رنگ کا کام دار دوپٹا ہولے ہولے سے لہرا رہا تھا۔ آنکھوں میں کاجل کے ڈورے پھیرنے کے بعد اس نے صرف ہلکی سی لپ اسٹک لگا رکھی تھی پھر بھی قیامت ڈھا رہی تھی۔ ایک طرف کو بنائے گئے بال سلیقے سے اس کے شانے پر سجے ہوئے تھے جس کی وجہ سے دوسرے کان میں پہنا لمبا سا سنہری آویزہ نمایاں ہو رہا تھا۔ ایک ہاتھ پہلو پر ٹکائے اور دوسرا ہاتھ گلفام کی جانب بڑھائے اس کے چہرے پر بھرپور سنجیدگی تھی لیکن آنکھوں میں دبی شرارت واضح نظر آ رہی تھی۔

''اور اگر میں انکار کر دوں تو......؟'' گلفام نے اسے ایسی محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ نازیہ کی شہابی رنگت مزید دہک اٹھی۔

''تو میں اسے کارِ سرکار میں مداخلت سمجھتے ہوئے دانیال سے کہوں گی کہ وہ آپ کو فی الفور گرفتار کر لے۔'' نازیہ نے دوسرے ڈیسک پر بیٹھے دانیال کو دیکھتے ہوئے تیزی سے کہا جو اُن دونوں کی نوک جھوک سنتے ہوئے خوامخواہ ہی دانت نکال رہا تھا۔

''ظالم دنیا......ظالم باس......آپ کیا جانو کہ ہم آپ کی محبت میں کتنے عرصے سے گرفتار ہیں؟'' گلفام نے اس کے لہجے میں عجلت کا عنصر محسوس کرتے ہوئے چابی نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے نکل آئی لیکن تادیر اس بات پر مسکراتی رہی کہ اس کے مڑنے کے فوراً بعد ہی گلفام نے دانیال کو ایک فائل فولڈر اٹھا کر دے مارا تھا۔

میٹنگ پر وہ وقت سے قبل ہی پہنچ چکی تھی۔ دیر سے آغاز ہونے کے باوجود میٹنگ چار گھنٹے جاری رہی۔ ضمنی اور بیزار کن تفصیلات سے ہٹ کر جب اس کے محکمے کی بات آئی تو اس نے بڑھ چڑھ کر گفتگو میں حصہ لیا۔ اس نے پولیس کے محکمے کے متوازی سی ٹی ایف کے قیام کی افادیت بھرپور طریقے سے بیان کی۔ پولیس کی روایتی تفتیش کے برعکس اس نے اپنے محکمے کے سراغرسانی پر مبنی طریقہ کار پر تفصیلی روشنی ڈالی کہ کس طرح سائنٹفک اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے وہ لوگ ثبوت تلاش کریں گے تاکہ مجرم کے بچ نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہ رہے۔ ان کا کسی بھی واردات پر رسپونس ٹائم بھی لاجواب تھا اور پولیس کے محکمے کے ایسے افسران و کارکنان کی بھرتی کی گئی تھی جو کہ پولیس کے مروجہ اصولوں کے پیروکار بننے کے بجائے دماغ کے استعمال کو ترجیح دیتے تھے۔

وزیر داخلہ کے سیکریٹری بھی موجود تھے۔ کچھ نازیہ کی شعلہ بیانی، بے باک خوبصورتی اور کچھ اس کی ایماندارانہ رائے...... یہ سب مل کر انہیں متاثر کرنے میں کامیاب رہی

تھی۔ انہوں نے آئی جی صاحب سے نا صرف سی ٹی ایف کے قیام پر خوشی کا اظہار کیا بلکہ اس محکمے کی کارکردگی و افادیت کے پیشِ نظر وفاقی دارالحکومت سے ہٹ کر دیگر شہروں میں بھی اس کی ممکنہ شاخیں کھولنے پر تبادلۂ خیال کیا۔

نازیہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس میٹنگ کے بعد سی ٹی ایف کے بجٹ میں بھی خاطر خواہ اضافہ کیا گیا تھا۔ آئی جی صاحب نے بھی میٹنگ کے بعد اسے علیحدہ بلا کر خصوصی تعریف اور مبارکباد پیش کی تھی۔ وہ بھی بہت خوش تھے کہ ایمرجنسی میٹنگ کال ہونے کے باوجود نازیہ کی تیاری و حاضر دماغی نے ان کا سر نیچا نہیں ہونے دیا تھا۔

ون وے روڈ پر وہ اس وقت تیز رفتاری سے اپنی کار دوڑا رہی تھی۔ اس نے ایف ایم ریڈیو آن کر دیا تھا جس پر ایک نئی پاپ سنگر کا سپر ہٹ گانا چل رہا تھا۔

خوشی کی سرشاری تو پہلے سے ہی اس پر طاری تھی تبھی میوزک پر ہلکے ہلکے وہ گاڑی چلانے کے دوران تھر کنے بھی لگی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اُڑتی ہوئی آفس پہنچے اور اپنے تمام کولیگز کو میٹنگ کا احوال سنا سکے۔

اچانک اس کے برابر سے ایک بائیک گزری......

اس پر بیٹھا شخص ہیلمٹ پہنے بغیر نہایت تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ بڑے سائز کے دھوپ کے چشموں نے اس کے چہرے کا بیشتر حصہ چھپا رکھا تھا البتہ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔

نازیہ نے ناگواری سے اس کی جانب دیکھا اور دھک سے رہ گئی۔ اس کے سینے میں سے دل اچھل کر یکلخت جیسے حلق میں آ گیا تھا۔ موٹر سائیکل سوار وہی تھا...... وہی اس کے خواب والا...... 'شکاری'...... جس نے اس کی نیند اُڑا کے رکھ دی تھی۔

وہ یکلخت ہی حواس باختہ ہو گئی تھی' وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ خواب کی صورت دیکھا جانے والا خیال یوں مجسم ہو کر اس کے سامنے آ جائے گا۔ بے خیالی میں اس کے پیر کا دباؤ ایکسلیریٹر پر بڑھتا ہی جا رہا تھا اور وہ اس کی بائیک کا پیچھا کرنے لگی تھی۔ نئے ماڈل کی ٹیوٹا برق رفتاری سے کولتار کی سڑک پر دوڑنے لگی۔

بائیک سوار نازیہ کے اس اقدام سے بے خبر رواں دواں تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ سی ٹی ایف کی ڈپٹی ڈائریکٹر آندھی طوفان کی طرح اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ ان کے درمیان فاصلہ بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔

کھلی سڑک پر بائیک اور سفید ٹیوٹا کی یہ مقابلے بازی جاری تھی کہ ایک دم سے سامنے سے ایک آوارہ کتا آ گیا...... بائیک سوار تو اس سے کنی کترا کر بہ آسانی گزر گیا لیکن نازیہ اس افتاد سے سنبھل نہ سکی۔

اس نے فوراً بریک لگایا اور اسٹیئرنگ ایک جانب گھما دیا۔ وہ شاید گاڑی سنبھال بھی لیتی لیکن رفتار بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے گاڑی بے قابو ہو کر سڑک سے اتر گئی اور دو چار قلابازیاں کھاتی کنارے پر موجود جھاڑیوں میں اٹک گئی۔

'تو وہ 'شکاری' آخر کار مجھے شکار کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔' یہ آخری مایوس کن سوچ تھی جو نازیہ کے دماغ میں ابھری...... اس کے بعد وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی۔

☆☆☆

اتنا زیادہ وزن ڈھو کر نیچے منجمد ندی تک لے جانے کا کام کوئی اپنے ہوش و حواس میں رہ کر نہیں کر سکتا تھا...... اور وہ تو یہ بوجھ عالم مجبوری میں برداشت کر رہا تھا۔ اس نے اپنی مدد آپ کے تحت ایک لکڑی کی سلیڈ بنائی تھی جو کہ کافی پھسلواں تھی۔ اس نے وہ بھاری لاشہ کھینچ کر سلیڈ پر ڈالا اور دھکیلنے لگا۔

نرم برف پر وہ گاڑی نما سلیڈ پھسلنے لگی...... لیکن اپنے پیچھے وہ ایک خونی لہر چھوڑتی جا رہی تھی۔ روئی کے گالوں جیسی وہ دودھیا برف میں ایک سرخ لکیر بہت واضح تھی۔ جب تک وہ ندی کے کنارے پہنچا تب تک پھر سے برف باری شروع ہو چکی تھی۔ اس ہلکی برفباری سے وہ وہ خونی لکیر مدھم پڑنے لگی تھی۔

جاوید نے اپنا شکاری خنجر ایک طرف رکھا اور دوسری تیز نوک والی چھری نکال لی۔ یہ چھری کھال اتارنے میں مددگار ثابت ہوتی تھی۔ وہ نہایت مشاقی سے اپنے شکار کی کھال اتارنے میں محو ہو گیا۔ وہ اردگرد سے بالکل بے بہرہ ہو کر گنگنا رہا تھا۔

''کسی روز ملو...... ہمیں شام ڈھلے......

سن تو لو میری جاں...... دھڑکنوں میں چھپا رکھے ہیں جو گلے......'' اس کی آواز جسامت کے برعکس نا صرف نرم تھی بلکہ اس کو بڑی حد تک خوش گلو بھی کہا جا سکتا تھا۔ ہلکی ہلکی برفباری کی تھپ تھپ کی آواز جیسے پسِ پردہ موسیقی کا کام دے رہی تھی۔

کھال اتارنے کے بعد وہ نہایت صفائی سے گوشت کے ٹکڑے کرنے لگا۔ رحم، مروت اور نرم دلی صرف اس کی

آواز میں ہی محسوس کی جاسکتی تھی...... چہرے پر ان میں سے کسی خوبی کا کوئی عکس موجود نہیں تھا۔ گوشت کے پارچے علیحدہ کرنے کے بعد وہ انہیں پلاسٹک کی تھیلیوں میں ڈالنے لگا جو وہ اپنے ساتھ ہی کیبن سے لایا تھا۔

اپنے کام سے فراغت کے بعد اس نے باقی بچی کھچی لاش کو جھاڑیوں میں پھینک دیا......

''بھیڑیئے باقی کام پورا کردیں گے......'' اس نے سوچا اور اپنے کیبن کی جانب روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے سب سے پہلے پلاسٹک کی تھیلیوں میں موجود گوشت کو خصوصی کنٹینر میں ڈالا۔ پھر کنٹینر کو اچھی طرح سے بند کرنے کے بعد اس نے فریزر میں رکھ دیا جہاں اس جیسے اور بھی کئی کنٹینر پہلے سے موجود تھے۔

''ہک ہا......'' اس کے حلق سے ایک سرد آہ سی نکل گئی۔

اسے یہ مارا ماری بالکل بھی پسند نہیں تھی لیکن اپنی جان کے مقابلے میں وہ کسی اور کو کیسے اہمیت دے سکتا تھا؟ بھیڑیوں کا پیٹ بھر جانے پر البتہ اسے خوشی محسوس ہوتی تھی جیسے کسی غریب بھوکے کو اس نے کھانا کھلایا ہو۔

وہ کچن میں پہنچا اور اپنے شکاری خنجر کو صابن کی مدد سے رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔ اپنے خون آلود کپڑے بھی اس نے سرف ملے پانی میں بھگو دیے تاکہ ان پر کوئی نشان باقی نہ رہ جائے...... اور اس کے بعد وہ خود واش روم میں گھس گیا۔

شاور لیتے ہی سکون جیسے اس کے رگ و پے میں دوڑ گیا۔ شہر سے وہ اکثر گیس سلنڈر بھروا کر رکھ دیتا تھا جو کھانا پکانے اور نہانے کا پانی گرم کرنے میں اس کا بھرپور مددگار ثابت ہوتا تھا۔ ابھی بھی جب دیسی ساختہ گیزر سے پانی کی پھوار اس پر پڑی تو تازگی اس کے روم روم میں دوڑ گئی تھی۔

وہ آرام چاہتا تھا لیکن حوالدار شیر خان کا تصور اس کے ذہن میں آ گیا۔ خون اس کے بدن سے بہہ کر نالی میں جارہا تھا اور وہاں نظریں جمائے وہ خونی خیالات کو ذہن سے نکالنے میں ناکام تھا۔

''نہیں...... نہیں...... آج تو نہیں......'' وہ سر کو تھامتے ہوئے چلّایا۔

اب وہ بار بار اپنے ہاتھوں کو دھو رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ ابھی تک خون آلود ہوں۔

''بیٹا منفی خیالات کو کبھی اپنے دماغ پر سوار نہ ہونے دینا......'' اسے حکیم صاحب کی تنبیہہ یاد آئی تو وہ تیزی سے نہا کر باہر نکل آیا۔

نہانے کے بعد اس کی طبیعت قدرے بہتر ہوگئی تھی اس لیے وہ اپنی خاص جڑی بوٹیوں والی چائے بنا کر آرام کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ کھڑکی سے باہر دیکھنے پر.... اندازہ ہوا کہ مطلع شدید ابر آلود ہو رہا تھا۔ ہلکی برف باری تھم چکی تھی لیکن سرمئی بادل چھٹنے کے بعد کالے سیاہ بادلوں نے ان کی جگہ لے لی تھی۔

''آج تو طوفان آیا ہی آیا......'' اس نے خود کلامی کی۔

''طوفان ہی تو تھا جو تمہاری اور میری زندگی میں آیا تھا......'' زنانہ آواز سن کر وہ چونک اٹھا۔

''مائرہ...... مائرہ...... کیا یہ تم ہو؟'' اس نے آواز دی تو جو خالی کیبن میں گونج اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

وہ تیزی سے اپنی دوا نما چائے پینے لگا۔ مائرہ کی آواز اگرچہ اس کے اپنے دماغ کی ہی کارستانی تھی لیکن وہ بُری طرح سہم گیا تھا۔

☆☆☆

وہ بہت زیادہ ڈر گیا تھا...... کھو دینے کا احساس اتنا شدید تھا کہ وہ حد سے زیادہ حواس باختہ ہو رہا تھا۔ کبھی کلائی میں بندھی گھڑی کو دیکھتا، کبھی اپنے موبائل فون کی اسکرین کو اور کبھی گاڑی کے اسپیڈو میٹر کو...... پر بے چینی تھی کہ کسی طرح بھی کم نہیں ہو رہی تھی۔

اسی اثنا میں اس نے ڈیش بورڈ کھولنے کی کوشش کی تو وہ اپنے ہاتھوں میں ہونے والی لرزش دیکھ کر خود ہی چونک اٹھا۔ اپنی جان کسی بھی معاملے میں جوکھوں میں ڈال دینے والا اپنی محبت کے انجام پر لرزہ براندام تھا۔ یہ محبت انسان کو جہاں ساری دنیا کے مقابل لا کھڑا کرتی ہے وہی محبوب کے دکھ درد، اس کی ذرا سی تکلیف، اس کو کھو دینے کے احساس پر بزدل ترین بھی بنا دیتی ہے۔

نازیہ اس کی پہلی اور آخری محبت تھی...... اس کے ہولناک ایکسیڈنٹ کی اطلاع اس کی سماعتوں پر کسی بم کی طرح ہی گری تھی۔ ایمرجنسی سے آنے والی کال نے اس کے ہوش اُڑا دیے تھے...... اور وہ ایک لمحے کے لیے اپنی ریوالونگ چیئر پر ڈھے سا گیا تھا۔

''کیا ہو گیا؟ خیریت تو ہے؟'' اپنی ٹیبل پر کام میں مصروف دانیال نے اس کی غیر ہوتی حالت پر چونکتے ہوئے کہا۔

''نازی...... نازیہ کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ اُسے سٹی ہاسپٹل لے گئے ہیں...... ایمرجنسی سروس والوں کا فون تھا۔'' ٹوٹتے بکھرتے الفاظ میں گلفام نے بتایا۔

''اوہ......'' دانیال کے منہ سے کچھ اور نہ نکل سکا۔

''معاملہ زیادہ سیریس تو نہیں ہے......'' چند لمحے کی خاموشی کے بعد دانیال نے پوچھا تو گلفام جیسے کسی ٹرانس سے باہر نکل آیا۔

''مجھے چابی دو اپنی گاڑی کی...... میں...... میں ابھی نازی کے پاس پہنچتا ہوں۔'' گلفام کو اچانک ہی احساس ہوا تھا کہ وہاں بیٹھ کر سوگ منانے کے بجائے یہ ہاسپٹل میں پہنچنے کا وقت ہے۔

''میں...... تمہارے ساتھ چلتا ہوں...... بلکہ گاڑی میں ہی ڈرائیو کر لیتا ہوں...... تمہاری ذہنی حالت کافی کشیدہ لگ رہی ہے...... ایسے میں تمہارا ڈرائیو کرنا مناسب نہیں لگتا۔'' دانیال نے نرمی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا جس پر گلفام نے کندھے ڈھلکاتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

گاڑی اس وقت سرپٹ دوڑ رہی تھی اور گلفام کا دل بھی اسی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ دانیال حدِ رفتار سے کچھ زیادہ ہی اسپیڈ کا مظاہرہ کر رہا تھا لیکن گلفام کا دل کر رہا تھا کہ وہ پَر لگا کر...... اسپتال پہنچ جائیں۔

''تم کول ڈاؤن ہو جاؤ......'' دانیال نے اسے ڈرائیونگ کے دوران تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''اللہ نے چاہا تو میڈم بالکل ٹھیک ہوں گی...... تم بس اب ذرا خود کو سنبھالو۔''

گلفام ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔ تسلیاں تو وہ بھی خود کو دے رہا تھا لیکن بے قابو دل کی بے چین دھڑکنوں کو کیسے سنبھالتا جو نازیہ کے نام کی مالا جپنے میں مصروف تھیں۔ دل ہی دل میں وہ پروردگار سے نازیہ کی سلامتی کی کئی بار دعائیں مانگ چکا تھا۔

کوئی پندرہ منٹ بعد دانیال ابھی گاڑی پارک کرنے میں ہی مصروف تھا کہ گلفام دروزہ کھول کر اتر گیا۔

''تم آجاؤ میں اتنی دیر میں ریسپشن سے معلومات حاصل کر لوں۔'' وہ عام پتھریلی روش پر چلنے کے بجائے کیاریاں پھلانگتے ہوئے مین گیٹ کی جانب جاتے ہوئے دانیال سے مخاطب ہوا۔

دانیال اس کی بات پر سر ہلا کر ہی رہ گیا۔ پارکنگ ٹوکن لے کر وہ ہاسپٹل کے مین گیٹ سے ہوتا ہوا استقبالیہ پر پہنچا تو گلفام کو وہیں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

وہ کسی سے معلومات لینے کے بجائے دیوار میں نصب ایک باون انچ کی اسکرین پر نظریں گاڑے ٹھہرا تھا۔ اسکرین پر کوئی نیوز چینل چل رہا تھا جس میں ایک تباہ حال سفید ٹویوٹا دکھائی جا رہی تھی۔ دانیال کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہ ہوئی کہ وہ گلفام کی ہی کار تھی۔ مناظر میں دکھایا جا رہا تھا کہ جھاڑیوں میں سے کس طرح ایک کرین اسے نکال رہی تھی۔ ریسکیو والوں کی گاڑی بھی وہاں پر نظر آ رہی تھی۔

دانیال استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی کی جانب بڑھ گیا جبکہ گلفام کی نگاہیں ابھی تک اسکرین پر ہی گڑی ہوئی تھیں۔

نیوز رپورٹر اپنا مائیک پکڑے سامنے آئی تو گلفام ایل سی ڈی اسکرین کے بالکل قریب پہنچ گیا تا کہ اسے بغور سن سکے...... اس کا دل پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔

☆☆☆

''لاش مل چکی ہے......'' وہ تقریباً چیختے ہوئے کارڈ سے پڑھ کر کیمرا مین سے بول رہی تھی۔ شور اتنا زیادہ تھا کہ وہ اپنے ائرپیس سے کچھ سن ہی نہیں پا رہی تھی۔

''ناظرین یہ بریکنگ نیوز آپ کو سب سے پہلے ہمارا نیوز چینل ہی دے رہا ہے...... ایک لاش مل چکی ہے اور وہ اتنی بُری حالت میں ہے کہ ہم آپ کو وہ مناظر اسکرین پر نہیں دکھا سکتے۔''

روزینہ نامی وہ رپورٹر اپنے بالوں کو سرخی مائل سنہرا رنگ، رنگتی تھی۔ قدرے بے باک حلیے میں وہ واحد مقامی خاتون رپورٹر تھی جس کی وجہ سے وہ بڑے ذوق وشوق سے اسے دیکھا کرتا تھا۔

سرخ لپ اسٹک سے سجے اس کے لال لال ہونٹوں پر یہ خبر سناتے ہوئے لرزش سی طاری تھی...... خبر پڑھتے ہوئے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا شاید اس وجہ سے بھی اس کے ہونٹوں کی لالی کچھ ضرورت سے زیادہ عیاں ہو رہی تھی۔ وہ اسکرین پر اسے دیکھتے ہوئے سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ واقعی خوفزدہ تھی یا اتنی بڑی خبر مل جانے کا جوش اس پر طاری تھا؟

''اس پولیس اہلکار کی لاش ایک مقامی چرواہے کو ملی ہے......'' روزینہ کا خبر دینے کا انداز نہایت پُرجوش تھا لیکن وہ جو اس کی باتیں نیم دلی سے سن رہا تھا، پولیس اہلکار کے بارے میں بولتا سن کر چونک اٹھا اور اپنی آرام کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''اوہ میرے خدا......'' روزینہ اپنے جذبات پر قابو

کھوتے ہوئے بولی۔ ''وہ پولیس اہلکار حوالدار شیر خان تھا......''

اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ حوالدار کو اچھی طرح جانتی ہو۔

''پولیس کی ابتدائی تحقیقات کے مطابق یہ لاش شام چار بجے کے لگ بھگ ملی ہے۔'' وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ ''حوالدار کی لاش کو بھیڑیوں نے کھایا ہے اور بہت کم باقیات ملی ہیں......اگر اس کا شناختی بیج ندی کے قریب ہی نہ ملتا تو یہ لاش ناقابلِ شناخت ہی رہتی......لاش کے ٹکڑے ہو جانے کی وجہ سے اس بات کا ابھی تک تعین نہیں کیا جا سکا کہ یہ کوئی حادثہ تھا یا پھر حوالدار شیر خان کا قتل کیا گیا ہے؟ اسلام آباد سے ایک خصوصی ٹیم بھی معاملے کی تحقیقات کے لیے روانہ کر دی گئی ہے لیکن موسم تیزی سے خراب ہو رہا ہے ناظرین......اگر یہ ٹیم برفباری کے بعد پہنچتی ہے تو تب تک تمام ثبوتوں کا نام و نشان مٹ چکا ہوگا......تازہ ترین اَپ ڈیٹس کے لیے ہمارے ساتھ رہیے گا۔ کیمرا مین شباب خان کے ساتھ میں ہوں روزینہ اچکزئی......''

وہ اسکرین سے غائب ہو چکی تھی اور اس وقت نیوز بریک میں اشتہار چلنے لگے تھے۔ آنکھیں موندے وہ اپنا سر کرسی سے ٹکا کر جھولنے لگا۔ خبریں اس کے حسبِ منشا تھیں......سب کچھ پرفیکٹ چل رہا تھا۔ حوالدار شیر خان کی وجۂ موت سے ابھی تک کوئی بھی واقف نہیں ہو پایا تھا۔

اسے کوئی پکار رہا تھا لیکن اس نے نظر انداز کرنے کو ترجیح دی۔ وہ اپنی کامیابی پر کسی کو دخل اندازی کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے دماغ میں ساری پلاننگ چل رہی تھی کہ اگلا قدم کس طرح سے اٹھانا ہے کہ سب ہی لوگ اُلجھ کر رہ جائیں۔

طوفان کی آمد خوش کن تھی لیکن 'خصوصی ٹیم' کی آمد کا سن کر اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔ اب جو بھی کرنا تھا فوری طور پر ہی کرنا تھا۔ دارالحکومت سے آنے والی ٹیم یقیناً بے وقوفوں کا ٹولا نہیں تھی......ان کو چکر دینے کے لیے اسے اپنی ساری پلاننگ پر سختی سے کاربند رہنا تھا ورنہ وہ ناکام ہو جاتا۔

''نہیں، میں ناکام نہیں ہو سکتا۔'' اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں، شدتِ جذبات سے وہ سرخ انگارے بن چکی تھیں۔

☆☆☆

چہرے پر اُس کے لاکھ طمانیت سہی لیکن آنکھوں کی سرخی چھپائے نہ چھپنے والی بات تھی۔ گلفام نے جب سے نازیہ کو زندہ سلامت دیکھا تھا تب سے ہی اندرونی طور پر بے حد خوش تھا۔

نازیہ اور گلفام کی یہ ملاقات بے حد جذباتی ہو گئی تھی اس لیے دانیال بہانہ بنا کر وہاں سے نکل گیا تاکہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اکیلے وقت گزار سکیں۔

''کتنی بار کہا ہے کہ گاڑی احتیاط سے چلایا کرو......'' گلفام شکایتی لہجے میں بولا۔ ''پر تمہیں تو کسی کی پروا ہی نہیں ہے......''

''پروا تو ہے......لیکن تمہاری ناز برداریاں کر کر کے تنگ آ گئی تھی اس لیے سوچا کہ کچھ عرصے کے لیے اپنا رول بدل لوں......'' سفید چادر والے بستر پر نیم دراز حالت میں بھی وہ شوخ لہجے میں بولی۔

اگرچہ وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ گلفام اس کے اندرونی خلجان سے واقف نہ ہو لیکن وہ اس کی ظاہری حالت پر ہی اتنا فکرمند تھا کہ بات بے بات پھر اس موضوع پر آ جاتا تھا کہ آخر وہ گاڑی اتنی تیز رفتاری سے کیوں چلا رہی تھی؟

ایکسیڈنٹ کافی ہولناک تھا لیکن گلفام کی اس نئی ماڈل کی کار میں حادثے کی صورت میں جدید حفاظتی نظام موجود تھا۔ ایئر بیگز کھل جانے کے سبب وہ کسی بھی سخت چوٹ سے بچ گئی تھی لیکن کار کی قلابازیوں کے دوران اس کا دایاں شانہ دروازے سے رگڑ کھانے کی وجہ سے کافی زیادہ زخمی ہوا تھا۔ ماتھے پر بھی چند خراشیں آئی تھیں لیکن مجموعی طور پر اس کی حالت کافی بہتر تھی۔

''جانے کون سی نیکی کام آ گئی ورنہ ایک بار تو میں بھی ڈر ہی گئی تھی۔'' اس نے گلفام کو چھیڑا جو کہ اس کی ناز برداریوں والی بات پر منہ پھلا کر بیٹھا تھا۔

''تم......تم بہت ظالم ہو......'' وہ پھٹ پڑا۔ ''مجھے ستا کر ہی تمہیں سکون آتا ہے۔ جانتی بھی ہو کہ تمہیں کھونے کا تصور ہی میرے لیے سوہانِ روح بن جاتا ہے لیکن تم باز نہیں آتیں......کسی دن میں اس دنیا سے چلا گیا تو پھر یاد کرتی رہو گی۔''

نازیہ کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔ وہ گلفام کی جذباتیت سے واقف تھی لیکن اس طرح جب اس نے اپنے مرنے کی بات کی تو اسے دھچکا لگا......اسے یہ بات اتنی بُری لگی کہ ایک بار تو وہ خاموش ہی ہو کر رہ گئی۔

وہ گلفام کی محبت سے کہیں زیادہ محبت کی دعوے دار

تھی اور اکثر اوقات اپنی ڈیوٹی کا حوالہ دے کر جدائی کی بات کر جاتی تھی۔ آج اسے یکلخت پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ وہ جب جب اپنے مرنے کی بات کرتی ہوگی، گلفام کو کتنا بُرا لگتا ہوگا۔

''آئی ایم سوری......'' وہ نادم ہوتے ہوئے بولی لیکن اس کی ہلکی سی آواز دبی کی دبی رہ گئی۔

''ارے اتنا شور کیوں کر رہے ہیں آپ......؟'' نازک سی دبلی پتلی ایک ڈاکٹر نے گلفام کے پاس آکر ڈانٹتے ہوئے کہا۔ آپ کو پتا بھی ہے کہ ایسی نازک حالت میں احتیاط کرنی چاہیے۔''

''کک...... کیا مطلب ڈاکٹر؟'' گلفام کو ایسا لگا کہ جیسے اس کے حلق میں کوئی چیز پھنس گئی ہو۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے تو آپ نے کہا تھا کہ مریضہ کو کوئی خطرناک چوٹ نہیں آئی ہے؟ اب...... اب کی رپورٹس کچھ اور کہہ رہی ہیں؟''

وہ ڈاکٹر کے ہاتھ میں موجود نازیہ کی فائل دیکھ کر گھبرا گیا۔

''یہ چوٹ تو ان کو اس حادثے سے قبل ہی پیش آچکی ہے۔'' ڈاکٹر نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ اس کی ذمے داری صرف آپ پر ہی عائد ہوتی ہے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں ڈاکٹر؟'' گلفام کبھی نازیہ کے سرخ پڑتے چہرے اور کبھی ڈاکٹر کے مسکراتے انداز کو دیکھتے ہوئے گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کوئی زیادہ پریشانی والی بات تو نہیں ہے۔''

''ہاہاہا......'' ڈاکٹر اس بار کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''کوئی پریشانی والی بات نہیں ہے...... مجھے ان کا چیک اپ کرتے ہوئے ایک شبہ ہوا تھا جس کی وجہ سے کچھ ٹیسٹ کروا لیے...... رپورٹ ماشاء اللہ سے پازیٹو آئی ہے...... آپ باپ بننے والے ہیں مسٹر گلفام۔''

''سچ...... کیا یہ بات سچ ہے ڈاکٹر؟'' گلفام کی تو یہ خوشخبری سن کر بولتی بند ہوگئی تھی تو نازیہ کے حلق سے بے یقینی کے ساتھ آواز نکلی۔ وہ ڈاکٹر کی چھیڑ چھاڑ کو قدرے سمجھ گئی تھی لیکن اتنے عرصے بعد یہ خوشخبری سن کر اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''بالکل سچ......'' ڈاکٹر نے بھی ان کی خوشی میں شامل ہوتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔ ''اور مسٹر گلفام...... اب آپ اپنی مسز کے ساتھ ایسے سخت انداز میں بات بالکل بھی نہ کیجیے گا جیسے پہلے کر رہے تھے۔ یہ وقت ماں اور بچے کی صحت کے لیے بہت اہم ہوتا ہے...... ماں کو جسمانی کے ساتھ ساتھ ذہنی طور پر بھی صحت مند رہنا چاہیے۔''

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد اس نے انہیں ایک گائنی ڈاکٹر کے کلینک کا ایڈریس دیا تاکہ وہ کیس کو مناسب انداز میں دیکھ سکے اور مبارکباد دیتے ہوئے چلی گئی۔ گلفام اس کی لمبی لہراتی چوٹی کو دیکھتا رہا۔

''لو جی...... بیگم پریگنینٹ ہوئی نہیں اور میاں صاحب ڈاکٹر پر ہی عاشق ہوگئے......'' نازیہ کی آواز سن کر وہ جھینپ گیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں......'' وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ ''وہ ڈاکٹر تو مجھے کوئی فرشتہ معلوم ہو رہی تھی...... چھ سال کے طویل انتظار کے بعد ہمیں یہ خوشخبری ملی ہے...... آئی ایم سو ہیپی...... اور آئی لو یو...... صرف تم سے۔''

نازیہ خود بھی بہت خوش تھی...... لیکن گلفام کے اس طرح واشگاف الفاظ میں ایک بار پھر سے اظہارِ محبت کرنے پر جیسے اس کا دل پگھل کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور اس نے گلفام کو سینے سے لگا لیا۔ صدیوں کا بوجھ سا تھا جو اس کے سینے سے ہٹ گیا تھا۔

☆☆☆

دانیال پر کام کا بوجھ یکلخت ہی بڑھ گیا تھا۔

آفس میں عہدے کے اعتبار سے تو نازیہ کے بعد نمبر ٹو کی حیثیت انسپکٹر داور شاہ کی تھی لیکن فیلڈ میں وہی سیکنڈ باس کی پوزیشن پر فائز تھا۔

دانیال کو اپنا سیکنڈ بنانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نازیہ خود ایکشن میں رہنا پسند کرتی تھی اور ہر ریڈ میں اسے ایک ایسے نائب کی ضرورت تھی جو بلا چون وچرا اس کے احکامات کو بجا لائے اور یہ کام دانیال بہت اچھی طرح کرتا تھا۔

دانیال کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ ٹھنڈے دماغ کا مالک تھا اور جسمانی فٹ نیس کا یہ لیول تھا کہ وہ پولیس کے محکمے کے بجائے کسی خفیہ ادارے کا ایجنٹ لگتا تھا۔ نازیہ کی غیر موجودگی میں بھی وہ اپنا کام پورا کرنے کی بھرپور اہلیت رکھتا تھا۔

نازیہ اور گلفام کی غیر موجودگی میں اسے دونوں کا کام سنبھالنا پڑ رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ داور شاہ کے کیبن میں ایک فائل لے کر موجود تھا جس پر دو گھنٹے کی محنت کے بعد وہ ایک نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔

''سر آپ نے بلایا تھا......'' وہ فائل اس کی میز پر

رکھتے ہوئے تمہید باندھنے لگا۔ نازیہ کے مقابلے میں داور کا رویہ ہمیشہ اپنے جونیئرز سے قدرے درشت رہتا تھا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ پولیس میں عہدہ یکساں ہونے کے باوجود نازیہ کو اس نئے محکمے کا ڈپٹی ڈائریکٹر بنا دیا گیا تھا۔ اپنے تھانے کا ایس ایچ او ہونے کی وجہ سے وہ حکم چلانے کا عادی تھا اور اب ایک عورت کی سرکردگی میں کام کرتے ہوئے وہ جھجک کا شکار تھا۔

محکمے کا انچارج بننے میں نازیہ کرمانی کی قابلیت تو شامل تھی ہی لیکن اسکاٹ لینڈ یارڈ سے چھ ماہ کی خصوصی تربیت حاصل کرنے کے بعد کوئی اس سے زیادہ موزوں فرد اس پوسٹ کے لیے نہیں رہا تھا۔ عورت ہونے کے باوجود جتنی تیزی سے اس نے اپنے حصے کا کام سنبھالا تھا، وہ داور شاہ جیسے مردوں کی انا پر سخت ضرب لگاتا تھا۔ نازیہ کی کارکردگی اتنی شاندار جارہی تھی کہ اس کو ڈی ایس پی کا عہدہ تفویض کیے جانے کی باتیں گردش میں تھیں...... اور یہ سب داور شاہ کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا جارہا تھا۔

''رہنے دو اس کیس کو......'' داور شاہ نے ایک ہاتھ کے اشارے سے فائل کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''ایک انتہائی ہائی پروفائل کیس ہے...... 'قاتل شکاری' کا...... آج سے چھ سال قبل اس کا بڑا چرچا رہا ہے...... اس کی تمام تفصیل نکالو...... ایبٹ آباد کے ایک نواحی علاقے میں کچھ اس طرز کی وارداتیں رپورٹ ہو رہی ہیں، اس پر فوری کام کرنا ہے...... شاید وہ 'سیریل کلر' لوٹ آیا ہے۔''

''جی سر میں ابھی فائل لے کر آیا......'' دانیال نے اس کے جوشیلے انداز پر اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا اور اپنی کرسی سے اٹھ گیا۔ نازیہ کی غیر موجودگی میں داور کو باس بن کر آرڈر دینے میں بڑا مزہ آتا تھا اور یہ بات آفس میں سب لوگ ہی جانتے تھے۔

''بلکہ رکو...... بیٹھو یہاں...... فائل لانے کی ضرورت نہیں ہے...... خود ہی اسے پڑھ لو......'' داور نے فوراً ہی اسے رکنے کا کہا اور وہ بیٹھ گیا۔ ''ایسا کرو کہ اے ایس آئی شہباز کو بھی اپنے ساتھ شامل کرلو...... شاید تم دونوں کو فوری طور پر فیلڈ میں بھی بھیجنا پڑے۔''

''ضرور سر......'' دانیال نے مستعدی سے جواب دیا۔ ''لیکن کیا آپ نازیہ میڈم کی طرح خود فیلڈ میں کام نہیں کریں گے؟''

''نری بے وقوف......'' داور کہتے کہتے رک گیا۔ ''نری بے وقوفی کی بات ہوگی یہ کہ یہاں آفس میں کوئی سرکردہ بندہ معاملات کی جانچ کے لیے نہ رہے...... نازیہ کی واپسی کا ابھی ہمیں کوئی اندازہ نہیں...... میں بھی چلا گیا تو سی ٹی ایف کو کون چلائے گا؟''

''جی سر...... ٹھیک ہے سر...... میں ابھی آپ کے احکامات پر عمل کرتا ہوں۔'' دانیال نے کھٹاک سے ایڑیاں بجائیں کیونکہ ایسا کرنے سے داور شاہ کا چہرہ کھِل اٹھتا تھا۔

اس سے پہلے کہ داور شاہ اپنا دماغ بدل کر پھر اسے روکتا، وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے آفس سے نکل آیا۔

☆☆☆

وہ نہایت تیزی سے قدم چلا رہا تھا لیکن نازیہ کا ساتھ دینا اس کے بس کی بات ہی نہیں تھی۔ وہ کسی ہرنی جیسی سبک خرامی سے درگاہ کی سیڑھیاں چڑھتی جارہی تھی۔ آخر اس کی ہمت جواب دے گئی تو وہ وہیں سیڑھیوں کی سائڈ پر بنے ایک قدمچے پر بیٹھ گیا۔

''تھک گئے ہو کیا مسٹر ہسبینڈ؟'' نازیہ کی کھنکتی ہوئی آواز اسے سنائی دی۔ وہ گلفام سے کوئی دس پندرہ سیڑھیاں اوپر تھی اور آگے بڑھنے کے بجائے وہیں رک کر اس کا انتظار کرنے لگی۔

''آخر فوری طور پر یہاں حاضری کی کیا ضرورت تھی...... ہم پہلے اپنے آبائی گھر جا کر کچھ دیر آرام بھی تو کر سکتے تھے؟'' چند منٹ کے وقفے کے بعد وہ ٹہلتا ہوا نازیہ کے برابر پہنچا تو بھناتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''نیکی کے کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔'' نازیہ اپنے بازو کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ٹھنڈ کے باعث وہ خود کو قدرے بے آرام محسوس کر رہی تھی۔

اسپتال سے فارغ ہوئے اُسے چار روز ہو چکے تھے اور وہ گلفام کے ساتھ اپنے آبائی علاقے میں آئی ہوئی تھی۔ اولاد کے لیے اس نے بھی ابتدا میں کئی منتیں مانگی تھیں لیکن پھر گلفام کی ناراضگی کے پیشِ نظر یہ کام بند کر دیے تھے۔ اب بھی وہ اپنی ایک منت اتارنے کے لیے ضد کر کے پہلے گلفام کو درگاہ پر لے آئی تھی کیونکہ اسے پورا یقین تھا کہ گھر پہنچنے کے بعد وہ اسے کبھی یہاں نہ لاتا۔

نازیہ نے اس کی ہیئت کذائی کو دیکھتے ہوئے تیزی سے اپنا کام نمٹایا اور درگاہ کے مجاور کو پلاؤ کی دیگوں کے پیسے دینے کے بعد واپسی کے لیے روانہ ہوگئے۔

یہ خوبصورت پہاڑی علاقہ تھا لیکن اس وقت برف کی سفید چادر نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ پُرپیچ اور چکردار راستوں سے گھومتے ہوئے وہ اپنے آبائی مکان پر

پہنچے تو سہ پہر سے شام ہوگئی اور وہ بہت تھک چکے تھے۔

گلفام کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور ایک رشتے کے غریب چچا کو اس نے اپنا مکان سپرد کر دیا تھا تاکہ ان کی رہنے کی مشکل بھی حل ہوسکے اور ساتھ ساتھ گلفام کے گھر کی حفاظت بھی ہوتی رہے۔

نازیہ کے والدین اپنا سب کچھ بیچ کر شہر میں ہی منتقل ہو چکے تھے۔ اپنے کمرے میں پہنچنے کے بعد وہ دونوں بستر پر ڈھے سے گئے۔ جیپ پر چھ گھنٹے کے طویل سفر نے ان کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔

''گلفام......'' نازیہ کہتے کہتے یوں رکی جیسے مناسب الفاظ کا چناؤ کرنے میں اسے مشکل پیش آرہی ہو۔ ''اگر فیلڈ میں کام کرنا ہے تو ذرا اپنی فٹنس پر توجہ دو...... تم اسی پہاڑی علاقے کے رہنے والے ہو اور دیکھو کہ چند سالوں کی آرام پرستی نے تمہارا کیا حال کر دیا ہے کہ ایک چھوٹی سی ایسی پہاڑی بھی نہیں چڑھ پا رہے تھے جس پر سیڑھیاں بھی بنی ہوئی ہیں۔''

''میں...... میں خود بھی انہی خطوط پر سوچ رہا تھا۔'' گلفام نے ہچکچاتے ہوئے اقرار کیا۔ اسے کبھی بھی حق بات کو تسلیم کرنے میں عار نہیں ہوتا تھا چاہے اس میں اس کی ذات ہی کیوں نہ لپیٹ میں آرہی ہو۔

یہ حقیقت تھی کہ گلفام اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔ پولیس میں رہنے کے باوجود وہ بہت سست ہوگیا تھا اور بھاگ دوڑ کا کام کرتے ہوئے اس کی سانس پھول جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ نازیہ فیلڈ میں اس کے بجائے دانیال کو ساتھ رکھنے کی کوشش کرتی تھی اور اسے داور شاہ جیسے بدمزاج بندے کے حوالے کر دیا تھا۔

حال ہی میں نازیہ کو پیش آنے والے حادثے اور اس کے بعد نازیہ کی پھرتیاں دیکھنے کے بعد ایک بات کا تو اسے یقین ہوگیا تھا کہ نازیہ کسی صورت نچلی بیٹھنے والی نہیں ہے اور ہمیشہ فرنٹ لائن پر ہی آکر کام کرے گی۔ اب اپنی اولاد کو مقدم جانتے ہوئے وہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ نازیہ سے کہہ کر اس کے ساتھ ہی فیلڈ میں رہا کرے گا۔ ایسا نہیں تھا کہ نازیہ اپنی حفاظت کرنا نہیں جانتی تھی۔ بس یہ اس کی پدرانہ محبت کا تقاضا تھا کہ وہ اب نازیہ کو ایسی پُرخطر راہوں میں اکیلے سفر نہیں کرنے دینا چاہتا تھا بلکہ اس کا ہم سفر بن کر رہنے کا خواہش مند ہوگیا تھا۔

''واقعی......؟'' نازیہ اس کی بات سن کر کھل اٹھی۔ ''کیا تم باقاعدگی سے فٹنس ٹریننگ شروع کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہو؟''

''ہاں بالکل......'' وہ بستر پر اس کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔ ''اب تو تم سے ایک پل کی جدائی بھی برداشت نہیں ہوگی۔''

اس کے محبت پاش لہجے پر نازیہ پگھل کر رہ گئی۔ وہ جذباتی ریلے میں بہہ ہی جاتے کہ نازیہ کا سیل فون گنگنانے لگا۔

''یہ کس کو موت پڑ گئی؟'' گلفام نے ناگواری سے کہا۔

نازیہ نے سرہانے رکھے فون کو اٹھا کر اسکرین کو دیکھا تو چونک گئی کیونکہ اس پر داور شاہ کا نام لہرا رہا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''داور کی کال ہے......'' اس نے گلفام کو بتایا اور فون کی ٹچ اسکرین کو لیس میں سلائڈ کر کے کال ریسیو کر لی۔ ''نازیہ کرمانی اسپیکنگ۔''

''السلام علیکم میڈم...... معذرت چاہتا ہوں کہ اس پہر آپ کو تکلیف دی......'' داور شاہ نے کہنا شروع کیا لیکن نازیہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''وعلیکم السلام...... داور صاحب یقیناً کوئی اہم کام ہی ہوگا تو آپ نے کال کی ہے۔ تمہید رہنے دیں اور مسئلہ بتائیں۔ کیا اسلام آباد واپس آنا ہے؟''

''نہیں...... یہاں کے معاملات میں دیکھ رہا ہوں...... مسئلہ وہاں آس پاس ہی ہے جہاں آپ اس وقت موجود ہیں۔''

''تفصیل سے بتاؤ۔'' نازیہ بیڈ سے اٹھ کر کھڑکی کی جانب چلی گئی تو گلفام نے بھی منہ بنایا اور چائے کھانے وغیرہ کا کہنے کے لیے باہر چلا گیا۔ اسے یہ بے وقت کی راگنی بالکل بھی پسند نہیں تھی...... لیکن نازیہ کے عہدے کے پیش نظر وہ سمجھ سکتا تھا کہ کسی بھی وقت کوئی ایمرجنسی ہوسکتی ہے۔

جب وہ ٹرالی میں کھانے کا سامان اور چائے کافی تیار کرنے والی چیزیں لے کر آیا تو نازیہ سراسیمہ سی بیڈ پر بیٹھی تھی۔

''کیا ہوا؟'' وہ اس کی حالت دیکھ کر پوچھ اٹھا۔

''ایک سیریل کلر کی علاقے میں موجودگی کے امکانات ہیں...... ہمارا کیس ٹاسک ہے کہ اس پورے علاقے کی اسکاؤٹنگ کریں اور ابتدائی اندازہ قائم کر کے بیک اپ کے لیے کال کرلیں۔''

''ہم...... یعنی چھٹیاں کینسل اور کام شروع۔''

گلفام نے کندھے اُچکاتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں کہا جیسے کوئی بڑی بات نہ ہو اور اپنے لیے کافی مگ میں انڈیلنے لگا۔ کمرا کافی کی اشتہا انگیز خوشبو سے ایک دم ہی مہکنے لگا۔

''پوچھو گے نہیں...... کس 'سیریل کلر' کی بات ہو رہی ہے؟'' نازیہ نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ اس نے ابھی تک کھانے پینے کی کسی چیز کی جانب توجہ دینے کی زحمت نہیں کی تھی۔

''کس کی؟'' وہ چسکی لیتے ہوئے بولا۔

''قاتل شکاری کی......''

''کیا...... ؟'' گلفام کو ایک ٹھسکا سا لگا تھا اور کافی اس کے منہ سے پھوار کی صورت باہر آئی تھی۔

☆☆☆

اُس کے چہرے پر ٹھنڈی پھوار پڑی تو وہ چونک کر رہ گیا۔ یہ پھوار اکیلی نہیں آئی تھی بلکہ اپنے ساتھ ایک اور تحفہ بھی لائی تھی۔

''ٹھا......'' ابھی وہ سنبھل ہی نہیں پایا تھا کہ ایک پانی والا غبارہ اس کے سر پر آ کر پھٹ گیا۔

سخت ٹھنڈ میں پانی سے بھیگ کر اس کی حالت دیدنی ہو گئی تھی۔ بال بھیگ گئے تھے اور پانی اس کے سر سے ہوتا ہوا کپڑوں کو بھگو رہا تھا۔ اس نے غصے سے اپنے نشانہ باز کی جانب دیکھا اور جیسے اس کے غیظ و غضب پر بھی گھڑوں پانی پڑ گیا۔

مائرہ اپنی سہیلیوں نازیہ، روبینہ اور ذکیہ کے ساتھ کھڑے قہقہے لگا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ابھی بھی چند غبارے موجود تھے جن میں یقیناً پانی بھرا تھا۔ گلفام، قدیر اور جواد بھی فلک شگاف قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ بھی پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے ان کے برابر پہنچ گیا مبادا مزید غباروں کی مار اور پانی کی بھرمار اس پر پڑ جائے۔

''شرم کرو...... اب مجھے ہاسٹل جا کر چینج کرنا پڑے گا ورنہ میں تو ٹھٹھر کر ہی مر جاؤں گا'' اس نے دوستوں کے گروپ کے پاس آ کر انہیں شرم دلانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں...... جا کر چینج کر لو...... یہ نہ ہو محبت میں مرنے کے بجائے سردی سے مر جاؤ۔'' نازیہ نے کھلکھلاتے ہوئے کہا۔

''نازی کی بچی......'' وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔ ''مجھے پورا یقین ہے کہ یہ تمہاری شرارت ہے۔''

ہاہاہا...... قسم لے لو جو میں نے کچھ کیا ہو......؟'' نازیہ اس کے مصنوعی غصے کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔ ''میں نے تو بس اتنا کہا تھا مائرہ سے کہ اگر اس سوچتے فلسفی پر پانی کا غبارہ پھینک دو تو آج کا ڈنر میری طرف سے۔''

سب ہی جانتے تھے کہ مائرہ کی کسی بات کا جاوید بُرا مان ہی نہیں سکتا اس لیے اپنی ہر شرارت اس کے کھاتے میں ڈال کر تماشا دیکھتے تھے۔ مائرہ بھی کسی بات کا انکار یا اقرار نہیں کرتی تھی بس جاوید کی حالت دیکھ کر چپکے چپکے مسکراتی رہتی تھی۔

''ارے واہ...... یونیورسٹی کا ٹائم تو ختم ہی ہونے والا ہے...... تو چلیں پھر کبابش پر؟'' گلفام نے سوال کم اور اعلان زیادہ کرتے ہوئے کہا۔

''نہ بابا نہ...... میں تو نہیں جانے والی۔'' روبینہ نے ہاتھ کھڑے کرتے ہوئے کہا۔

''کیوں تم بھی 'قاتل شکاری' کی افواہوں سے خوفزدہ ہو؟'' مائرہ نے اپنی کاجل بھری بڑی بڑی آنکھوں میں سارے جہان کی حیرت سموتے ہوئے پوچھا۔

''یہ افواہیں نہیں ہیں...... شہر میں واقعی ایسا کوئی قاتل موجود ہے...... بس ہم تک پراپر اطلاعات نہیں پہنچ رہیں تاکہ یونیورسٹی میں ہراس کی فضا نہ قائم ہو جائے۔'' جواد نے اپنی معلومات جھاڑیں۔

''اللہ میری توبہ...... میں تو پھر کہیں نہیں جا رہی بلکہ میں تو سوچ رہی ہوں کہ اگلے ہفتے جانے والے تفریحی ٹور سے بھی اپنا نام کینسل کرا دوں۔'' روبینہ تو خوفزدہ تھی ہی اُن کی باتیں سن کر ذکیہ نے بھی اعلان کر دیا۔

''ہاں جی...... تاکہ ہم سب یہاں سے دور ہوں اور وہ شکاری آ کر تمہارے جسم میں خنجر سے سوراخ کر جائے۔'' نازیہ نے اس کو اپنے مطلب کے لیے مزید ڈرایا۔

''اُف...... اب کیا کروں؟'' ذکیہ نے سر پکڑتے ہوئے کہا۔

''فی الحال تو ابھی کا سوچو......'' گلفام نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم لوگ اگر ساتھ رہیں گے تو کوئی مائی کا لال ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا...... اور جب میں پولیس میں جاؤں گا تو اس قاتل شکاری کو میں ہی پکڑوں گا...... بہت چالاک ہے یہ اور ہماری پولیس کے بس کا روگ تو لگتا ہی نہیں ہے۔''

تم نے بھی تو پولیس فورس میں جا کر ''ہماری پولیس'' بن جانا ہے...... میں بتا رہی ہوں نازی اگر یہ موٹا ہو جائے تو بے شک اسے چھوڑ کر کسی سلم اسمارٹ سے شادی کر لینا......''

مائرہ نے نازیہ کو گلفام سے خبردار کرتے ہوئے کہا۔
''ہاں ہاں...... میں ہوں نا......'' جواد نے سینہ چوڑا کرتے ہوئے کہا۔
اس بات پر فلک شگاف قہقہے پڑے کیونکہ جواد کا نا صرف قد چھوٹا تھا بلکہ وزن زیادہ ہونے کے سبب وہ ان دوستوں کے گروپ کا ''گول گپا'' بھی مشہور تھا۔
''چل میرے بھائی...... یہ تو سارا دن ایسے ہی باتیں کرتے رہیں گے۔'' گلفام نے جاوید سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''کہیں تجھے ٹھنڈ پانی جانے سے پہلے ہی ٹھنڈ نہ لگ جائے...... اور کمراٹ ویلی میں تو ڈبل نمونیا کے مزے لیتا ہوا بالکل ہی ویلا رہے۔''
''واہ بھئی واہ...... شکل اس کی قدیر سے ملتی اور بھائی تو بنا پھرتا ہے اس کا......؟'' جواد نے ٹکڑا لگایا۔
گلفام واقعی جاوید کا خیال رکھتا تھا۔ وہ اسے ہاسٹل لے گیا۔ پھر اچانک ہی منظر بدل گیا تھا۔ خوشیوں بھری محفل کو کسی بدخواہ کی نظر لگ گئی تھی جہاں پہلے خوشیاں قہقہے لگاتی تھیں وہاں اب غم والم کی برسات کا عالم تھا۔
اس کی آنکھ ایک پہاڑی کھوہ میں کھلی تھی۔ اس کے ہاتھ خون آلود ہو رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی مائرہ پڑی تھی جس کا جسم زخم زخم ہو رہا تھا۔
''کک...... کیا ہوا؟'' اس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ غار میں روشنی صرف دہانے سے ہی آ رہی تھی اور یہ دیکھنے کے لیے ناکافی تھی۔
مائرہ کا کوئی جواب نہ آنے پر اس نے اسے جھنجوڑ ڈالنے کی کوشش کی تو اس کا سرد بدن ڈھلک سا گیا۔ وہ کانپ کر رہ گیا کیونکہ مائرہ کی بے نور آنکھیں اور سرد وجود یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی۔
اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تو چکرا کر رہ گیا۔
اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے دہانے کی جانب بڑھا۔
''کوئی ہے......؟'' اس نے صدا لگائی۔ اپنی ہی آواز کی بازگشت اسے سنائی دی تھی۔ کوئی نہیں تھا جو اسے پلٹ کر جواب دیتا۔
''پلیز کوئی میری مدد کرو......'' اس نے دہانے کے پاس پہنچ کر آواز لگائی لیکن وہ اتنی اونچی نہیں تھی کہ اسے کوئی سن پاتا۔ اس کے بدن سے توانائی جیسے کسی نے نچوڑ لی تھی۔
''جاوید...... کہاں ہو؟''
باہر سے آتی چند آوازوں نے اس کا حوصلہ مہمیز کر دیا تھا۔ وہ باہر نکلا تو اسے اپنے دوست کافی فاصلے پر نظر آئے۔
''میں یہاں ہوں......'' وہ اپنی پوری ہمت مجتمع کر کے چلایا۔
غالباً یہ گلفام ہی تھا جس نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ تیزی سے دوڑتا ہوا اس کی جانب آ رہا تھا۔
''رکو...... وہیں رکو۔'' شاید وہ چیخ کر یہی کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جاوید نے ایک قدم آگے بڑھایا اور پھر جیسے اس کے قدموں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔ وہ ایک کھائی کے کگر پر تھا لیکن نیچے دیکھنے کے بجائے اس کی توجہ اپنے دوستوں کی جانب تھی۔ گلفام کی بات کو نظرانداز کر کے وہ لڑھکتا ہی چلا گیا تھا۔ کسی اندھی کھائی میں...... یا پھر موت کی وادی میں۔
وہ ایک جھٹکے سے بیدار ہو گیا۔ آج کے خواب نے ماضی کی بہت سی دھند صاف کر دی تھی...... سخت سردی میں بھی اس کا بدن پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔

☆☆☆

اُس کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ آنسوؤں کے ساتھ ساتھ غم بھی جیسے اس کے چہرے سے ٹپک رہا تھا۔
''مار ڈالا ظالم نے...... میرے بابا کو بھی مار ڈالا'' قدیر خان سسکتے ہوئے بولا۔
قاتل شکاری کا اگلا شکار کوئی اور نہیں بلکہ علاقے کی معزز شخصیت نصیر خان تھا۔ اس کی لاش کو بھی بھیڑیوں نے بھنبھوڑنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے بیٹے قدیر خان کی بروقت مداخلت نے انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔
''ارے میرا باپ تو چلنے پھرنے سے بھی عاجز تھا...... پھر کیوں یہ ظلم کر ڈالا؟'' قدیر کسی نوعمر بچے کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اس نے سر پر گرم اونی ٹوپی اوڑھ رکھی تھی اور جسم پر قیمتی لیدر جیکٹ موجود تھی۔
گلفام نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ کچھ دیر تک وہ ایسے ہی اسے بھینچے رکھا تاکہ وہ رو کر اپنے دل کا سارا غبار نکال سکے۔
نازیہ اور گلفام اپنی تفتیش کرتے پھر رہے تھے کہ نصیر خان والے واقعے کی رپورٹ انہیں ملی۔ قدیر نے چونک کر بروقت مداخلت کر لی تھی اس لیے ابتدائی تفتیش سے ہی یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ نصیر خان کو کسی تیز دھار خنجر کی مدد سے زخمی کر کے ہلاک کیا گیا ہے۔ قدیر نے پوسٹ مارٹم کرانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اپنے باپ کی لاش کی مزید بے حرمتی برداشت کرنے پر قطعاً تیار نہیں تھا۔

نصیر خان پہلے ہی ایک ٹانگ سے معذور تھا پھر ایک اور حادثے میں جب اپنی دوسری ٹانگ تڑوا کر مستقل طور پر ہی بستر پر لیٹ گیا تو قدیر کو اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ ویسے بھی قدیر کا اپنے والد کے سوا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ وہ ایسے موقع پر منہ پھیر لیتا تو اس کے باپ کا کوئی پُرسانِ حال نہ رہتا۔ یونیورسٹی کے سبھی دوستوں نے قدیر کی اس قربانی کو سراہا تھا اور ہمیشہ والدین کی عزت کے حوالے سے بات ہونے پر اس کا حوالہ دیا کرتے تھے۔

آج نصیر خان کی موت کو چوتھا دن تھا۔ تدفین و دیگر رسومات وغیرہ کی ادائیگی کے بعد بیشتر لوگ جا چکے تھے۔ گلفام اور نازیہ تفتیش کی غرض سے آئے تھے لیکن قدیر پرانے دوستوں کی صورت دیکھ کر خود پر قابو نہ رکھ پایا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

''اللہ اُن کے درجات بلند کرے...... آمین۔'' دعائے مغفرت کے بعد گلفام نے کہا۔

نازیہ چپ کر کے ایک جانب بیٹھی ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ اس طرح کی جذباتی صورتِ حال میں وہ ہونق سی ہو جاتی تھی...... ویسے بھی اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ فی الحال تعزیت کرے یا تفتیش؟ بالآخر اس نے سکون کا سانس لیا جب گلفام نے پہلا سوال کیا۔

''کیا تمہیں کسی پر شک ہے؟''

''نہیں...... بابا کی بھلا کسی سے کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔'' قدیر نے چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''پھر بھی اگر کسی پر کوئی شک ہو تو بتا دو......'' گلفام اپنے مروجہ طریقہ کار سے ہٹ کر روایتی سوالات کر رہا تھا تاکہ قدیر کو اپنے ڈھب پر لا سکے۔

''نہیں...... ایسا تو کوئی بھی نہیں ہے۔'' جواب میں قدیر نے سر کو انکار میں ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں یہ کسی سیریل کلر کی باتیں سننے میں آرہی ہیں آج کل۔''

''پچھلے کچھ عرصہ میں کوئی غیر معمولی بات یا شخص علاقے میں نظر آیا ہو؟''

''نہیں ایسا بھی نہیں ہے......'' قدیر نے ایک بار پھر انکار میں جواب دیا تو گلفام کے چہرے پر قدرے ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔

''قدیر...... تمہارے بابا چل پھر نہیں سکتے تھے...... پھر اُن کی مدد کے لیے کیا تم ہر وقت ہی پاس رہتے تھے؟ کوئی کام دھندا نہیں کرتے تھے؟ میں آمدنی اور خرچے کے حوالے سے پوچھنا چاہ رہی تھی۔'' نازیہ نے سوال کیا...... وہ اس کیبن کی تزئین و آرائش سے کافی متاثر نظر آتی تھی۔ یہ نا صرف علاقے کے تمام کیبن سے بڑا تھا بلکہ اندر سے پارٹیشن بھی موجود تھیں جو کہ اسے تین چار کمروں والے گھر کی حیثیت دیتی تھیں۔

خواب گاہ، طعام گاہ اور نشست گاہ علیحدہ علیحدہ تھیں۔

وہ اس وقت نشست گاہ میں براجمان تھے جہاں صوفوں پر مخمل کے پوش چڑھے ہوئے تھے۔ سامنے ایک ایل سی ڈی اسکرین بھی نصب تھی جس کے ساتھ ڈش کا کنیکشن وہ دیکھ سکتی تھی۔ علاقے میں کیبل ابھی نہیں پہنچی تھی لیکن فی الواقع اس کا جدید ترین متبادل اس کیبن میں موجود تھا۔

''یہاں علاقے میں آدھی سے زائد زمینیں ہماری ہی ہیں۔ ایک اخروٹ کے باغ میں بھی حصہ ہے جس سے معقول سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔ پھر کام دھندے کی کیا ضرورت ہے؟'' قدیر کے لہجے میں یہ سب بتاتے ہوئے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک کروفر سا آ گیا تھا جسے نازیہ کے ساتھ ساتھ گلفام نے بھی محسوس کیا تھا۔

''اور سوال کے دوسرے حصے کا جواب؟'' گلفام نے پوچھا۔

''کون سا دوسرا حصہ......؟''

''یہی کہ پھر تمہارے بابا کا خیال کون رکھتا تھا؟''

''میں ہی رکھتا تھا...... ان کو پسند نہیں تھا کہ کوئی ملازم ان کے کام کرے۔ جھاڑ پونچھ اور کھانا پکانے کے لیے ایک جز وقتی ملازمہ تو آتی ہی ہے لیکن بابا کے سارے ذاتی کام مجھے اپنے ہاتھ سے ہی کرنے پڑتے تھے۔'' قدیر نے بتایا۔

''پھر تو تمہیں اپنا بیشتر وقت ان کے ساتھ ہی گزارنا پڑتا ہوگا؟'' نازیہ نے پوچھا۔

''ہاں پہلے پہل تو بابا کے دوست وغیرہ آتے تھے لیکن پھر ان میں سے کچھ مر کھپ گئے اور کچھ اتنے بوڑھے ہو گئے کہ یہاں آ ہی نہیں پاتے تھے...... مجھے اپنا سارا وقت ہی بابا کے کاموں میں گزارنا پڑتا تھا لیکن خدا کا کرنا ہوا کہ جاوید واپس آ گیا۔ بابا اس سے بھی ویسی ہی محبت کرتے تھے جیسی مجھ سے، اس لیے اسے ایک کیبن برائے نام کرائے پر دے دیا۔ اب وہ جب بھی آتا ہے تو مجھے کچھ وقت اپنے لیے گزارنے کا موقع مل جاتا ہے۔'' قدیر اپنی ہی دُھن میں بولے جا رہا تھا جبکہ گلفام اور نازیہ شدید حیرت کے باعث ایک دوسرے کو منہ کھولے دیکھ رہے تھے۔

''کک...... کس جاوید کی بات کر رہے ہو تم؟'' نازیہ

نے پوچھا تو اس کے لبوں پر الفاظ لرز گئے تھے۔
''ارے وہی اپنا جاوید وارثی...... جو کہ کمراٹ والے ٹرپ میں کھائی میں جا گرا تھا اور ہم سب اسے مردہ سمجھ بیٹھے تھے۔ وہ مرا نہیں تھا...... وہیں کہیں کسی بوڑھے کو مل گیا تھا، سر پر لگنے والی چوٹ کے سبب اسے سب بھول گیا تھا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے یادداشت بہتر ہوئی ہے تو اِدھر واپس آگیا ہے۔ بابا کے ساتھ اس کی بڑی گہری چھنتی تھی...... جنازے کو کندھا دیتے ہوئے وہ مسلسل روتا رہا تھا۔'' قدیر نے تفصیل بتائی تو گلفام اچھل کر کھڑا ہو گیا۔
''اتنی اہم بات اور تم ہمیں اب بتا رہے ہو۔'' نازیہ نے بھی کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''اس کی تمہارے بابا تک رسائی تھی...... وہ قاتل بھی ہوسکتا ہے۔''
''وہ......؟'' قدیر نے عجیب سی نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ قاتل نہیں ہوسکتا۔''
''کیوں؟''
''کیونکہ اُس بے چارے کو تو اپنا بھی ہوش نہیں ہے......'' قدیر نے تاسف سے جواب دیا۔ ''ہم منہ پر نہیں کہتے لیکن وہ اپنا ذہنی توازن کھو چکا ہے...... حکومت سے ملنے والی امداد پر اس کا گزارہ چلتا ہے۔ وہ پاگل ہو چکا لیکن ہے تو بالکل بے ضرر...... بالکل کسی معصوم بلّے کی طرح۔''

☆☆☆

''میں پاگل ہو جاؤں گا......'' شدید جھنجلاہٹ کے بعد گلفام بڑبڑایا۔
وہ اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا اور اس کی کیفیت جلے پیر کی بلی جیسی ہو رہی تھی۔ اس وقت وہ مقامی تھانے میں موجود تھا جہاں کی نفری نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس علاقے میں جرائم کی شرح عموماً صفر فیصد ہی رہتی تھی۔ گرمیوں کے سیزن میں سیاحوں کی آمد سے کچھ شور شرابا اور دھوم دھڑکا ہو جاتا تھا لیکن وہ کوئی ایسے معاملات نہیں ہوتے تھے جن کو مقامی طور پر حل نہ کیا جاسکے۔
اس طرح کی قتل و غارت اور سیریل کلر سے ان کا واسطہ پہلی بار پڑا تھا اور وہ شدید بوکھلاہٹ کا شکار تھے۔ گلفام نے یہ بات بھی نوٹ کی تھی کہ وہ لوگ حوالدار شیر خان کی ہلاکت کے بعد سے کافی خوفزدہ بھی محسوس ہو رہے تھے۔
''جب پولیس کی یہ حالت ہے تو عوام کے خوف و ہراس کا عالم جانے کیا ہوگا؟'' اس نے مایوسی سے سوچا۔
قدیر کے ہاں سے واپسی پر اس کی نازیہ سے بحث چھڑ گئی تھی۔ نازیہ کوئی بھی کارروائی بیک اَپ فورس کے بغیر کرنے کے لیے راضی نہیں تھی...... چنانچہ گلفام کے اختلاف کے باوجود بھی وہ دو گھنٹے کے فاصلے پر واقع قریبی شہر روانہ ہو گئی تھی تاکہ وہاں سے دارالحکومت رابطہ کر سکے۔ گلفام ابھی تک شش و پنج کا شکار تھا۔ اس نے جاوید کے ساتھ بہت وقت گزارا تھا۔ اس کا دل مانتا ہی نہیں تھا کہ وہ قاتل ہوسکتا ہے۔
موبائل فون سگنل اس علاقے میں کام نہیں کرتے تھے...... صد شکر کہ تھانے میں انٹرنیٹ کی سہولت موجود تھی۔ گلفام نے دانیال سے کہہ کر ''قاتل شکاری'' کی فائل منگوا لی تھی اور پھر اس کا پرنٹ نکال لیا تھا۔ ابھی بھی وہ ٹہلتے ہوئے کوئی چوتھی بار وہ فائل دیکھ رہا تھا۔
''...... قاتل شکاری کا کہیں کوئی سراغ نہ مل پایا تھا...... اس کے آخری شکار مائرہ کی لاش پر زخموں کی تعداد و نوعیت دیگر چار ہلاکتوں سے مختلف تھی...... اہم بات یہ تھی کہ باقی مقتولین کے برعکس اس کے ساتھ زیادتی بھی کی گئی تھی اور پھر نہایت بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا...... جاوید نامی ایک فیلو اسٹوڈنٹ پر اس بات کا شک تھا کہ وہ قاتل شکاری ہوسکتا ہے کیونکہ ایک حادثے میں ہونے والی موت کے بعد سے قتل و غارت کا یہ سلسلہ رک گیا تھا...... کیس کلوزڈ۔''
گلفام نے فائل کی آخری لائنیں پڑھ کر فائل میز پر پٹخ دی۔ اس کا دل ابھی تک جاوید کو مجرم تسلیم کرنے سے انکاری تھا۔
جب پہلی بار وہ ہاسٹل میں ملا تھا تو کسی معصوم بلونگڑے کی طرح خوفزدہ تھا۔ اس کا قد کاٹھ گلفام سے بھی نکلتا ہوا تھا لیکن دبی دبی شخصیت نے اس کی ساری وجاہت ماند کر کے رکھ دی تھی۔ ہاسٹل اور پھر یونیورسٹی میں ان کا تعلق دوستوں سے بڑھ کر بھائیوں والا ہو گیا تھا۔
''تم نازی سے جتنی محبت کرتے ہو...... اس کو پرپوز کر دو...... ورنہ اتنی اچھی لڑکی کو کوئی اور لے اُڑے گا۔'' جاوید نے پہلی بار اسے کسی معاملے میں پہل کرنے کا کہا تھا ورنہ عموماً گلفام ہی اسے کھینچ کھانچ کر ہر جگہ لے جاتا تھا۔
''میرے بھائی نے کہا ہے تو یہ کام تو اب جلد ہی کرنا پڑے گا......'' گلفام نے ہنستے ہوئے کہا تھا لیکن وہ جاوید کی بات پر واقعی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ''تم بھی مائرہ سے اقرارِ محبت کروالو...... ورنہ اس کی ڈولی کو کندھا دیتے پھرو گے۔''
اس بات پر جاوید نے زخمی نگاہوں سے گلفام کی جانب دیکھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے دل میں کوئی بغض

نہیں ہے...... وہ بس دل لگی ہی کر رہا ہے۔
''وہ میری ہے...... اور ہمیشہ میری ہی رہے گی......
اُس کی ہر سانس پر میرا ہی حق ہے...... اس کا انگ انگ میری محبت کا اقرار کرتا ہے تو زبان سے کہلوانے کی کیا ضرورت ہے؟'' جاوید نے ٹھہرے لہجے میں کہا تو محبت اس کے ہر لفظ سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔
''بھئی واہ...... میرا بھائی تو شاعر ہی ہو گیا۔'' گلفام نے سر دھنتے ہوئے کہا۔
جب ان کا تفریحی ٹرپ ٹھنڈیانی پہنچا تو سب نے ہی دل کھول کر تفریح کی تھی۔ برف باری ہوئے ایک دن ہو چکا تھا اس لیے سب نے مل کر 'اسنومین' بنائے اور برف کے گولے مار کر ایک دوسرے سے اپنے بدلے چکائے۔ جاوید نے جتنے پانی والے غبارے کھائے تھے اس سے دگنے نازیہ اور مائرہ کو مارے۔ اس کا نشانہ بڑا پکا تھا اور پھرتیلا وہ اتنا ثابت ہوا کہ جب تک سب لڑکوں نے اسے قابو کر کے برف پر نہ لٹا دیا تب تک لڑکیاں اسے ایک گولا بھی مارنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔
ٹھنڈیانی سے وہ لوگ سہ پہر میں ہی وادی کمراٹ کی جانب روانہ ہو گئے تھے۔ راستہ بہت کٹھن تھا لیکن اس ارضی جنت کے نظارے دیکھ کر وہ اپنی ساری تھکن بھلا چکے تھے۔ یہ علاقہ ابھی تک عام سیاحوں کی پہنچ میں نہیں آیا تھا اس لیے فطرت اپنی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ ہی وہاں پر جلوہ گر تھی۔ ایک مشکل یہ تھی کہ وہاں پر کوئی آؤٹ کلاس قسم کے ہوٹل موجود نہیں تھے جہاں قیام کیا جا سکتا۔ چنانچہ کلاس کی لڑکیوں کے لیے وہاں ہوٹل کے نام پر بنے لکڑی کے کیبن کرائے پر لے لیے گئے جبکہ لڑکوں نے کیمپ لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔
خیمے لگانے کے بعد وہ الاؤ روشن کر کے بیٹھ گئے۔ بجلی، موبائل فون اور جدید دنیا کی تمام سہولیات سے کٹ کر اس رات انہوں نے خوشی کے جو نغمے گائے تھے وہ آج بھی ذہن کے نہاں خانوں میں زندگی کی حسین ترین یادوں کے طور پر محفوظ تھے۔
جاوید، قدیر اور گلفام نے اس رات الاؤ کے گرد تالیوں کی تھاپ پر اپنے علاقے کا مخصوص رقص بھی کیا تھا۔ مائرہ نے اس رات لائٹ پرپل رنگ کا لباس پہنا تھا۔ کانوں میں چاندی کے جھمکے اور سر پر ست رنگی دوپٹا اوڑھے وہ خوشی سے تالیاں بجا رہی تھی، جاوید بہت زیادہ خوش تھا...... رات سونے سے قبل چائے پیتے ہوئے اس نے گلفام کو بتایا تھا کہ مائرہ نے اسے اپنے گھر پیغام بھیجنے کا کہا ہے۔
''یاہو......'' گلفام بھی اس خبر پر بے حد خوش ہوا اور مبارک دی تھی۔
اس حسین رات کی صبح بڑی ہی بھیانک ثابت ہوئی تھی۔ صبح جب یہ سب لوگ بیدار ہوئے تو کیمپ سے مائرہ اور جاوید غائب تھے۔ ان کی ڈھنڈیا مچ گئی لیکن تلاش بے کار ثابت ہوئی۔
گلفام دیگر دوستوں کے ساتھ مل کر ان دونوں کو آوازیں دیتا اور تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ لڑکیاں اور ان کے پروفیسر صاحب الگ پریشان تھے کیونکہ اس طرح ایک کپل کا غیاب یونیورسٹی کی بدنامی کا سبب بن سکتا تھا۔
''...... مدد کرو۔'' گلفام کو کھائی کی جانب سے ایک ہلکی سی آواز سنائی دی تو وہ اس جانب دوڑا۔
جاوید ایک کھوہ نما غار کے دہانے پر ٹھہرا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہے۔ اس کا چہرہ، ہاتھ اور کپڑے دور سے ہی خون آلودہ نظر آ رہے تھے۔ دہانے کے بالکل سامنے کی طرف کھائی تھی جب کہ محفوظ راستہ ذرا پیچھے کی جانب دائیں طرف تھا۔
جاوید جس طرح سے ڈول رہا تھا لگتا تھا کہ اسے سنبھالا نہ گیا تو کھائی میں گر جائے گا۔
''رک جاؤ جاوید...... وہیں رکو...... وہاں سے مت ہلو۔'' گلفام اس کی جانب دوڑتے ہوئے چیخ رہا تھا لیکن جاوید پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بار بار اپنے ہاتھوں کو مسل کر صاف کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی کوشش کے دوران وہ آگے بڑھا تو اس کا پاؤں رپٹ گیا۔ جب تک گلفام وہاں پہنچا، تب تک جاوید کے وجود کو اس اندھی کھائی نے نگل لیا تھا۔
حادثے کے بعد پروفیسر صاحب نے سب طالب علموں کو اکٹھا کیا۔ انہوں نے جاوید اور مائرہ کے ایک ہی غار میں ہونے کے حوالے سے بتایا کہ کس قسم کے غلط نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔
''میں نے یونیورسٹی کی انتظامیہ سے بات کی ہے...... میں نہیں چاہتا کہ آپ کے فیلو اسٹوڈنٹس کی نیک نامی پر حرف آئے...... آپ سب کا ایک ہی مشترکہ بیان ہونا چاہیے کہ مائرہ اور جاوید کھائی میں گرنے سے ہلاک ہوئے...... مائرہ کی لاش تو مل گئی لیکن جاوید کی تلاش جاری رہے گی۔''

سب ہی طالب علموں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔
پولیس کی تفتیش کو بھی بریک لگ گئے جب اس واقعے کو ایک حادثہ ڈیکلیئر کر دیا گیا۔ بعد میں گلفام نے اپنے تئیں بھی پوری کوشش کی تھی لیکن جاوید کی لاش کا کوئی سراغ نہ مل پایا تھا۔ اپنے دوست کی موت پر وہ بہت عرصہ تک اَپ سیٹ رہا۔

''جاوید ایسا نہیں تھا...... وہ جس سے محبت کرتا تھا، جس سے شادی کرنا چاہتا تھا اُسے کیوں اپنے ہی ہاتھوں سے مار دیتا؟'' گلفام نے خود کلامی کی۔ وہ اب بھی پُریقین تھا کہ اپنے بھائیوں جیسے دوست کو بے گناہ ثابت کر کے رہے گا۔ اس نے تیزی سے اپنا سامان سمیٹا۔

''میں جاوید کے کیبن کی جانب جا رہا ہوں...... میں جانتا ہوں، وہ قاتل نہیں ہوسکتا۔'' موبائل فون سگنل تو آنہیں رہے تھے چنانچہ وہ ایک کاغذ پر نازیہ کے لیے نوٹ لکھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

اس کے سامنے کاغذ پر ٹوٹی پھوٹی لکھائی میں ایک نوٹ لکھا ہوا تھا۔

''آج دوا کی ڈبل ڈوز لینی ہے۔''

وہ کل ایک وقت کی اپنی دوا لینا بھول گیا تھا۔ رات کو وہ اپنے بھیانک خوابوں کے سلسلے کو طول نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے صبح کے لیے نوٹ لکھ کر رکھ دیا تھا۔ دوا وہ کب کی کھا چکا تھا۔ اب بس اس کاغذ کے ٹکڑے کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ کیا یہ اس کی اپنی ہی لکھائی ہے؟

''ٹھک ٹھک ٹھک......'' اس کے دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونک گیا۔

اس نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر کی جانب جھانکا۔ برف باری کب کی رک چکی تھی اور اب دھوپ نے سارا ماحول زرد زرد سا کر دیا تھا۔ سورج کی کرنیں، برف سے ڈھکے صنوبر کی شاخوں سے چھن چھناتی ہوئی گزر رہی تھیں۔

''کون ہے......؟'' اس نے غصے سے پوچھا۔

''مجھے تم سے بات کرنی ہے...... کیا تم جاوید وارثی ہو؟'' ایک نرم سی آواز سنائی دی۔

''ہاں میں ہی ہوں......'' یہ کہہ کر وہ دروازے کی جانب آیا اور تھوڑا سا کھول کر باہر کی جانب جھانکا۔

ایک لمبا چوڑا مرد کھڑا تھا جس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اس کے جسم پر کوئی یونیفارم نہیں تھی لیکن اس کا تعلق کسی قانون نافذ کرنے والے محکمے سے ہی معلوم پڑتا تھا۔

جاوید نے دروازہ پورا کھول دیا اور اُسے مسکراتے ہوئے اندر آنے کی دعوت دی۔ اس اجنبی کا چہرہ جانے کیوں اسے شناسا لگ رہا تھا۔ کوئی ایسا جس پر اعتبار کر لیا جائے...... کوئی ایسا جس سے آپ کا گہرا قلبی تعلق ہو۔ وہ اندر داخل ہو گیا تو کیبن کو بغور دیکھنے لگا۔ کیبن میں ہلکی سی بُو تھی جو بہت عرصہ تک تازہ ہوا کی عدم فراہمی کے باعث پیدا ہو جاتی ہے لیکن باقی سب کچھ صاف ستھرا اور ترتیب سے رکھا ہوا تھا۔

''میں کرائم ٹاسک فورس کا ایک آفیسر ہوں...... آپ مجھے آفیسر کرمانی کہہ سکتے ہیں۔'' آنے والے نے اپنا تعارف کرایا۔ جاوید کو ایسا محسوس ہوا جیسے تعارف کراتے ہوئے وہ اس کے چہرے پر کچھ تلاش کر رہا ہو...... کوئی شناسائی کی رمق؟

''میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں آفیسر کرمانی؟''

''کیا حوالدار شیر خان یہاں تفتیش کی غرض سے آیا تھا؟''

''ہاں...... کیوں کیا ہوا؟'' جاوید بولا تو اُسے لگا کہ جیسے آفیسر اس کے اقراری جواب پر حیران ہونے کے ساتھ مطمئن بھی ہو گیا ہو۔

''کیا تمہیں پتا ہے کہ اس کی موت واقع ہو چکی ہے؟''

''ہاں...... معلوم ہے۔'' جاوید نے مختصر جواب دیا۔

''ہم اس کی موت کی تفتیش کر رہے ہیں...... بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ حادثہ ہو لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ شیر خان کو مارنے کے بعد وہاں پھینکا گیا ہو۔ بھیڑیوں نے اس کی لاش کا اتنا بُرا حال کر دیا تھا کہ صحیح اندازہ لگانا ممکن ہی نہیں رہا۔'' کرمانی نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''یہ تو بہت بُرا ہوا...... لیکن آپ مجھ سے کیا پوچھنے آئے ہیں؟'' جاوید نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''کیا تمہیں کوئی اندازہ ہے کہ حوالدار شیر خان تم سے ملنے کے بعد کہاں گیا تھا؟''

''مجھے یاد نہیں...... میری یادداشت صحیح طرح کام نہیں کرتی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ بڑے خان صاحب کے پاس گیا ہو۔'' جاوید نے غیر محسوس انداز میں اپنے ہاتھوں کو رگڑنا شروع کر دیا تھا۔ وہ پھر سے ناموجود خون کو صاف کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم نصیر خان کی ہی بات کر رہے ہو نا...... جو کہ قدیر خان کے والد ہیں؟'' کرمانی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے

ہوئے کہا۔

''ہاں وہی...... بڑے اچھے انسان ہیں۔ مجھے یہ کیبن انہوں نے ہی کرائے پر دے رکھا ہے۔'' جاوید نے کہا تو کرمانی کے چہرے پر اُلجھن کے آثار نظر آنے لگے۔

''تم جانتے ہو نا کہ ان کا چند دن پہلے انتقال ہو چکا ہے؟'' کرمانی بولا۔

جاوید کا یہ اطلاع سن کر چہرہ دھواں دھواں ہو گیا...... یکلخت ہی اسے یاد آیا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے نصیر خان کو قبر میں اتار کر آیا تھا۔ اسے پرانی باتیں بھی یاد آنے لگی تھیں۔ کرمانی اس کی حالت دیکھ رہا تھا کہ جاوید اس کی پروا کیے بغیر ہی اپنے ہاتھوں کو پتلون سے رگڑ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر یہ سب دیکھ کر تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔

''ہاں...... ہاں مجھے یاد آ گیا۔ وہ فوت ہو گئے ہیں۔ مجھے اُن کی قبر پر فاتحہ پڑھنے بھی جانا ہے۔'' جاوید نے بمشکل یہ الفاظ ادا کیے۔ اس کے سر کا درد جانے کہاں سے عود آیا تھا۔

''جاوید...... تمہیں یہاں آئے کتنا عرصہ ہو چکا ہے؟'' کرمانی نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

''چھ ماہ سے زیادہ ہی ہو گئے ہیں......'' وہ تلخی سے بولا۔

''اور اس سے قبل تم کہاں تھے؟''

''کمراٹ ویلی میں......''

''اور کمراٹ سے پہلے بھی تم یہیں رہے ہو؟''

''ہاں بھی رہا ہوں...... یہیں اس علاقے میں رہا تھا۔ زندگی کا کافی سارا حصہ ایبٹ آباد میں بھی گزارہ ہے...... وہاں میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔''

''کیا میں تمہیں بالکل بھی یاد نہیں ہوں؟'' آفیسر نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا جو کہ گلفام کرمانی تھا۔

وہ بہت دیر سے کوشش کر رہا تھا کہ جاوید اُسے پہچان لے لیکن اس کی بے اعتنائی اندر ہی اندر سے اسے کھائے جا رہی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کا اتنا قریبی دوست اسے یوں بھول جائے گا۔ اب بھی اگرچہ اس نے بھئی کہا تھا لیکن گلفام کو اس کا 'بھائی' کہنا یاد آ گیا اور وہ بے ساختہ یہ سوال کر گیا۔

جاوید کو اس بات پر ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تم...... تم میرے خوابوں میں آتے ہو۔ تم یونیورسٹی میں میرے ساتھ تھے نا؟'' جاوید نے بے یقینی سے پوچھا

لیکن گلفام کرمانی کے چہرے پر اتنی بات سن کر ہی رونق آ گئی تھی۔

''مجھے تھوڑا تھوڑا یاد ہے...... ایک لڑکی مائرہ تھی، ایک گلفام تھا۔'' وہ چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔ ''تمہی گلفام ہو نا؟''

اس کا اثبات میں ہلتا سر دیکھ کر جاوید نے اپنی بات جاری رکھی۔

''ہم پہاڑوں میں تھے...... برف باری بھی ہوئی تھی اور ہم خیمے میں تھے...... پھر جانے کیا ہوا؟ میں زخمی ہو کر غار میں پہنچ گیا، میرے سر سے خون بہہ رہا تھا...... میرے ساتھ مائرہ بھی تھی۔ نہیں مائرہ کی لاش تھی...... وہ مر چکی تھی۔'' وہ ٹکڑوں میں بول رہا تھا۔

''ہاں ہاں ایسا ہی ہوا تھا...... پھر کیا ہوا؟'' گلفام اس کی طرف کی کہانی سننے کے لیے بے چین تھا اس لیے اس کی حوصلہ افزائی کرنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ جاوید کی ٹوٹی پھوٹی یادداشت میں سے اہم معلومات جلد از جلد حاصل کر لے کہ کہیں وہ پھر سے ہی سب کچھ نہ بھول جائے۔

''میں گر گیا تھا...... مجھے بہت چوٹ آئی تھی۔ وہ حکیم صاحب نے میرا خیال رکھا اور دوا دیتے رہے۔ انہوں نے ہی میری یادداشت واپس آنے پر مجھے یہاں بھیجا تھا...... وہ کہتے تھے کہ میں چھ سال تک سب بھولا رہا۔ بس ایک چیز ہی میرے ساتھ محفوظ رہی...... ٹھہرو وہ میں تمہیں دکھاتا ہوں۔'' جاوید نے تفصیل بتاتے ہوئے الماری کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔

الماری کے پاس جا کر اُس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ الماری کھول کر اسے اپنا ہتھیار لگا نظر آیا تو جیسے اس کا کھویا ہوا اعتماد لوٹ آیا۔ وہ خطرناک انداز میں واپس پلٹا تو اس کے ہاتھ میں بڑے پھل والا شکاری خنجر موجود تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی سفاکی تھی اور چہرے پر ایسی مسکراہٹ جو کہ سب کچھ تہس نہس کر کے رکھ دینے والوں کے چہروں پر ہوتی ہے۔

گلفام جو اپنے ہی خیالوں میں گم تھا، جاوید کے یہ تیور دیکھ کر اس کے چہرے پر بلا کا خوف اتر آیا۔ وہ بوکھلا کر پلٹا لیکن اپنے ہی قدموں میں اُلجھ کر فرش پر گر گیا۔

☆☆☆

اس کے فرش پر گرنے سے ایک دھما کا سا ہوا۔ نازیہ حیران رہ گئی کہ یہ چھوٹا سا ٹرانسمیٹر گرنے پر اتنا شور کیسے کرتا ہے۔

''دھیان سے میڈم...... ہمارے ریسورسز پہلے ہی محدود ہیں اور یہ بڑا مہنگا آلہ ہے۔'' دانیال نے اسے تنبیہہ کی۔

وہ اپنی ٹیم کے ساتھ ہیلی کاپٹر پر ایبٹ آباد آیا تھا۔ وقت کم تھا اور مقابلہ سخت اس لیے نازیہ نے ہیلی کاپٹر کے استعمال کی اجازت دے دی تھی۔ وہ گلفام کو وہاں چھوڑ تو آئی تھی لیکن اس کا دل نہایت بے چین تھا۔

اپنی چار رکنی ٹیم کے ساتھ وہ جلد از جلد روانہ ہونا چاہتی تھی لیکن برفانی طوفان نے ان کا سفر دشوار کر دیا تھا۔ ہر قسم کی تیزی کے باوجود انہیں انتظار کرنا پڑ رہا تھا۔

اس دوران دانیال نے سب کو بریف کر دیا تھا کہ وہ کس طرح سے ایکشن لیں گے۔ موبائل فون کے رابطے کی کمی کو انہوں نے دور کرنے کے لیے اپنا میڈیم رینج کمیونیکیشن سسٹم لانچ کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اسے کوئی بھی انٹرسیپٹ نہیں کر سکتا تھا اور چار سے پانچ کلومیٹر کے علاقے میں ٹیم کے ہر ممبر کے پاس موجود انٹر کام ٹرانسمیٹر پر دوطرفہ رابطہ ممکن بناتا تھا۔

اگلے دن وہ سب تیار ہو کر اپنی ایک نشست گاہ میں بیٹھے تھے۔ نازیہ، گلفام کے بارے میں فکرمندی کا شکار ہو رہی تھی۔ ٹرانسمیٹر بالوں میں بڑی آسانی سے منسلک کیا جا سکتا تھا۔ تو سب ہی اسے اپنے اپنے کان کے اوپر لگا کر بیٹھے تھے۔ چھوٹا اور ہم رنگ ہونے کی وجہ سے یہ نظر بھی نہیں آتا تھا۔ بلیک یونیفارم کے ساتھ سب اپنی گنز اور اضافی میگزین کے ساتھ مشن کے لیے مکمل تیار تھے۔

''اگر کوئی اہم بات کرنی ہے تو آپ گلفام کو ای میل بھی کر سکتی ہیں......'' دانیال نے نازیہ کی بے چینی کو نوٹس کرنے کے بعد رابطے کا حل تجویز کرتے ہوئے کہا۔ ''وہاں تھانے میں انٹرنیٹ کی سہولت موجود ہے۔''

''انٹرنیٹ تو موجود ہے لیکن......'' نازیہ نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہ یقین نہیں کہ گلفام بھی وہاں موجود ہے یا نہیں۔''

''کیا وہ آپ کے ڈائریکٹ آرڈرز کی بھی خلاف ورزی کرتا ہے؟'' دانیال نے حیرانی سے پوچھا۔ وہ جانتا تھا کہ نازیہ ہر معاملے کو دیکھ کر اور آخر میں اپنے ہر ماتحت کو ہدایات دے کر ہی اپنی جگہ سے ہٹتی ہے۔

''ہوں......'' نازیہ نے ایک سرد آہ بھری۔ ''مسئلہ یہ ہے کہ وہ میرا شوہر بھی ہے...... اور پاکستان میں شوہر جب تک بیوی کی ہر بات کے خلاف عمل نہ کریں، انہیں چین ہی نہیں آتا ہے۔''

''ہاہاہا......'' دانیال اس کی بات پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ ''تو آپ نے جس بات پر عمل کروانا ہو اس کے الٹ ہی ہدایت دیا کریں۔''

''ایسا ہی کرتی ہوں......'' نازیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن صرف گھریلو معاملات میں...... دفتری معاملات میں مجھے سیدھا ہی چلنا پڑتا ہے لیکن اب تم اُسے یہ بتامت دینا۔''

دانیال اس کی بات پر مسکرا دیا۔ ہلکی پھلکی بات چیت سے خود نازیہ کے کشیدہ اعصاب کو سکون ملا تھا ورنہ وہ پچھلے ایک دن سے شدید بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اپنا سیل فون کھولا اور گلفام کے نام خیریت نامہ ٹائپ کرنے لگی۔

وہ جانتی تھی کہ جاوید اپنا خیال خود رکھنے کا اہل ہے لیکن کبھی کبھی وہ بچہ بن جاتا تھا۔ کسی بات کی ضد طاری ہوتی تھی تو جب تک اپنی بات نہ منواتا تھا تب تک اسے چین نہیں آتا تھا۔

''...... مجھے تم سے بہت محبت ہے...... بہت پیار اور اپنا خیال رکھنا۔

تمہارے ہونے والے بے بی کی ماما'' طویل میسج کے آخر میں اس نے لکھا اور پھر خود ہی پڑھ کر شرما کے رہ گئی۔

''میڈم...... سب کچھ ریڈی ہے۔ ہم فوری طور پر روانہ ہو سکتے ہیں۔'' اس کی ٹیم کے ایک رکن حارث نے آ کر کہا تو وہ اپنا موبائل فون بند کر کے پھرتی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ تیز قدم اٹھاتے ہوئے ہیلی پیڈ کی جانب روانہ ہو گئے۔

طوفان کے بعد وہ لوگ ہیلی کاپٹر پر روانہ ہوئے تھے...... لیکن انہیں اپنے مطلوبہ وقت سے پورا ایک دن اور تین گھنٹے کی تاخیر ہو چکی تھی۔

☆☆☆

جاوید کو ندی کنارے والی چراگاہ سے آئے تین سے چار گھنٹے بیت گئے تھے۔ بھیڑیے اس کی مخالف سمت میں چنگھاڑتے ہوئے گزرے تھے۔ ندی کے دوسرے کنارے پر ان کے جھنڈ گھومتے پھرتے...... اگر انہیں کوئی شکار میسر آ جاتا تھا تو اس جانب بھی آ جاتے تھے۔

''ہاؤووو......'' ایک بھیڑیا چلّایا تو جاوید کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

طوفان کی آمد آمد تھی اس لیے تیز تیز چلتا ہوا وہ اپنے کیبن کے پاس پہنچ گیا۔ آوازوں سے وہ اندازہ لگا سکتا تھا بھیڑیے جنگل میں دعوت اُڑا رہے تھے۔ اس نے بھی گھر میں اپنے لیے لذیذ روسٹ تیار کیا اور مزے سے کھایا۔ کھانے کے بعد اسے کوئی کام نہیں تھا اس لیے وہ ڈٹ کر سویا۔

رات شدید طوفان آیا تھا لیکن اگلے دن اس کا نام و نشان ہی باقی نہیں رہا تھا۔ ہر سمت پھیلی برف میں البتہ چند فٹ کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ناشتا دیر سے کرنے کی وجہ سے دوپہر کے کھانے کی اسے کوئی چاہ نہیں رہ گئی تھی۔ دوا والی چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اس نے بھٹی میں گوشت کو مصالحہ لگا کر پکنے کے لیے رکھ دیا۔ سہ پہر تک وہ بہترین انداز میں پک کر تیار ہو چکا ہوتا۔ دوپہر کو وہ آتش دان جلائے ٹی وی پروگرام سے لطف اندوز ہو رہا تھا جب اس نیوز فلیش اور بریکنگ نیوز کی پٹیاں چلنے لگیں۔

علاقے کی مشہور نیوز رپورٹر روزینہ ایک ہاتھ میں مائیک جبکہ دوسرے میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھامے کھڑی تھی۔

''ناظرین...... پلیز یہ مناظر بچوں کو نہ دیکھنے دیں۔ ہم اس وقت سیٹلائٹ کے ذریعے لائیو کوریج کر رہے ہیں اور یہ ایکسکلوزو نیوز آپ تک ہمارا چینل ہی پہنچا رہا ہے۔'' اس کی آواز رُندھ گئی۔ ''اف اللہ......''

خبر دینے سے قبل پڑھتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک اٹھے تھے۔ ''بہت افسوس کے ساتھ آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ہمارے علاقے میں ایک اور قتل ہو گیا ہے۔ ہماری ٹیم کے ہی ایک نمائندے نے لاش دریافت کی ہے۔ بھیڑیوں نے اسے نوچ کھایا ہے لیکن حیرت انگیز طور پر چہرہ محفوظ رہا ہے۔ شناختی کارڈ کی بدولت ہم آپ کو بتا سکتے ہیں کہ یہ کرائم ٹاسک فورس کے آفیسر گلفام کرمانی کی لاش ہے۔''

جاوید کے پیٹ میں جیسے کسی نے لات مار دی۔ وہ اچھل کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا۔ ٹی وی پر اب گلفام کی لاش کے مناظر دکھائے جا رہے تھے۔ یہ سب دیکھتے ہوئے اس کا سر چکرایا اور اس نے فرش پر الٹی کر دی۔

''پولیس کو اس بارے میں مطلع کر دیا گیا ہے اور وہ جلد ہی موقع پر پہنچ جائے گی۔'' نیوز رپورٹر اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھی۔ ''یہ علاقے میں پچھلے کچھ ہی عرصہ میں ہونے والی چوتھی موت ہے۔ سب سے پہلے ماریہ بخاری کی لاش دریافت ہوئی اس کے بعد حوالدار شیر خان مارا گیا۔ علاقے کے معزز اور معذور بزرگ شہری نصیر خان کے بعد اب سی ٹی ایف جیسے ادارے کے اہلکار کو اس بربریت کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ان سب وارداتوں کے ڈانڈے کسی ایک ہی قاتل سے جا کر مل رہے ہیں...... حکام کا کہنا ہے سی ٹی ایف کی ٹیم پوری شد و مد سے اس سیریل کلر کی تلاش پر توجہ مرکوز کیے ہوئے اور وہ جلد ہی اسے اس کے انجام تک پہنچائے گی۔''

اس کے بعد وہ جائے واردات کے مناظر پھر سے دکھانے لگی۔ جاوید کے سر میں شدت سے دھماکے ہو رہے تھے۔ کنپٹیوں پر کوئی پوری شدت کے ساتھ ٹھوکریں مار رہا تھا۔ اس کا دل پسلیاں توڑ کر باہر آنے کے لیے آمادہ تھا۔ اس کے ذہن میں پوری شدت کے ساتھ لاشوں اور گوشت کے ٹکڑوں کے مناظر گھوم رہے تھے۔

''میرا بھائی...... میرا بھائی۔'' وہ پوری شدت سے چلّا اٹھا اور باہر کی جانب بھاگا۔ نجانے کون سی قوت تھی جو اسے دوڑائے جا رہی تھی۔

☆☆☆

حارث کو نازیہ نے فوراً ہی مقامی تھانے کی جانب دوڑا دیا تھا۔

''وہاں موجود انچارج کو بتا دو کہ ہم کارروائی کرنے لگے ہیں اور گلفام کو لے کر کیبن پہنچو۔ ہم شاید اس سے پہلے ہی ریڈ کر دیں۔'' وہ تیزی سے ہدایات دینے لگی۔

ندی کے کنارے والی چراگاہ میں ہموار سطح دستیاب تھی۔ ان کے ہیلی کاپٹر نے وہیں لینڈ کیا تھا۔ سیاہ چست یونیفارم میں ملبوس اس کے ٹیم ممبر سفید برف پر واضح نظر آ رہے تھے۔

''یہ سیاہ لباس دن میں چھاپا مارنے کے لیے قطعی نامناسب ہے۔'' حارث کے روانہ ہونے کے بعد نازیہ تنقیدی نگاہ سے جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ''دانیال...... مجھے ہیڈ کوارٹر واپس جا کر یاد کرانا، اس معاملے میں بھی اسٹریٹجی بنانے کی ضرورت ہے کہ ہمارا لباس مقام کے مطابق ہو۔''

دانیال نے سر ہلا کر تائید کی۔

جاوید کا کیبن دس سے پندرہ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہ تیز رفتاری سے حرکت کرتے ہوئے وہاں پہنچے۔ برف کی نرم تہ پر چلنا آسان کام نہیں تھا لیکن ان کی ایک ایک حرکت سے بھرپور ٹریننگ کا اظہار ہو رہا تھا۔

کیبن نسبتاً ترائی میں تھا۔ وہاں سے ایک پگڈنڈی نکل کر مرکزی راستے سے مل رہی تھی۔ پیچھے اور سائڈ کی

جانب سے وہ چراگاہ سے ملا ہوا تھا جس کو عبور کر کے وہ وہاں تک پہنچے تھے۔ اسی چراگاہ کو پار کر کے ندی تھی اور پھر صنوبر دیودار کے درختوں کا جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ کیبن کے اطراف میں بھی چند درخت موجود تھے۔ ایک جانب کے قطعہ زمین پر پھول بوٹوں کا جھاڑ جھنکار دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ اسے بھی بنا برف والے موسم میں کاشت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

''خاور...... تم پیچھے والا حصہ کور کرو گے...... فاروق...... تم سائڈ والی کھڑکی دیکھنا تا کہ وہ وہاں سے نہ نکل سکے۔ دانیال تم فرنٹ سے اینٹری کرو گے...... اور میں تمہیں کور دوں گی۔'' نازیہ نے اپنی اسالٹ ٹیم کو ہدایات دیں۔ وہ مجرم کے فرار کی ساری راہیں مسدود کر دینا چاہتی تھی۔

''کیا یہ بات کنفرم ہے کہ وہ کیبن میں ہی موجود ہے؟''

تمہیں دروازہ توڑ کر داخل نہیں ہونا ہے دانیال......'' نازیہ خشمگیں لہجے میں بولی۔ ''یہاں کسی فلم کی شوٹنگ تو نہیں ہو رہی...... تم دستک دے کر ہی داخل ہونے کی کوشش کرو گے۔ باقی سارے اقدامات تو حفظِ ماتقدم کے لیے ہیں۔''

دانیال اس بات پر قدرے جھینپ کر رہ گیا۔ اپنی تمام تر فطری ذہانت کے باوجود وہ کبھی کبھی بالکل سامنے کی بات نظر انداز کر دیتا تھا۔

''ویسے بھی تم دیکھ سکتے ہو کہ کیبن کی چھت پر آتشدان والی چمنی کے ساتھ ساتھ کچن والی چھوٹی چمنی کے پائپ سے بھی دھواں نکل رہا ہے جو کہ کھانا پکنے کی نشانی ہے...... اس لیے زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ کیبن میں ہی ہو گا۔'' نازیہ نے اپنا تجزیہ پیش کر دیا۔

دانیال اس پر سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ نازیہ کی صلاحیتوں کا معترف تھا اور اس بات کا قائل تھا کہ وہ ایسی چیزیں بھی دیکھ لیتی ہے جو کہ عام طور پر وہ نظر انداز کر جاتا تھا۔ فیلڈ میں اسے نازیہ سے ہمیشہ ہی کچھ نیا سیکھنے کو ملتا تھا۔

''حارث اور گلفام کا انتظار کیا جائے یا نہیں؟''

نازیہ نے اپنی کلائی والی گھڑی کو دیکھا، اس کا دل پہلے سے ہی بے چین تھا۔ اس نے مزید انتظار کرنے کے بجائے فوری اقدام کا فیصلہ کیا۔

''نہیں...... تم جا کر دستک دو۔ باقی ٹیم...... ٹیک یور پوزیشنز۔''

سب اپنی اپنی مقرر کردہ پوزیشن پر فکس ہو گئے۔

نازیہ نے اپنی گن نکال کر مضبوطی سے ہاتھ میں تھام لی۔ وہ دانیال کو کیبن کے دروازے کی جانب جاتا دیکھ رہی تھی۔ خاور اور فاروق اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے لیکن انٹرکام ٹرانسمیٹر پر ان کا رابطہ قائم تھا۔

''آل الرٹ...... دانیال اینٹر ہونے لگا ہے۔'' وہ بولی۔

دانیال نے ٹین کے دروازے پر دستک دی تو کوئی جواب نہ آیا۔ وہ اسے کھلا ہوا محسوس ہو رہا تھا...... دانیال نے آہستگی سے اس کے پٹ کو کھولا تو دروازہ بہ آسانی کھلتا چلا گیا۔

''ایزی دانیال...... دروازہ کھلا ہونا مجرم کی کوئی چال بھی ہو سکتی ہے...... اندر داخل ہونے سے پہلے اچھی طرح تسلی کر لینا۔'' نازیہ نے صورتِ حال بدلتے دیکھ کر نئی ہدایات جاری کیں۔

دانیال نے دراوزہ چوپٹ کھول دیا۔ اندر کا ماحول نظر آنے لگا تھا۔ نازیہ کو پہلی نظر میں کسی ذی روح کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

''دانیال اینٹری کرو...... فاروق اینڈ خاور، اپنی پوزیشن پر ہی رہو...... مجرم ہمیں فرنٹ پر مصروف رکھ کر کہیں سے بھی فرار ہو سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ وہ دانیال کو زیادہ بہتر کور دینا چاہتی تھی۔

دانیال اندر داخل ہوا تو چھوٹے سے کیبن کا جائزہ فوری طور پر ہی مکمل کر لیا۔ وہاں اس کے علاوہ کوئی ذی نفس نہیں تھا۔ ٹی وی پر کوئی نیوز چل رہی تھی اور وہیں سامنے ہی کسی نے قے کی ہوئی تھی جس کی ہلکی سی بو کیبن میں رچی ہوئی تھی۔

''آل کلیئر...... یہاں کوئی نہیں ہے۔'' دانیال نے کہا۔

نازیہ تیزی کے ساتھ کیبن میں داخل ہوئی۔ وہ ایک ایک چیز کو بغور دیکھ رہی تھی۔ فرش پر الٹی دیکھ کر اس نے ناک سکیڑی۔ اتنی دیر میں اس کی نگاہ ٹی وی پر پڑی تو ٹھٹک کر رہ گئی۔

''یہ...... یہ کیا......؟'' وہ ہکلا کر رہ گئی۔

دانیال نے غور کیا تو ٹی وی پر گلفام کے مرڈر کی رپورٹ چل رہی تھی۔ کونے پر لائیو کے الفاظ سرخ رنگ میں جل بجھ رہے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر والیوم اونچا کر دیا۔

''فاروق، خاور...... اندر ہی آ جاؤ۔'' وہ بولا۔

''ناظرین آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ گلفام کے کوئی قریبی ہیں جنہوں نے جائے واردات پر آ کر تباہی پھیلا دی ہے۔'' رپورٹر حواس باختہ انداز میں بول رہی تھی۔ ''آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس نے آتے ہی لاش کے بکھرے ٹکڑوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ جانے یہ پولیس ایسے موقعوں پر کہاں مر جاتی ہے؟''

آخری جملہ اس نے مائیک ایک سائڈ پر کرتے ہوئے کہا تھا لیکن اس کی بات سنائی دے گئی تھی۔

ایک شخص دیوانہ وار چلا رہا تھا اور باقی ٹی وی کریو کے لوگ اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اتنا بپھرا ہوا تھا کہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ تھوڑا سا تھم گیا جب سرخ ٹائی اور براؤن اوورکوٹ میں ملبوس ایک شخص نے ریوالور نکال کر اسے دھمکی دی۔ سانولی رنگت والا یہ کلین شیو، ریوالور بردار شخص غالباً نیوز چینل والوں کا سیکورٹی گارڈ تھا۔

''میرا بھائی...... مار ڈالا...... میرا...... بھائی۔'' وہ بے ہنگم انداز میں چلّا رہا تھا اور الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔

نازیہ دیکھ سکتی تھی کہ وہ جاوید تھا۔ وہ وہیں کرسی پر ڈھے سی گئی۔ اس کے بدن کی ساری توانائی جیسے کسی نے نچوڑ لی تھی۔ کچھ بُرا ہونے کا جو احساس تھا اب نگاہوں کے سامنے آ گیا تھا۔ اس کے ساتھیوں کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس پر کیا قیامت گزر گئی ہے لیکن کسی نے ایک لفظ تک نہیں کہا۔ سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس پر کیا بولیں۔

کھو دینے کا احساس اتنا شدید تھا کہ نازیہ کا دماغ ہی سن ہو کر رہ گیا تھا۔ دماغ میں ہوتی سائیں سائیں میں اُسے کہیں کوئی اور آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ گلفام کو ہمیشہ کے لیے کھو چکی ہے۔

''اس لوکیشن کو چیک کرو......'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد نازیہ نے اپنی آنکھوں میں اُمڈتی نمی کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اس رذیل شخص کو گرفتار کر لو میں اس کا انجام بہت بُرا کروں گی۔''

☆☆☆

اس کی گرفتاری کے بعد عوام میں شدید غم و غصہ پایا جاتا تھا اور وہ قاتل کے بھیانک انجام کے خواہش مند تھے۔ عدالتی کارروائی نہایت تیز رفتاری سے ہوئی تھی اور آج چار ماہ بعد کیس کا فیصلہ سنایا جانا تھا۔

یہ کیس عام پولیس کے پاس ہوتا تو وہ اب تک پولیس مقابلے میں مارا جا چکا ہوتا لیکن سی ٹی ایف والوں نے اسے

اپنی تحویل میں ہی رکھا تھا۔ ماورائے عدالت قتل، معاشرے میں بڑھتی ناانصافی کے بعد فروغ پا رہے تھے اور عوام کا اعتماد اداروں سے اٹھنے لگا تھا۔ ایسے میں سی ٹی ایف والوں کا انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے کیس پوری دیانت داری سے عدالت میں لے کر جانا ایک مثال قائم کرنے کی ہی کوشش تھی۔

''میں جانتی ہوں کہ چاہے جتنی مرضی کوشش کر لی جائے...... لیکن وہ ذہنی معذور ہے...... اُسے پھانسی کی سزا نہیں ملے گی۔'' ایک رات قبل آفس سے رخصت ہوتے وقت اس نے جب دانیال سے بات کی تو اس کے لہجے سے ہی مایوسی ٹپک رہی تھی۔ ''لیکن میں اسے اپنی خطا بھگتتے دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''اسے کسی نہ کسی جگہ تو بند رکھا جائے گا...... چاہے پاگل خانہ ہی کیوں نہ ہو؟ اس طرح ہم اس جنونی کو چھوڑ کر مزید قتل و غارت کا نشانہ تو نہیں بنیں گے نا؟'' دانیال نے اپنی رائے دی۔

''کیا اتنی سزا کافی ہے؟'' نازیہ کے لہجے کا تاسف دل چیر دینے والا تھا۔

''یہاں بڑے بڑے مجرم باعزت بری ہو جاتے ہیں...... کم از کم اسے اپنے کیے کی کوئی تو سزا ملے گی۔'' دانیال نے کہا۔

نازیہ نے کچھ نہ کہا...... گلفام کے بعد سے وہ اپنے والدین کے ہاں ہی رہ رہی تھی لیکن آج وہ آفس سے اپنے گھر چلی گئی۔ اسے گلفام کی یاد بہت شدت سے آرہی تھی۔ وہ اپنا اور گلفام کا سامان نکال کر دیکھنے لگی جو واپسی پر آیا تھا لیکن اس نے کھولنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی۔ گلفام کا لکھا ایک پرچہ اس کے ہاتھ لگا تو اسے دیکھ کر رو پڑی۔

نازیہ نے اب تک بہت ہمت و حوصلے کا ثبوت دیا تھا اور جاوید کی پھانسی کے لیے ہی کیس فائل کیا تھا۔ کئی لوگوں نے اس کے عدت میں نہ بیٹھنے پر اعتراض کیا تھا لیکن وہ گلفام کے قاتل کو چھوڑ کر آٹھ نو ماہ کے لیے ایک طرف نہ بیٹھ پائی۔ بیشتر وقت وہ فل یونیفارم میں ہی گزارتی تھی۔ اپنی گن بھی ہمیشہ ساتھ رکھتی تھی۔ وہ پوری تندہی سے اپنا کام کرتی رہی لیکن فیصلے کا دن قریب آتے آتے اس کی ہمت جواب دینے لگی تھی۔

اگلے دن کا سورج طلوع ہوا تو وہ آفس نہیں آئی تھی اور نہ ہی عدالت آنے کی زحمت کی تھی۔ دانیال البتہ وہاں سی ٹی ایف کی جانب سے موجود تھا۔ نازیہ کی غیر موجودگی پر اُسے اچنبھا ضرور ہوا تھا۔

جاوید کا علاج چل رہا تھا اور وہ کافی بہتر دکھنے لگا تھا۔ اب ٹوٹے ٹوٹے الفاظ میں بولنے کے بجائے وہ پوری بات کرتا تھا لیکن عموماً وہ ایسی ہی ہوتی تھی سوال گندم اور جواب چنا۔

جاوید کو حوالدار شیر خان، نصیر خان اور بائزہ بخاری کے علاوہ ایبٹ آباد میں ہونے والی خواتین کے قتل کا ذمے دار بھی ٹھہرایا گیا لیکن ناکافی ثبوتوں کی بنا پر سزا نہ دی گئی۔

''عدالت تمام دلائل اور ثبوتوں کی بنا پر ملزم جاوید وارثی کو آفیسر گلفام کرمانی کا قاتل قرار دیتی ہے۔ جس خنجر سے پے در پے وار کر کے گلفام کو قتل کیا گیا، وہ جاوید کے کیبن سے ہی ملا جس پر اس کی انگلیوں کے نشان ثبت ہیں۔'' جج نے فیصلہ سنانا شروع کیا۔ ''عدالت مجرم کو پھانسی کی سزا سناتی ہے۔''

اس اعلان پر کمرائے عدالت میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ میڈیا والے پھٹ پڑے اور ایک طوفانِ بدتمیزی برپا ہو گیا۔

''آرڈر...... آرڈر۔'' جج نے ہتھوڑا مارتے ہوئے لوگوں کو چپ کروایا۔ ''عدالت کا احترام ملحوظِ خاطر رکھا جائے...... ابھی فیصلہ مکمل نہیں ہوا۔''

اس اعلان پر یکلخت ہی خاموشی چھا گئی۔

''عدالت مجرم کو پھانسی کی سزا کا مستحق سمجھتی ہے لیکن ملک کے ایک ماہر سائیکاٹرسٹ نے بیان دیا ہے کہ ملزم شیزوفرینیا کا مریض ہے...... جو اپنے تئیں کچھ بھی سوچتا رہتا ہے اور اس پر عمل بھی کرتا رہتا ہے۔ اس کی ذہنی حالت کے پیشِ نظر عدالت تاحیات اس کو پاگل خانے بھیجنے کا حکم سناتی ہے۔''

دانیال نے دیکھا کہ اس بات پر جاوید کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ پولیس جب اسے لے کر جا رہی تھی تو وہ ایک ہی لفظ بار بار بڑبڑا رہا تھا۔

''زینہ...... زینہ......'' اس کے الفاظ سمجھ نہیں آرہے تھے لیکن ان میں پکار واضح تھی۔

دانیال کو اب آفس جانا تھا جہاں پر کچھ نئی آنے والی فرانزک رپورٹس وہ پڑھنا چاہتا تھا۔ یہ کیس بالکل صاف تھا۔ فیصلہ بھی ہو چکا تھا پھر بھی جاوید کی تکرار سن کر اس کے ذہن میں کچھ کھٹکا ضرور لیکن وہ سمجھ نہیں پایا تھا اور وہ اُلجھ کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

جاوید اُلجھ کر ہی رہ گیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے سزا کیوں دی گئی ہے۔ ذہن پر چھائی دھند ہٹنے لگی تھی۔

''میں نے تو کچھ نہیں کیا...... پھر مجھے سزا کیوں مل رہی ہے؟'' آہنی کرسی پر اُکڑوں بیٹھا وہ یہی سوچ رہا تھا۔ اسے پاگل خانے کے ایک علیحدہ کمرے میں رکھا گیا تھا۔ وہ اپنے سفید براق لباس پر ہاتھ رگڑ کر خون صاف کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو کبھی وہاں تھا ہی نہیں۔

یہاں آ کر جو اسے ٹریٹمنٹ مل رہا تھا، اس کی وجہ سے تیزی سے ریکوری ہو رہی تھی۔ اسے بہت ساری ماضی کی باتیں یاد آ گئی تھیں لیکن ابھی تک وہ انہی یادوں میں جی رہا تھا۔ اپنے موجودہ حال سے اسے نہ کوئی سروکار تھا اور نہ ہی پروا۔

''میں نے تو کبھی خرگوشوں، جنگلی بھیڑوں اور ہرنوں کو بھی نقصان نہیں پہنچانا چاہا تھا...... یہ کیوں کہہ رہے کہ میں نے گلفام کو مار ڈالا؟'' وہ خود کلامی کر رہا تھا۔ ''ہاں ان کا گوشت بڑا لذیذ بنتا تھا خاص طور پر روسٹ......'' ذہنی رو ایک بار پھر بہک گئی تھی۔

''میں تو ان کا گوشت اتارنے کے بعد بچی ہوئی لاشیں بھی ندی کنارے پھینک آتا تھا تاکہ بے چارے بھیڑیئے بھوکے نہ رہ جائیں۔'' اس نے معصومیت سے سوچا جیسے بھیڑیوں کو اس کی ہمدردی کی ضرورت تھی۔

''میں ٹھیک ہو جاؤں گا تو ان سب کو بتاؤں گا۔'' اس نے سوچا۔ ''لیکن آج جب میں عدالت میں 'نازی...... نازی' کہہ رہا تھا تو وہ سی ٹی ایف والے انسپکٹر کی شکل کیوں اتنی عجیب ہو گئی تھی؟''

☆☆☆

نازیہ کے سامنے موجود شخص نے قہقہہ لگایا تو اس کی شکل عجیب سی ہو گئی تھی۔ لذت، خوشی اور درد کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر وحشت بھی ناچ رہی تھی۔ اسی عالم میں اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا خنجر میز میں گھونپ دیا۔

''امم...... امم۔'' نازیہ نے رسن بستہ حالت میں بولنے کی کوشش کی۔ اس کے منہ پر پٹی بندھی تھی جب کہ ہاتھ پیر کو مضبوط رسی کی مدد سے کرسی کے ساتھ ہی باندھ دیا گیا تھا۔

اس کا سر شدت سے دکھ رہا تھا کیونکہ جب وہ اپنے گھر سے نکلی تھی تو سر پر پڑنے والی چوٹ سے ہی بے ہوش ہوئی تھی۔ کل رات سے ہی وہ اس جنونی کی قید میں تھی۔ وہ کوئی بات کیے بغیر اسے باندھ کر اپنی تیاریوں میں مشغول تھا۔ وہ اس وقت بھی اپنے مخصوص بلیک یونیفارم میں ہی تھی۔ البتہ اس کی گن نکال لی گئی تھی...... قاتل اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ اس کی گن اس کے ساتھ رہنے دیتا۔ وہ حاملہ ہونے کی وجہ سے زیادہ اٹھا پٹخ بھی نہیں کر سکتی تھی ورنہ کرسی توڑ کر آزاد ہونے کی کوشش ضرور کرتی۔ رسّی کھولنے کی کوشش بے کار ہی ثابت ہوئی تھی کیونکہ اس نے ایک کے بجائے کئی رسیوں کا استعمال کر کے باندھا تھا۔

چار ماہ کی حاملہ ہونے کی وجہ سے اس کی بہت سی ضروریات تھیں لیکن ان کو پورا کرنے کے لیے بھی وہ اسے کھولنے کا روادار نہیں رہا تھا...... اسے سب وہیں بیٹھے بیٹھے کرنا پڑا۔ سارا دن اسے اپنے ہی بول و براز میں ایک اکیلے کمرے میں گزارنا پڑا تھا۔ بعد میں وہ اسے اپنے ڈائننگ روم میں لے آیا تھا۔ نازیہ سمیت کرسی گھسیٹنے میں اسے کوئی مشکل نہیں ہوئی تھی۔ وہ کمرا آتشدان کے جلنے کی وجہ سے گرم تھا۔ کھڑکی سے باہر دیکھنے پر بہر حال نری تاریکی ہی دکھائی دیتی تھی۔

''چپ کر گندی عورت...... میں تجھے اتنا چاہتا تھا اور تو مجھے چھوڑ کر اس گلفام کے پیچھے پاگل ہو گئی تھی؟'' قدیر خان بولا تو اس کے لفظ لفظ سے نفرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''زندگی میں مجھے ہر مقام پر دھوکا ہی ملا ہے...... تو نے بھی مجھے دھوکا ہی دیا۔''

''امم...... امم۔'' نازیہ نے اب کی بار قدرے زور لگایا تو کرسی بھی ہلنے لگی تھی۔ اسے شاید اس بات سے شدید اختلاف تھا۔ قدیر نے آگے بڑھ کر اس کے منہ سے پٹی ہٹا دی۔

''ہاں بول کیا بولنا چاہتی ہے تو کمینی؟'' نازیہ کی تیز تیز سانس بحال کرنے والی آواز کے دوران وہ بولا۔ ''میرا یہاں کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا...... میرے جرائم کی ساری سزا جاوید کو ہی ملے گی۔''

''میں نہیں جانتی تمہارا مسئلہ کیا ہے قدیر...... لیکن مجھے جانے دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔'' نازیہ نے تقریباً گھگیاتے ہوئے فریاد کی تو قدیر کا قہقہہ نکل گیا۔

''سی ٹی ایف کی ڈپٹی ڈائریکٹر...... اور اتنی بودی؟'' وہ استہزائیہ انداز میں گویا ہوا۔ ''نہیں نہیں...... یہ مجھے بے وقوف بنانے کی ہی کوشش ہے...... لیکن میں شکل سے ہی چغد لگتا ہوں...... اصل میں نہیں ہوں۔''

نازیہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ وہ واقعی بہت چالاک مجرم تھا اور اپنے پیچھے کوئی سراغ نہیں چھوڑتا تھا۔ وہ اس کے جھانسے میں بھی نہیں آیا تھا اس لیے اس نے اپنا طریقہ کار بدل دیا تھا۔

''خیر، تم شکل سے بھی چُغد نہیں لگتے۔ کیسے کیا یہ سب تم نے...... ہم میں سے کوئی آخر تک سراغ نہ لگا پایا...... بلکہ ایک بے گناہ تمہارے حصے کی سزا بھگت رہا ہے۔'' نازیہ کے لہجے میں تحسین کا عنصر شامل ہو چکا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جب کوئی پیار کی مار سے نہیں مرتا تو تعریف کے جال میں ضرور پھنس جاتا ہے اور ایک حسین عورت کے منہ سے سننے والی تعریف کسی بھی مرد کو بے وقوف بنا سکتی۔

''ہاہاہا...... میں بہت چالاک جو ہوں۔'' اب وہ خود ہی اپنے منہ میاں مٹھو بننے لگا۔ ''میں نے یہ سب بہت باریکی سے پلان کیا تھا' یہ جاوید تو اچانک ہی بیچ میں آپھنسا...... اور مزے کی بات کہ ایک بار نہیں بلکہ دو دو بار۔''

''وہ کس طرح ؟ میں بالکل بھی نہیں سمجھی......؟'' نازیہ نے آنکھیں پٹ پٹائیں۔

''کمراٹ وادی میں میرا نشانہ مائرہ نہیں تھی...... میں تمہیں شکار بنانا چاہتا تھا۔ جب میں اندھیرے میں غار کا جائزہ لینے گیا تو وہ سمجھی کہ میں جاوید ہوں...... وہ پیچھے پیچھے آگئی اور بس پھر...... تو لٹ گئے ہاں لٹ گئے ہم تیری محبت میں......'' وہ بے موقع گنگنایا جس پر نازیہ نے اپنے چہرے پر آنے والی ناگواری کے تاثرات نہایت مشکل سے روکے۔

''لیکن جاوید پر تم نے کیسے قابو پایا......؟'' نازیہ نے نکتہ اٹھایا۔

میرے پاس نشہ آور دوا ہمیشہ رہتی تھی...... اتنی ٹھنڈ میں جاوید کو چائے میں پلانا کونسا مشکل کام تھا اور وہ چائے تو گلفام نے بھی پی تھی؟'' قدیر کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

''تو کیا تم نے یہ سب ٹرپ پر جانے سے پہلے ہی پلان کیا ہوا تھا؟'' نازیہ نے حیرت سے کہا۔

''ہاں ہاں...... ارے بتایا تو ہے کہ پلان تمہارے ساتھ تھا...... اور جاوید کی جگہ گلفام مارا جاتا لیکن سوئے اتفاق وہ دونوں مارے گئے اور تم دونوں بچ گئے۔'' قدیر نے ایسے سمجھاتے ہوئے کہا جیسے کسی بچے کو بتا رہا ہو۔ ''سارا الزام گلفام پر آجاتا اور معاملہ فنش۔''

''جب سب ختم ہو گیا تو اب پھر کیوں شروع کر دیا ہے؟''

''میں بور ہو گیا تھا......'' قدیر نے ایسے کہا جیسے یہ ساری قتل و غارت گری اس کے لیے کوئی معنی ہی نہ رکھتی ہو۔ ''بابا اپنی عمر پوری کر چکے تھے...... آج نہیں تو کل مر جاتے لیکن جاوید واپس آیا تو وہ کھل اٹھے۔ وہ اتنی تیزی سے صحت یاب ہونے لگے تھے جیسے ان کی روح کو کوئی نئی خوراک ملنے لگی ہو۔ تب پہلی بار مجھے شک ہوا کہ سب میری اور جاوید کی مشابہت کی بات کرتے ہیں تو اس کے پیچھے کیا کوئی وجہ بھی ہے؟ بابا ہمیشہ سے جاوید کے غریب ہونے کے باوجود اس پر اپنا دستِ شفقت رکھتے تھے۔ اس کے یونیورسٹی کے اخراجات بھی وہی اٹھا رہے تھے...... میں نے جب ان سے ان سب مہربانیوں کے بارے میں سوال کیا تو وہ بے ساختہ بول اٹھے...... ''کیونکہ وہ تمہارا بھائی ہے۔' تم نہیں جانتیں نازیہ کہ میں اس بات پر کیسے تڑپ کر رہ گیا تھا۔''

''تمہارا بھائی؟'' نازیہ کا منہ اس بار حقیقی حیرت سے کھلا رہ گیا تھا۔

''ہاں میرا سگا بھائی ہے جاوید...... مجھے بابا نے گود لیا تھا۔ جاوید کے ماں باپ ہی میرے اصلی ماں باپ تھے لیکن اتنے غریب تھے کہ مجھے پال ہی نہیں سکتے تھے اس لیے بابا کے ہاتھ فروخت کر دیا۔'' وہ نفرت سے بولا اور اپنی اونی ٹوپی اتار دی تو لمبے بال نظر آنے لگے۔ نازیہ اب دیکھ سکتی تھی کہ اسلام آباد میں بائیک پر نظر آنے والا چہرہ اسی کا تھا اور اس کے بھیانک خوابوں کا شکاری بھی۔

''وہ تمہارا بھائی ہے تو تمہیں خوشی ہونی چاہیے...... یہ سب تم نے کیا شروع کر دیا؟''

''چپ کر کمینی......'' قدیر ایک بار پھر غلیظ زبان پر اتر آیا تھا۔ ''مجھے نصیحتیں نہ کر...... میں یہ سب اپنی ذات کی تسکین کے لیے کرتا تھا۔ ایبٹ آباد میں جب میں نے قتل شروع کیے تھے تو تب کسی سے انتقام نہیں لیتا پھر رہا تھا...... مجھے مزہ آتا تھا یہ سب کر کے اور ایسے ماں باپ و بھائی سے اچھا تھا۔ میں پیدا ہوتے ہی مر جاتا۔''

یہ کہہ کر اس نے شیطانی قہقہہ لگایا جبکہ نازیہ دل میں تائید کیے بنا نہ رہ سکی۔

''جاوید تو میرے لیے دوسرا جنم بن کر آیا تھا...... وہ نہ آتا تو مجھے یہ خونی کھیل کھیلنے کا پھر سے موقع بھی نہ ملتا۔ اب میں تجھے مار کر اپنی تشنہ رہ جانے والی حسرت پوری کروں گا...... اسی لیے تو اتنی دور اسلام آباد سے تجھے اٹھا کر یہاں لایا ہوں۔ کیا تو نہیں جانتی کہ میں کبھی کبھی بائیک پر تیرے

اردگرد گھوما کرتا تھا؟'' وہ خنجر اٹھانے کے لیے آگے بڑھا۔
''میری لاش کا کیا کرو گے؟'' نازیہ نے پوچھا، اس کی آواز میں خوف سا تھا۔ شاید یہ اس کے پیچھا کرنے کا ہی اثر تھا کہ وہ اس کے خوابوں میں لاشعوری طور پر نظر آنے لگا تھا۔
''ہاہاہا...... جو باقیوں کے ساتھ کیا، بھیڑیوں کو ڈالوں گا مائی ڈارلنگ۔ اگر اس وقت تیری یہ حالت نہ ہوتی تو میں بھی اپنی خواہش پوری کرتا۔'' اس نے دیدہ دلیری کا مظاہرہ کیا۔
نازیہ کے چہرے پر جو پہلے سراسیمگی طاری تھی، وہ یکلخت ختم ہوگئی۔
''ایک منٹ رکو......''
''کیا بات ہے۔ جلدی بکو......''
''گلفام کو کیوں مار دیا......؟''
''او بے وقوف عورت...... تجھے ابھی تک یہ بھی پتا نہیں چلا؟ گلفام تمہاری ٹیم میں سب سے زیادہ عقلمند تھا۔ اس نے دو جمع دو کر کے یہ سراغ پالیا تھا کہ ہر اس جگہ پر جہاں 'شکاری قاتل' کا سراغ ملتا ہے وہاں جاوید کے علاوہ ایک اور شخصیت بھی کامن ہے...... یعنی میں۔ وہ اپنی طرف سے ہیرو بن کر مجھ پر چڑھائی کرنے آیا تھا۔ ایک ہی وار میں اس سالے کا کام تمام کر ڈالا تھا اور اپنا خنجر جاوید کے خنجر سے بدل ڈالا۔ وہ مجھے پکڑنے آیا تھا کمی......'' قدیر نے اپنی بات کا اختتام گالیوں پر کیا۔
اس نے کیک کا ایک پیس اٹھا کر منہ میں ڈالا۔ ''آج میرے جنم دن کا تحفہ وصول کرنے کا وقت آگیا ہے......''
نازیہ کی جان لینے کے لیے اس نے خنجر والا بازو بلند کر لیا تھا۔ نازیہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہی تھی۔ یکلخت ہی قدیر کا ہاتھ نیچے آیا اور اسی وقت کھڑکی کا شیشہ توڑتے ہوئے گولی آکر اس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ اسے ایک جھٹکا لگا اور وہ پیچھے کی جانب گرا۔ کسی بے زبان اسنائپر نے اپنا کام پورا کر دیا تھا۔
دھڑ کی آواز کے ساتھ ہی دروازہ ٹوٹا اور دانیال اندر داخل ہوگیا، اس کے پیچھے خاور بھی تھا۔ دانیال نے تیزی سے آگے بڑھ کر نازیہ کو بندشوں سے آزاد کرانا شروع کر دیا۔
''بچو......'' نازیہ چلائی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ قدیر نے لیٹے لیٹے ہی اپنی جیکٹ سے نازیہ والی گن نکال لی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، خاور نے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چار فائر داغ دیے۔
''ٹھاہ...... ٹھاہ...... ٹھاہ۔'' فائر کی آواز کیبن میں بُری طرح گونج رہی تھی اور ہر فائر کے ساتھ ہی قدیر کے بدن میں ایک نیا روشن دان کھلتا جا رہا تھا۔ نازیہ کے چہرے پر اس کے ساتھ ساتھ ہی طمانیت اترتی چلی جا رہی تھی۔
کوئی دو گھنٹے بعد وہ مقامی تھانے میں بیٹھے ضروری کارروائی سے نمٹ رہے تھے۔ نازیہ ایک کمبل اوڑھے کافی کی گرمائش اپنے وجود میں اتار رہی تھی۔
''تو تم نے میرا سراغ لگا ہی لیا......؟'' اس نے مسکراتے ہوئے دانیال سے پوچھا۔
''میں آپ کے بارے میں سوچتا ہی نہ...... لیکن فیصلے کے بعد جاوید کی بات میرے ذہن میں اٹک گئی تھی۔ مجھے کافی تاخیر سے پتا چلا کہ وہ 'زینہ زینہ' نہیں بلکہ 'نازی نازی' بول رہا تھا۔ نئی والی فرانزک رپورٹس چیک کیں تو اس میں جاوید کے فریزر سے ملنے والے سارے گوشت کے پیکٹ حیوانی تھے۔ میں نے آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش تیز کر دی لیکن آپ کی طرف سے جواب ندارد۔ میں بہت حیران ہوا کہ آپ نے تو گلفام کے شہید ہونے کے بعد بھی اپنی روش نہیں بدلی تھی تو پھر ایسا کیا ہوا؟ آپ کے والدین سے رابطہ ہونے کے بعد کنفرم ہوگیا کہ آپ کسی مصیبت میں ہیں۔ شکر ہے کہ آپ اپنا ٹرانسمیٹر ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی ہیں۔ اس کی بدولت ہی ہم آپ کو ٹریک کرنے میں کامیاب ہو پائے۔'' دانیال بولنے پر آیا تو بولتا ہی چلا گیا جبکہ نازیہ اس کی بات مسکراتے ہوئے سنتی رہی۔
''یعنی تمہارے ساتھ ساتھ مجھے اب جاوید کا شکریہ بھی ادا کرنا ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔
''ہاں جی...... اور اس کے ساتھ ساتھ داور شاہ کا بھی جس نے 'مشن ریسکیو باس' کے لیے فوری طور پر ہیلی کاپٹر کا بندوبست بھی کرا دیا۔'' دانیال نے شرارتی لہجے میں کہا تو وہ دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔
ہیلی کاپٹر پر بیٹھ کر جب وہ واپسی کے سفر کے لیے روانہ ہوئی تو برف باری کا آغاز ہوگیا۔ روئی کے گالوں جیسی گرتی برف کی وجہ سے فضا میں چھائی ہوئی دھند چھٹنے لگی تھی۔ دھند کے پار...... اسے سب دکھائی دینے لگا تھا۔ نیچے پھیلے ہوئے شہر کی روشنیاں اسے یہی پیغام دے رہی تھیں کہ اسے جینا ہے...... ایک بہت اچھی زندگی جینا ہے۔ اپنے لیے...... اپنے بچّے کے لیے...... اور اس بچے کے چاچو کے لیے جو پے در پے حادثات کا شکار ہو کر اپنی ذہنی رو میں متوازن نہ رہا تھا۔

❖❖❖